جلد ۲۷
شمارہ ۱

محرم الحرام ۸۱ھ
جولائی ۱۹۶۱ء

ماهنامه

رامپور یوپی

سالانہ پانچ روپیہ

فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

ماہنامہ

زندگی رام پور

محرم الحرام ۱۳۸۱ھ
جولائی ۱۹۶۱ء

جلد ۲۷
شمارہ ۱

مدیر:۔ سید احمد عروج قادری

● خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ — منیجر زندگی رام پور یوپی

● پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیج کر رسید ہمیں ارسال کریں

منیجر ماہنامہ بتول ۴ اے ذیل دار پارک اچھرہ، لاہور۔

● زرِ سالانہ:۔ صہ ر ششماہی:۔ تین روپیہ۔ فی پرچہ:۔ پچاس نئے پیسے

ممالک غیر سے:۔ دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

احمد حسن طابع و ناشر نے جماعت اسلامی ہند کی طرف سے ناظم پریس بازار نصراللہ خاں میں چھپوا کر دفتر رسالہ زندگی رامپور سے شائع کیا

اشارات

(سید احمد عروج قادری)

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا جو لوگ ثبوت مانگتے ہیں وہ دراصل اس بات کا ثبوت طلب کرتے ہیں کہ خدا نے کسی انسان کو اپنا رسول بنایا بھی ہے یا نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ کی نبوت ورسالت ثابت نہ ہو تو آج دنیا میں کسی ایک نبی کی نبوت بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے اپنے آخری نبی کی نبوت پر جو دلیل عطا کی وہ صفحۂ عالم پر اس طرح نقش ہے کہ قیامت تک کوئی اسے مٹا نہیں سکتا۔ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی نبوت ورسالت پر ایمان کا دعویٰ کرنے والے جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت میں شک کرتے ہیں تو واقفِ حال حیران رہ جاتا ہے حالانکہ صورت واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ کی نبوت ورسالت میں ایک درجہ شک کی گنجائش ہو تو ان مذکورہ بالا انبیاء کی نبوت ورسالت میں سو درجہ شک کی گنجائش نکل آئے گی۔ فی الواقع یہ نبوت محمدی کا احسان ہے کہ اس نے ان انبیاء کی نبوت کو بھی حتمی اور قطعی بنا دیا ہے۔ احسان ماننے کے بجائے آپ کی شخصیت پر پھبتیاں اڑانا اور جان بوجھ کر آپ کی نبوت میں شک پیدا کرنا، انتہا درجہ کی ناشکری ہی نہیں ہے، پرلے درجے کی حماقت بھی ہے اس لیے کہ اس غیر معقول رویے سے صرف اس گروہ کو فائدہ پہنچا ہے جو ہر آسمانی دین کے انکار پر تلا ہوا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو ایک طرف دیوتاؤں، دیویوں اور اوتاروں پہ عقیدہ رکھتے ہیں جس کی پشت پر کوئی دلیل و برہان موجود نہیں ہے اور دوسری طرف نبوت محمدی میں شک کرتے ہیں جو ناقابلِ انکار دلائل سے مدلل ہے تو واقفِ حال کو بڑی حیرانی ہوتی ہے۔ قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ اللہ نے ہر قوم اور ہر ملک میں اپنے رسول بھیجے ہیں۔ اس کی ہدایت کا نور ہر افق پر چمکا اور اس کے پیغام کی ابدی و سرمدی صدا ہر ملک میں گونجی ہے۔ یہ اعلان ثابت کرتا ہے کہ ہندوستان میں بھی خدا کی آواز گونجی ہو گی اور یہاں بھی اس کے قاصد اور رسول آئے ہوں گے۔ اس اعلانِ حقیقت کا تقاضا کیا ہے کہ برادرانِ وطن کو قرآن اور اس کی تعلیمات پر غور و فکر کرنا چاہیے یا یہ ہے کہ قرآن اور پیغمبرِ قرآن کا بغیر کسی معقول دلیل کے انکار کر دینا چاہیے؟

انبیاء کرام علیہم السلام کے مقدس گروہ میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آج بھی دنیا میں آپ کی دلیلِ نبوت موجود ہے جسے ہاتھوں سے چھوا، آنکھوں سے دیکھا اور زبانوں سے پڑھا جا سکتا ہے اور جسے اپنے سینوں میں محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ یہ امتیاز آپ کو اس لیے عطا کیا گیا کہ قیامت تک پھر کوئی نبی آنے والا نہ تھا آپ سلسلۂ نبوت کے خاتم تھے۔ ایک طرف آپ نے انبیاء سابقین کی نبوت و رسالت کی تصدیق فرمائی اور دوسری طرف منصبِ نبوت و رسالت پر مہر لگا کر ہمیشہ کے لیے اسے بند کر دیا۔

آپ کی نبوت و رسالت کو ثابت کرنے والا، دائمی اور قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ قرآن مجید ہے۔ نبوتِ محمدی کی جس قدر معقول و منقول دلیلیں موجود ہیں ان سب کا ماخذ یہی ایک دلیل ہے۔ یہ ایک دلیل دراصل بیسیوں آفاقی، انفسی، عقلی، تاریخی اور تجربی دلائل و براہین کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبوتِ محمدی کے منکرین کو مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ پیش کیا ہے انہیں حسبِ ذیل چھ اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نبوتِ محمدی کے اثبات کے لیے خود قرآن کو بطور دلیل و شاہد پیش کرنا۔ (۲) قرآن کے وحی الٰہی ہونے پر دلائل (۳) وسیع کائنات کے بعض اجزاء کی شہادت۔ (۴) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قبلِ نبوت چالیس سالہ زندگی سے استشہاد (۵) نبوت کے بعد دعوتِ اسلامی کے بنیادی نکات اور آپ کے فکر و عمل اور اخلاق و کردار سے استشہاد۔ (۶) انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کی تاریخ سے استشہاد۔

ان چھ اقسام کی تفصیلات قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں میں شروع سے آخر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تمام مضامین کو مفصل طور پر پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ہر قسم سے متعلق کچھ اہم نکات پیش کیے جائیں گے۔

جس طرح اللہ نے توحید و آخرت کے اثبات کے لیے آفاق و انفس کی بہت سی چیزوں کو پیرایۂ قسم میں بطور شاہد و دلیل پیش کیا ہے۔ اسی طرح نبوتِ محمدی کے اثبات کے لیے عظیم ترین معجزہ، قرآن کریم کی قسم کھا کر اسے آپ کے دعویٰ نبوت کی صداقت کے لیے بحیثیت شاہد و دلیل پیش کیا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت و رسالت کو سچا ثابت کرنے کے لیے اس کائنات میں قرآن سے بڑی کوئی محسوس و مشاہد دلیل موجود نہیں ہے۔ سورۂ یٰسین کی ابتدا درجۂ ذیل آیات سے کی گئی ہے۔

یٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

قرآن کریم اس بات پر گواہ ہے کہ بلاشبہ تم خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہو، سیدھی راہ پر ہو۔ زبردست

تَنزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ اور مہربان ہستی نے نازل کیا ہے۔

یہ قرآن جو ایک طرف بڑی مضبوط و محکم بنیاد پر قائم اور دوسری طرف بے مثال حکمتوں سے معمور ہے، شہادت دے رہا ہے کہ تم اسی طرح خدا کے رسول ہو جس طرح تم سے پہلے اس نے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ یہ قرآن جو نہ محض شاعرانہ پرواز تخیل ہے، نہ بے بنیاد کہانت، بلکہ ناقابلِ انکار حقیقتوں سے بھری ہوئی ایک لاجواب کتاب ہے، اس بات پر شاہد عدل ہے کہ تم گمراہی و ضلالت کے ہر شائبے سے پاک اور ٹھیک اس صراطِ مستقیم پر چل رہے ہو جو خود خدا نے تمہیں دکھائی ہے۔ اس قرآن کی ایک ایک آیت پکار رہی ہے کہ میں کسی انسان کا کلام نہیں ہوں بلکہ خدائے عزیز رحیم کا کلام ہوں جسے اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مطہر قلب پر اتارا ہے اور جسے ان کی پاک زبان ٹھیک اسی طرح سنا رہی ہے جس طرح وہ اتارا گیا ہے ــــــ قرآن کی شہادت کسی معمولی کتاب کی شہادت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی کتاب کی شہادت ہے جو حکیم یعنی ہر جہت سے محکم و استوار اور حکمتوں سے پُر ہے۔ کسی شے کی قدر و قیمت اور حقیقت اس کی صفات و خصوصیات سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں خود قرآن کے لیے جن صفات و خصوصیات کا ذکر موجود ہے ان سب کی مکمل فہرست تیار کرنے کا موقع تو نہیں ملا لیکن سرسری نظر ڈالنے سے بھی ذیل کے الفاظ سامنے آئے۔

حکیم، کریم، عظیم، مجید، عزیز، مبین، منیر، شفاء، رحمت، ہدایت، نور، ذکر، ذکریٰ، تذکرہ، موعظہ، بصائر، مبارک، مصدق، مہیمن، روح۔

قرآن کھولتے ہی ہماری نگاہوں کے سامنے اس کی ایک ایسی خصوصیت اور ایک ایسی صفت جلوہ گر ہوتی ہے جو اسے دنیا کی تمام دوسری کتابوں سے ممتاز کر دیتی ہے۔

الٓمٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں، پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔

قرآن کے سوا دنیا کی کون سی کتاب ہے جسے لاریب فیہ کی خصوصیت حاصل ہوا اور جو ضلالت و گمراہی سے پاک، هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کی صفت سے متصف ہو۔ اس کتاب کی دوسری خصوصیت جو پہلی ہی خصوصیت کا نتیجہ ہے یہ ہے:۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ (حٰمٓ السجدۃ ۵) کسی سمت اور کسی جہت سے کبھی اس کتاب میں باطل کا دخل نہیں ہے۔

جو کتاب ہر شک و شبہ سے پاک، سراپا ہدایت اور غلطی و کذب کے ہر اندیشے سے بری ہو کیا اس کی شہادت

معمولی اور بے وزن شہادت ہو سکتی ہے ؟ ایک ایسے کلام کی شہادت بھی اگر مخاطبین کو مطمئن نہیں کرتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مطمئن ہونا چاہتے ہی نہیں، دوسرے مقام پر پھر فرمایا:۔

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ بَلْ	قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی، بلکہ
عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ	انہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہیں میں
مِّنْهُمْ ۔	کا ایک ڈر سنانے والا آیا۔

بزرگی اور عظمت وشان والا قرآن خود اس بات پر دلیل ہے کہ تم خدا کے رسول برحق ہو، تمہاری رسالت میں کوئی شک نہیں، جو لوگ تمہاری رسالت کا انکار کر رہے ہیں ان کے پاس انکار کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ جہل ونادانی کی وجہ سے وہ اس پر متعجب ہیں کہ انہیں میں کا ایک آدمی خدا کا رسول کیسے بن گیا۔

ٹھیک یہی بات سورۂ صٓ کی ابتدا میں کہی گئی ۔

صٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۚ بَلِ	قسم ہے اس قرآن ناصح کی، بلکہ انکار کرنے
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝	والے غرور اور عناد ومخالفت میں مبتلا ہیں ۔

یہ نصیحتوں اور یاد دہانیوں سے پُر تبلیغ وتاثیر کا شاہکار قرآن، نبوت محمدی کی صداقت پر گواہ ہے اور انکار کرنے والے، جاہلانہ غرور اور معاندانہ مخالفت کے جوش میں اس نبوت و رسالت کا انکار کر رہے ہیں ۔

قرآن کو نبوت محمدی کی صداقت کے لیے شاہد اور دلیل بناتے ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے ؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ قرآن کی جو صفات وخصوصیات ذکر کی گئی ہے وہی اس حقیقت تک پہنچ جانے کے لیے کافی ہیں کہ یہ کسی انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتی لیکن یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے صرف اس جواب پر بس نہیں کیا بلکہ اس دعوے پر متعدد جہتوں سے دلائل پیش کیے تاکہ حجت پوری ہو جائے اور کسی کے پاس عذر انکار باقی نہ رہے سب سے پہلی چیز جو قاری کے ذہن کو چونکاتی ہے وہ پر زور اور شاہانہ انداز میں اس دعوے کی تکرار ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور اسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اسے اتارا ہے۔ اوپر سورہ یٰسٓ کی جو آیات پیش کی گئی ہیں ان میں کی ایک آیت تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ میں بھی یہی دعویٰ کیا گیا ہے۔ آیئے ہم سب سے پہلے یہی دیکھیں کہ قرآن میں یہ دعویٰ نو بہ نو انداز میں کتنی دفعہ دہرایا گیا ہے۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ اس تکرار کی غرض صرف تاکید نہیں ہے بلکہ ہر جگہ دعوے میں ایک دلیل بھی چھپی ہوئی ملے گی ۔ یہاں بھی العزیز اور الرحیم کے اسمائے حسنیٰ، دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں

العزیز (زبردست اور غالب) تو اس حقیقت کو ثابت کر رہا ہے کہ خدا کی سلطنت میں کوئی نہیں ہے جو اس کے ارادے کی تکمیل میں حائل اور مانع بن سکے اس کائنات میں خدا کی مزاحم طاقت سرے سے موجود ہی نہیں ہے' وہ اگر اپنے کسی بندے پر اپنا کلام نازل کرنا چاہے تو یہ بات اس کے دائرۂ قدرت کے اندر ہے۔ اب اگر کوئی شخص نزول وحی کا انکار کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی قدرت کا انکار کر رہا ہے۔ الرحیم اس بات کی دلیل ہے کہ صحیح راستے کی طرف راہنمائی اور ہدایت کے لیے کتاب نازل کرنا اور رسول مبعوث کرنا اس کی رحمت کا تقاضا ہے اور یہ بات اس کی رحمت سے بعید ہے کہ وہ انسانوں کو زندگی کے تاریک جنگل میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے اب اگر کوئی شخص کتاب الہی اور رسالت کا انکار کرتا ہے تو دراصل وہ خدا کی رحمت کا انکار کر رہا ہے۔

یہی دعویٰ سورۂ سجدہ کی اس آیت میں ہے:۔

الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ	یہ کتاب رب العلمین کی طرف سے اتاری گئی
مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بندوں کی ہدایت کے لیے قرآن نازل کرنا پروردگار عالم کی ربوبیت کا تقاضا ہے جس کی ربوبیت نے انسان کی مادی اور جسمانی زندگی کی تمام ضروریات پوری کی ہیں اور ہر آن وہ ان کی تکمیل میں لگا ہوا ہے۔ کیسے ممکن تھا کہ وہ انسان کی روحانی زندگی کی ضرورت پوری نہ کرتا جب کہ روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضرورت' مادی زندگی کی ضرورت سے زیادہ اہم ہے۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اس نے انسان کی یہ اہم ترین ضرورت پوری نہیں کی ہے تو فی الواقع وہ خدا کی ربوبیت کبریٰ کا انکار کر رہا ہے۔

سورۂ زمر میں فرمایا:۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝	یہ کتاب اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہے جو عزیز اور حکیم ہے۔

العزیز کی صفت ایک طرف تو یہ بتاتی ہے کہ قرآن کا نزول اس کی قدرت کاملہ کے تحت ہوا ہے اور کوئی اسے روک نہیں سکتا تھا اور دوسری طرف یہ بھی واضح کرتی ہے کہ کسی میں یہ دم خم نہیں جو اس کتاب کے نفاذ کو روک دے۔ یہ کتاب معاندین کی تمام مخالفتوں کے باوجود نافذ ہو کر رہے گی۔

سورۂ مومن میں کہا:۔

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ	یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو عزیز
الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝	اور علیم ہے۔

یہاں علیم کی صفت تنبیہ کرتی ہے کہ علم اس کی ذاتی صفت ہے اور تمام کائنات کو محیط ہے اس لیے اسی کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے قانون بنائے اسی کا قانون صحیح اور ہر خلل سے پاک ہو سکتا ہے۔ کم علم انسان خود جو قانون بھی بنائے گا، ناقص ہوگا اور خلل سے پاک ہرگز نہ ہوگا۔

سورۂ حم السجدہ میں ہے :۔

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (یہ رحمٰن اور رحیم کی اتاری ہوئی کتاب ہے) اسی سورہ میں ایک جگہ اور ہے، تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (یہ حکیم اور حمید کی اتاری ہوئی کتاب ہے) حمید کا لفظ جب اللہ کی صفت بنتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ محمودیت اس کی ذاتی صفت ہے۔ اس کی اپنی ذات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تمام اچھے صفات سے متصف اور تمام برے صفات سے بری ہو۔ اس صفت کا استعمال اس جگہ یہ بتا رہا ہے کہ اگر وہ قرآن نازل نہ کرتا تو یہ بات اس کے لیے نقص وعیب ہوتی اور وہ ہر نقص وعیب سے پاک ہے ـــــ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا :۔

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝	یہ کتاب اس خدا کی طرف سے اتاری گئی ہے جو زمین اور بلند آسمانوں کا خالق ہے۔

ان متعدد صفات حسنیٰ کا ذکر یہ بتاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کرنا خدا کی ان صفات کا تقاضا ہے، اگر کوئی شخص خلوص کے ساتھ خدا کو ان صفات سے متصف مانتا ہے تو آخر کس بنیاد پر وہ خدا کی طرف سے قرآن کے نزول کا انکار کرے گا؟ اس کی خالقیت، ربوبیت، رحمت، قدرت، علم وحکمت اور ذاتی طور پر تمام صفات حمیدہ سے اتصاف اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے کتاب حق نازل کی ہے اگر وہ یہ کتاب نازل نہ کرتا تو اس کی ربوبیت مطلقہ اور رحمت عامہ میں نقص پیدا ہو جاتا حالانکہ اس کی ذات ہر شائبۂ نقص سے پاک ہے۔ ان آیتوں کے علاوہ متعدد آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں بہ انداز شاہانہ انزال قرآن کی نسبت اپنی طرف کی گئی ہے۔ سورۂ انسان میں فرمایا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۝	بلاشبہ ہم نے قرآن کو تم پر بتدریج نازل کیا ہے۔

سورہ حجر میں کہا :۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝	ہم نے یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے محافظ ہیں

یہ کسی انسان کا گھڑا ہوا ذکر نہیں ہے بلکہ ہم نے اسے نازل کیا ہے اور کسی انسان کی مجال نہیں کہ اُسے

مٹایا دبا سکے اور نہ کسی کے بس کی بات ہے کہ اس میں تحریف کر سکے اس لیے کہ ہم خود اس کے نگہبان اور محافظ ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا :۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ	اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا
نَزَلَ ۔	ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے

"اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے" اس بات کی ضمانت ہے کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک بحفاظت تمام ٹھیک اسی طرح پہنچ گیا ہے جس طرح ہم نے اسے نازل کیا، راستے میں ذرہ برابر اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ دوسری جگہ اس کے بحفاظت پہنچنے کی صورت یہ بتائی ۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	یہ قرآن پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے
نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ	امانت دار روح لے کر نازل ہوئی ہے، تمہارے
لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ	قلب پر، تاکہ تم ڈرانے سنانے والے ہو جاؤ۔
عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ (الشعراء ۱۹۵)	واضح عربی زبان میں۔
قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ	ان سے کہو اسے تو روح القدس نے
رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (النحل ۱۰۲)	میرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے

"امانت دار روح" اور "پاک روح" حضرت جبرئیل علیہ السلام کا لقب ہے۔ ان دونوں آیتوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا نام نہیں لیا گیا بلکہ ان کی نوعیت تخلیق اور دو صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کو مرسل الیہ تک پہنچانے کی خدمت ایسے وجود اور ایسی ہستی سے لی گئی ہے جو مادیت کی کثافتوں سے پاک اور بشری نفسانیت و نقص سے بری ایک روح مجرد ہے جس میں پاکی و پاکیزگی کے ساتھ امانت کی صفت بھی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک قرآن پہنچانے میں اس سے کسی طرح کی خیانت صادر نہیں ہوئی۔ اس میں اس نے ایک شوشے اور ایک حرف کا ردو بدل بھی نہیں کیا اور ٹھیک ٹھیک اسی طرح پہنچا دیا جس طرح اسے اللہ رب العالمین نے عطا کیا تھا۔ قرآنی سفارت ہی کی وجہ سے حضرت جبریل کو فرشتوں کے درمیان یہ مقام امتیاز حاصل ہے کہ قرآن میں ان کی متعدد صفات کا مفصل ذکر موجود ہے تاکہ کسی کو بھی اس سفارت کے بارے میں شک و شبہہ پیدا نہ ہو۔ حضرت جبریل کی صفات جاننے کے لیے سورۂ نجم اور سورۂ تکویر بھی پڑھنی چاہیے ہم طوالت کے خوف سے یہاں وہ آیات پیش نہیں کر رہے ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو

یہودیوں سے سابقہ پیش آیا۔ یہودی حضرت جبریل کے دشمن تھے اور یہی قرآن کی سفارت پر مامور تھے اس لیے یہاں آکر لقب کے بجائے ان کا نام لیا گیا تاکہ عداوت یہود کے علی الرغم یہ بات بالکل واضح ہو جائے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ — ان سے کہو جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا

نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ — ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریل نے اللہ ہی کے اذن

(بقرۃ ر ۱۲) — سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے۔

یعنی جو لوگ جبریل سے عداوت رکھتے ہیں وہ دراصل خدا کے دشمن اور اس کے اختیار و انتخاب پر معترض ہیں اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن خدائے بزرگ و برتر کا کلام ہے جسے اس نے اپنی حفاظت میں حضرت جبریل کے ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔ مرسل خدائے عزیز و رحیم، سفیر روح الامین اور مرسل الیہ صاحب خلق عظیم اس کے باوجود اگر کوئی شخص قرآن میں شک کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خود اس کا اپنا ذہن مریض ہے اور جب تک وہ اپنے قلب و نظر کا علاج نہ کرے، اسے صحت روحانی حاصل نہیں ہو سکتی۔

قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انسان اس جیسی کتاب بلکہ اس کی سورتوں جیسی کسی سورۃ کی تصنیف پر بھی قادر نہیں ہے۔ یہ بات انسانی حیطۂ امکان سے باہر ہے کہ وہ اس کلام کی کوئی نظیر پیش کر سکے یہی وجہ ہے کہ جب قرآن کے مخاطبین اول۔ جن کو اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان آوری کا غرہ تھا ــــ کسی طرح عنادِ سے باز نہ آئے اور بے شرمی کے ساتھ یہ الزام دہراتے رہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود یا کسی کے سکھانے سے یہ کلام گھڑ کر پیش کر رہے ہیں تو اللہ نے پوری قوت کے ساتھ چیلنج دیا کہ اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو اس جیسا کلام پیش کر کے دکھاؤ۔ یہ تحدی ہمیں قرآن کی پانچ سورتوں میں ملتی ہے۔ سورۂ بقرہ ر ۳، سورۂ یونس ر ۴، سورۂ ہود ر ۲، سورۂ بنی اسرائیل ر ۱۰، سورۂ طور ر ۲ ــــ ترتیب نزول کے لحاظ سے یہ تحدی سب سے پہلے سورۂ بنی اسرائیل میں ملتی ہے۔ اس وقت تک قرآن کا ایک معتدبہ حصہ نازل ہو چکا تھا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ — کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر

عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا — اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ

يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ — لا سکیں گے چاہے وہ سب ایک دوسرے کے

لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ۝ (بنی اسرائیل ر ۱۰) — مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔

اشارات

اس آیت میں صراحۃً جنوں کو تحدی میں دو وجوہ سے شریک کیا گیا ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ مشرکین عرب جنوں کو معبود بنائے ہوئے تھے اس لیے کہا جا رہا ہے کہ مشرکین ہی نہیں اگر ان کے معبود جن بھی اس مہم میں مددگار بن جائیں تو وہ انہیں اس قابل نہیں بنا سکتے کہ قرآن جیسی کوئی کتاب تصنیف کر لیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جنوں کی طرف بھی تھی۔ آپ کی نبوت اور قرآن پر ایمان لانا ان کے لیے بھی ضروری تھا۔ ان میں بھی منکرین نبوت اور منکرین قرآن کی کثیر جماعت موجود تھی اس لیے اس تحدی میں وہ بھی شریک کر لیے گئے تاکہ ان پر بھی حجت پوری ہو جائے۔

اس تحدی میں جس زور بیان اور جس یقین کے ساتھ مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کی ہے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں ہے کیونکہ کسی معقول انسان سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی کسی تصنیف کے بارے میں اس طرح کی تحدی کرے ــــ یہی چیلنج دوبارہ ان الفاظ میں نازل ہوا۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا	کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟
بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا	کہو (اچھا یہ بات ہے) تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں
مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ	تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جنہیں تم مدد کے لیے بلا سکتے ہو
كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا	بلا لو اگر تم سچے ہو۔ اب اگر وہ (تمہارے معبود) تمہاری
لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ	مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے
وَاَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ	نازل ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں
مُّسْلِمُوْنَ ۝ (ہود ر ۲)	ہے پھر کیا تم اب سر تسلیم خم کرتے ہو؟

سورۂ بنی اسرائیل میں تحدی پورے قرآن کے ساتھ تھی، اب یہاں کہا جا رہا ہے کہ پورے قرآن جیسی تصنیف لانے سے عاجز ہو تو اس جیسی دس سورتیں ہی بنا لاؤ۔ جب تم سب مل کر اس سے بھی عاجز ہو تو ثابت ہو گیا کہ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصنیف نہیں ہے اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو اس کے علم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے تو ان کا دعویٰ نبوت بھی ثابت ہو گیا۔ اب بتاؤ، تمہارے پاس کیا عذر باقی رہا، کیا اب تم خدا کا حکم ماننے پر تیار ہو؟ کیا اب تم سر تسلیم خم کرتے ہو؟

یہی تحدی سورۂ یونس میں نیا انداز اختیار کرتی ہے۔ یہاں پہلے دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کسی انسان کی تصنیف ہو ہی نہیں سکتی۔

وَمَا كَانَ الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جسے اللہ کے سوا
کوئی بنالے ۔

اس دعوے کے بعد یہ چیلنج دیا گیا ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا
بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ
بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ
وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ
(یونس رہم)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا
ہے۔ کہو اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورہ
اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس
کو بلا سکتے ہو مدد کے لیے بلا لو، اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے
علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے
نہیں آیا اس کو انھوں نے (خواہ مخواہ اٹکل پچو) جھٹلا دیا۔

اب اس مقام پر دس سورتوں کی قید بھی ہٹا دی گئی اور کہا گیا کہ اس جیسی ایک سورۃ بھی بنا کر لے آؤ۔ اس طرح اللہ نے تدریج کے ساتھ انسان کے عجز کو اس کی آخری حد پر پہنچا دیا ہے اور اس پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ پورے قرآن کی نظیر تو دور رہی اس جیسی ایک سورۃ بھی خدا کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا جن و انس اور خدا کی دوسری مخلوقات کی متحدہ و متفقہ کوشش بھی اس سے عاجز ہے اور رہیگی۔ ساتھ ہی ساتھ ان پر یہ بات بھی کھول دی گئی کہ تمہارے پاس قرآن کو جھٹلانے کی کوئی معقول بنیاد موجود نہیں ہے۔ نادانی اور ظن و تخمین تمہاری وہ کل پونجی ہے جس کی بنا پر تم قرآن جیسی کتاب کو جھٹلا رہے ہو ـــــ سورۂ طور میں یہی بات بہت نرم لہجے میں کہی گئی ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۚ
فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا
صٰدِقِيْنَ ۝ (طور ر ۲)

کیا یہ کہتے ہیں کہ رسول نے اسے گھڑ لیا ہے بلکہ
(بات یہ ہے) وہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ تو انہیں اس
جیسا کلام لے آنا چاہیے اگر وہ اپنے الزام میں سچے ہیں۔

اس چیلنج کے جواب میں معقول رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ اس جیسا کلام پیش کریں یا پھر یہ تسلیم کر لیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ دعویٰ سچا ہے کہ قرآن میرا کلام نہیں ہے بلکہ خدا کی وحی ہے جو مجھ پر جبریل امین کے واسطے سے اتر رہی ہے ـــــ مکے میں بار بار چیلنج دینے کے بعد مدینے میں آکر اس تحدی کو ان الفاظ پر ختم کیا گیا۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا
عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے
اپنے بندے پر اتاری ہے یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کے مانند

(باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ کیجیے)

نظریۂ اوتار اور عقیدۂ رسالت

قسط (۹)

جناب ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری

تبصرہ شری رام چندر اور شری کرشن جی کی تاریخی حیثیت، ان کی شخصیت اور ان کے اوتار ہونے کی نسبت ہندو علمار و محققین کی جو بحث و تحقیق اوپر گزری ہے، بالمیکی رامائن سے جو نتیجہ نکلتا ہے اور سوامی دیانند کی "ستیارتھ پرکاش" میں جو کچھ لکھا ہوا ہے ان سب کی موجودگی میں نہ اوتار واد (نظریۂ اوتار) پر نقد و تبصرہ کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ شری رام چندر اور شری کرشن جی کی اوتاری حیثیت کے بارے میں، کیونکہ خود ہندو علمار فضلار کے نزدیک نہ صرف ان ہستیوں کا اوتار ہونا انتہائی اختلافی اور نزاعی ہے بلکہ واقعات و سوانح کے مستند اور صحیح ہونے پر بھی ہندو علمار و محققین کا اتفاق نہیں ہے۔ شری رام چندر جی کے وقائع اور سوانح میں دو بنیادی کتابیں، بالمیکی رامائن اور تلسی داس کی رام چرت، ان دونوں کے بیانات بھی ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف ہیں، بالمیک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ رام چندر کے ہمعصر تھے۔ روایت پسند ہندو علمار کے نزدیک صرف رام چندر اور شری کرشن کے زمانوں میں لاکھوں برس کا فرق ہے۔

رام جی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا زمانہ آج سے دس لاکھ سال قبل تھا اور کرشن جی کا چھ ہزار سال قبل، اور تلسی داس جی "ابھی گھوڑ گلجگ اکبر شاہ کے زمانے میں ہوئے ہیں، تلسی داس کے رام چرت کا جتنا حصہ بالمیکی کے مطابق ہے وہ بھی باعتبار تفصیلات اس کے مطابق نہیں اس سے قابل لحاظ بات یہ ہے کہ تلسی داس کی رامائن میں بال کانڈ اور اتر کانڈ کا اضافہ ہے جو حالات بالمیکی کی رامائن میں نہیں ہیں ان کے متعلق یہ سامنے کا سوال ہے کہ وہ تلسی داس کی رامائن میں کیسے اور کہاں سے آگئے؟ اگر کہا جائے کہ تلسی داس بڑے ایشور بھگت تھے اس لیے ان کو کشف کے ذریعہ حالات معلوم ہوئے تھے اس پر سوال پیدا ہوگا کہ دیو منی نارد اور برہما جی نے بالمیکی کو یہ حالات کیوں نہیں بتائے؟

تلسی داس کے زمانے یعنی دس لاکھ سال تک دنیا کو ان حالات سے کیوں بے خبر رکھا؟ ان سوالات کی موجودگی میں ایک آزادانہ غور و فکر کرنے والا دونوں رامائنوں میں سے کس کو صحیح مانے اور کس کو صحیح نہ مانے؟ اگر وہ اصول کے مطابق بالمیکی رامائن کو صحیح مانے تو رام چندر کے سوانح و وقائع کا بہت سا حصہ از خود ساقط الاعتبار ہو جائے گا اور ان سے ان کی اوتاری حیثیت بری طرح مجروح اور مشتبہ ہو جائے گی' اور اگر تلسی داس کی رامائن کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ مستند اور قابل اعتماد مانا جائے تو اس کی کوئی ٹھوس بنیاد ہی موجود نہیں ہے' یہ کسی غیبی حقیقت کا بھی مسئلہ نہیں۔ یہ ہماری اسی دنیا کی ایک شخصیت کی تاریخی بحث ہے۔ شری کرشن کے وقائع اور سوانح کا بھی تقریباً وہی حال ہے' ان کا ماخذ پران ہیں' اور پرانوں کی صحت کے بارے میں ہندو محققین نے سخت بحث و کلام کیا ہے۔ سوامی دیانند جی اور ان کے پیرو آریہ پرانوں کو نہیں مانتے جب ہندوؤں ہی کے نزدیک وہ مستند اور قابل تسلیم نہیں تو ہمارے لیے وہ کہاں تک قابل قبول و اعتماد ہو سکتے ہیں؟ یہ بات ملحوظ رہے کہ ہمارا اصل موضوع تاریخ نہیں مذہب ہے' اور مذہب تاریخ سے بھی زیادہ صحت و تحقیق کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہ اعتقاد کا مسئلہ ہے اور اعتقاد کی بنا مسلم و مستند حقائق ہی ہو سکتے ہیں جن کی پشت پر ٹھوس اور مستحکم دلائل و شواہد موجود ہوں جو نقد و نظر کے معیار پر پورے اترتے ہوں۔

اس صورت حال کے باوجود موضوع بحث کا تقاضا ہے کہ اوتار واد یا نظریۂ اوتار پر اصولی حیثیت سے اور شری رام چندر اور شری کرشن جی کی اوتاری حیثیت پر جزئی طور پر ہم ایک نگاہ ڈالیں

خالق اور مخلوق کا تعلق

شری پرشوتم شاستری چتر ویدی نے یہ بتاتے ہوئے کہ "ایشور کیا ہے؟" یہ بتایا ہے کہ ایشور ہی تمام مخلوقات کا خالق ہے اور مخلوق میں جو روح ہے وہ ایشور کا جز ہے اور مخلوق میں جو کم و بیش طاقت پائی جاتی ہے وہ اسی روح کے ایشور کے جز ہونے کی وجہ سے' لیکن ایشور کی طاقت لامحدود اور مخلوقات کی طاقت محدود ہے اور جو اوتار ہوتے ہیں وہ بصورت دیگر ایشور ہی ہوتے ہیں اس لیے ان کی طاقت بھی غیر محدود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کام انسانوں کے لیے ناممکن ہوتے ہیں اوتار ان کو بھی کر ڈالتے ہیں چتر ویدی جی نے تو چند لفظوں میں یہ بات کہہ دی لیکن خالق و مخلوق اور مخلوق میں خالق کی طاقت کا یہ نظریہ ایسا نہیں جس سے ہم سرسری طور پر گزر جائیں۔ جانوروں میں شیر' ہاتھی اور دوسرے کتنے جنگلی جانور ہیں جن میں غیر معمولی طاقت ہوتی ہے۔ اگر ہم خالق و مخلوق کے اس تعلق اور مخلوق میں خالق کی طاقت کے اس نظریے کو قبول کر لیں تو اوتاروں کے مقابلے طاقتور جانوروں میں جتنی طاقت ہو اسی نسبت سے وہ ہمارے اعتقاد و احترام کے مستحق ہوں گے اور شاید اسی نظریے کا یہ نتیجہ ہے کہ انسانوں کے علاوہ کتنے جانوروں کو بھی اوتار مان لیا گیا اور دوسری مخلوقات میں کتنی ہی چیزیں معبود اور مستحق پرستش قرار دے دی گئیں۔

جانوروں کے بعد انسانوں پر نظر جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کیسے کیسے جنگ جو، کیسے کیسے بہادر، کیسے کیسے فاتح، کیسے کیسے سلاطین، کیسے کیسے عالی دماغ ارباب علم و کمال، کیسے کیسے موجد گذرے ہیں۔ ان میں نیک بھی ہوئے ہیں اور کتنے ظالم و ستمگر بھی جنھوں نے انسانیت پر بے انتہا مظالم ڈھائے ہیں۔ راون اور ایسے ہی کتنے دوسرے افراد کا نام خود ہندو مذہب کی تاریخ کے سلسلے میں لیا جاتا ہے جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے دیوتاؤں کو بھی قابو میں کر لیا تھا۔ نظریۂ طاقت کی بنا پر تو ناقابلِ احترام ان کو بھی ماننا پڑے گا کہ جتنی طاقت کے وہ مظہر تھے، لیکن یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مذہبی حیثیت سے ان کو کبھی قابلِ احترام مانا گیا اور نہ اب مانا جا سکتا ہے۔

شری رام چندر اور کرشن جی نے اپنی طاقت کے جو کرشمے دکھائے ان کو ان کے ایشور یا اوتار ہونے کا ثبوت مانا جائے مثلاً رام چندر کا سمندر پر پل بندھوا دینا یا کرشن جی کا انگلی پر گوبردھن پہاڑ کو اٹھا لینا تو اس امریکن کو کیا کہا جائے گا جس کے بنائے ہوئے دو گولوں سے جاپان کے دو خطے چشم زدن میں تباہ ہو گئے، لاکھوں انسان کا آن کی آن میں خاتمہ ہو گیا اور اس کے ہولناک اثرات اب تک اپنا کام کیے جا رہے ہیں ان بموں کی تباہ کاریوں سے پہلے کسی انسان کو ان کا تصور بھی نہ گذرا تھا، پھر اس انسان کو کیا قرار دیا جائے گا جس نے ایسی مشین ایجاد کی جس نے چاند پر انسانی ہاتھ کے بغیر روس کا جھنڈا نصب کر دیا؟ خواہ اس کو اوتار نہ مانا جائے، لیکن اوتار کے قریب کا تو ماننا ہی پڑے گا، لیکن ایسے باکمال ماہرین سائنسی موجدوں کو نہ کسی نے اوتار مانا ہے اور نہ مانے گا، لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ خالق و مخلوق کے تعلق اور ہر مخلوق میں ایشوری طاقت کے اسی نظریے نے کتنے انسانوں کو خدا کا مظہر اور معبود بنا دیا

اوتار سے متعلق آگ کی مثال

شری جے دیال گوئندکا نے یہ سوال قائم کر کے کہ جب ایشور غیر مجسم اور ہر جگہ موجود ہے تو وہ کسی ایک مقام پر کیسے ظاہر ہوتا ہے؟ نیز یہ کہ اس صورت میں تو دوسری جگہ اس کا عدم ہو جاتا ہوگا یا اس کی طاقت بہت کم ہو جاتی ہو گی۔ آگ کی مثال سے جواب دیا ہے کہ آگ ہر جگہ موجود ہے، لیکن وہ مختلف صورتوں سے ظاہر ہو جاتی ہے اور اس حالت میں بھی اس کی ہمہ گیری میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس مثال میں ایک مغالطہ ہے جو شاید گوئندکا جی نے محسوس نہیں کیا۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ جب ایشور غیر مجسم ہمہ گیر اور ہر جگہ موجود ہے تو ایک جگہ ظاہر ہونے سے اس کی یہ ہمہ گیری باقی رہتی ہے یا نہیں اور اس کی طاقت میں اس سے فرق واقع ہوتا ہے یا نہیں۔ اصل سوال یہ بھی نہیں ہے کہ ایشور میں اوتار لینے اور مجسم ہو کر ظاہر ہونے کی قدرت ہے یا نہیں اصل سوال یہ ہے کہ ایشور کا مچھلی، سور، شیر، انسان وغیرہ مختلف مخلوقات کی صورتوں میں ظاہر ہونا ایشور کی عظمت و جلالت اور اس کی تقدیس و پاکیزگی کے لیے زیبا ہے یا نہیں؟ جس شخص کو ایشور کی عظمت و بزرگی کا ذرا بھی شعور ہوگا اور جس کے دل

ایشور کی کچھ بھی قدر و عزت ہوگی وہ یہی جواب دے گا کہ یہ سب باتیں ایشور کی شان کے سراسر منافی ہیں کہ وہ مچھلی، کچھوا، سور، سنگھ، انسان وغیرہ کی صورتوں میں اوتار لیتا ہے۔ سُبْحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ

ایشور کے ظہور و خفا کی خصوصی کیفیت

شری جے دیال گوئندکا نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ ایشور کا اوتار لینا انسانوں کی طرح اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتا اور نہ اوتاروں کا جسم انسانوں کے جسم کی طرح عناصر خمسہ سے تخلیق پذیر ہوتا ہے، اوتار ادیات سے پاک اور ماورا ہوتے ہیں، ان کی پیدائش بھی انسانوں کی پیدائش کی طرح نہیں ہوتی۔ انھوں نے شری کرشن اور رام چندر کے بارے میں بتایا ہے کہ کرشن جی جیل میں اپنے والدین کے سامنے اپنی وشنو کی اصل صورت میں ظاہر ہوئے، ان کے چار ہاتھ تھے، ایک ہاتھ میں سنکھ، دوسرے میں گدا، تیسرے میں چکرا اور چوتھے میں کنول کا پھول تھا، شری رام چندر بھی اپنی ماں کوسلیا کے سامنے اسی شکل میں ظاہر ہوئے اور ان کی درخواست پر دو ہاتھ والے بن گئے۔ اسی طرح گوئندکا جی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اوتاروں کا وجود سے عدم ہونا بھی انسانوں کی طرح نہیں ہوتا، وہ لافانی جسم کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور اسی جسم کے ساتھ دنیا سے چلے جاتے ہیں، اس سلسلے میں گوئندکا جی نے بالمیکی رامائن کے حوالے سے بتایا ہے کہ جس وقت رام جی دنیا سے جانے لگے تو لوکوں (جہانوں) کے جدامجد برہما جی دیوتاؤں کے ساتھ دریائے سرجو کے ساحل پر آئے اور رام جی سے اپنے وشنو جسم میں داخل ہونے کی درخواست کی اور وہ ان کی درخواست قبول کرکے اپنے تینوں بھائیوں کے ساتھ اپنے اسی جسم کے ساتھ وشنو جسم میں داخل ہوگئے

گوئندکا جی کے جن بیانات کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہ سب پران اور رامائن کے بیانات ہیں اور ان کی نسبت ہندو علماء محققین کی بحث و تحقیق ہمارے سامنے ہے، ان سے صرف نظر کرکے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ گوئندکا جی کا یہ کہنا کہ اوتاروں کے جسم عام انسانوں سے مختلف اور مادیات سے ماورا ہوتے ہیں اور ان کا آنا جانا بھی عام انسانوں کے مرنے جینے کی طرح نہیں ہوتا۔ خود گوئندکا جی ہی کے ایک بیان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ فاضل موصوف ہی کا ایک کتابچہ پرلوک اور پنر جنم اس مسئلے پر ہے کہ انسان اپنے اعمال کے مطابق اچھی بری مخلوق میں بار بار جنم لیتا رہتا ہے۔ یہ کتابچہ بھی گیتا پریس ہی کا شائع کردہ ہے۔ اس کتاب میں اسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے گوئندکا جی لکھتے ہیں:

> گیتا کے دوسرے ادھیائے میں بھگوان (شری کرشن) ارجن سے کہتے ہیں (بحذف متن) نہ تو ایسا ہی ہے کہ میں کسی کال (زمانے) میں نہیں تھا یا تو نہیں تھا یا یہ راجہ لوگ نہیں تھے، اور نہ ایسا ہی ہے کہ اس سے آگے ہم سب نہیں رہیں گے۔

"جس طرح انسان پرانے کپڑوں کو دور کر کے دوسرے نئے کپڑوں کو پہنتا ہے اسی طرح روح پرانے جسموں کو چھوڑ کر دوسرے نئے جسم حاصل کر لیتی ہے "

چوتھے ادھیائے میں بھگوان (کرشن) ارجن سے کہتے ہیں۔

(بجذوف متن) " اے پرنتپ ارجن! میرے اور تیرے بہت سے جنم ہو چکے ہیں۔ ان سب کو تو نہیں جانتا لیکن میں جانتا ہوں" (صفحہ ۱۶ و ۱۷)

دیکھیے گوبندکا جی نے اپنی گیتا کے حوالے سے کرشن جی کے جتنے اقوال نقل کیے ہیں وہ اس بارے میں کتنے صاف ہیں کہ پنر جنم یا آواگون کے عقیدے کے مطابق اوتاروں کا جنم بھی اسی طرح اعمال کے تحت ہوتا ہے جس طرح دوسرے انسانوں کا، اور وہ مرتے بھی اسی طرح ہیں جس طرح دوسرے انسان۔ شری کرشن کے دو اقوال خود اپنے متعلق ہیں، وہ کھلے لفظوں میں بتاتے ہیں کہ ہم سب پہلے بھی تھے اور آئندہ بھی ہوں گے، آنے جانے کا یہ سلسلہ چلا آرہا ہے اور چلا جائے گا۔ ہم دونوں ہی کے بہت سے جنم ہو چکے ہیں۔ ہم کچھ پہلی بار پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہاں کرشن جی کے بار بار آنے جانے سے مراد اوتاروں کا وہ آنا جانا مراد نہ ہوگا جس کو گوبندکا جی نے اوتاروں کے بارے میں ہمیں بتایا ہے۔ کرشن جی نے یہ بات پرلوک اور پنر جنم یا آواگمن سے متعلق فرمائی ہے۔ یہاں اوتاروں کے آنے جانے کا کوئی ذکر نہیں۔ خود گوبندکا جی نے بھی یہ اقوال اوتار کے ثبوت میں نہیں پنر جنم کے ثبوت میں پیش کیے ہیں

بالمیکی کا جو حوالہ گوبندکا جی نے پیش کیا ہے اس میں صرف رام چندر جی کے بارے میں یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے موجودہ جسم کے ساتھ وشنو کے جسم میں داخل ہو گئے، بلکہ ان کے تینوں بھائی بھی اپنے جسموں ہی کے ساتھ وشنو کے جسم میں سما گئے۔ آخر یہ کیوں؟ وہ تو اوتار نہ تھے، ان کا جسم تو اوتاروں کی طرح مادیات سے پاک محض روحانی نہ تھا، وہ تو بہرحال عام ہی انسانوں کے جسم تھے۔ وہ کتنے ہی مہاپرش رہے ہوں پھر بھی وہ انسان ہی تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نیک انسان اسی طرح اپنی ایشور بھگتی اور نیک عمل کے باعث آواگمن سے نجات پا کر برہم میں مل جاتے ہیں تو وہ موجودہ جسم کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں ان کی روح برہم میں مل جاتی ہے نہ کہ مادی جسم۔ بعض اشخاص کے متعلق ایسی کہانیاں آئی ہیں کہ وہ جسم کے ساتھ سورگ میں چلے گئے تو سورگ اور برہم ایک ہی چیز نہیں ہیں کہ سورگ میں جانے کو برہم میں ضم ہو جانا کہیں۔ سورگ جانے والوں کی نسبت بتایا گیا ہے کہ ان کا سورگ جانا ابدی نہیں ہوتا ان کے اعمال کے مطابق عارضی ہوتا ہے اپنے اعمال کے مطابق وہاں کے عیش و آرام سے بہرہ ور ہونے کے بعد وہ پھر اسی دنیا میں لوٹا دیے جاتے ہیں اور پھر جنم لے کر

میں پڑ جاتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانوں اور رامائنوں کے مصنفین فرطِ ارادت عقیدت میں عقل و منطق سے بے نیاز ہو کر اپنے رجحان کے مطابق کتھائیں لکھتے چلے گئے ہیں اور اسی عقیدت و ارادت سے اب بھی لوگ ان کو پڑھ رہے ہیں اور بجائے اس کے کہ ان کی حقیقت پر غور کرنے کی کوشش کریں نا قابلِ فہم فلسفوں کے ذریعہ سب کو برحق ثابت کرنے کی کوشش کرتے جاتے ہیں۔ البتہ ان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو تحقیق و تدقیق سے کام لیتا ہے جس کی تحقیقاتی کوششوں کے نتائج ہم اوپر دیکھ چکے ہیں اور آریہ فرقہ جو اپنے کو سچا ہندو کہتا ہے اور سناتن دھرمی فرقہ کو پران پنتھی کہہ کر اس کی تحقیر کرتا ہے وہ تو اوتار کے عقیدے اور پرانوں کو کھلے لفظوں میں وید اور شاستر کے خلاف قرار دیتا ہے۔

کیا اوتار کا نظریہ ایشور کے شایانِ شان ہے

اس سے قطع نظر کہ اوتاروں کے بارے میں جو کتھائیں ہیں وہ عقل و منطق کے معیار پر کہاں تک پوری اترتی ہیں اور ان کے ظاہر اور غائب ہونے اور ان کے اجسام کے ماورائے مادیات ہونے کے متعلق جو بیانات پائے جاتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟ اوتاروں کے اصل الفاظ اور ان کے مفاہیم ہم تک محفوظ صورت میں پہنچے یا نہیں؟ ان کے تمثیلات و استعارات کو حقیقت کا رنگ تو نہیں دے دیا گیا؟ گوبند کا جی نے جو کچھ لکھا ہے اسی کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے کہ کیا وہ باتیں ایشور کے شایانِ شان ہیں؟

ایشور کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیسی شان و عظمت والا ہے، کیسا پاک اور پوتر ہے، وہ آپ سے آپ ہے، تمام طاقتوں کا مالک ہے، اس میں کوئی ضعف اور نقص نہیں، وہ دائم اور باقی ہے، اس کے لیے فنا اور زوال نہیں۔ وہ تمام کائنات کا خالق ہے، اس کا پروردگار ہے، سب پر حکومت و فرماں روائی کرنے والا ہے، ساری کائنات اس کے تحت قدرت و حکومت ہے، اس کا کوئی شریک اور ہمسر نہیں، اس کی ذات نگاہوں ہی سے نہیں، فکر و تصور سے بھی ماورا ہے، وہ ہر جگہ موجود ہے، سب کچھ دیکھ رہا ہے، سب کچھ سن رہا ہے، کوئی ظاہر اور چھپی چیز اس سے پوشیدہ نہیں، دلوں کے بھید بھی اس پر ظاہر ہیں۔ قرآن مجید ایشور کے بارے میں کیا کچھ کہتا ہے؟ اسے تھوڑی دیر کے لیے الگ رکھ کر ہندو مذہب کی کتابوں پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے وہ کیا کہتی ہیں گیتا پریس کی شائع کردہ ایک اہم اور ضخیم کتاب "ایشور کی ستا اور مہتا" (خدا کی ہستی اور اس کی عظمت) ہے جو بڑے بڑے ہندو علماء و فضلاء کے مقالات کا مجموعہ ہے، اس میں ایک مقالہ سناتن دھرم کے مشہور و ممتاز عالم اور رہنما پنڈت مدن موہن مالویہ بانی ہندو یونیورسٹی بنارس کا ہے ہم اس کے کچھ اقتباسات یہاں پیش کر رہے ہیں

پنڈت مدن موہن مالویہ رگ وید کا ایک اقتباس نقل کر کے لکھتے ہیں:۔
اسی وید کے ارتھ (معنی) کو منو بھگوان نے لکھا ہے کہ سرشٹی سے پہلے یہ جگت تیرہ و تار تھا، ہر طرح سوتا ہوا دکھائی پڑتا تھا اس وقت جن کا کسی قدرت کے ذریعہ جنم نہیں ہوا، جو آپ اپنی قدرت سے اپنی بزرگی میں سدا سے موجود ہیں اور رہیں گے۔ ان گیان میہ (علیم و حکیم) پرکاش میہ (النور) سوئم بھو (ذات مطلق) نے اپنے کو ظاہر کیا اور ان کے ظاہر ہوتے ہی اندھیرا مٹ گیا۔ (ایشور کی ستا مہتا صفحہ ۲۸)

شری مد بھاگوت کا ایک اقتباس نقل کر کے اس کا مطلب لکھتے ہیں
"وہ ایک ہی آتما، پران، پرش، ستیہ، سوئم پرکاش روپ (آپ سے آپ روشن ذات) نتیہ (قائم) ادی ناشی (لافانی) (لا زوال) نرنتر سکھی (السلام) مایا سے نرپت (مادیات سے پاک) اکھنڈ (ناقابل تقسیم) ادیتیہ (بے مثل و بے ہمتا) اپادھی سے رہت (اسماء و صفات سے معرا) اور رام (الحی) ہے۔ (ایضاً صفحہ)

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔
"جو وید کہتے ہیں کہ یہ پرماتما ہے وہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کو ہم آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے (شوے تاشوپ ([Devanagari]) کے دو فقروں کا ترجمہ۔)
"ایشور کو کوئی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا، لیکن ہم میں سے ہر ایک دل کو صاف کر کے صاف عقل سے ایشور کو دیکھ سکتا ہے، اس لیے جو لوگ ایشور کو دل کی آنکھوں (عقل) سے دیکھنا چاہتے ہوں ان کو لازم ہے کہ وہ اپنے جسم اور دل کو صاف اور عقل کو پاک کر کے ایشور کی تلاش کریں (ایضاً)

اور ایک مقام پر لکھتے ہیں
"برہما، وشنو، مہیش، یہ اسی ایک پرماتما کے تین صفات یعنی نام ہیں، وشنو پران میں لکھا ہے۔ (بحذف متن)
"وہ ایک ہی جناردن بھگوان، سرشٹی (تخلیق) پالن اور سنہار (ہلاک) کرنے والے برہما، وشنو اور شیو کے صفات رکھتے ہیں۔"

یہی بات ویر سنار دیہہ پران ([Devanagari]) میں بھی لکھی ہے۔ (بحذف متن)
"بھگوان، نارائن، ادی ناشی (لازوال) انت (لا انتہا) سرو ویاپک (ہمہ گیر) اور مایا (مادیات) سے پاک ہیں۔ یہ جگ اور متحرک سنسار ان سے بھرا ہوا ہے۔ ان لازوال ازلی دیوتا کو کوئی شیو، کوئی سدا ستیہ سوروپ وشنو اور کوئی برہما کہتا ہے۔ (ایضاً صفحہ)

سوامی دیانند ستیارتھ پرکاش میں یجر وید کا ایک منتر نقل کرکے اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں

"ایشور کی ستوتی ۔ حمد ۔ وہ پرماتما سب میں دیا پک (موجود) شیگھر کاری (سریع العمل) اور انت بلوان' شدھ (مقدس) سروگیہ (دانائے کل) سب کا انتریامی (علیم بذات الصدور) سرواوپر (اعلیٰ واکبر) ویراج مان (حاضر) سناتن (دائم) سوئم سدھ (واجب الوجود) پرمیشور جیو روپ سناتن انادی پرجا کو (یعنی روح کو جو دائمی اور لاانتہا اور اس کی رعایا کے مثل ہے) اپنی سناتن ودیا (ذاتی علم) سے یتھاوت ارتھوں کا بودھ ویدد وارا کراتا ہے (یعنی ویدوں کے ذریعہ اپنے علم کی صحیح فہم کراتا ہے) وہ سگنر ستوتی ارتھات جس جس گن سے سہت پرمیشور کی ستوتی کرنا یہ سگن ہے (یعنی اس کی حمد و ثنا اس کی صفات کی بنیاد پر کرنی چاہیے) اکائے یعنی وہ کبھی شریر دھارن وا جنم نہیں لیتا۔ (یعنی وہ جسم اختیار نہیں کرتا) جس میں چھید ر (سوراخ) نہیں ہوتا۔ ناڑی آدی کے بندھن میں نہیں آتا' یعنی وہ جسمیات سے پاک ہے)"

(باب ہفتم صفحہ ۱۱۵)

اب ایک طرف ایشور کے ان صفات کو دیکھیے اور دوسری اوتار کے اصول و عقیدہ کو دیکھیے ایشور کبھی مچھلی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے' کبھی کچھوے کی صورت میں' کبھی سنگھ اور سور کی صورت میں اور کبھی کسی مرد و عورت کے بیٹے کی صورت میں' وہ گود میں کھیلتا ہے' پالنے میں جھولتا ہے' ہنستا ہے' روتا ہے' دودھ پیتا ہے' پاخانہ پیشاب کرتا ہے' پلتا ہے' بڑھتا ہے' جوان ہوتا ہے' عورتوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا ہے' ناچتا گاتا ہے' شادی بیاہ کرتا ہے۔ بیوی کے ساتھ سوتا ہے' بچے پیدا کرتا ہے۔ غرض وہ سب کچھ کرتا ہے جو دوسرے انسان کرتے ہیں۔ اب آپ کہتے ہیں کہ اس کا پیدا ہونا اور دنیا سے اس کا جانا عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتا۔ اس کا جسم بھی عنصریات سے پاک ہوتا ہے' عقل اور منطق ایسی باتوں کو مانے یا ان باتوں کو جن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے؟ کیا ایشور کی ذات و صفات اور اس کی عظمت و پاکیزگی سے یہ باتیں کسی طرح بھی میل کھاتی ہیں؟ قرآن مجید نے کتنا صحیح اعلان کیا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

یعنی تیرا رب' ہر طرح کی عزت و بزرگی کا مالک' ان تمام خلاف شان باتوں سے پاک ہے جن سے لوگ اسے متصف کرتے ہیں اور سلام ہو رسولوں پر (جنھوں نے انسانوں کو ایسے خیالات و عقائد کے مفاسد سے خبردار کیا) اور ہر خوبی و ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا مالک ہے۔

ایک سے انیک کا سلسلہ　اوپر ویدوں اور شاستروں کے جو اقتباسات دیے گئے ہیں وہ اس بات کی نشان دہی کرتے

کرتے ہیں کہ ہندوستان میں خدا کے رسول آئے۔ ان پر خدائی تعلیمات وہدایات کا نزول ہوا لیکن امتدادِ زمانہ سے نہ ان رسولوں کے صحیح حالات محفوظ رہے، اور نہ ان کی تعلیمات ہی صحیح صورت میں باقی رہیں۔ ان کی شخصیتیں اور وہ تعلیمات و ہدایات جو ان پر خدا کی طرف سے نازل ہوئیں کچھ سے کچھ بن کر رہ گئیں۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ خدا کی طرف سے رسولوں کو جو تعلیم وہدایت دی جاتی تھی وہ عقائد واعمال دونوں کے اعتبار سے سلجھی ہوئی صاف اور سیدھی ہوا کرتی تھی۔ لیکن آگے چل کر ایسے الجھے ہوئے اور ٹیڑھے دماغ کے فلسفی اور حکیم پیدا ہوجاتے تھے جو اس سیدھی اور صاف تعلیم کو اپنی موشگافیوں اور خیال آرائیوں سے ایک لاینحل معمہ بنا کر رکھ دیا کرتے تھے۔ یہ طبّاعی اور طبع آزمائی خصوصیت کے ساتھ عقائد پر کی جاتی تھی کہ عقائد کا تعلق بڑی حد تک غیبی حقائق سے ہوتا ہے اور غیبی حقائق میں سب سے پہلی چیز خدا کی ذات وصفات سے متعلق عقیدہ ہوتا ہے اس لیے اندھیرے میں اسی پر ناوک فگنی کی جاسکتی تھی اور کی جاتی تھی اور جب ایسے فلسفیوں اور حکیموں کی بن آتی تھی اور لوگ ان کے علم وکمال کے آگے سر جھکا دیتے تھے تو پھر عقائد کے لپیٹ میں مذہبی شعائر واعمال بھی آجاتے تھے اور سچا دین یا ستیہ دھرم پورے کا پورا اپنی حقیقت اور اپنی اصل صورت کھو بیٹھتا تھا۔ خدا کی طرح روح و مادہ اور خلقت کو ازلی وابدی ماننا ہر شے میں خدا کی موجودگی کا اعتقاد، اواگمن یا تناسخ کا عقیدہ یہ سب فلسفیانہ خیال آرائیوں ہی کا نتیجہ ہے۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

بات صاف تھی کہ غیبی حقیقتیں اس طرح عقل کی گرفت میں آنے والی نہیں جس طرح مادی حقائق مگر ان پر خواہ مخواہ طبع آزمائی کی گئی، اور اس غلط راہ پر جیسے جیسے قدم بڑھتا گیا سلجھاؤ کی جگہ الجھاؤ ہی بڑھتا گیا۔ ع

کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بحکمت ایں معمہ را

یہاں ہم پنڈت مدن موہن مالویہ جی کے مقالے سے کچھ ایسے اقتباسات بھی پیش کریں گے جن سے یہ حقیقت بے نقاب ہوجائے گی کہ "ایشور ایک ہے" کی حقیقت کو "انیک" بنا کر اس سب سے سچی کھری، بے لاگ اور سیدھی بات کو کیسا لاینحل معمہ بنا دیا گیا۔

اوپر ہم نے دیکھا کہ پنڈت مالویہ نے وید وغیرہ کے حوالوں سے بتایا ہے کہ برہما، وشنو اور مہیش تین الگ الگ ہستیاں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی پرماتما کی تین صفتیں ہیں۔ کتنی صاف اور صحیح بات ہے جو آسانی سے سمجھ میں بھی آجاتی ہے، لیکن نہ جانے کب اور کس قسم کا انقلاب ہوا کہ ایک پرماتما کی یہ تین صفتیں باقاعدہ تین جداگانہ ہستیاں بن گئیں اور ان کی کتھاؤں کے الگ الگ پران تصنیف ہوگئے۔ سب سے پہلے تو ان تین ہستیوں کے نام ہی معلوم

کر کے خاصی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ ان ہستیوں کے کچھ نام یہ ہیں۔

۱۔ برہما کے نام — آتم بھو، سر جیشٹھ (بڑے دیوتا) پتامہ (جد اعلیٰ) ہیرنیہ گربھ، سوئم بھو، لوکیش (جگت کے ایشور) پرجاپتی، سرشٹا (خالق) کملاسن (کنول کے پھول پر بیٹھنے والے) ان کے بیٹے بھی ہیں جن کا نام سنت کمار ہے

۲۔ وشنو کے نام — نارائن کرشن گووند، جنار دن، پرشوتم ان کی سواری گرڑ ہے ان کی بیوی بھی ہیں ان کے بھی کئی نام ہیں۔ لچھمی، پدیما، کملا، شری وغیرہ۔

۳۔ مہیش کے نام — شنکر، شیو، ایش، مہیشور، ایشور، ردر، وام دیو، (پستہ قد دیوتا) مہا دیو، ان کی بھی بیوی ہیں جن کے بہت سے نام ہیں۔ اوما، گوری، کالی، بھوانی، پاروتی، درگا، چنڈیکا، ان کے دو بیٹے ہیں۔ گنیش اور کارتکیہ (ان دونوں کے بھی متعدد نام ہیں۔

ان ناموں سے معلوم ہوا کہ یہ الگ الگ مستقل ہستیاں ہیں جن کے الگ الگ اعمال و فرائض ہیں اور یہ بیوی بچے والے بھی ہیں اور ان کے متعلقین بھی دیوتاؤں میں شامل ہیں۔[1]

آپ ان ناموں کو سامنے رکھ کر پنڈت مالویہ کے مقالے کے اقتباسات دیکھیے کہ ان تینوں دیوتاؤں کے نام کہاں کہاں آتے ہیں۔

شیو پُران کے حوالے نقل کر کے ان کا ماحصل لکھتے ہیں

اس وقت ایک ردر ہی تھے، دوسرا کوئی نہ تھا، ان جگت رکھچک (کائنات کے محافظ) ہی نے سنسار کی رچنا کر کے آخر میں اس کا سنہار (خاتمہ) کر دیا، ان کو ان کے چاروں طرف آنکھیں ہیں، چاروں طرف منھ ہیں، چاروں طرف ہاتھ ہیں اور چاروں طرف پاؤں ہیں۔ زمین و آسمان کو پیدا کرنے والے ایک مہیشور دیو ہی ہیں، وہ سب دیوتاؤں کے ذریعہ اور پیدائش کے مرکز ہیں جو آنکھ اور کان کے بغیر ہی سنتے ہیں۔ سب کو جانتے ہیں اور جاننے

---

[1] ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ اصل تعلیم و ہدایت کچھ تھی اور بعد کے حکماء و فلاسفہ نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اس کا سامنے کا ثبوت یہ ہے کہ سوامی دیانند نے ستیارتھ پرکاش میں بڑی وضاحت سے ثابت کیا ہے کہ برہما وشنو اور مہیش کے جو نام بتائے جاتے ہیں وہ دراصل پر برہم کے صفاتی نام ہیں۔ (دیکھیے ستیارتھ پرکاش باب اول) پنڈت مالویہ کے مقالے کو دیکھیے، وہ خود اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایک پر برہم کے عقیدے کو آگے چل کر کیسے کیا بنا دیا گیا۔

کوئی نہیں جانتا وہ پرم پرش کہے جاتے ہیں۔

پیدا کرنا برہما کا کام بتایا گیا ہے۔ پرورش کرنا وشنو کا اور مارنا مہیش کا مگر یہاں سب کچھ شیو ہی کو قرار دیا گیا ہے وہ اس طرح کہ اوپر آپ دیکھ چکے ہیں کہ رودر مہیش کا نام ہے

"وہ پرماتما ایک ہی ہے" کی سرخی کے تحت چاند نرگیہ اور رگ وید کے فقرے نقل کر کے ان کے مطالب لکھتے ہیں

"ایک ہی پرماتما ہے، کوئی اس کا دوسرا نہیں، ایک ہی کو وپر لوگ بہت سے ناموں سے ذکر کرتے ہیں، ہے ایک ہی لیکن اس کا بہت سے ناموں سے تصور کرتے ہیں۔

وشنو سہست (ہزار) نام اور شیو سہست نام اس بات کے مشہور ثبوت ہیں۔ یدھشٹر نے پتامہ بھیشم سے پوچھا کہ بتائیے لوک میں وہ کون دیوتا ہے؟ کون سب مخلوقات کا سب سے بڑا واحد پناہ ہے؟ کون ہے جس کی ثنا کرتے اور جس کو پوجتے انسان کی فلاح ہوتی ہے؟

اس کے جواب میں پتامہ نے کہا۔ (بحذف متن۔ مہابھارت)

"انسان روزانہ اٹھ کر سارے جگت کے مالک، دیوتاؤں کے دیوتا، اننت پرشوتم کی ہزار ناموں سے ستوتی (ثنا و ستائش) کرے، سارے جہان کے مہیشور، لوک کے صدر (حکومت کرنے والے)، تمام جہان میں موجود وشنو کی جو نہ کبھی پیدا ہوئے ہیں اور نہ جن کی کبھی موت واقع ہوگی، ہمیشہ ستوتی کرتا ہوا انسان تمام تکلیفوں سے نجات پا جاتا ہے، جو سب سے بڑا جلال ہے، جو سب سے بڑا رعب ہے، سب سے بڑے برھم ہیں، جو تمام مخلوقات کے سب سے بڑے پناہ ہیں، جو پاکوں میں سب سے بڑے پاک ہیں سب مبارک باتوں کے مبارک، دیوتاؤں کے دیوتا اور تمام مخلوقات کے لافانی باپ ہیں۔

(ایشور کی ستا او رمہتا ص ۲۸-۲۹)

جو باتیں شیو پران میں شیو کے بارے میں کہی گئی تھیں وہی یہاں وشنو کے متعلق کہی گئی ہیں

آگے چل کر وشنو پران کا ایک اقتباس دیا ہے جسے مہیشور کا قول بتایا ہے اور مہیشور شیو کے ناموں میں سے ایک ہے۔ اقتباس کا مطلب لکھتے ہیں

اے وشنو! پیدا کرنا، پالنا اور مارنا ان تینوں صفتوں کی بنا پر میں ہی برہما وشنو اور شیو کے تین مختلف ناموں سے موسوم ہوا، اے ہری! در حقیقت میری ذات اختلاف سے ہمیشہ پاک ہے۔ میں، آپ، یہ (برہما) اور دیو در اور آگے جو کوئی بھی ہوگا ان سب کی ایک ہی ہستی ہے، ان میں کوئی فرق نہیں۔ فرق ماننے سے بندھن ہوتا ہے۔

ان اقوال کو دیکھیے، یہ آپس میں کتنے الجھے ہوئے ہیں۔

کہاں یہ بات کہ برہما وشنو اور مہیش ایک ہی ہستی پر برہم کے تین صفاتی نام ہیں اور کہاں تینوں ہستیوں کی جداگانہ کتھائیں اور مہیشو یعنی مہیش کا وشنو سے خطاب، یہ ایک سیدھے سادے عقیدے کو معمہ نہیں بنایا گیا تو اور کیا ہے؟ قرآن مجید میں بھی خدا کے بہت سے صفاتی نام ہیں جن کے بارے میں اس کی تعلیم کتنی صاف ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ - اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى	(اے رسول!) کہہ دو کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، تم اسے جس نام سے بھی پکارو (سمجھو کہ) تمام اچھے نام (جو قرآن نے بتائے ہیں) اسی ایک ہستی کے ہیں۔
(بنی اسرائیل)	

اوتار کے مقاصد پر دوبارہ ایک نظر

اوتار کے عقیدے پر علم و عقل کی روشنی میں پوری تفصیل کے ساتھ غور کیا گیا ہے، ہم شری پرشوتم شرما چترویدی اور شری بج دیال گوئندکا کی توضیحات میں یہ بھی دیکھ گئے ہیں کہ اوتار کے اغراض و مقاصد کیا ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں ان مقاصد پر دوبارہ ایک نظر ڈال لی جائے،

چترویدی جی کی وضاحت کے مطابق اوتار کے مقاصد یہ ہیں

شری کرشن جی کے مشہور قول کے مطابق جب دھرم زوال پذیر ہو جاتا ہے اور ادھرم زور پکڑ جاتا ہے۔ دھرماتما لوگ ستائے جانے لگتے ہیں اور ادھرمیوں کا غلبہ ہو جاتا ہے تو دھرم کو قائم کرنے، ادھرم کو مٹانے، بھگتوں کی حفاظت اور ادھرمیوں کی سرکوبی کے لیے اوتار ہوا کرتے ہیں۔

یہ قول بھاگوت گیتا میں ہے، چترویدی جی نے بتایا ہے کہ شریمد بھاگوت میں اس کی مزید وضاحت آئی ہے اس کی رو سے اوتار کے یہ چار خاص مقاصد ہیں

(۱) بھکتی کا قیام

(۲) بھگتوں کی پرارتھنا سے دنیا کی فلاح اور ادھرمیوں کی ہلاکت

(۳) زمین کا بوجھ اتارنا

(۴) دنیا میں جہالت، ہوا و ہوس اور اپنے اعمال و افعال کے ذریعہ تکالیف میں مبتلا لوگوں کے لیے سننے اور ذکر کرنے کے لائق لیلائیں کرنا جن کے سننے اور ذکر کرنے سے مخلوق کی تکالیف دور ہوں، لیکن بھگتوں کے نزدیک تو اوتار کا چوتھا ہی مقصد سب کچھ ہے، کیونکہ زمین کا بوجھ دور کرنا اور ادھرمیوں اور شریروں کو تباہ و برباد کرنا ایسے

کام نہیں جو بھگوان کے اوتار لیے بغیر نہ ہو سکیں اوتار کا اصل مقصد چوتھا ہی ہے کہ بھگوان اوتار نہ لیتے تو بھگت لوگ ان کے چرتوں (وقائع و سوانح) نہ سن ہی سکتے اور نہ ان کا ذکر ہی کر سکتے' نیز سادھوؤں کی سادھوتا کا تحفظ بھگوان کے اوتار لیے بغیر ممکن نہ تھا' اس لیے کہ جب بھگوان ظاہر نہ ہوں تو سادھو لوگ کس کا دھیان کریں' کس کو پوجیں اور کس کا گن گائیں؟ (صفحہ ۴۶-۴۷-ملخصاً)

اوتار کے اسی چوتھے مقصد پر گوئندکا جی نے بھی زور دیا ہے۔ یہ پہلو شاید اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ سوامی دیانند جی نے ستیارتھ پرکاش میں کرشن جی کے اوتار ہونے سے انکار کرتے ہوئے ان کے گیتا میں آئے ہوئے قول کی تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ ادھرمیوں اور شر پسندوں کی ہلاکت کے لیے اوتار کی کوئی ضرورت نہیں۔ پرماتما اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق سے بڑے بڑے شریر اور ادھرمی کو جب چاہے تباہ و برباد کر دے' رہا چوتھا مقصد تو ہم ابتدا میں اس پر بھی غور کر آئے ہیں۔ ہندو فضلاء نے اوتار کے چوتھے مقصد کو اوتار کی اصل اساس قرار دیتے ہوئے متعدد حقیقتوں کو فراموش کر دیا' مثلاً

(۱) اوتار انسانی ہی صورتوں میں نہیں ہوا ہے۔ کچھوے' مچھلی' سور' سنگھ وغیرہ کی صورتوں میں بھی اوتار مانا جاتا ہے' رام جی کو تو آدرش پرش یعنی قابلِ اتباع معیاری یا نمونہ کا انسان کہا جاتا ہے لیکن ان جانوروں کے اوتاروں سے سادھو اور بھگت لوگ اپنی زندگی کے لیے کس قسم کا آدرش اور معیار اخذ کر سکتے ہیں؟ اور ان جانوروں کو پرماتما کا اوتار ماننے سے پرماتما کے متعلق بھگتوں کے دلوں میں کس طرح کا پاکیزہ اعتقاد پیدا ہو سکتا ہے اور ان کی روحیں کس قسم کی پاکیزگی حاصل کر سکتی ہیں جو سادھوتا اور بھکتی کا جوہر ہے۔

(۲) پربرہم کی جو صفات ویدوں اور اپنشدوں میں بیان ہوئی ہیں اوتاروں کے ذریعہ ان کا ظہور کہاں ہوتا ہے؟ رام چندر اور کرشن جی کے سوانح موجود ہیں جن کی صداقت خود ہندو علماء کے نزدیک مشتبہ ہے لیکن ان کو جوں کا توں صحیح مان لیجیے جب بھی پربرہم کے صفات اور اوتاروں کے وقائع و سوانح میں کوئی مطابقت نہیں جو مافوق الفطرت وقائع رام چندر جی اور شری کرشن سے منسوب ہیں۔ اگر آپ مذاہب کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دوسرے ملکوں اور قوموں میں بھی ایسے انسان گزرے ہیں جن سے مافوق الفطرت کارنامے ظہور میں آئے ہیں۔ مثلاً پیغمبروں کے معجزات جن کو ہم آگے پیش کریں گے اگر اوتار کا یہی معیار ہے تو رسول کو بھی اوتار ماننا پڑے گا کیونکہ انھوں نے بھی زوال یافتہ دھرم کو زندہ کیا' ان کے ذریعہ بھی دھرماتما لوگوں کو ادھرمیوں' پاپیوں' بددینوں اور ظالموں سے نجات ملی اور ان کے ذریعہ بھی بہت سے کرشمے ظہور میں آئے۔

(۳) ہندو دھرم کے مطابق دنیا کی عمر تقریباً دو ارب سال ہے اور رام چندر کے زمانے کو دس لاکھ برس بتایا جاتا ہے حالانکہ اوپر کے مباحث سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہندو محققین اسے صحیح نہیں مانتے، لیکن ہم اسے صحیح مان لیں جب بھی رام چندر سے پہلے کے کسی اوتار کی کوئی مفصل کتھا نہیں ملتی پھر رام چندر سے پہلے کے بھکتوں اور سادھوں کی بھکتی اور سادھنا کی تکمیل کیسے ہوتی تھی؟ اگر نہیں ہوتی تھی تو اسے ہندو دھرم کا نقص کہا جائے گا یا اور کچھ؟ اور اگر بھکتی اور سادھنا کی تکمیل ہوتی تھی تو اوتاروں کی کوئی ضرورت ثابت نہ ہو سکے گی؟

رام چندر کو خواہ کتنا ہی زمانہ ہو بالمیکی کو ان کا ہم عصر بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بالمیکی رامائن رام جی کے زمانے میں لکھی گئی، اس کتاب میں کتنے حقائق ہیں اور کتنی شاعری اور افسانہ۔ اس سے قطع نظر اس رامائن میں رام چندر کو اوتار کی حیثیت دی ہی نہیں گئی ہے۔ موصوف کو اوتار کی حیثیت تو دی ہے۔ اکبر کے زمانے میں تلسی داس جی نے جو رامائن لکھی ہے کسی تاریخ کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے تخیل اور تصور سے، اس لیے کہ اگر والمیکی رامائن کی کوئی تاریخی حقیقت ہو بھی تو تلسی داس جی کی رامائن اس سے بالکل مختلف ہے۔

(۴) کرشن جی کے زمانے کو چھ ہزار برس بتایا جاتا ہے، یہ زمانہ بھی بہت ہے لیکن اسے بھی جوں کا توں صحیح مان لیا جائے تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے درمیان میں کسی اوتار کی کوئی مفصل کتھا موجود نہیں، پھر اس طویل فصل کے دوران میں بھکتی اور سادھنا کی تکمیل و تسکین کیسے ہوتی تھی؟ اور ہوتی تھی تو کرشن اوتار کے بغیر نہ ہونے کی کیا توجیہ کی جائے گی؟

اب اگر آپ اوتار کے عقیدے کی جگہ عقیدہ رسالت کو رکھ دیجیے تو سارے سوالات و مباحث لمحۂ اول ختم ہو جائیں یا و رساری گرہیں آپ سے آپ کھل جائیں اور میں غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عقیدۂ اوتار عقیدۂ رسالت ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ چونکہ آریہ فرقہ غیر خدا کی پرستش کو جائز قرار نہیں دیتا اس بنا پر عام خیال ہے کہ وہ اسلام سے زیادہ قریب ہے لیکن میری رائے اس کے برعکس ہے۔ آریہ فرقہ نہ فرشتوں کو مانتا ہے اور نہ جنت اور دوزخ وغیرہ کو، اس کے نزدیک یہ دنیا ہی دار العمل بھی ہے اور دار الجزا بھی۔ دنیا کی عیش و عشرت کی زندگی نیک عملی کا ثمرہ ہوتی ہے اور تکلیف و مصیبت کی زندگی بد عملی کا نتیجہ۔ آریہ مذہب سے خدا کے عقیدے کو الگ کر دیا جائے تو وہ ایک مادہ پرستانہ مذہب ہو کر رہ جائے۔ وہ خدا کو مانتا بھی ہے تو کتنا پابند، پرماتما کے عفو و بخشش کا قائل نہیں، کوئی گناہ خواہ کسی نوعیت کا ہو اس کی سزا لازمی ہے۔ پرماتما اسے معاف کر ہی نہیں سکتا۔ آریہ عقیدہ کی رو سے یہ بات قانونِ عدل کے منافی ہے۔ پرماتما قانون سے اتنا بندھا ہوا ہے کہ اسے کسی مجرم کو

معاف کرنے کی اتنی آزادی بھی نہیں ہے جتنی ہندستان کے صدر جمہوریہ یا اپنی صوابدید کے مطابق عدالتوں کے ججوں کو لیکن آریوں کے برعکس سناتن دھرم میں دیوتاؤں کی صورت میں فرشتوں کا بیکنٹھ اور نرک کی صورت میں جنت و دوزخ کا، خدا سے گناہوں کی معافی کے لیے دعا اور بخشش کا اور اوتاروں کی صورت میں رسولوں کا، ویدوں کی صورت میں وحی والہام کا عقیدہ موجود ہے، رہ گیا سناتن دھرم کا پرماتما کے ساتھ دوسری ہستیوں کا پوجنا تو اس کے بارے میں بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ التباس عبادت اور عقیدت واحترام کے فرق کو بھول جانے کی وجہ سے ہو گیا ہے۔ ہمارے یہاں "محترم" لفظ کا استعمال عام ہے۔ جیسے "والدِ محترم" ہندو بھائیوں کے یہاں ہے — "پوجیہ پتا جی" ہم جس محل پر محترم کا لفظ استعمال کرتے ہیں اسی محل پر ہندو بھائی پوجیہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں قیاس یہ ہے کہ مذہبی بزرگوں اور غیبی ہستیوں کے لیے بھی "محترم" "پوجیہ" بنا اور رفتہ رفتہ پوجیہ نے بجائے احترام کے پوجا اور عبادت کی صورت اختیار کر لی۔ ایک اور مثال لیجیے۔ حضرت آدم کو فرشتوں کے سجدہ کرنے کی۔ اس سے مقصود حضرت آدم کے احترام کا اظہار تھا۔ امتدادِ زمانہ کے باعث ایسی چیزوں کی حقیقت فراموش ہو جانے سے بھی انسان پرستی، بت پرستی اور مخلوق پرستی کی راہ پر انسان پڑ جاتا ہے۔

میں غور و فکر کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندو مذہب چونکہ بہت قدیم مذہب ہے اس لیے اس میں ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں — انبیاء کرام علیہم السلام اور خود قریش مکہ کی تاریخ دیکھیے۔ پیغمبروں کی امتیں ہمیشہ آگے چل کر مبتلائے شرک ہوتی رہیں۔ دوسری مشرک قوموں کے مقابلے میں ان قوموں کے یہاں جن کا تعلق انبیائی تعلیمات ہدایات سے رہا ہے بگڑے سے بگڑے ہوئے حالات میں بھی اسی طرح ان تعلیمات و ہدایات کے آثار پائے جاتے ہیں جیسے قلعوں کے کھنڈرات میں قلعوں کے آثار۔

آپ سناتن دھرم کے مذہبی لٹریچر کا بنظر غائر محققانہ مطالعہ کیجیے تو آپ کو اس میں انبیائی تعلیمات کے کتنے ہی آثار کہیں ابھرے اور کہیں دبے نظر آئیں گے، اگر اس نقطہ نظر سے ہندستان کے مسلمان کام کریں تو اس سے ہندو مسلمانوں کے درمیان ٹھوس مفاہمت کی ایک جدید راہ نکل سکتی ہے۔ پنڈت سندر لال جی اور سنت ونوبا نے اس مقصد سے کچھ کام کیا ہے یہ کام مسلمانوں کو بھی کرنا چاہیے تاکہ اسلامی حقائق مسخ نہ ہو جائیں۔ اس کام کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسلامی حقائق کی روشنی میں ہندو مذہب کے حقائق کی تحقیقات کی جائے اور ان کو نکھار کر برادرانِ وطن کے سامنے رکھا جائے۔ یہ ہمارا ان کا مشترکہ مقصد ہے کہ ہم دونوں خدا کی رضا و خوشنودی اور نجات و سعادت پر عقیدہ رکھتے ہیں میری اس کاوش کا مقصد یہی ہے نہ کہ رد و قدح۔

(باقی)

مُسلم فیملی لاز آرڈیننس پر علمائے کرام کا تبصرہ

ماہنامہ زندگی مئی ۱۹۶۰ء کے اشارات میں پاکستان کے مسلم فیملی لاز پر راقم الحروف نے اپنے تاثرات لکھے تھے اور حکومت پاکستان کی خدمت میں چند گزارشات رکھی تھیں، پاکستانی مسلمانوں کے اس حلقے سے جو مغربی تہذیب سے بے حد مرعوب ہے اصرار کیا جا رہا ہے کہ اس قانون کو جلد نافذ کر دیا جائے اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایک بار پھر پاکستانی حکومت کی خدمت میں خلوص و خیر خواہی کے ساتھ یہ بات رکھی جائے کہ مٹھی بھر مغرب زدہ لوگوں کی پاسداری میں عجلت سے کام نہ لے اور ہرگز اس قانون کو نافذ نہ کرے بلکہ اسلامی شریعت کی روشنی میں مخلصانہ طور پر از سر نو غور و فکر کر کے اسے کتاب و سنت کے مطابق بنائے۔ پاکستان کے علماء نے اس پر جو مخلصانہ اور مدلل تبصرہ کیا ہے اس پر حکومت پاکستان کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ ہم افادۂ عام کے لیے یہاں وہ تبصرہ معاصر "شہاب" لاہور کے شکریے کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔ (ع۔ ق)

۲ مارچ کو مرکزی حکومت نے مسلم فیملی لا آرڈیننس ۱۹۶۱ء کے نام سے جو قانونی حکم صادر کیا ہے اور اس کو پیش کرتے ہوئے وزیر قانون جناب محمد ابراہیم صاحب نے جو توضیحی بیان دیا ہے اس کو ہم نے بغور دیکھا۔ ہم اس بات پر افسوس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پچھلے پانچ سال کے دوران میں عائلی کمیشن کی رپورٹ پر اہل علم (یعنی علم دین کے جاننے والوں) کی طرف سے جو مدلل تبصرے کیے گئے تھے اور اس کی کمزوریوں کی جو صاف صاف نشاندہی خود کمیشن کے ایک عالم دین رکن اور دوسرے لوگوں کی طرف سے کی گئی تھی ان سب کو مرکزی حکومت نے بے تکلف نظر انداز کر دیا اور اسی کمیشن کی بیشتر سفارشات کو قانون کا جامہ پہنا دیا۔ مزید افسوس اس بات کا ہے کہ وزیر قانون نے اس نئی قانون سازی کو عین مطابق قرآن قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ تاہم یہ امر موجب اطمینان

ہے کہ اس آرڈیننس کو فوری طور پر نافذ العمل قرار نہیں دیا گیا ہے اور اس کے آئندہ نفاذ کو آئندہ کے کسی اعلان تک مؤخر رکھا گیا ہے۔ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پورے دلائل کے ساتھ اس آرڈیننس کی کمزوریوں اور اس کے نقصانات کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ حکومت پھر ایک مرتبہ غور کرلے اور اس غلطی کی تلافی کرے اب تک موجودہ حکومت کی یہ ایک قابل قدر روایت رہا ہے کہ اس کے کسی فیصلے کی غلطی اگر اس پر واضح کر دی گئی ہے تو اس نے اس فیصلے پر نظر ثانی کرنے میں تامل نہیں کیا ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس آرڈیننس کے معاملے میں بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔

ذیل میں آرڈیننس کی قابل اعتراض دفعات پر سلسلہ وار تبصرہ اسی تعمیری غرض کے لیے پیش کیا جارہا ہے

دفعہ نمبر ۴

اس دفعہ کی رو سے دادا اور نانا کے اُن پوتوں اور پوتیوں اور نواسوں نواسیوں کو دادا اور نانا کا وارث قرار دیا گیا ہے جن کے باپ یا ماں مورث کی زندگی ہی میں وفات پاگئے ہوں۔ محترم وزیر قانون کے خیال میں یہ قرآنی قانون کی پیروی ہے۔ لیکن اس کے اندر قرآن کے چار صریح قاعدوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔

۱۔ قرآن ایک مورث کے ترکے میں صرف ان رشتہ داروں کے حصے مقرر کرتا ہے جو مورث کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں۔ لیکن آرڈیننس کی یہ دفعہ بعض ان رشتہ داروں کو حصہ دلاتی ہے جو مورث کی زندگی میں وفات پاچکے ہوں۔ اس دفعہ کی رو سے پہلے یہ فرض کیا جائے گا کہ وہ وفات یافتہ رشتہ دار مورث کی وفات کے وقت زندہ ہیں اور اس مفروضے کی بنا پر واقعی زندہ رشتہ داروں کے ساتھ ان کا حصہ نکالا جائے گا۔ پھر ان کا حصہ نکالتے ہی انہیں مردہ تسلیم کرلیا جائے گا اور آگے ان کے وارثوں میں وہ حصہ تقسیم کیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کی کس آیت سے یہ قانونی مفروضات اور قانونی حیلے اخذ کیے گئے ہیں۔

۲۔ قرآن کریم میں جن رشتہ داروں کے حصے مقرر کیے گئے ہیں۔ ان میں بیٹوں اور بیٹیوں کے علاوہ ماں، باپ بیوی، شوہر اور مورث کے کلالہ ہونے کی صورت میں بھائی اور بہن بھی شامل ہیں لیکن آرڈیننس کی یہ دفعہ ان میں سے صرف بیٹوں اور بیٹیوں کو اس امتیاز کے لیے منتخب کرتی ہے کہ مورث کی زندگی میں مرجانے کے باوجود وہ حصہ وصول کرنے کے لیے مورث کی موت کے وقت زندہ فرض کیے جائیں اور پھر آگے حصہ تقسیم کرنے کے لیے مردہ تسلیم کرلیے جائیں۔ یہ امتیاز قرآن کی کس نص یا اس کے کس اقتضا یا دلالت یا اشارے سے ماخوذ ہے۔

۳۔ قرآن کی رو سے ایک مورث کے ترکے میں اس کے تمام بیٹوں اور بیٹیوں کا حق ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ صاحب اولاد ہوں یا نہ ہوں، شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں، بالغ ہوں یا نہ ہوں لیکن اس آرڈیننس میں مزید امتیاز

یہ برتا گیا ہے کہ جو بیٹے اور بیٹیاں مورث کی زندگی میں لاولد مر گئے ہوں ان کو تو حصہ وصول کرنے کے لیے زندہ فرض نہیں کیا جائے گا، البتہ جو اولاد چھوڑ گئے ہوں صرف ان کا حصہ وصول کیا جائے گا۔ اس امتیاز کے لیے قرآن میں کیا دلیل ہے؟

۴۔ یہ آرڈیننس مزید امتیاز یہ برتتا ہے کہ فوت شدہ صاحب اولاد بیٹوں اور بیٹیوں کی بھی صرف اولاد کو حصہ پہنچاتا ہے۔ درآں حالیکہ قرآن کی رو سے اگر مورث کے مال میں ان کا کوئی حق ہے تو وہ پھر ان کی ماں یا ان کے باپ اور ان کی بیوی یا ان کے شوہر کو بھی پہنچنا چاہیے۔ مثلاً اگر ایک متوفیہ بیٹی کا حصہ نکالا جائے تو اس کا شوہر بھی حق دار ہوگا، وہ زندہ ہوتا اور اس کی ماں بھی حصہ دار ہے اگر وہ متوفی باپ سے حصہ پا رہی ہو۔ اور اس کا باپ بھی حق دار ہے اگر وہ متوفیہ ماں سے حصہ پا رہی ہو۔ نانا سے صرف نواسوں اور نواسیوں کو حصہ دلوانا اور دوسرے وارثوں کو چھوڑ دینا قرآن کے کس حکم پر مبنی ہے؟

ان سوالات کے جواب میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام مفروضات اور قاعدے صرف قرآن کے اس منشاء کو پورا کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں کہ یتامیٰ کی مدد کی جائے اگرچہ بجائے خود یہ قاعدے و مفروضے قرآن سے ماخوذ نہیں ہیں۔ لیکن یہ عذر دو وجوہ سے بالکل غلط ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا قانون میراث سرے سے اس اصول پر مبنی نہیں ہے کہ کسی پر رحم کھا کر اس کی مدد کی جائے، ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ قرآن ایک مالدار رشتہ دار کو میراث کا حق پہنچاتا محض اس بنا پر کہ وہ قاعدے کے مطابق حقدار رشتوں کے دائرے میں آتا ہے اور ایک انتہائی مفلس اور قابل رحم رشتہ دار کو محروم رکھتا صرف اس بنا پر کہ وہ قاعدے کے مطابق حق دار رشتوں میں شامل نہیں ہے۔ ایک اپاہج مفلس بھائی کو محروم کرنا اور ایک دولتمند بیٹے کو دولتمند باپ کی جائداد کا وارث بنانا بالکل بے معنی ہو جاتا۔ اگر قانونِ میراث بنانے سے قرآن کا منشاء یہ ہوتا کہ حاجتمندوں کی مدد کی جائے۔ دوسری وجہ جس کی بنا پر یہ عذر قطعی غلط ہوگا یہ ہے کہ اگر فی الواقع قرآن کا ایسا کوئی منشا ہوتا کہ یتیم پوتوں اور نواسوں کی مدد دادا اور نانا کی میراث میں ان کو حصہ دار بنا کر کی جانی چاہیے تو آخر کیا اس امر میں مانع تھا کہ قرآن اپنے اس خاص منشاء کو ایک صاف حکم کے ذریعے سے کھول دیتا۔ اور اگر قرآن نے نہ کھولا تھا تو یہ منشا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تو مخفی نہ رہنا چاہیے تھا۔ حضور نے ایسا حکم کیوں نہیں دیا؟ اگر حضور نے اس کو نہیں کھولا تھا تو آخر کیا معقول وجہ ہے کہ قرآن کا یہ منشاء تمام خلفائے راشدین سے، تمام صحابہ سے، تمام ائمہ واہل بیت سے، تمام مجتہدین اور پچھلی تیرہ صدیوں میں اسلام کے سارے فقہاء سے مخفی رہ گیا اور اس کو پایا تو اس زمانے میں چند ان لوگوں نے جنہوں نے چاہے جس علم کی بھی تعلیم و تربیت پائی ہو، قرآن و سنت کے علم کی تعلیم و تربیت نہیں پائی۔ باپ کی زندگی میں فوت ہو جانے والے بیٹوں اور بیٹیوں کی اولاد کو جو مشکلات

پیش آتی ہیں ان کو رفع کرنے کا صحیح طریقہ بارہا علماء کی طرف سے پیش کیا جا چکا ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ البتہ اس معاملے میں شریعت کے خلاف طریقوں کو درخور اعتنا سمجھا جاتا ہے اور انہیں رواج دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

دفعہ نمبر ۵

اس دفعہ کی رو سے یہ لازم کیا گیا ہے کہ تمام نکاح جو کسی علاقے میں ہوں وہ اس علاقے کی یونین کونسل کے مقرر کردہ نکاح رجسٹرار کے پاس درج کیے جائیں اور اگر نکاح رجسٹرار کے سوا کسی اور نکاح خواں نے پڑھایا ہو تو اس کی اطلاع نکاح رجسٹرار کو کی جائے۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو تین مہینے قید یا ایک ہزار روپیہ جرمانہ تک کی سزا دی جائے گی یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

جہاں تک کہ نکاح کی رجسٹری کا تعلق ہے اس کی ضرورت اور اس کے فائدے سے انکار نہیں اگر اس رجسٹری کے لیے ملک میں جگہ جگہ مناسب انتظامات موجود ہوں اور لوگوں کے علم میں اس کے فائدے لائے جائیں تو امید ہے کہ لوگ خود اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے رجسٹریشن کی ان سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن اس کو قانوناً لازم کرنا اور اس کی خلاف ورزی کو ایک جرم مستلزم سزا قرار دینا متعدد وجوہ سے غلط ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ میں نکاح خواں کا سرے سے کوئی باقاعدہ منصب ہی نہیں ہے۔ ایک نکاح شرعاً بالکل صحیح منعقد ہو جاتا ہے اگر عورت اور مرد نے دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کر لیا ہو نکاح کا خطبہ پڑھا جانا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ کسی قاضی یا عالم کا موجود ہونا اور اس کا خطبہ پڑھنے کے بعد ایجاب و قبول کرانا زیادہ سے زیادہ مستحبات میں سے ہے۔ نکاح اس کے بغیر منعقد ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ رجسٹریشن کا حکم نکاح خواں کا ایک باقاعدہ منصب قائم کرتا ہے۔

دوسری بات وضاحت طلب یہ ہے کہ جس نکاح کی رجسٹری نہ ہوئی ہو اور شریعت کے مطابق دو شہادتیں اس پر قائم ہو جائیں آیا اس کو آپ کی عدالت تسلیم کرے گی یا نہیں؟ اس نکاح کی بنا پر عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا جائز وارث تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟ ان سے پیدا شدہ اولاد کو جائز اولاد مانا جائے گا یا نہیں؟ وہ اولاد اپنے باپ سے میراث پائے گی یا نہیں؟ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو شریعت اسلامیہ سے کھلا تصادم ہے کیونکہ شریعت کی رو سے ایک نکاح جائز ہوگا اور آپ کے قانون کی رو سے ناجائز ہوگا۔ شریعت کی رو سے کچھ حقوق ثابت ہوں گے اور آپ کے قانون کی رو سے وہ باطل ہو جائیں گے۔ اور اگر ان سوالات

کا جواب اثبات میں ہے تو پھر آپ کا از روئے قانون رجسٹریشن کو لازم کرنا اور رجسٹری نہ کرنے والوں کو سزائیں دینا عملاً بے معنی ثابت ہو جاتا ہے۔

تیسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ آیا واقعی یہ رجسٹریشن جائز نکاحوں کے ثبوت کا کوئی یقینی ذریعہ ہے؟ اور آج تک مسلمانوں میں جو نکاح بغیر رجسٹریشن ہوتے رہے ہیں ان پر اس طریقے کو کوئی واضح فوقیت حاصل ہے؟ ہمارے خیال میں تو رجسٹریشن کو اس حد تک اہمیت دینا صحیح نہیں ہے۔ ملک کی موجودہ بگڑی ہوئی حالت میں اس بات کا بہت کافی امکان ہے کہ ایک بااثر غنڈہ رشوت اور سازش کے ذریعہ سے کسی شریف عورت کے ساتھ اپنے نکاح کا بالکل فرضی اندراج کرا دے اور اس پر اپنے ساتھی غنڈوں کی گواہیاں ثبت کرا دے۔ اس طرح کے اندراجات سے وہ ساری قباحتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو مروج طریق نکاح کی صورت میں فرض کی جا سکتی ہیں۔

ان وجوہ سے ہم پھر اپنے اس رائے پر اصرار کریں گے کہ رجسٹریشن کی سہولتوں کو صرف مہیا کر دینے پر اکتفا کیا جائے اور بتدریج لوگوں کو اس بات کا عادی کیا جائے کہ وہ رضاکارانہ طریقے پر ان سے فائدہ اٹھائیں معاشرے کے ہر مسئلے کو جبر و تعزیر کے زور سے حل کرنے کی کوشش نہ صحیح ہے اور نہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

دفعہ نمبر ۶

یہ دفعہ تعدد ازدواج پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس دفعہ کا تجزیہ کر کے اس پر بحث کریں، ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ تعدد ازدواج کو اصلاً ایک برائی سمجھنا اور صرف ناگزیر ضرورت کی حالت میں اس کو جائز قرار دینا ایک غیر اسلامی تخیل ہے۔ اسلام اس تخیل سے قطعاً نا آشنا ہے۔ یہ مغرب سے درآمد ہوا ہے اور اس کے جواز کو ناگزیر ضرورت کے ساتھ مقید کرنے کی کوشش مغرب کے سامنے ایک معذرت کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ قرآن جن انبیاء کو خدا کے مقرر کردہ امام و پیشوا اور مقتدا قرار دیتا ہے ان میں سے بیشتر تعددِ ازدواج پر عامل تھے۔ خود سرور انبیاء سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد بیویاں تھیں۔ کوئی منکرِ حدیث بھی اس امرِ واقعہ سے انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قرآن میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کا ذکر ہے (وازواجه امهاتهم ۔۔۔ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ) پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں خلفاء بیشتر صحابہ اکثر ائمہ اہل بیت اور اسلامی تاریخ کے بیشتر اکابر جن پر مسلمانوں کو فخر ہے بیک وقت متعدد بیویاں رکھنے والے تھے۔ ان میں سے کس کس کے متعلق آخر آپ ثابت کریں گے کہ ان کو ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی سخت ضرورت تھی؟ اس چیز کو اصلاً

ایک برائی تسلیم کر لینے کے بعد تو لازماً ایک زوجی کے قائل اہلِ مغرب بہت سی ناجائز داشتائیں اور آشنائیں رکھنے کے باوجود صالح قرار پاتے ہیں، اس لیے کہ ان میں سے کسی نے کسی ضرورت کی بنا پر بھی ایک سے زائد قانونی بیویاں نہیں رکھیں، اور مسلمانوں کے بیشتر اکابر کم از کم نیم صالح تو قرار پاتے ہی ہیں کیونکہ وہ فرداً فرداً اس برائی پر عمل کرتے رہے۔

مزید برآں یہ بات قابلِ غور ہے کہ تعددِ ازدواج کے معاملے میں تو ہمارے وزیرِ قانون صاحب اور ہمارے دوسرے لیڈروں اور حکمرانوں کو قرآن کا کوئی مخفی منشا تلاش کر کے اس پر پابندیاں عائد کرنے کی اس قدر سخت ضرورت محسوس ہوئی لیکن قرآن نے جن برائیوں سے صریح الفاظ میں منع کیا ہے ان میں سے کسی کو قانون کے ذریعہ سے روکنے کی انھوں نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر ایک شخص ایک بیوی کے موجود ہوتے ہوئے طوائفوں کے یہاں جائے یا کوئی داشتہ رکھے یا آزادانہ شہوت رانی کرتا پھرے تو فرمائیے کہ آپ کے قانون میں اس کے لیے کیا رکاوٹ ہے؟ کیا سزا اس کے لیے تجویز کی گئی ہے؟ کن بیگمات نے اس کے خلاف کبھی احتجاج کیا اور اس کو از روئے قانون روکنے کا کبھی مطالبہ کیا؟ کب آپ نے کوئی کمیشن بٹھایا کہ اس کے سدِّباب کے لیے بھی کوئی تدبیر تجویز کی جائے؟ اس صریح برائی کو تو آپ رواداری کا مستحق سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن اسے انتہائی سخت جرم قرار دیتا ہے اور اس کے لیے سخت سزا تجویز کرتا ہے مگر تعددِ ازدواج پر آپ پابندیاں عائد کرنے کی فکر کرتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم قرآن کے منشا کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ طرزِ عمل کسی صحیح ذہنیت کی غمازی نہیں کرتا کیوں صاف صاف یہ اعتراف نہیں کیا جاتا کہ قرآن کا منشا پورا کرنا پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ ان اہلِ مغرب کے سامنے معذرت پیش کرنا مقصود ہے جو مسلمانوں سے سابقہ پیش آتے ہی سب سے پہلے تعددِ ازدواج پر برسنا شروع کر دیتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ غیر قانونی تعددِ ازدواج ان کے ہاں جس بڑے پیمانے پر رائج ہے اتنا مشکل ہی سے دنیا کی کسی سوسائٹی میں آج تک رائج رہا ہوگا حتیٰ کہ ان کے بعض ملکوں میں آج خود ان کی ایک رپورٹ کے مطابق ناجائز ولادتوں کا اوسط ۶۰ فی صدی تک پہنچ چکا ہے۔

اب ہم اس دفعہ کے مشتملات پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔ اس میں ایک شخص کو جو ایک بیوی یا زائد بیویوں کی موجودگی میں مزید نکاح کرنا چاہتا ہو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ اولاً وہ اپنی موجودہ بیوی یا بیویوں کی رضامندی حاصل کرے، ثانیاً اپنے علاقے کی یونین کونسل کے چیرمین سے اجازت حاصل کرنے کی درخواست کرے، ثالثاً ایک پنچایت کو جو اس شخص کے نمائندے اور اس کی بیوی یا بیویوں کے نمائندے اور یونین کونسل کے چیرمین پر مشتمل ہوگی، اس بات پر مطمئن کرے کہ اس کا مزید ایک بیوی کرنا ضروری اور حق بجانب ہے۔ ان شرائط کی تکمیل کے بعد پنچایت سے اجازت نامہ

حاصل کرنے پر وہ نکاح کرنے کا مجاز ہوگا۔ لیکن پنچایت کے اس فیصلے کے خلاف مغربی پاکستان میں کلکٹر کے پاس اور مشرقی پاکستان میں سب ڈویژنل افسر کے پاس نگرانی کی جاسکے گی اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا جس کے خلاف کسی کوئی اپیل نہ ہوسکے گی، قطع نظر اس سے کہ وہ نکاح کی اجازت دینے کے حق میں ہو یا اجازت منسوخ کرنے کے حق میں۔ مزید برآں اس دفعہ میں یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ جو شخص مذکورہ بالا قاعدے کے خلاف نکاح کرلے

ا۔ اس کی بیوی یا بیویوں کو فوراً پورا مہر دلوایا جائے گا خواہ وہ معجل مہر معجل ہو یا موجل

۲۔ اس کو ایک سال قید یا پانچ ہزار روپیہ جرمانے تک کی سزا دی جائے گی یا دونوں سزائیں دی جائیں گی

۳۔ اس کا نکاح علاقے کے رجسٹرار کے پاس درج نہیں کیا جائے گا جس کے معنی غالباً یہ ہیں کہ وہ سرے سے قانوناً مسلم ہی نہیں ہوگا۔

۴۔ اس کی بیوی یا بیویوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اس شکایت کی بنا پر عدالت میں خلع کا مطالبہ کرے یا کریں۔

وزیر قانون صاحب ہم کو یہ یقین دلانے کی کوشش فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ انھوں نے قرآن کے منشا کو پورا کرنے کے لیے کیا ہے۔ لیکن قرآن کے جس منشا کی وہ نشان دہی فرماتے ہیں وہ خود ان کے الفاظ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک سے زائد بیویوں کے ساتھ نکاح اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ شوہر سب بیویوں کے ساتھ عدل کرے۔ وزیر قانون صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ تعدد ازدواج پر پابندیاں اس لیے عائد فرما رہے ہیں کہ لوگ اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھا کر ایک سے زائد بیویاں کرلیتے ہیں اور عدل کی شرط پوری نہیں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ عدل کا سوال آیا نکاح سے پہلے پیدا ہوتا ہے یا نکاح کے بعد؟ ظاہر بات ہے کہ یہ سوال ایک سے زائد نکاح کرلینے کے بعد پیدا ہوتا ہے کہ آیا شوہر نے عدل کیا ہے یا نہیں؟ وجہ شکایت قرآن کی رو سے جائز طور پر صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ شوہر نے عدل نہ کیا ہو۔ اور اس وقت ایک بیوی کو جس کے ساتھ عدل نہ ہو رہا ہو یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے کہ یا تو اس کے ساتھ عدل کیا جائے یا شوہر صرف ایک بیوی رکھے۔ قرآن کا کام ہے کہ اس کے اس منشا کو پورا کرنے کی یہ شکل قرآن کے کس لفظ یا اشارے یا مفہوم سے اخذ کی گئی ہے کہ نکاح سے پہلے شوہر اپنی موجودہ بیوی یا بیویوں کی رضامندی حاصل کرے اور ایک پنچایت کو اپنی ضرورت کا اطمینان دلائے؟ پھر قرآن کے کس لفظ یا اشارے سے یہ حکم اخذ کیا گیا ہے کہ جو نکاح موجود بیوی یا بیویوں سے اجازت لیے بغیر اور ایک پنچایت سے لائسنس حاصل کیے بغیر کیا گیا ہو، وہ قانوناً تسلیم ہی نہ کیا جائے اور اس شخص کو جیل بھی بھیجا جائے اور قبل اس کے کہ اس کی بیوی یا بیویوں کو عدل نہ کیے جانے کی شکایت پیدا ہو، مجرد نکاح کرلینا ہی وہ جائز وجہ شکایت

ہو جس کی بنا پر وہ خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے یا کر سکتی ہیں؟ براہِ کرم کہیں یہ بتایا جائے کہ یہ سب کچھ قرآن نے کس مقام سے اخذ کیا گیا ہے؟ اور اگر قرآن میں یہ نہیں ہے تو کیا کہیں کوئی شہادت اس امر کی موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیوی کے بعد جتنی شادیاں کیں ان سے پہلے حضور نے صحابہ کرام کو جمع کر کے انہیں اس بات پر مطمئن کیا ہو کہ مجھے مزید بیویوں کی ضرورت ہے؟ یا صحابہ کرام میں سے کسی کو دوسری شادی کرنے سے پہلے اس بات پر مجبور کیا گیا ہو کہ وہ کسی پنچایت کے سامنے اپنی ضرورت ثابت کریں؟ یا تاریخ اسلام میں کبھی کسی بیوی کو صرف اس بنا پر خلع کے مطالبے کا حق دیا گیا ہو کہ اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے؟ یا کسی شخص کو اس جرم میں پکڑا گیا ہو کہ اس نے پچھلی بیوی یا بیویوں سے اجازت لیے بغیر اور پنچایت سے لائسنس لیے بغیر مزید ایک نکاح کر ڈالا ہے۔

اگر پیشِ نظر قرآن کا نام لے کر مغربی تخیلات کو اسلامی قانون میں داخل کرنا ہو تب تو بات دوسری ہے ورنہ قرآن کے منشاء ہی کو پورا کرنا فی الواقع پیشِ نظر ہو تو یہ پورا کا دفعہ منسوخ کر دینے کے قابل ہے کیونکہ قرآن اور سنت اور فقہ اسلامی اس کے بنیادی تخیلات اور اس کے اصول و قواعد سے بالکل ناآشنا ہیں۔ اس کے بجائے صرف ایک چیز اس دفعہ میں ہونی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی صورت میں ان کے درمیان عدل نہ کرے اس کے خلاف اس بیوی کو عدالت میں شکایت لے جانے کا حق ہو گا جس کے ساتھ عدل نہ کیا جا رہا ہو اور عدالت شوہر کو اس کے ساتھ انصاف کرنے پر مجبور کرے گی۔

دفعہ نمبر ۷

اس دفعہ میں طلاق کے جو احکام وضع کیے گئے ہیں، وہ تقریباً پورے کے پورے قرآن کے احکام کے خلاف ہیں اور ان احکام کو نافذ کرنے کے نتائج مسلم معاشرے کے حق میں اس قدر فتنہ انگیز ہوں گے کہ شاید ابھی ان کا پورا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس کی پہلی شق میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو کسی صورت میں طلاق دے (غالباً "کسی صورت" سے مراد یہ ہے کہ خواہ وہ طلاق رجعی ہو یا بائن یا مغلظ) وہ یونین کونسل کے چیرمین کو اپنے اس فعل کی اطلاع دے گا۔ دوسری شق میں یہ طے کیا گیا ہے کہ جو شخص اطلاع نہ دے اس کو ایک سال قید یا پانچ ہزار روپیہ جرمانہ تک کی سزا یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔ تیسری اور پانچویں شق میں طے کیا گیا ہے کہ

۱۔ طلاق کی عدت طلاق دینے کے وقت سے نہیں شروع ہو گی بلکہ یونین کونسل کے چیرمین کو نوٹس ملنے کے بعد سے شروع ہو گی۔

۲۔ اور یہ عدت عورت کے غیر حاملہ ہونے کی صورت میں ۹۰ دن کی ہوگی اور حاملہ ہونے کی صورت میں وضع حمل تک یا ۹۰ دن تک (ان میں سے جو مدت بھی طویل تر ہو) ممتد ہوگی۔ یعنی اس مدت کے اندر رجوع کا حق ہوگا۔

۳۔ یونین کونسل کا چیرمین نوٹس ملنے کے بعد ۳۰ دن کے اندر ایک پنچایت مقرر کرے گا جو زوجین کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے گی اور اس کے ناکام ہونے کی صورت میں طلاق نافذ ہوگی۔

یہ تمام شقیں قرآن کے صریح احکام سے ٹکراتی ہیں۔ وزیر قانون صاحب اپنے بیان میں فرماتے ہیں کہ "اسلامی قانون طلاق کے اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کبھی میاں اور بیوی میں اختلاف رونما ہوں تو قریبی رشتہ دار اور دوسرے لوگ ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کریں۔ تاکہ فوری تفریق نہ ہونے پائے۔ لیکن دراصل انہوں نے قرآن کے دو احکام کو بالکل غلط طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے اور قرآن کے دیے ہوئے حق طلاق کو ایک پنچایت کے ساتھ معلق کر کے رکھ دیا ہے۔ قرآن مجید میں طلاق کے احکام بالکل الگ بیان کیے گئے ہیں اور میاں اور بیوی کے اختلافات کو رفع کرنے کی صورت الگ بیان کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ میں آیت ۲۲۷ سے لے کر ۲۳۲ تک اور سورۂ احزاب کی آیت ۴۹ میں اور سورۂ طلاق کی پہلی سات آیتوں میں طلاق کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ کوئی قانونی فہم رکھنے والا شخص ان احکام کو پڑھتے ہوئے قطعاً یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ یہاں شوہر کے حق طلاق کو کسی پنچایت یا عدالت کے سامنے پیش کرنے اور اس کا فیصلہ حاصل کرنے سے مقید کیا گیا ہے۔ ان تمام احکام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شوہر جب چاہے طلاق دینے کا مختار ہے۔ ایک آیت کے اندر تو صاف الفاظ میں "بیدہ عقدۃ النکاح" کا فقرہ ارشاد فرمایا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عقد نکاح کو برقرار رکھنا یا توڑ دینا شوہر کے اختیار میں ہے اور اپنے اس اختیار کو استعمال کرنے کے لیے وہ قطعاً کسی دوسرے کی طرف رجوع کرنے کا پابند نہیں ہے۔ دوسری طرف سورۂ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں، نیک بیویاں شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ اگر بیوی نشوز کا رویہ اختیار کرے تو شوہر کو اسے مطیع بنانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرنے کا حق ہے اور اگر زوجین کے درمیان کوئی جھگڑا ہو تو ایک حکم شوہر کے خاندان سے اور ایک حکم بیوی کے خاندان سے مقرر کیا جائے تاکہ وہ دونوں مل کر ان کے جھگڑے کو رفع کرانے کی کوشش کریں۔ اس آیت میں سرے سے طلاق کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے اور کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اس کی مصالحت کے بغیر شوہر طلاق کا اختیار استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ ان دو الگ قوانین کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کر کے ایک قانون کا منشا، دوسرے قانون کے ذریعہ فوت کرنے کی کوشش کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

دراصل اس دفعہ کا پورا تخیل مغرب کے انتہائی ناقص قوانین نکاح و طلاق سے اخذ کیا گیا ہے اور نام یہ لیا جا رہا ہے کہ یہ قرآنی قانون طلاق کا اصول بنیادی ہے۔ مغرب ایک مدت دراز تک طلاق کو ایک برائی اور ایک ناجائز کاروائی

سمجھتا رہا اور اسلام پر اعتراض کرتا رہا کہ اس میں یہ چیز جائز ہے۔ پھر اپنے اس غلط تخیل کے بدترین نتائج دیکھ لینے کے بعد جب اس نے طلاق کے جواز کی ضرورت محسوس کر لی تو اپنے سابق طرز فکر کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے طلاق کی ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ شکل اختیار کی کہ عورت اور مرد دونوں کو علیحدگی چاہنے کی صورت میں عدالتی فیصلہ کا پابند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانوں کے گندے کپڑے کھلم کھلا عدالتوں میں دھوئے جانے لگے۔ طلاق چاہنے والے چونکہ مجبور تھے کہ ایک عدالت کو اس بات پر مطمئن کریں کہ ان کے لیے جدائی ناگزیر ہو چکی ہے۔ اس لیے انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف جھوٹے الزامات اور زیادہ تر بداخلاقی کے اتہامات مجبوراً لگائے کیونکہ اصل وجوہ طلاق لازماً ایسی نہیں ہو سکتے جو کسی عدالت کو مطمئن کر دیں۔ اس طرح ان غلط قوانین طلاق کی بدولت مغربی معاشرہ طلاق کے انتہائی فتنہ انگیز مقدمات سے لبریز ہو گیا۔ اب ہمارے قانون سازان اہل مغرب کی اندھی تقلید میں ہمارے معاشرے کو اس فتنے سے دوچار کرنے کے درپے ہیں۔

آرڈیننس کی اس دفعہ کی مذکورہ بالا شقوں میں حسب ذیل امور صریح طور پر قرآن کے خلاف ہیں۔

۱۔ اس میں عورت کی عدت یونین کونسل کے چیرمین کو نوٹس دینے کے بعد سے شروع ہوتی ہے خواہ طلاق دینے کے مہینہ دو مہینہ بعد ہی یہ نوٹس دیا گیا ہو۔ حالانکہ قرآن کی رو سے طلاق زبان سے نکالتے ہی عدت کی مدت شروع ہو جاتی ہے۔

۲۔ اس میں عدت کی مدت غیر حاملہ عورت کے لیے ۹۰ دن قرار دی گئی ہے، حالانکہ قرآن کی رو سے تین حیض اس کی مدت ہے۔

۳۔ اس میں حاملہ عورت کی عدت کی مدت وضع حمل یا ۹۰ دن (ان میں سے جو مدت بھی طویل تر ہو) قرار دی گئی ہے۔ حالانکہ قرآن کی رو سے حاملہ کی عدت وضع حمل پر ختم ہو جاتی ہے اور صرف غیر حائضہ عورت کی مدت عدت نوے دن نہیں بلکہ تین مہینے رکھی گئی ہے۔

۴۔ اس میں طلاق کے نفاذ کو یونین کونسل کے چیرمین تک اطلاع پہنچنے اور اس کی سعی مصالحت کرنے پر موقوف کر دیا گیا ہے حالانکہ یہ قرآن کے بالکل خلاف ہے جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔

۵۔ اس میں شوہر کے خاندان اور بیوی کے خاندان کے ایک ایک حکم کے ساتھ یونین کونسل کے چیرمین کا مزید اضافہ کر دیا گیا ہے حالانکہ قرآن صرف دونوں خاندانوں کے ایک ایک حکم کے سامنے اختلافات پیش کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یونین کونسل کا چیرمین لازماً اپنے علاقے کے عام خاندانوں کا کوئی معتمد علیہ سرپرست نہیں ہو سکتا بلکہ آپ کے کسی قانون کی رو سے اس کا مسلمان تک ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں خاندان یا ان میں سے کوئی ایک اس بیرونی آدمی کے سامنے اپنے گھر کے جھگڑے رکھنے پسند نہ کریں۔ کسی بیرونی شخص کے سامنے میاں اور بیوی کے بعض ایسے معاملات بھی آ سکتے ہیں کہ اگر از روئے قانون ان کا لانا لازم

کر دیا جائے تو شاید وہی خواتین جو آج اس طرح کے قانون کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم فرما رہی ہیں اس وقت چیخ اٹھیں گی جب یہ جھگڑے پنچایتوں میں آنے شروع ہوں گے اور بعید نہیں کہ جب طلاق کا نفاذ ایک پنچایت کے اطمینان پر موقوف ہو جائے تو ہمارے ہاں بھی شوہر اپنی بیویوں پر جھوٹے اخلاقی الزامات لگانا شروع کر دیں تاکہ پنچایت کو طلاق کے ناگزیر ہونے کا قائل کر سکیں۔

اس دفعہ کی شق نمبر ۶ ایک اور خطرناک صورت پیدا کرتی ہے اس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ہر وہ نکاح جو کسی مؤثر طلاق کے ذریعے ختم ہو چکا ہو اس کے فریقین دوبارہ باہم نکاح کر سکیں گے بغیر اس کے کہ بیک وقت دی ہوئی طلاقیں خواہ تین ہی کیوں نہ ہوں مغلظہ نہیں ہوں گی اور عملاً ان کی تاثیر ایک ہی طلاق کی ہوگی۔ بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے۔ حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیے گئے ہوں تو اس سے طلاق مغلظہ واقع ہو جاتی ہے اور مطلقہ عورت سے اس کا سابق شوہر نہ تو مدت عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت گزر جانے کے بعد اس کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے جب تک کہ اس کی تحلیل نہ ہو جائے۔ اس ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔ ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور مذہب حنفی کے ائمہ و فقہاء کے علم و تقویٰ پر ہے وہ اعتماد آج کل کے قانون سازوں پر نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا۔ اس قانون سازی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے عقیدے اور قانون رائج الوقت کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے گا اور اس سے ان کی معاشرتی زندگی میں بڑی پیچیدگیاں رونما ہوں گی۔ مثال کے طور پر ایک شوہر اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاق دینے کے بعد اس سے رجوع کرے تو اس کی حنفی بیوی اور اس کا خاندان اس رجوع کو جائز تسلیم نہیں کریں گے۔ بیوی نہ شوہر سے آزاد ہو کر دوسرا نکاح کر سکے گی کیونکہ قانون اس میں مانع ہوگا اور نہ اپنے آپ کو اس شوہر کے حوالے کر سکے گی کیونکہ اس کے عقیدے کی رو سے یہ زنا کا ارتکاب ہوگا۔ کیا اس پیچیدگی کو آپ کا کوئی قانون رفع کر سکتا ہے؟ کیا آپ کے قوانین یہ طاقت رکھتے ہیں کہ لوگوں کے عقائد تبدیل کر سکیں۔

دفعہ نمبر ۱۲

اس دفعہ میں لڑکیوں کے لیے عمر نکاح کی مدت ۱۴ سال سے بڑھا کر ۱۶ سال کر دی گئی ہے۔ یعنی ۱۶ سال سے کم عمر کی لڑکی کا نکاح اب از روئے قانون نہ ہو سکے گا۔ عمر نکاح مؤثر کرنے کا قانون پہلی مرتبہ جب انگریزی دور میں بنایا گیا تھا اس وقت بھی علماء نے اس پر احتجاج کیا تھا اور اب اس موقع پر ہم پھر اس پر اعتراض کرنے کے لیے مجبور ہیں کیونکہ یہ قرآن مجید کے صریح حکم کے خلاف اور ان کے مصالح سے متصادم ہے جنہیں اسلامی شریعت نے اہمیت دی ہے —

قرآن مجید میں بالفاظ صریح ایسی لڑکی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے جس کو ابھی حیض نہ آیا ہو۔ سورۂ طلاق کی آیت نمبر ۴ میں بتایا گیا ہے کہ جن عورتوں کا حیض آنا بند ہو چکا ہو یا جن عورتوں کو ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو ان کے معاملے میں عدت طلاق تین مہینے ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ عدت طلاق کا سوال پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جبکہ پہلے نکاح ہو چکا ہو۔ اس طرح قرآن مجید صریح طور پر اس لڑکی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیتا ہے جس کو حیض آنا شروع نہ ہوا ہو۔ ہمارے ملک میں بالعموم لڑکیوں کو ۱۳ برس کے لگ بھگ عمر میں حیض آنا شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی رو سے اس سے کم عمر کی لڑکی کے ساتھ نکاح جائز ہے لیکن اس آرڈیننس کی رو سے ۱۶ برس سے کم عمر کی لڑکی سے نکاح ناجائز ہے۔

قرآن کے ساتھ اس تصادم کے علاوہ یہ سوال قابل غور ہے کہ اس ملک میں کیا کوئی ایسا قانون ہے جس کی رو سے ۱۶ برس سے کم عمر کی لڑکی کے ساتھ زنا کی روک تھام ہو سکے؟ محض یہ بات کہ ۱۶ برس سے کم عمر کی لڑکی نابالغہ ہو اور اس کے ساتھ مباشرت زنا بالجبر قرار پائے اس خرابی کی روک تھام کے لیے موثر ذریعہ نہیں ہے اس لیے کہ ایسی لڑکی اگر اپنی مرضی سے زنا کرائے تو اس جرم کا قانون کے علم میں آنا ضروری نہیں ہے لیکن اس کا نکاح جب بھی کیا جائے گا وہ لازماً قانون کے علم میں آئے گا اور اس کے مرتکبین سزا پائیں گے۔ اب یہ ستم ظریفی ہے کہ ایک لڑکی کے زانیہ ہو جانے کا تو سدباب نہ ہو مگر اس کے نکاح کا سدباب کر دیا جائے اور اگر ایک باپ اپنی ۱۴، ۱۵ برس کی عمر کی لڑکی کو بگڑتے ہوئے دیکھ کر اس کا نکاح کر دینا چاہے تو نہ کر سکے اور اس کے بگڑنے کے خطرے کو مجبوراً برداشت کرتا رہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ صغر سنی کی شادی بالعموم ہمت افزائی کی مستحق نہیں ہے اور جن علاقوں میں اس کا رواج قباحتیں پیدا کر رہا ہے وہاں اس کی اصلاح کی ضرورت ہے لیکن معاشرے کی ہر خرابی کا علاج لازماً جبر ہی نہیں ہے۔ عوام میں تعلیم و تلقین کے ذریعے اس رجحان کو روکا جا سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ قانوناً نکاح کی عمر مقرر کر کے اس سے کم عمر کے نکاح کو سرے ہی سے حرام کر دیا جائے۔

یہ ایک حق نصیحت ہے جو ہم اس ملک کی صلاح کے لیے اس آرڈیننس کے نفاذ سے پہلے ادا کر رہے ہیں۔ اس کو ادا کر دینے کے بعد ہمارا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ اب یہ حکومت کا کام ہے کہ جن غلطیوں کی نشان دہی دلائل کے ساتھ کر دی گئی ہے ان کی اصلاح کرے۔

مولانا مفتی محمد حسن مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور۔ مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری ناظم مرکزی حزب الاحناف پاکستان لاہور۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور۔ مولانا مفتی جعفر حسین مجتہد سابق ممبر بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ دستور ساز اسمبلی پاکستان۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف مدیر الاعتصام لاہور۔ مولانا سید محمود احمد رضوی نائب ناظم مرکزی انجمن حزب الاحناف پاکستان لاہور۔ مولانا ابوالحسنات سید خلیل احمد قادری خطیب مسجد [illegible] مولانا [illegible] خطیب جامع مسجد اہل حدیث لاہور۔ مولانا حافظ محمود احمد [illegible] ناظم جامعہ قدس اہل حدیث لاہور۔ مولانا [illegible] امام خان نوشہروی لاہور۔ مولانا عبدالستار خان نیازی لاہور۔

(باقی صفحہ [illegible] پر دیکھیے)

تراجم و اقتباسات

"ذہنی سکون" — حقیقی خوشی کا گمشدہ خزانہ

باطن — اصل مسئلہ

جب میں ولولوں سے لبریز زندگی لیے ہوئے اوائل شباب کے مرحلوں سے گزر رہا تھا تو ایک بار مجھے یہ سوجھی کہ لاؤ ایک ایسی "فہرست" تیار کی جائے جس میں زندگی کے تمام ہی مسلّمہ ساز و سامان قلمبند ہوں۔ بہت سے لوگ جس طرح اپنی ملکیت کی تفصیلات پر مشتمل فہرستیں بنایا کرتے ہیں۔ میں نے یوں ہی دنیا کی "قابلِ آرزو" چیزوں کو لے کر اس ذہنی خاکے میں سمیٹنا شروع کیا — جس میں صحت بھی تھی — محبت بھی حسن بھی تھا اور طاقت بھی — دولت بھی تھی اور شہرت و ناموری بھی — اور ان کے ساتھ ساتھ وہ متعدد چھوٹے چھوٹے متفرقات بھی جو میرے خیال میں انسانی مسرت کی تکمیل کا ایک لازمی جزو قرار پا سکتے تھے۔

جب میری یہ "ایجاد" پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو میں نے اس کو بڑے فخر کے ساتھ اپنے ایک دانا بزرگ کو دکھایا جو میری جوانی کے ایک جہاں دیدہ استاد اور میرے لیے ایک "روحانی اسوہ" کا درجہ رکھتے تھے۔ میں شاید ان کو اپنی امنگوں اور اپنے مفادات اور دلچسپیوں کی لمبی چوڑی "آفاقیت" سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا — بہرکیف میں نے وہ فہرست ان کی طرف بڑھا دی۔

میں نے ایک پُراعتماد آواز میں عرض کیا — "یہ ہے متاعِ دنیا کا لبِ لباب! — جب انسان کے پاس یہ سب جمع ہو گیا وہ ایک دیوتا نہ کہلائے گا —"

میں نے دیکھا کہ میرے کرم فرما کی بوڑھی آنکھوں کے گوشوں میں مسکراہٹ کی شکنیں ایک سنجیدہ انداز میں پیدا ہوئیں۔ "نہایت نفیس فہرست!" انھوں نے فہرست کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "بڑے سلیقے سے بات کو سمیٹا گیا اور معقولیت سے دامن بچاتے ہوئے ان کو ترتیب دیا گیا ہے لیکن میرے نوجوان رفیق! ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم نے سب سے زیادہ اہم پہلو کو نظرانداز کر دیا! تم سے نسخہ کا وہ جزو چھوٹ ہی گیا جس کے بغیر ہر ایک ساز و سامان بھیانک عقوبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور تمہاری یہ فہرست مجموعی طور سے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔

مسٹر فیل لارڈ ڈنیس

"ذرا بتایئے تو سہی!" میں نے اپنی آواز کو جھنجلاہٹ سے تیکھا بناتے ہوئے کہا "ذرا مجھے بتایئے تو سہی کہ گمشدہ جز ہے کیا آخر؟"

انھوں نے پنسل کی نوک سے میری ساری فہرست پر خط نسخ کھینچ دیا اور اس طرح بیک جنبش قلم میرے جواں سال خوابوں کے خانے کو ڈھانے کے بعد تین لفظ لکھ دیے۔

ذہن کا سکون

ایک نادر عطیہ

انھوں نے کہا

یہ ہے وہ عطیہ جسے کہ خدا" خاصان خدا کے لیے بچا کر رکھتا ہے۔ صلاحیتیں اور حسن صورت وہ بہتیروں کو دیدیتا ہے۔ دولت ایک پیش پا افتادہ شے ہے۔ شہرت بھی نادر نہیں۔ لیکن "ذہنی سکون"! — یہ تو اس کی پسندیدگی کا آخری انعام ہے۔ اور اس کی رحمت کی سب سے زیادہ پرشکوہ علامت! — اس کو وہ بڑی احتیاط سے ودیعت کرتا ہے۔ بیشتر لوگ اس نعمت سے کبھی سرفراز نہیں ہوتے کچھ تمام عمر اس کی راہ دیکھتے دیکھتے پیری کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں کہ یہ تحفہ ان پر آسمان سے اتر سکے! —"

انھوں نے گوشۂ چشم سے میری طرف دیکھ کر اندازہ کیا کہ میری نوجوان پیشانی پر شک و شبہ کے آثار ابھر رہے ہیں۔

"یہ کوئی میری خانہ ساز رائے نہیں! — انھوں نے تشریح کی۔ "میں تو مشہور علمائے صحائف مارکوئیس اوریلیس اور لاوزی کے منظوم خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کر رہا ہوں" (اپنی دقت نظر کے نتائج کو قدیم حکماء کی طرف منسوب کرنا ان کا دل پسند شیوہ ہے) "خدا — اس کائنات کا مالک" ان حکیموں میں سے ہر ایک نے کہا "خدا — اس کائنات کا مالک احمقوں کے قدموں میں متاع دنیا کے ڈھیر لگا دیتا ہے۔ لیکن میرے دماغ پر صرف سکون و طمانیت کی شبنم افشانی کرتا ہے — مجھے ایسا ذہن عطا فرماتا ہے جو فکر سود و زیاں سے بلند ہو! —"

زندگی کی سچی منزل مقصود

اپنے عمر دوست کرم فرما کی حکمت و دانائی کو ماحاصل اس وقت مجھے کٹھن لگا۔ لیکن ذاتی تجربوں اور کاروباری مشاہدوں کی ایک چوتھائی صدی نے اس حقیقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا کر چھوڑا کہ ان کے منہ سے جو بات نکلی تھی وہ گویا کہ کوئی الہام تھا! — ہاں میں سمجھ گیا کہ سکون قلب خود خدا کی امتیازی شان ہے اور یہ کہ یہی ہے وہ شے جس کو ہمیشہ

ہی ایک سوچ سمجھی زندگی کی منزل مقصود بنایا جاتا رہا ہے۔ اب میں جانتا ہوں کہ دوسرے تمام تر ساز و سامان کا جو کچھ بھی ماحصل ہے ضروری نہیں کہ اس سے ذہنی سکون کو تقویت ہی حاصل ہو ــــ لیکن دوسری جانب یہ حال ہے کہ میں نے اس باطنی طمانیت کو زر و زمین کی پشت پناہی اور جسمانی صحت کے سہاروں کے بغیر پروان چڑھتے دیکھا ہے۔ آہستہ آہستہ ــــ بڑی دقت کے ساتھ میں نے یہ سبق حاصل کر لیا کہ سکون قلب ایک معمولی سی کٹیا کو عظیم الشان قصر شاہی میں ڈھال سکتا ہے اور اگر یہ سکون موجود نہ ہو تو ایک شاہی پائیں باغ بھی کال کوٹھری بن کر رہ جاتا ہے۔

تلاشِ پیہم

اس لافانی باطنی سکون کے لیے لگاتار اور ہمہ گیر تلاش جاری ہے۔ گوتم بدھ، میمانڈس اور کیمپس کی تعلیمات کی گہرائیوں میں دیکھا جائے تو ہمیں یہ پتہ چلے گا کہ وہ اپنی گوناگوں تعلیمات کی بنیاد ایک وسیع داخلی طمانیت کے اوپر اٹھاتے ہیں۔ کسی بھی زمانے کے کسی بھی عقیدہ و خیال کے پریشان خاطر اور تفکرات سے بوجھل انسانوں کی دعاؤں کا تجزیہ کیا جائے تو وہاں بھی جو آخری ماحصل نکلے گا وہ یہی "نان شبینہ اور باطنی سکون" کی آرزو ہوگی۔ پختہ کار لوگ لاطائل چیزوں کی تمنا نہیں کرتے۔ وہ جب اس وادیِ اشک و آہ میں "زبان و دل کی پکار" بلند کرتے ہیں تو جرأت اور سوجھ بوجھ کی بھیک مانگتے ہیں۔

طمانینت کی ضرورت

خاص طور پر آج کی دنیا میں روتی اور گڑگڑاتی ہوئی انسانی دعائیں جب خدا کی بارگاہ جود و عطا کی طرف بلند ہوتی ہیں تو ان کا دامن طلب سکون و طمانیت ہی کے لیے پھیلا ہوتا ہے ــــ طمانیت و سکون جو ایک مضبوط قلعہ بھی ہے اور ایک مقدس معبد بھی! ــــ اور بات معقول ہے۔ نیا انسان اس تنگ و تاریک نالی میں پڑا ہوا ہے جس کی سرحدیں اس تباہ حال دوزخ سے ملتی ہیں جس کا تصور نہ ڈانٹے کر سکتا تھا نہ ڈورا اس کی تصویر کشی کر سکتا تھا۔ انسان ــــ ایک پر بریدہ طائر ــــ شعوری خدشوں سے کچلا ہوا ــــ جذباتی کشمکش سے نڈھال ــــ معاشی خطروں میں محصور ــــ اور سیاسی تشکیک و بدگمانی سے مغلوب انسان جب تہذیب و تمدن کی شاہراہ سے گزرتا ہے تو ایک خاص قسم کا "نخچیر سادہ" ثابت ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کبھی اس کا طوطی بولتا تھا لیکن اب تو اس پر یہ خوف سوار ہے کہ تقدیر کا تیشہ اس کی گردن زنی کے لیے سان پر رکھا جا رہا ہے۔ وہ کانپ اٹھتا ہے اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ اپنی طرف بڑھتے ہوئے بدقسمتی کے آسیبی سایے کو غرق کر دینے کے لیے وہ "بے پناہ موسیقی اور تیز و تند شراب" کی پکار لگاتا ہے۔ اس صورت حال کے نتیجہ میں وہ "انسان" نمودار ہوتا ہے جس کا خوف نی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نڈھال اور قابل رحم کردا

پر فریک پڑا رہتا ہے۔

حقیقی ضرورت

یہ انسان ڈرکا مارا انسان ادھر ادھر دوڑا پھرتا ہے کہ جان بچانے کی راہ ڈھونڈ نکالے ـــــ کوئی ایسی شئے پا جائے جو اس کو نئے خطرات کے پار لگا دے ــــــــــــــــ اور پرانے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے وہ جرأت عطا کر سکے جس کی اس کو شدید ضرورت ہے۔ اسے جس چیز کی ضرورت ہے (اور ہم سب کو ہی ہے) وہ ایک نئی یقین دہانی کی زبان میں اس کے سوالات کے جوابات کا سیٹ نہیں ـــــ کیونکہ اس نئی یقین دہانی کا کوئی فارمولا سرے سے دنیا میں ہے ہی نہیں ـــــ بلکہ اس کو کہیں زیادہ ضرورت ہے اندرونی توازن کی ـــــ ایک روحانی صلابت کی ضرورت ہے جو ہلاکت انتشار کے خلاف سپر کا کام کر سکے۔

ذہنی سکون کو زندگی کے شور و غوغا سے ایک شاندار فراریت کے مماثل نہ سمجھنا چاہیے اور نہ ہی یہ بقول وحائیٹ ہیڈ "حیاتی تعطل کا ایک منفی تصور ہے" ـــــ یہ تو ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم خوش قسمتی اور بدقسمتی کی کشمکش اور زور آزمائیوں کو سکون و اطمینان کی شان سے برداشت کر سکیں ـــــ نہ صرف سکون و اطمینان بلکہ ایک مخصوص اشتیاق کے ساتھ بھی جو اس یقین و آگہی کی پیداوار ہوتا ہے کہ اس قسم کے موانع راہ ہمیں زندگی کی تخلیقی راہ سے ہٹا نہیں سکتے۔

توازن ـــــ ایک شرط لازم

سنجیدہ فکر سماجی مصلحین پورے اخلاص سے پوچھتے ہیں۔ "کیا آج انسانوں کو سکون قلب کا استحقاق بھی حاصل ہے؟ ـــــ کیا کسی شخص کو اس کا جواز حاصل ہے کہ جب دنیا نئی تعمیر کے لیے اس قسم کے ہنگامے اور اضطراب سے دوچار ہو تو وہ سکون ذہنی کی اس حسین کیفیت کے بارے میں کچھ سوچ بھی سکے؟" ـــــ

ہمارا جواب ہے: ـــــ "سماجی تعمیر نو کی کوئی عمارت تعمیر نو سے محروم افراد کی اینٹوں سے نہیں اٹھائی جا سکتی۔ شخصی عدم توازن کبھی بھی اس قسم کے سماجی استحکام کی منزل تک نہیں لے جا سکتا۔ لہٰذا ذہنی سکون انفرادی اور سماجی توازن کے لیے پہلی شرط لازم ٹھہرا" ـــــ

تعقل ہمیں نہیں بچا سکتا

بلاخوف تردید اور بڑی صفائی سے کہا جا سکتا ہے کہ ذہنی سکون کوئی ایسی شے نہیں جس کو مرعوب بوتلوں میں بند خریدا جا سکے ـــــ "یا جس کو خوشبودار روغن کی طرح جلد کی سطح پر لگا لیا جائے! ـــــ اس کو صبح و شام ... قسم

کی گولیاں کھا کر بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا! ——— اور نہ ہمارے "ہفتہ میں تین بار" والے کسی نصاب میں نام لکھا کر اس کا حصول ممکن ہے۔ میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ ادیبانہ ——— فلسفیانہ اور فنکارانہ تخلیقات کے ساتھ طویل اور گہرا ربط قائم کرنا باطنی سکون میں خصوصی ممد و معاون ہوگا۔ لیکن اس کے بعد مجھے یاد آتا ہے کہ کتنے ہی فنکار اور فضلائے روزگار قابلِ رحم حد تک مضطرب انسان رہے ہیں جن کا اضطراب ہی ان کو بے رحمی کے ساتھ ان کاوشوں کی طرف دھکیلتا رہا ہے جن کے لیے وہ مامور ہوئے تھے۔

نہیں نہیں! ——— تعقل ہمیشہ سکونِ قلب عطا نہیں کرتا۔ گوئٹے کا ہیرو جو کئی پہلوؤں سے موجودہ عہد کے حواس باختہ آدمی کی بہترین تصویر ہے اس نے عرق ریز کاوشوں کے بعد سائنس، فلسفہ اور ریاضی پر عبور حاصل کر لیا تھا ——— مگر ہم جانتے ہیں کہ اس کے باوجود اس کو اپنے سکون و قناعت کے حصول کے لیے بدی کی ناپاک قوتوں سے سودا طے کرنا پڑا تھا! ——

وقتی خواب آور دوائیں

گاہے گاہے جب ہم بیتھوون (BETHOVEN) کی اتھاہ موسیقی کو سنتے ہیں تو ہمیں اک گونہ سکون ملتا ہے، یا شام و شفق کے سائے میں چوپن (CHOPIN) کی محویتِ خیال ہمیں اپنے سے مانوس کر لیتی ہے لیکن یہ محض ہنگامی نشے ہیں اور بس! جب دل کا بوجھ ہماری سکت کی حدوں سے آگے نکل جاتا ہے تو یہ چیزیں ہمیں تھپکی دے کر ——— لوریاں سنا کر سلا دیتی ہیں۔ کچھ خوش نصیب ایسے بھی ہیں جو الگریکو (EL-GRECO) کے تفکر یا کانسٹیبل (CONSTABLE) کے دیہاتی سکون میں ایک کیف و نشاط کا احساس کرتے ہیں ——— اعلیٰ تصاویر کا معنوی خاکہ، تناسب اور رنگ و روغن کا امتزاج بھی سکون و طمانیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن چونکہ ایک مصور پردے پر کسی تصویر کی محض لمبائی چوڑائی (یا زیادہ سے زیادہ موٹائی) ہی دکھا پاتا ہے تو اس کی یہ کاوش اس "روح" کو آسودہ نہیں کر پاتی جو "صد ہزار جہاتی" قسم کی شے ہے!

الکحل

تو پھر ہم کس کی طرف رجوع کریں جو خود اپنے وجود کی گہرائیوں میں سکون پانے کے فن میں ہماری رہنمائی کر سکے؟ الکحل کی طرف نہیں ——— اگرچہ بادہ نوشی کی وبا تہذیبِ حاضر کے بدنما چہرے کا داغ بن کر رہ گئی ہے اور رکھنے منفعلانہ رنگ رکھے رہتی ہے۔ فرائڈی نشے کی طرف بھی نہیں! ——— اگرچہ امریکہ والے روزانہ فرائڈ غلے کے لاکھوں دانے اس لیے ہڑپ کر جاتے ہیں کہ اعصاب پر فرائڈی نشے کی میٹھی میٹھی خماری ہو سکے۔ ہمیں جنسی لذت کوشی میں بھی پانیکا

تقویتِ قلب حاصل نہ ہو سکے گی ـــــ اگرچہ تمام کی تمام حسین فلمیں اور سنسنی خیز رسائل کی بھیڑ ان سرگرمیوں ہی کو حاصل زندگی بنا دینے کے لیے ان میں حسن و جمال پیدا کرنے میں لگی ہوئی ہے ۔

دولت اور شہرت

یقینی بات ہے کہ شہرت کے لیے تگ و دو میں بھی ہم یہ سکون نہ پائیں گے ۔ "شہرت" جو ملٹن کی اصطلاح میں "اعلیٰ دماغوں کی سب سے آخری کمزوری" ہے ! ـــ نہ دولت کا عرق ریزی سے پیچھا کرکے ہی یہ سکون میسر ہو سکے گا ـــ وہی "دولت" جو قطرۂ سیماب کی طرح ہمارے ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان سے نکل بھاگتی ہے ۔ نہ ہی ایک گھنٹہ کی "ایک ہزار مدہوش و جو اس کو شل کرنے والی حقیر چیزوں" کو اپنے سامنے حاضر کرکے ہم طمانیت قلب کا لطف اٹھا سکتے ہیں ۔ کیونکہ اگرچہ وہ ہماری پکار پر ہمارے احساسات کو شل ضرور کر دیتی ہیں ۔ لیکن جیسے ہی ہماری ان ہنگامہ آرائیوں میں ٹھیراؤ پیدا ہوتا ہے پرانی بےچینی پھر اپنی جگہ پلٹ آتی ہے اور آخری حد یہ ہے کہ انسانی محبت کے باہمی بلند تبادلے میں بھی یہ سکون نہیں ملتا ـــ وہی محبت جو ایک ایسا جذبہ ہے کہ جو ہم کو مکمل خوشی کے دھوکے میں ڈالتا ہے (اور کبھی اس دھوکے سے نکال دیتا ہے !) تو کیا اس کے اندر وثوق کے ساتھ ہم کو سکون باطنی کا سراغ مل سکے گا ؟ ـ تو پھر ذہنی سکون کی اس اہم ترین، بنیادی اور بےکراں تلاش میں ہم کس کی طرف نظر اٹھائیں ؟ ـــ کس کے آستانے پر دہائی دیں ؟ کیا وضع اختیار کریں ؟ ـــ اور کن اصولوں کو پکاریں ؟

اپنے اندر جھانک کر دیکھیے

یہ سوالات وسیع ہیں ۔ اور دردمندانہ، پُرخلوص جواب کے مستحق ہیں ۔

اس مسئلے کی کنجی، حس کو استعمال کی کوشش کریں تو بے حد سادہ و سہل ہے، ہمیں میتھو آرنلڈ کی نظم امپیڈوکلس ـــ اِٹینا پہاڑ پر ـ کے اندر دستیاب ہو سکتی ہے ۔

یونانی فلسفی امپیڈوکلس جو الاکھی پہاڑ پر کھڑا ہوا ـــ دل ہی دل میں سرگوشی کرتا ہوا ـــ نیچے پھیلی ہوئی بےقرار دنیا کا جائزہ لیتا ہے ـ انسانی غموں کا تجزیہ کرتا ہے ـ اپنی تمام تر صلاحیتیں اس سوال کو حل کرنے میں لگا دیتا ہے جو آج کی طرح اس وقت بھی انتشار اضطراب کے پردے پر فنا پذیر سکون کے امکان کی تصویر کھینچ رہا ہو ـ

امپیڈوکلس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ انسان خود ہی اپنے مضطرب دکھ درد کا موجد ہے ۔ وہ بڑے سکون و متانت کے ساتھ اعلان کرتا ہے:

"باطنی سکون تو ہمیں مل چکا ہوتا ! ـــ
لیکن ہم اپنے اندر جھانکنے والے کب ہیں ! ـــ "

"لیکن ہم اپنے اندر جھانکنے والے کب ہیں!" اس ایک جملے میں کیا کچھ ہے! ـــ ہماری ہٹ دھرمی کو شاعر کی بے رحمانہ نشتر زنی نے پوست کندہ کر دیا ہے! ہم ان ضدی بیماروں کی طرح ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ہم بیمار ہیں مگر اپنے علاج کے لیے کسی دارو ئے تلخ کو قبول کرنے والے نہیں! کیا ہم کبھی اپنی زرد روئی کو آئینہ دکھاتے ہیں؟ کبھی بھی نہیں۔ اس کنج کاوی کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم اپنے مرض کی علامات کا سراغ اپنی تکلیف کے اندرونی بیمار سرچشمے ـــ اندر ہی اندر پریشاں حال روح میں تلاش کریں۔ یہ وہ بات ہے جس کا ہم تصور تک نہیں کر سکتے! بایں ہمہ جب تک ہم اپنے روگ کی اس طرح نشان دہی نہ کریں گے اس وقت تک شفا کی کوئی امید ہی قائم نہیں کی جا سکتی۔ اور بہت ممکن ہے کہ ہم خود کو ایک ڈرپوک اور خود فریب شخص کی سی "نیم جاں زندگی" کے حوالے کر کے ہی بیٹھ رہیں۔

عملی طور سے یہ بات آسان نہیں کہ ہم اپنے اندر جھانک کر دیکھیں۔ البتہ اس کے اصول اور طریقے ضرور موجود ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک تو ایسا لگتا تھا کہ ان پر مذہب کی اجارہ داری ہو۔ "روحانی مراقبہ" ہمیشہ ہی سے ایک ایسے دروازہ کی طرح رہا ہے جس سے گذر کر خود شناسی کی دنیا میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ جو بھی فکر پسند روح شجر غور و فکر کے سایے میں خود اپنے آپ سے ملاقات کر سکے۔ ایک قیمتی انعام اسی کا انتظار کر رہا ہے۔

جوشوا لوتھ لیبمن

"ذہنی سکون" میں ـــ (سیڈار بکس ـــ ۱۹۵۷ء)

ترجمہ: ش، ن، عثمانی

<u>بقیہ آرڈیننس</u> "مجھے اصل دفعات سے وہی اختلاف ہے جو اس مضمون میں ظاہر کیا گیا ہے لیکن ان دفعات کی وضاحت میں جو امور تحریر فرمائے گئے ہیں ان کے بعض اجزاء سے اتفاق نہیں ہے۔"

مولانا حافظ کفایت حسین، مجتہد ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان لاہور

"مضمون بالا کی بعض جزئیات اگرچہ تفصیل طلب یا غور طلب ہیں مگر اصل مقصد کے لحاظ سے میں اس پورے مضمون سے متفق ہوں۔"

مولانا حافظ محمد عبداللہ روپڑی، متولی جامع قدس اہلحدیث لاہور

تنقید و تبصرہ

اسلام کا نظام قانون

مرتبہ جناب غلام علی صاحب۔ صفحات ۲۲۰ قیمت تین روپیہ بارہ آنے
ناشر: مکتبہ چراغ راہ۔ ۲۳ اسٹریچن روڈ کراچی ۱

تراجم کا یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا بڑا حصہ صفحہ ۲۳ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۱۰ پر ختم ہوا ہے۔ یہ حصہ مصر کے مشہور اخوانی رہنما عبدالقادر عودہ شہید رحمۃ اللہ کی معروف کتاب "الاسلام واوضاعنا القانونیۃ" کا ستھرا اور سلجھا ہوا ترجمہ ہے۔ دوسرے حصے میں پہلے حصے کے مطالب و معانی سے ہم آہنگ چار مضامین کے ترجمے ہیں۔ پہلا مضمون الاستاذ الامام حسن البنا شہید کا ہے۔ دوسرا اور تیسرا دمشق کے لاکالج کے پروفیسر شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء کا ہے اور چوتھا مملکۂ برطانیہ کے کورٹ آف اپیل کے ایک جج سر الفرڈ ڈیننگ کی کتاب "چینجنگ لاء" (بدلتا ہوا قانون) کے آخری باب کا ترجمہ ہے۔ اس طرح یہ مجموعۂ تراجم قیمتی اور مفید بن گیا ہے۔ اس کتاب سے ہر وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اسلامی نظام قانون کی افادیت اور اس کے مزاج و ذہنیت کو سمجھنا چاہتا ہو۔ کھلے اور صاف ذہن کے ساتھ جو شخص بھی اس کتاب کو پڑھے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسلامی قانون کی برتری کا خیال محض اندھی تقلید کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر تشفی بخش دلائل موجود ہیں اس پر یہ بات بھی مخفی نہ رہے گی کہ مذہبی اصول و عقائد سے الگ ہو کر مغرب نے جو قانون سازی کی ہے وہ حد درجہ ناقص اور مضر ہے۔ مذہب سے آزاد قانون سازی، مغربی مفکرین کے جوش انتقام کا نتیجہ تھا اس کی کوئی معقول بنیاد موجود نہ تھی اور یہ بات تو پڑھنے والے کو انتہائی عبرت ناک نظر آئیگی کہ مصر جیسے ملک کے سربراہوں نے اسلامی قانون کی موجودگی میں، مغربی قوانین کو ترجیح دی، جہالت اور نفس پرستی کی یہ ایک روح فرسا صورت حال ہے۔ اس مجموعے میں آخری مضمون بھی خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اس مضمون کے خاتمے کی ایک عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے۔

"لارڈ کوک نے بریکٹن کا حوالہ دیتے ہوئے (جیمز اول سے) کہا "بادشاہ کسی آدمی کا محکوم نہیں مگر وہ خدا اور قانون کا محکوم ہے۔" بریکٹن کے جو الفاظ یہاں مستعار لئے گئے تھے کوک نے نقل کیے تھے یہ در حقیقت ...

دستور کا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہیں۔ خدا اور قانون سے بادشاہ کے بالاتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ قانون کے ماتحت ہے ہمارے قانون داں جب یہ دستوری کلیہ بیان کرتے تھے تو وہ دراصل اپنا ایک مذہبی عقیدہ دہرا رہے ہوتے تھے۔ اگر ہم اس عقیدے کو فراموش کر بیٹھیں تو ہمارا انجام کیا ہو گا اور اس خود فراموشی کی زد کہاں کہاں جا کر پڑے گی اس کے دور رس نتائج و عواقب کا مشاہدہ کرنے کے لیے آپ ایک نظر اٹھا کر دنیا کی آمرانہ ریاستوں کو دیکھ لیں۔ وہاں ریاست کو فرد پر مقدم قرار دے کر فرد کے وجود کو ریاست میں گم کر دیا گیا ہے وہاں شہری ریاست کے لیے زندہ ہے نہ کہ ریاست شہری کے لیے۔ وہاں کے حکمراں خدا اور قانون کے تابع نہیں ہیں وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ہیں۔ فرد کی آزادی کی حقیقت خواب و خیال سے بھی کم تر ہے۔ ایسی ہولناک مطلق العنانی اور استبداد کے خلاف اور حیات انسانی پر ایسے مہیب آہنی تسلط کے خلاف ہمارا مذہب پورے زور اور پوری قوت کے ساتھ احتجاج کرتا ہے۔ (صفحہ ۲۰۹)

اس وقت پاکستان جس دور سے گزر رہا ہے اس میں اس طرح کی کتابیں ان لوگوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہو سکتی ہیں جنھوں نے اپنی آنکھوں پر پٹیاں نہ باندھی ہوں۔ (ع۔ق)

فسادات جبل پور و ساگر اور اس کے بعد

ابوالنعیم حیدرآبادی۔ صفحات ۲۰۸ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط قیمت دو روپیہ۔ ناشر: مکتبہ الہلال اٹالہ — الٰہ آباد ۳

جناب ابوالنعیم حیدرآبادی صاحب اپنی مرتب کردہ کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"ہم نے کوشش کی ہے کہ فسادات جبل پور کے بارے میں ذمہ دارانہ بیانات و تاثرات کو آپ کے سامنے پیش کریں .... اس کتاب کے شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ ابھی اس ملک میں خیر اور انسانیت زندہ ہے اور ظلم کو ظلم کہنے اور ہماری ہمدردی کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔"

جبل پور، ساگر اور وہاں کے دوسرے مقامات پر اکثریت نے مسلمان اقلیت کے ساتھ کیا سلوک کیا اس کا ایک اجمالی خاکہ یک جا اس کتاب میں مل جاتا ہے۔ مرتب نے اس طرح کے فسادات کے انسداد کی کچھ تدابیر بھی بتائی ہیں۔ امید ہے کہ لوگ اس کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے۔ (ع۔ق)

"میثاق" کی اشاعت میں التواء

چونکہ میثاق کو اس کے مخصوص معیار پر جاری رکھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس کا موجودہ پالیسی تبدیل نہ ہو جائے۔ اس وجہ سے پالیسی کی تبدیلی تک اس کی اشاعت مجبوراً ملتوی رہے گی۔ کوشش ہو رہی ہے کہ یہ پالیسی جلد سے جلد تبدیل ہو جائے۔ — مدیر ماہنامہ میثاق لاہور

بقیہ اشارات

وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ (بقرۃ ر ۳)

ایک ہی سورۃ بنالاؤ اور ایک اللہ کو چھوڑ کر اپنے تمام حمایت کرنے والوں کو مدد کے لیے بلالو اگر تم سچے ہو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کرسکتے تو اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن انسان اور پتھر بنیں گے، جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے

یہاں بھی تحدی کے ساتھ زوردار پیشین گوئی کی گئی ہے کہ تم ہرگز ایسا کلام پیش نہیں کرسکیں گے ـــــ نبوت محمدی کے منکرین ایک طرف اس بات کے مدعی تھے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ انسان کا کلام ہے إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (مدثر) اور دوسری طرف الزام کو مضبوط کرنے کے لیے یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ اگر ہم چاہیں تو ایسا کلام ہم بھی پیش کرسکتے ہیں۔ وَلَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا (انفال) اور اگر ہم چاہیں تو ایسی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں۔ لیکن جب ان کو چیلنج دیا گیا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو قرآن جیسی کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورہ ہی بنا کر لے آؤ تو فصاحت و بلاغت، پرزور و پراثر خطابت، فلسفیانہ انداز، شاعری اور مدعیانہ زباں آوری کے باوجود ساری شیخی دھری رہ گئی اور کوئی بات بنائے نہ بنی

اس چیلنج پر تقریباً چودہ سو سال گزر چکے ہیں اور یہ آج بھی اسی طرح لاجواب ہے جس طرح اس وقت تھا اور ہمیں یقین ہے کہ یہ قیامت تک اسی طرح لاجواب رہے گا ـــــ اگر انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی کائنات جیسی کوئی کتاب بنا ڈالے تو اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی کتاب جیسی کوئی کتاب تصنیف کرلے۔ اگر انسان کا اختیار اور قدرت، خدا کے اختیار و قدرت کا مقابلہ نہیں کرسکتی تو اس کا علم اور اس کی حکمت خدا کے علم و حکمت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ بندہ اگر خدا بننا چاہے تو وہ خدا نہیں ہوسکتا، ہاں اپنی اس متکبرانہ حماقت کی پاداش میں چیونٹیوں کی طرح پامال ضرور ہوسکتا ہے۔ قرآن اللہ کے دفتر علم و حکمت کا شاہکار ہے ظلوم و جہول انسان کی کیا مجال کہ وہ اس ہی شاہکار کے مقابلے میں کوئی چیز پیش کرسکے۔ (باقی)

ماہنامہ "چراغ راہ" کراچی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی نے کوئی وجہ بتائے بغیر ماہنامہ چراغ راہ کو نیا ڈکلریشن دینے سے انکار کردیا ہے۔ ہم قانونی چارہ جوئی کر رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اس میں ناکامی ہوئی تو جن خریداروں کا چندہ ہمارے پاس جمع ہے ان کے بقایا کی ادائیگی کا انتظام کر دیا جائے گا۔ امید ہے کہ ناظرین چراغ راہ ہماری مجبوری کا لحاظ کریں گے۔

ـــــ ناظم ادارہ چراغ راہ کراچی

مندرجات ماہنامہ "زندگی"

کی

محرم الحرام ۱۳۶۸ھ سے ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ تک
نومبر ۱۹۴۸ء سے جون ۱۹۶۱ء تک

ماہنامہ زندگی نے تیرہ سال کی مدت میں جو کچھ پیش کیا ہے اس کی اہمیت و افادیت سے قارئینِ زندگی واقف ہیں اس پوری مدت کی یہ فہرست بھی متعدد پہلوؤں سے مفید ہے۔ مندرجات میں "اخبار و افکار" اور "تنقید و تبصرہ" کی فہرست کی اشاعت ضروری نہیں سمجھی گئی۔

امید ہے کہ "زندگی" کے قدردان اس محنت کی قدر کریں گے۔

سید احمد عروج قادری

اشارات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	صفحہ
	مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی	مولانا محمد میاں صاحب کے ایک مضمون سے متعلق	۶	۵	۲
		انتخابات کے مسئلے پر (۶)	۶	۶	۲
		مولانا محمد منظور نعمانی کے مضمون "جماعت اسلامی اور	۷	۱ و ۲	۲
		اس کے خلاف فتوے" پر اظہار خیال		″	۴۳
		مرض مایوسی کا علاج (سابقہ اشارات سے متعلق)	۷	″	۴۳
		مرض خوف وہراس کا علاج	۷	۳	۲
		پاکستان جانے والوں کے عذر تنگی معاش پر اظہار خیال	۷	۴	۲
		مستقل امراض ملی	۷	۵	۲
		زمانہ سازی اور وحدت ادیان	۷	۶	۲
		متحدہ قومیت	۸	۱	۲
		ہمارا واقعی مقصد کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے	۸	۲	۲
		"رامپور منکریس" کے ادارے پر شرعی نقطہ نظر سے اظہار خیال	۸	۳	۲
		سیکولرزم پر اظہار خیال	۸	۴	۲
		امرت پتریکا کے مضمون اور اس کے اثرات مابعد پر اظہار خیال	۸	۵	۲
		مذہبی اوقاف کے نظم میں حکومت کی مداخلت سے متعلق	۹	۱	۲
		بمبئی ہائی کورٹ کے فیصلے پر اظہار خیال			
		ایک رفیق کے خط کی بعض عبارت پر تنقید کا جواب	۹	۲	۳
		موجودہ نظام تعلیم پر اظہار خیال (۱)	۹	۳ و ۴	۲
		گزشتہ سے پیوستہ (۲)	۹	۵	۲
		دوسری جماعتوں اور اداروں پر جماعت اسلامی کی	۹	۶	۲
		تنقید کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے			
		گجرات میں شدھی کی تحریک مختلف و متضاد جزروں کا	۱۰	۱	۲

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	صفحہ
		تجزیہ اور کچھ مشورے (۱)			
		گزشتہ سے پیوستہ (۲)	۱۰	۲	۲
		مولانا مودودی کے ایک مضمون کی روشنی میں پاکستان کے حالات کا جائزہ	۱۰	۳	۲
		پارلیمنٹ میں جماعت اسلامی ہند سے متعلق سوال جواب پر اظہار خیال (۱)	۱۱	۱	۲
		گزشتہ سے پیوستہ (۲)	۱۱	۲	۲
		پاکستان کے زیر ترتیب دستور وغیرہ پر پنڈت نہرو کے بیان اور پاکستانی لیڈروں کے احتجاج کا جائزہ	۱۱	۳	۲
		دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں رفقاء کو ہدایات (۱)	۱۱	۴	۲
		گزشتہ سے پیوستہ (۲)	۱۱	۵	۲
		تدارکی نظر بندی ایکٹ کے تحت گرفتاری ایک سال کے بعد رہائی کے بعد حکومت کے رویے پر اظہار خیال اور دعوت اسلامی و طریقہ کار کی مزید وضاحت (۱)	۱۳	۵	۲
		گزشتہ سے پیوستہ (۲)	۱۳و۱۴	۶ و ۱	۲
		جماعت اسلامی کے ساتھ مسلم پریس اور مسلم زعماء کے رویے پر اظہار خیال (۳)	۱۴	۲ و ۳	۲
		عام مسلمانوں کے رویے پر اظہار خیال (۴)	۱۴	۴ و ۵	۲
		رفقاء سے خطاب (۵)	۱۵	۴	۲
		گزشتہ سے پیوستہ (۶)	۱۵	۵	۲
		" (۷)	۱۵	۶	۲
		الکشن سے متعلق اپنے مسلک کی توضیح	۱۶	۶	۲

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوعِ بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	صفحہ
		جماعت اسلامی کی گزشتہ تاریخ، موجودہ کوائف اور اس کے مقصد و طریقہ کار کے بارے میں مختصر توضیح	۱۸	۲ و ۳	۲
		علمائے دیوبند کی مخالفت کے سلسلے میں اپنی روش مختار کی کچھ تفصیل	۱۸ و ۱۹	۶ و ۱	۲
		لکھنؤ مسلم کنونشن پر اظہارِ خیال	۱۹	۴ و ۵	۲
		لکھنؤ مسلم کنونشن کے ضمن میں مسلمانوں کی تنظیم کے مسئلے پر اظہار خیال	۱۹ و ۲۰	۶ و ۱	۲
		جماعت اسلامی پاکستان کے چند ارکان کے استعفے اور اس سلسلے میں مولانا منظور نعمانی کے بیان پر تبصرہ (۱)	۲۰	۲	۲
		گزشتہ سے پیوستہ (۲)	۲۰	۳	۲
		" (۳)	۲۰	۴ و ۵	۲
		کیرلا میں کانگرس اور دوسری پارٹیوں اور مسلم لیگ کے متحدہ محاذ پر اظہار خیال	۲۳	۱	۲
۲	مولانا حامد علی	اجرائے زندگی کا ابتدائیہ۔ اشاعت کے مقاصد	۱	۱	۲
		مسلمان قوم کا مختصر جائزہ (۱)	۱	۲	۲
		گزشتہ سے پیوستہ تیز حال کی تدابیر (۲)	۱	۳	۲
		گاندھی جی کے حادثہ قتل پر تبصرہ	۱	۴	۲
		شری پرشوتم داس ٹنڈن اسپیکر یوپی اسمبلی کی تقریر کے ایک حصے پر تبصرہ	۱	۵	۲
		پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد پاس کی تھی۔ اس پر تبصرہ	۱	۶	۲

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	صفحہ
		جلد اول کے خاتمے پر اظہار تشکر، رفقاء سے تعاون کی طلب اور کتاب و سنت سے استفادے کی نصیحت	۲	۱	۲
		اصلاح کی تدبیر کتاب و سنت کی روشنی میں	۲	۲	۲
		رمضان، تربیت کا مہینہ	۲	۳	۲
		چین میں اشتراکیوں کی فتوحات اور اس کے اثرات پر تبصرہ	۲	۴	۲
		عید الاضحیٰ	۲	۵	۲
		دوسری جلد کے خاتمے پر ادائے تشکر اور رفقاء سے تعاون کی درخواست	۲	۶	۲
		کمیونزم پر اظہار خیال	۳	۱	۲
		کمیونزم کو روکنے کی تدابیر	۳	۲	۲
		سیرت رسول اور ہم	۳	۳	۲
		قوموں کا عروج و زوال (۱)	۳	۴	۲
		گزشتہ سے پیوستہ (۲)	۳	۵	۲
		خیر و شر کی کش مکش پر تبصرہ کرتے ہوئے داعیانِ خیر و صلاح کی روش پر اظہار خیال	۱۰	۴	۲
		صحیح مقصد زندگی کا بیان اور رفقاء کو نصیحت	۱۰	۵ و ۶	۲
		پاکستان میں اسلامی دستور کے پاس ہونے پر تبصرہ	۱۶	۱	۲
		حکومت ہند نے گوتم بدھ کی ۲۵۰۰ ویں برسی منائی تھی اُس پر تبصرہ	۱۶	۳	۲
		عالم انسانی کی سب سے بڑی ضرورت اس کی صحیح رہنمائی ہے	۱۷	۴ و ۵	۲
		دین کے پانچ اساسات میں حج کا مقام	۱۸	۴ و ۵	۲
		فضا میں مصنوعی چاند چھوڑنے پر پنڈت نہرو کے تاثرات اور ان پر تبصرہ	۱۹	۲	۲

اشارات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	صفحہ
۴	مولانا صدر الدین اصلاحی	مولانا ابواللیث صاحب اور دوسرے رفقاء کی گرفتاری کے بعد حکومت کے برتاؤ کی تفصیل	۱۱	۶	۲
		انفرادی و جماعتی آزمائشوں کے فوائد و مصالح	۱۴	۶	۲
		ہندوستان کے ارباب دین اور ارباب سیاست کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ یہ دونوں قول و عمل کے سخت تضاد میں مبتلا ہیں اور اس ملک میں تحریک اسلامی کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے	۱۵	۱	۲
		دینی حلقوں کی طرف سے جماعت کی مخالفت کی علت	۱۵	۲ و ۳	۲
		بھوپال میں جماعت کے تین ارکان اور ایک ہمدرد کی گرفتاری اور انتظامی نظر بندی ایکٹ پر تبصرہ	۱۶	۲	۲
		تحریک اسلامی کے عروج و زوال کے عوامل (۱)	۱۶	۴ و ۵	۲
		گزشتہ سے پیوستہ (۲)	۱۶	۶	۲
		" (۳)	۱۷	۱ و ۲	۲
۵	جناب سید عبدالقادر حیدرآبادی	مولانا صدر الدین صاحب کی گرفتاری کے بعد رفقاء کو ابتلا و آزمائش کے محاذ پر ثابت قدمی کی نصیحت (۱)	۱۲	۱ و ۲	۲
		گزشتہ سے پیوستہ (۲)	۱۲	۳ تا ۶	۲
۶	سید احمد عروج قادری	ایمان و استقامت سورہ مومن کے "رجل مومن" کے واقعات سے استشہاد کرتے ہوئے داعیان حق کے لیے استقامت کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے	۲۵	۳	۲

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	صفحہ
		حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا اصل کارنامہ	۲۵	۴	۲
		توحید دین اسلام کی اصل ہے اور دیگر تمام عقائد اس اصل کی فرع ہیں	۲۵	۵	۲
		جماعت اسلامی ہند کے سالانہ اجتماع دہلی کے تاثرات	۲۶	۱	۲
		رسالت (۱)	۲۶	۲	۲
		گزشتہ سے پیوستہ (۲)	۲۶	۳	۲
		رمضان کی تربیت سے ہم کیا فائدے حاصل کرسکتے ہیں	۲۶	۴	۲
		پاکستان کی موجودہ حکومت نے میراث اور نکاح و طلاق کے جس قانون کی منظوری دی ہے اس کی غیر اسلامیت پر اشارے اور نفاذ سے پہلے چند گزارشات پر غور کی دعوت	۲۶	۵	۲
		رسالت (۳)	۲۶	۶	۲
۷	جناب وحید الدین خاں صاحب	کیرلہ میں کمیونسٹ حکومت کی ناکامی پر تبصرہ	۲۳	۲	۲
		ثابت کیا گیا ہے کہ روسی راکٹ کے چاند پر پہنچ جانے سے کسی مذہبی عقیدے کی تردید نہیں ہوتی اور اس سے مذہب کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا	۲۳	۳	۲
		بھارت پر چینی حملے کے بعد پارلیمنٹ میں پنڈت نہرو نے تقریر کی تھی اس کے بعض جملوں کو موضوع بحث بنا کر ہند چینی تعلقات پر مفصل گفتگو اور اس واقعہ سے جو سبق ملتا ہے اسے اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے	۲۳	۶	۲
		آریہ سماج کے ایک جلسہ کی مختصر روداد اور آریہ سماجی مقرر کی مذہبی اتحاد کی تجویز پر اسلامی نقطہ نظر سے تبصرہ	۲۴	۱	۲
		آغا دیر (مراکش کا ایک شہر) کے زلزلے کی تفصیلات	۲۴	۲ و ۳	۲

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	صفحہ
		پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ اس میں ہمارے لیے کیا صحیح تعلیم			
		"ہمیں کیا کرنا ہے"	۲۴	۴ و ۵	۲
		ترقی کس چیز کا نام ہے اور قربانی کی حقیقت کیا ہے	۲۵	۱	۲
		خاندانی منصوبہ بندی	۲۵	۲	۲
		"مذہب فی الحقیقۃ کس چیز کا نام ہے"	۲۵	۶	۲

تفسیر آیات

نمبر شمار	لکھنے والے	سورتیں اور آیتیں	جلد	شمارہ	صفحہ
۱	مولانا حامد علی	دعوت القرآن			
	؍؍	ازابتدائے سورہ بنی اسرائیل تا آیت ۱۰	۱	۱	۹
	؍؍	بنی اسرائیل از آیت ۱۱ تا ۲۲	۱	۲	۵
	؍؍	؍؍ از آیت ۲۳ تا ۳۰	۱	۳	۵
	؍؍	؍؍ از آیت ۳۱ تا ۳۹	۱	۴	۲
	؍؍	؍؍ از آیت ۴۰ تا ۵۲	۱	۵	۹
	؍؍	؍؍ از آیت ۵۳ تا ۶۰	۱	۶	۹
	؍؍	؍؍ از آیت ۶۱ تا ۷۰	۲	۱	۷
	؍؍	؍؍ از آیت ۷۱ تا ۸۱	۲	۲	۹
	؍؍	؍؍ از آیت ۸۲ تا ۹۶	۲	۳	۹
	؍؍	؍؍ از آیت ۹۷ تا ختم سورہ	۲	۴	۱۹

نمبر شمار	لکھنے والے	سورتیں اور آیتیں	جلد	شمارہ	صفحہ
	مولانا حامد علی	سورہ کہف از ابتدا تا آیت ۱۶	۲	۵	۹
	"	" از تا ۲۱	۲	۶	۵
	"	" از آیت ۲۲ تا ۲۸	۳	۱	۵
	"	" از آیت ۲۹ تا ۳۱	۳	۲	۱۰
	"	" از آیت ۳۲ تا ۴۴	۳	۳	۷
	"	" از آیت ۴۵ تا ۴۹	۳	۴	۹
	"	" از آیت ۵۰ تا ۵۳	۳	۶	۹
	"	" از آیت ۵۴ تا ۵۹	۴	۱	۹
۲	مولانا شمس الدین شمس پیرزادہ	قرآن حکیم اور مرد مومن۔ سورہ زمر آیت ۲۳	۱۹ و ۲۰	۶ و ۱	۱۲
۳	مولانا صدرالدین اصلاحی	تیسیر القرآن			
	"	سورۂ فاتحہ و سورۂ بقرہ از ابتدا تا آیت ۵	۴	۴ و ۵	۱۲
	"	سورۂ بقرہ از آیت ۶ تا ۲۵	۴	۶	۷
	"	" از آیت ۲۶ تا ۲۹	۵	۱	۹
	"	" از آیت ۳۰ تا ۳۴	۵	۲	۹
	"	" از آیت ۳۵ تا ۳۹	۵	۳	۱۲
	"	" از آیت ۴۰ تا ۴۶	۵	۴	۸
	"	" از آیت ۴۷ تا ۶۱	۵	۵	۹
	"	" از آیت ۶۲ تا ۷۴	۵	۶ و ۱	۸
	"	" از آیت ۷۵ تا ۸۶	۶	۵	۹
	"	" از آیت ۸۷ تا ۱۰۳	۷	۱ و ۲	۱۷
	"	" از آیت ۱۰۴ تا ۱۱۵	۷	۳	۹
	"	" از آیت ۱۱۶ تا ۱۲۹	۷	۴	۱۳

نمبر شمار	لکھنے والے	سورتیں اور آیتیں	جلد	شمارہ	صفحہ
	مولانا صدرالدین اصلاحی	سورہ بقرہ از آیت ۱۳۰ تا ۱۴۱	۷	۵	۹
	"	" از آیت ۱۴۲ تا ۱۵۲	۷	۶	۱۷
	"	" از آیت ۱۵۳ تا ۱۶۷	۸	۱	۷
	"	" از آیت ۱۶۸ تا ۱۷۷	۸	۲	۹
	"	" از آیت ۱۷۸ تا ۱۸۶	۸	۳	۹
	"	" از آیت ۱۸۷ تا ۱۹۵	۸	۴	۹
	"	" از آیت ۱۹۶ تا ۲۰۷	۸	۵	۹
	"	" از آیت ۲۰۸ تا ۲۱۴	۹	۱	۹
	"	" از آیت ۲۱۵ تا ۲۲۲	۹	۲	۹
	"	" از آیت ۲۲۳ تا ۲۳۱	۹	۳ و ۴	۱۴
	"	" از آیت ۲۳۲ تا ۲۳۹	۹	۵	۱۵
	"	" از آیت ۲۴۰ تا ۲۵۱	۹	۶	۹
	"	" از آیت ۲۵۲ تا ۲۵۷	۱۰	۱	۹
	"	" از آیت ۲۵۸ تا ۲۶۷	۱۰	۲	۹
	"	" از آیت ۲۶۸ تا ۲۷۵	۱۰	۳	۹
	"	" از آیت ۲۷۶ تا ۲۸۳	۱۰	۴	۹
	"	" از آیت ۲۸۴ تا ختم سورہ	۱۰	۵ و ۶	۹
۴	جناب وحیدالدین خاں صاحب	مطالعہ قرآن			
	"	مومن اور منافق۔ سورۂ حدید آیت ۱۲ تا ۱۵	۲۱	۲ و ۳	۱۳
	"	بڑی کامیابی۔ سورۂ صف آخری رکوع	۲۱	۴ و ۵	۲۰
	"	مومن کی معاشی زندگی۔ سورۂ جمعہ کی آخری تین آیتیں	۲۱ و ۲۲	۶ و ۱	۱۵

نمبر شمار	لکھنے والے	سورتیں اور آیتیں	جلد	شمارہ	صفحہ
	جناب وحید الدین خاں صاحب	سورۃ القدر	۲۶	۳	۹

ارشادات

نمبر شمار	شارح	مضمونِ احادیث	جلد	شمارہ	صفحہ
۱	مولانا حامد علی	خدا اور بندے کا باہمی رابطہ	۱۱	۲	۱۷
	"	قرب الٰہی اور اس کے حصول کے طریقے	۱۱	۳	۹
	"	ذکر الٰہی اور اس کے ثمرات	۱۱	۴	۹
	"	شدتِ احساسِ معصیت و خوف نفاق	۱۱	۵	۹
	"	استغفار و توبہ	۱۱	۶	۹
	"	اخلاص و احتساب	۱۳ و ۱۴	۶ و ۱	۹
	"	ریا اور اخلاص نیت۔ حسن نیت اور اس کے ثمرات	۱۴	۲ و ۳	۹
	"	ایمان۔ اسلام۔ احسان	۱۶	۳	۹
	"	شرک اور توحید	۱۶	۴ و ۵	۹
	"	شرک اور اس کے مظاہر	۱۶	۶	۹
	"	توحید اور اس کے تقاضے	۱۸	۴ و ۵	۹
	"	صفات باری تعالیٰ	۱۹	۲	۹
	"	صفات الٰہی اور اس کے مقتضیات	۱۹ و ۲۰	۶ و ۱	۲۰
		رمضان المبارک اور اس کے روزے	۲۲	۲	۱۷
۲	مولانا شمس الدین شمس پیرزادہ	خلوص و خیر خواہی	۲۴	۴	۲۱
	"	امت کو وصیت	۲۵	۳	۹

مقالات

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۳	مولانا ابوبکر اصلاحی	کیا حضرت احمد شہید جمہوری لادینی نظام کے داعی تھے؟	۱۸	۲ و ۳	۴۳
	"	توبہ و استغفار	۲۲	۶	۱۷
	"	احتساب	۲۳	۱	۱۷
	"	حق کا غلبہ	۲۴	۴ و ۵	۷۹
۴	مولانا ابوداؤد دھنفری	اسلام میں انضباط کی اہمیت	۱۳	۱	۲
۵	سید ابوالعرفان مظاہری	ایک تہذیبی انقلاب کی ضرورت	۴	۱	۳۹
	"	برصغیر ہند میں امت مسلمہ کا مستقبل	۱۰	۲	۳۵
۶	جناب ابومحمد امام الدین رام نگری	اسلام کا معیار شرف و امتیاز (۱)	۴	۴ و ۵	۷۱
	"	" (۲)	۴	۶	۲۷
	"	تاریخ دعوت اسلام کا ایک زریں ورق (۱)	۵	۳	۲۷
	"	" (۲)	۵	۴	۱۵
	"	پنر جنم یا مسئلہ تناسخ	۱۸ و ۱۹	۱ و ۲	۶۲
	"	دو ہندی کتابوں کا تعارف (۱)	۱۹	۴ و ۵	۸۹
	"	" (۲)	۱۹ و ۲۰	۱ و ۲	۷۰
	"	" (۳)	۲۰	۴ و ۵	۵۳
	"	حیات بعد الممات کے عقیدے پر ایک نظر (۱)	۲۰ و ۲۱	۱ و ۲	۴۶
	"	" (۲)	۲۱	۲ و ۳	۹۳
	"	" (۳)	۲۱	۴ و ۵	۲۵
	"	ہندو مذہب کا عقیدۂ خدا	۲۱ و ۲۲	۱ و ۲	۵۴
	"	تصوف اور صوفیت (۱)	۲۲	۲	۳۱
	"	" (۲)	۲۲	۳	۳۰

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۱۰	احسن مظہری	کیا موجودہ انسانی آبادی ایک خاندان کی صورت اختیار کرسکتی ہے	۳	۳	۲۶
	"	ایمان باللہ کی افادیت	۴	۳	۳۸
۱۱	مولانا شیخ احمد ناندیری	والدین کے اہم ترین فرائض	۴	۲	۲۶
		خدائی آزمائشوں کی حقیقت	۱۱	۶	۲۳
		دعا اور اس کی حقیقت	۱۲	۱ و ۲	۹
۱۲	مولانا محمد اسمٰعیل مدراسی	حدیث اور نقد داخلی	۱۸ و ۱۹	۱ و ۶	۱۰۰
۱۳	قاضی محمد اشفاق	اسلامی سیاست کے بنیادی اصول	۱۳	۲ و ۳	۳۹
۱۴	سید اصغر علی عابدی	ہندستان دوراہے پر (۱)	۵	۱	۲۵
		" (۲)	۵	۲	۴۳
		" (۳) تمام شد	۵	۳	۳۵
		کیا بھارت کی نجات سیکولرزم میں ہے؟ (۱)	۹	۱	۱۹
		" (۲) تمام شد	۹	۲	۲۳
		اسلامی نظام کیا ہے (۱)	۹	۵	۳۵
		" (۲) تمام شد	۹	۶	۲۲
		کلچر کا مسئلہ اور بھارت (۱)	۱۲	۳ تا ۶	۸۱
		" (۲)	۱۳	۲ و ۳	۵۴
		" (۳)	۱۳	۵	۴۹

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۱۴	سید اصغر علی عابدی	کلچر کا مسئلہ اور ہمارت (۴)	۱۵	۲ و ۳	۸۰
		" (۵)	۱۵	۶	۹
		" (۶) ناتمام	۱۷	۱ و ۲	۳۷
۱۵	حکیم مولوی افتخار الحق	فریب نفس	۱	۵	۳۶
۱۶	جناب اکرام الدین احمد	روسی اشتراکیت	۱۰	۱	۳۵
	"	(سرمایہ داری کا ایک نیا روپ)			
	"	مادہ پرستی سے زندگی کے مسائل حل نہیں ہو سکتے	۱۰	۵ و ۶	۶۷
	"	ضابطۂ حیات اور سائنس	۱۱	۱	۱۰۸
	"	مسئلۂ ارتقاء (۱)	۱۵	۱	۹
	"	" (۲)	۱۵	۲ و ۳	۳۷
	"	" (۳)	۱۵	۴	۳۱
	"	" (۴) ناتمام	۱۵	۵	۹
۱۷	سید آل رسول	عالمگیر اخوت کا نظریہ اور اس کا حصول	۱۳	۲ و ۳	۹۷
۱۸	امان اللہ خاں عاصی ضیائی	اٹھاؤ چرخا بوندیں آئیں	۱	۶	۴۰
۱۹	انور اعظمی	دین میں تحریف	۵	۱	۳۰
	"	تحریک اسلامی کا انقلابی طریقۂ کار	۵	۵	۲۶
	"	تحریک اور تعمیر افراد (۱)	۵ و ۶	۶ و ۱	۴۴

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۱۹	انور اعظمی	تحریک اور تعمیر افراد (۲)	۶	۵	۴۹
	″	(۳) ناتمام	۶	۶	۲۱
۲۰	انور علی خاں سوز	خوراک سے زائد ذخیرے	۱	۱	۴۵
	″	حشر اجساد	۲	۲	۲۳
۲۱	اے' احسن زیدی	کچھ مسلمانوں سے	۱	۴	۳۱
۲۲	مولانا محمد ایوب اصلاحی	والدین کا احترام و ادب	۳	۳	۲۳
	″	ایمان اور عمل صالح	۱۱	۲	۳۳
	″	داعیٔ حق کا طریق خطاب	۱۳	۱	۹
	″	تعاون	۱۳	۲ و ۳	۲
	″	عدل	۱۳	۵	۱۷
	″	تن آسانی یا جاں فشانی	۱۶	۲	۴۵
۲۳	مولانا جلیل احسن ندوی	فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم	۱	۲	۲۷
		داعیانِ حق کے اوصاف	۹	۵	۲۵
		ایک آیت قرآنی کا صحیح مفہوم	۱۱	۵	۲۲
		داعیانِ حق اور خدا کی نصرت سے مایوسی؟	۱۷	۴ و ۵	۴۹
۲۴	مولانا جلال الدین انصر عمری	صبر و توکل کی تعلیم کا قرآنی اسلوب	۱۳	۵	۹
	″	مطالعۂ فطرت انسانی (۱)	۱۳ و ۱۴	۶ و ۱	۴۱

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۲۴	مولانا جلال الدین انصر عمری	مطالعہ فطرت انسانی (۲) تمام شد	۱۴	۲ و ۳	۸۷
	"	اسلامی معاشرے کی بنیادیں اور ان کے نتائج (۱)	۱۶	۲	۹
	"	(۲)	۱۶	۳	۳۳
	"	(۳) تمام شد	۱۶	۴ و ۵	۳۳
	"	اسلام کا شورائی نظام (۱)	۱۷	۴ و ۵	۷۸
	"	" (۲)	۱۷	۶	۹
	"	(۳)	۱۸	۱	۹
	"	اسلام کا عائلی نظام (۱)	۱۸	۲ و ۳	۹
	"	" (۲)	۱۸	۴ و ۵	۳۳
	"	" (۳) تمام شد	۱۸ و ۱۹	۶ و ۱	۹
	"	جنسی بے راہ روی کا انسداد (۱)	۱۹	۲	۳۳
	"	" (۲) تمام شد	۱۹	۳	۴۶
	"	پردہ قرآن و حدیث کی روشنی میں (۱)	۲۰	۲	۲۵
	"	" (۲) تمام شد	۲۰	۳	۱۷
	"	عورت اسلامی معاشرے میں (۱)	۲۱	۴ و ۵	۶۹
	"	" (۲)	۲۱ و ۲۲	۶ و ۱	۶۶
	"	" (۳)	۲۲	۳	۱۶
	"	" (۴)	۲۲	۴	۱۹
	"	" (۵)	۲۲	۵	۴۵
	"	" (۶)	۲۳	۲	۱۵
	"	عورت اور جدید نظریات	۲۳	۳	۱۵
	"	جنسی تعلقات	۲۳	۴ و ۵	۱۴

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
	مولانا جلال الدین انصر عمری	انسان کے مسائل	۲۳	۴ و ۵	۸۳
	"	اسلام سے بغاوت کے اسباب	۲۳	۶	۱۸
	"	اسلام کے عقائد و نظریات	۲۴	۲ و ۳	۵۱
	"	انسانی تعلقات	۲۴	۴ و ۵	۲۸
	"	خدا کا قانون	۲۴	۶	۲۴
	"	اسلام ایک ابدی نظام	۲۵	۲	۴۸
	"	زندگی کی وسعتوں پر خدا کی حکمرانی	۲۵	۴	۳۹
	"	رسول کی ضرورت	۲۶	۱	۳۹
	"	ایمان بالرسالۃ	۲۶	۶	۱۳
۲۵	مولانا حامد علی	خدا کی ہدایت کہاں ہے؟	۱	۱	۵
	"	خدا کو ملنے کا صحیح طریقہ	۱	۱	۳۱
	"	قربانی	۱	۱	۳۴
	"	پریشانیاں اور الجھنیں	۱	۱	۳۷
	"	رب کا حقیقی مفہوم	۱	۲	۱۷
	"	ہندستان دنیا کا رہنما بن سکتا ہے	۱	۲	۳۶
	"	ہندستان کس طرح دنیا کا رہنما بن سکتا ہے	۱	۳	۲۳
	"	یہ قافلہ کدھر جا رہا ہے (۱)	۲	۱	۳۳
	"	" (۲)	۲	۲	۳۳
	"	افکار پریشاں	۲	۲	۴۱
	"	کلچر کا تحفظ اور جمعیۃ العلماء	۲	۳	۳۲
	"	حقیقی آزادی	۲	۴	۳۳

مقالات

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۲۹	مولانا سید سلیمان ندوی	خدا کی حاکمیت (مولانا عبدالماجد کے استفسار سے متعلق)	۶	۲، ۳، ۴	۹
۳۰	شبنم سبحانی	وحدت ادیان (۱)	۲۰	۲	۴۶
		" (۲) تمام شد	۲۰	۴ و ۵	۲۵
۳۱	مولوی شرافت علی	ناشکرے شکر گزار	۱	۵	۲۴
۳۲	مولانا مفتی محمد شفیع	دستور قرآنی (۱)	۱۱	۳	۳۴
		" (۲) تمام شد	۱۱	۴	۴۲
۳۳	مولانا شمس الدین شمس پیرزادہ	کیا ملی تقاضوں کو پورا کرنا قوم پرستی ہے؟	۲۴	۴ و ۵	۸۴
۳۴	جناب شمس نوید عثمانی	ایک کتاب کا تعارف	۲۶	۳	۳۴
۳۵	مولانا شہباز اصلاحی	تذکر و تفکر کا قدرتی سامان	۱۶	۳	۱۷
	"	مسخ	۱۶	۴ و ۵	۶۴
	"	خود فراموشی	۱۷	۱ و ۲	۲۵
۳۶	مولانا صدرالدین اصلاحی	اساس دین کی تعمیر (۱)	۴	۴ و ۵	۴۸
	"	" (۲)	۴	۶	۱۸
	"	" (۳)	۵	۱	۱۵

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۳۷	مولانا ضیاء النبی حبابی	اعمال کی مقبولیت کا معیار قرآن وحدیث میں	۲	۴	۴۶
۳۸	سید ضیاء الہدیٰ	انسانی تعلیم کے صحیح و فطری اصول (۱)	۸	۱	۲۹
	״	״ (۲) تمام شد	۸	۲	۳۰
	״	خیر و شر کا معیار	۸	۵	۲۹
	״	تنظیم کے فطری اصول	۱۸	۳ و ۴	۶۷
۳۹	مولانا ظفر احمد عثمانی	حکومت اسلامیہ اور اسلام {مولانا عبدالماجد دریا بادی کا استفسار اور اس کا جواب}	۵	۲	۲۶
۴۰	جناب ابو سلیم عبدالحی	خوف	۱	۱	۲۳
	״	ہماری آوازیں	۱	۵	۲۴
	״	حاکم کون؟	۱	۶	۳۴
۴۱	جناب عبدالحمید	ہند میں اسلام	۱۳	۴	۴۱
۴۲	جناب عبدالحمید صدیقی	دنیا کی حقیقت (۱)	۲۱	۳ و ۴	۱۹
	״	״ (۲) تمام شد	۲۱	۴ و ۵	۴۲
۴۳	جناب عبدالحق	سماجی ارتقاء کا نظریہ	۱۹	۴ و ۵	۹۳
۴۴	جناب عبدالقدیر	شہنشاہیت	۱	۴	۳۳

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۴۴	جناب عبدالقدیر	میں مجرم کیوں بنا	۱	۲	۳۷
	"	اردو شاعری کے ترقی پسند رجحانات	۲	۲	۳۶
۴۵	جناب عبدالمجید قریشی	معاشیات کا بنیادی مطالعہ	۱۴	۴ و ۵	۸۱
۴۶	جناب عبدالمعز منظر	اسلام پسند طلبہ کا فریضۂ حیات	۸	۱	۱۷
	"	اسلامی معیشت کے خط و خال	۱۳	۲ و ۳	۸۱
	"	بھارت کا نیا موڑ اور تحریک اسلامی	۱۳	۵	۳۶
۴۷	سید احمد عروج قادری	اسلام اور آمریت	۴	۴ و ۵	۳۱
	"	خوارج اور خارجیت	۶	۲ و ۳ و ۴	۲۳
	"	اولیاء اللہ	۸	۴	۲۰
	"	واقعہ موسیٰ و خضر علیہما السلام	۱۰	۵ و ۶	۴۹
	"	صحبت و بیعت اور تقلید	۱۲	۱ و ۲	۲۷
	"	داعیانِ حق پر اتہامات و الزامات	۱۲	۱ و ۲	۵۹
	"	مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست	۱۴	۲ و ۳	۶۴
	"	ہمہ گیر انقلاب صالح (۱)	۱۴	۴ و ۵	۹
	"	" (۲) تمام شد	۱۴	۶	۹
	"	عقیدت و احترام	۱۵	۴	۱۷
	"	انسان کا اخلاقی وجود (۱)	۱۵	۵	۲۳
	"	" (۲)	۱۵	۶	۲۹
	"	(۳)	۱۶	۴ و ۵	۴۴

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۴۷	سید احمد عروج قادری	انسان کا اخلاقی وجود (۴)	۱۷	۳	۹
	"	" (۵)	۲۳	۲	۴۱
	"	" (۶) ناتمام	۲۵	۳	۲۹
	"	جرأت حق گوئی	۱۶	۲	۳۳
	"	مدافعت	۲۶	۵	۳۸
۴۸	جناب محمد عزیز	مذہب فطرت	۱	۵	۳۹
۴۹	جناب عظمت علی	فلسطین کا مسئلہ	۱	۳	۳۷
	"	دنیا کا سب سے بڑا روگ	۱	۴	۴۰
	"	مجلس اقوام متحدہ کی ناکامی	۱	۵	۴۵
۵۰	حافظ غلام مرتضیٰ ایم اے	اسلام میں مملکت کا تصور	۱۷	۱ و ۲	۵۸
	"	اسلامی نظام میں مملکتی تنظیم کے مسئلے کی اہمیت	۱۷	۴ و ۵	۲۵
۵۱	جناب فاروق شاہ خاں	مرنے کے بعد کیا ہوگا؟	۱	۲	۲۰
۵۲	جناب محمد فاروق اعظم گڈھ	کائنات کی تین عظیم حقیقتیں	۲۰ و ۲۱	۶ و ۱	۱۷
	"	اسلام کے معتقدات اور قرآن کا طرز استدلال (۱)	۲۳	۳	۳۰
	"	" (۲) تمام شد	۲۳	۴ و ۵	۳۵
	"	حقیقت کی تصویر کائنات کے آئینے میں	۲۴	۴ و ۵	۴۹
	"	مادیت اور روحانیت	۲۶	۳	۲۱

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۵۳	جناب فضل الرحمٰن عزیزی ایم اے	صنعتی امن اور انسانی روابط	۱۴	۴ و ۵	۴۱
	〃	محنت و سرمایہ کی کشمکش اور اسلام	۱۵	۲ و ۳	۹
	〃	اقتصادی تعبیر تاریخ	۱۹ و ۲۰	۱ و ۶	۲۵
۵۴	جناب قمر بہرابی	دعوت حق کے دو دور	۳	۱	۲۷
۵۵	جناب کوثر عثمانی	اسلامی فقر اقبال کی نگاہ میں	۳	۴	۲۶
۵۶	جناب کوثر یزدانی	گیتا ایک تنقیدی مطالعہ	۱۹ و ۲۰	۱ و ۶	۹۷
	〃	اہنسا اور گیتا کی کسوٹی پر	۲۰	۴ و ۵	۶۵
	〃	آشرم نظام	۲۰ و ۲۱	۱ و ۶	۷۶
۵۷	مولانا مجیب اللہ ندوی	مصارف زکوٰۃ	۵ و ۶	۱ و ۲	۷۱
		اسلام کی غربت	۱۲	۱ و ۲	۸۰
		مزدوروں کی اجرت کا مسئلہ (۱)	۱۷	۱ و ۲	۸۳
	〃	〃 (۲)	۱۷	۳	۲۲
	〃	〃 (۳) تمام شد	۱۷	۴ و ۵	۹
	〃	اسلام کے بین الاقوامی اصول و تصورات (۱)	۲۲	۴	۴۷
	〃	〃 (۲)	۲۲	۵	۵۶
	〃	〃 (۳) تمام شد	۲۳	۲	۲۵
۵۸	علامہ محمد بن عبداللہ الانصاری	حکومت الٰہیہ اور اس کی دعوت (علامہ کی تصنیف اساس انقلاب یا مراقبہ نماز کے اقتباسات [illegible])	۱۱	۵	۳۳

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۶۵	مولانا نظام الدین اصلاحی	اقامت دین اور خلافت فی الارض (۳)	۶	۶	۲۸
		" (۴)	۷	۱ و ۲	۵۱
		" (۵) تمام شد	۷	۳	۲۰
		امر بالمعروف (۱)	۷	۵	۳۹
		امر بالمعروف (۲) تمام شد	۷	۶	۳۱
۶۶	جناب وحید الدین خاں	تعلیم کا حقیقی مقصد	۲	۵	۲۵
	"	بھارت میں جماعت اسلامی کی دعوت	۱۲	۳ تا ۶	۴۹
	"	ہندستان کی منزل ۔ سوشلزم یا اسلام	۱۳	۲ و ۳	۹
	"	نئے عہد کے دروازے پر	۱۳	۴	۲۵
	"	کیا ہندوستان ترقی کر رہا ہے ۔	۱۴	۲	۲۵
	"	دعوت اسلامی کے امکانات	۱۴	۴ و ۵	۶۲
	"	معاش کا مسئلہ اہم کیوں ہوا؟ (۱)	۱۴	۶	۲۵
	"	" (۲)	۱۵	۱	۲۴
	"	تحریک اسلامی کا مستقبل	۱۵	۲ و ۳	۷۵
	"	جماعت اسلامی نیا دین لے کر نہیں اٹھی ہے ۔	۱۶	۴ و ۵	۱۷
	"	ایک انسان ایک نظام	۱۶	۶	۱۷
	"	آخرت کی راہ	۱۷	۱ و ۲	۹
	"	جنھیں دیکھ کر خدا یاد آئے	۱۷	۶	۳۳
	"	تحریک اسلامی کا طریق دعوت	۱۸	۱	۴۲
	"	قرآن ۔ خدا کی آواز	۱۸	۲ و ۳	۳۲
	"	روزہ کی حقیقت	۱۸	۲ و ۳	۸۶
	"	نماز	۱۸	۴ و ۵	۸۴

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۶۶	جناب وحید الدین خاں	مارکسزم ۔ تاریخ جس کو رد کر چکی ہے (۱)	۱۸ و ۱۹	۶ و ۱	۳۱
	"	" (۲)	۱۹	۳	۲۵
	"	" (۳)	۱۹	۴ و ۵	۲۵
	"	سوشلزم ۔ ایک غیر اسلامی نظریہ (۱)	۱۹ و ۲۰	۶ و ۱	۵۰
	"	" (۲)	۲۰	۴ و ۵	۳۷
	"	" (۳)	۲۰ و ۲۱	۶ و ۱	۳۰
	"	اسلام ایک عظیم جدوجہد	۲۰	۴ و ۵	۸۴
	"	حقیقت کی تلاش	۲۱	۲ و ۳	۲۵
	"	ہندوستان کا سوشلسٹ سماج	۲۱	۴ و ۵	۵۲
	"	کائنات کا مطالعہ	۲۱ و ۲۲	۶ و ۱	۱۵
	"	تراویح ۔ اعتکاف ۔ شب قدر	۲۲	۲	۲۵
	"	زندگی کا امتحان	۲۲	۲	۴۶
	"	آج کا شرک	۲۲	۳	۴۱
	"	قربانی رسم نہیں، ایک زندہ حقیقت	۲۲	۵	۴۹
	"	چند حدیثیں	۲۲	۶	۳۵
	"	انسان اپنے آپ کو پہچان	۲۳	۱	۲۱
	"	تاریخ کا فیصلہ	۲۳	۳	۲۶
	"	خدا کی کتاب	۲۳	۴ و ۵	۶۷
	"	ہمیں کیا کرنا ہے	۲۳	۴ و ۵	۹۰
	"	علم والے کون ہیں	۲۳	۶	۳۴
	"	روزے کے متعلق احادیث	۲۴	۱	۱۳
	"	محمد رسول اللہ	۲۴	۴ و ۵	[illegible]

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۶۶	جناب وحید الدین خاں	تاریخ سے سبق	۲۴	۶	۳۳
	"	اسلام دین فطرت	۲۵	۱	۲۷
	"	منزل کی طرف	۲۵	۲	۳۰
	"	کل اور آج کا فرق	۲۵	۳	۲۲
	"	گوشت خوری کا مسئلہ	۲۵	۵	۲۲
	"	مسلمان کیا کریں	۲۵	۶	۱۰
	"	مومن کی تصویر	۲۶	۱	۱۶
	"	دینی تعلیم کا مسئلہ	۲۶	۲	۲۷
	"	روزے کا مہینہ	۲۶	۳	۱۸
	"	اسلام کا نظریۂ آخرت	۲۶	۴	۹
	"	نظریۂ ارتقاء	۲۶	۵	۱۰
		قرآن کا مطلوب انسان	۲۶	۶	۳۰
۶۷	جناب وکیل انصاری ٹانڈوی	گزرے ہوئے زمانے	۲	۴	۳۹
	"	آزادی	۲	۶	۳۰
۶۸	مولانا محمد یوسف اصلاحی	فرقہ بندی اور امت مسلمہ	۱۷	۱ و ۲	۴۷

تراجم واقتباسات

نمبر شمار	مترجم ومقتبس	عنوانات	جلد	شمارہ	صفحہ
۱	ادارہ	چند دعوتی تجربے (شیخ حسن البنا شہید کی ڈائری سے چند اقتباسات)	۹	۲	۴۹
		اسلام اور عورت (شیخ حسن البنا شہید کے ایک مقالے کا ترجمہ)	۸	۳	۲۹
		اقامت حکومت اسلامیہ ایک شرعی حکم ہے، دنیوی مصلحت نہیں اقامت حکومت اسلامیہ کا حکم شرعی، حکم مقصود ہے غیر مقصود نہیں {مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب ندوی کے مضمون "اسلام میں حکومت کا درجہ" کے دو اہم اقتباسات}	۱۲	۱ اور ۲	۹۷
		اسلام اور ہمارا قانونی نظام (۱) {عبدالقادر عودہ کی کتاب "الاسلام واوضاعنا القانونیۃ" کے ابتدائی حصے کا ترجمہ}	۱۳	۲ و ۳	۱۱۵
		اسلام اور ہمارا قانونی نظام (۲) (ترجمان القرآن سے لیا گیا)	۱۳	۴	۴۹
		اجتہادی مسائل میں صحیح راہ {احسن الکلام فی ترک قراءۃ الفاتحہ خلف الامام پر مولانا محمد طیب صاحب کا مقدمہ}	۱۶	۴ و ۵	۱۰۰
		نافرمان امت (صحیفہ یسعیاہ کے اقتباسات)	۱۶	۴ و ۵	۱۰۶

نمبر شمار	مترجم و مقتبس	عنوانات	جلد	شمارہ	صفحہ
۱	ادارہ	صبر و استقامت (افادات شیخ عبدالقادر جیلانی)	۱۶	۶	۴۷
		جہاد فی سبیل اللہ اور ریاضات و مجاہدات (افادات خواجہ محمد معصوم سرہندی)	۱۶	۶	۵۱
		اجتہاد و تقلید (۱) (افادات شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)	۱۷	۱ و ۲	۹۴
		طاعت الٰہی اور معصیت خداوندی کے نتائج ("عہد نامۂ عتیق" کے اقتباسات)	۱۷	۱ و ۲	۱۰۲
		اجتہاد و تقلید (۲) (افادات شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)	۱۷	۳	۴۱
		اخوان المسلمین کی دعوت کے بنیادی اصول (شیخ حسن البناء کے ایک مضمون کے اقتباسات کا ترجمہ)	۱۸	۴ و ۵	۱۰۹
		متاعِ گم شدہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کا اقتباس	۲۱	۲ و ۳	۱۰۵
		ہندوستان میں جمہوریت کا مستقبل (ایچ وی کامتھ کے مضمون کا ترجمہ)	۲۲	۳	۵۷
		ناظم اجتماع کی رپورٹ سے چند اقتباسات (کل ہند اجتماع جماعت اسلامی کے ناظم انیس الدین صاحب کی رپورٹ کے اقتباسات)	۲۶	۳	۴۸
۲	ا۔ س۔ ع	علماء حق کی جرأت (منبر الشرق قاہرہ کے ایک مضمون کا ترجمہ)	۱۰	۵ و ۶	۱۱۸

نمبر شمار	مترجم و مقتبس	عنوانات	جلد	شمارہ	صفحہ
۳	جناب اکرام احمد خاں	اشتراکی دنیا کا نظری انتشار (ژان پیاس کے مضمون کا ترجمہ)	۱۷	۲	۴۰
		کیا دنیا کو ایک نئی تہذیب کی ضرورت ہے (لوئی ممفورڈ کی کتاب "طریق زندگی" کے اقتباسات کا ترجمہ)	۱۸	۴ و ۵	۱۰۱
۴	جناب انور اعظمی	توحید کے مختلف مراتب شاہ ولی اللہ محدثؒ کے افادات	۴	۴ و ۵	۸۲
۵	مولانا محمد ایوب اصلاحی	داعیان حق کے لیے صبر و ضبط کی ضرورت (شیخ حسن البناء کی ایک تقریر کا ترجمہ)	۱۰	۴	۵۱
۶	جناب محمد حمید اللہ صدیقی	دین اور سوسائٹی	۱۰	۲	۴۳
۷	جناب حیرت شملوی	مغربی تہذیب اور سائنس (سابق آرچ بشپ سیر آگا ربٹ کی کتاب "اس عہد انقلاب میں" سے چند اقتباسات)	۲۱	۴ و ۵	۱۱۲
		مغرب کی تعلیم میں مذہب کا مقام (انگریزی ہفتہ وار الاسلام کراچی کے ایک مضمون کا ترجمہ)	۲۴	۱	۵۰
۸	جناب رشید عثمانی	یتیم مسلمان (الاستاذ سعید رمضان کے ایک مضمون کا ترجمہ)	۲۴	۴	۵۸
۹	جناب شمس نوید عثمانی	سائنس دانوں کی یافت (الاسلام کراچی کے ایک مضمون کا ترجمہ)	۱۹	۴ و ۵	۱۱۱

نمبر شمار	مترجم و مقتبس	عنوانات	جلد	شمارہ	صفحہ
۹	جناب شمس نوید عثمانی	روحانی نظام کی طرف واپسی (کرسٹوفر ڈاسن کے ایک خطبہ کا ترجمہ)	۲۲	۶	۴۱
		انسان صرف سائنس کے سہارے جی نہیں سکتا (ڈاکٹر کینیتھ واکر کی کتاب "معنی و مقصد" سے اقتباسات کا ترجمہ)	۲۳	۳	۵۲
		سائنس کا فلسفۂ جدید (جدید سائنس اور مادیت سے اقتباسات کا ترجمہ)	۲۳	۶	۴۹
		تسخیر ذات ــ انسانیت کا عظیم ترین تقاضا (کیلویٹ ورنولے کی کتاب "تقدیر انسانی" کی ایک جھلک)	۲۴	۶	۵۳
		مسائل حیات کو حل کرنے میں انسان کی ہولناک ناکامی (ایم۔ اے سوروکن کی تصنیف "انسانیت کی تعمیر نو" کے پہلے باب سے اقتباسات کا ترجمہ)	۲۵	۱	۴۵
		جدید معاشرے میں انسان کا مقام (ڈاکٹر الیکسس کارل کے مضمون کا ترجمہ)	۲۵	۳	۴۸
		سائنس کی نارسائیاں	۲۶	۵	۴۷
۱۰	جناب عبدالمعز منظر	امریکہ کی موتمر ثقافت اسلامی (المسلمون کے مدیر اعلیٰ کی خود نوشت روداد شرکت کا ترجمہ)	۱۱	۵	۴۹
		جدید ترکی (المسلمون قاہرہ کے ایک مضمون ترکیا کا ترجمہ)	۱۱	۶	۴۷
		منہ پر کسی کی تعریف کرنا اس کو ہلاک کر ڈالنا ہے (الاستاذ عبدالوہاب حمودہ کے ایک مضمون کا ترجمہ)	۱۲	۳ تا ۴	۱۰۳

نمبر شمار	مترجم و مقتبس	عنوانات	جلد	شمارہ	صفحہ
۱۱	جناب عبدالمجید اصلاحی	ربانی معاشرہ (سید قطب کے ایک مقالے کا ترجمہ)	۱۶	۱	۴۶
		شریعت کا نظام سیاست (امام ابن تیمیہ کی کتاب السیاستہ الشرعیہ کے کچھ حصے کا ترجمہ)	۱۶	۴ و ۵	۸۱۰
۱۲	سید احمد عروج قادری	قدیم و جدید (الاستاذ احمد محنون کے ایک مضمون کا ترجمہ	۱۴	۲ و ۳	۱۰۵
		مجدد الف ثانیؒ کا مکتوب	۱۴	۴ و ۵	۸۸
		میرے پاس وقت نہیں (البصائر کے ایک مضمون کا ترجمہ)	۱۴	۴ و ۵	۱۰۴
		شمالی افریقہ کی تحریک آزادی (ٹائمز آف انڈیا کے ایک مقالے کا ترجمہ	۱۵	۴	۵۳
		خواجہ محمد معصوم کے چند مختصر خطوط	۱۵	۶	۴۱
		فقہ و تصوف چوتھی صدی ہجری میں ("ظہر الاسلام" کے اقتباسات کا ترجمہ)	۱۵	۶	۴۴
		تخریبی ادب (شام کے مشہور ادیب علی طنطاوی کے مضمون کا ترجمہ)	۱۶	۳	۴۹
		مجدد الف ثانی کے ایک مکتوب کا ترجمہ	۲۵	۶	۴۳
		شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ایک خط	۲۶	۱	۵۴
		دعوت دین			
		شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ایک مکتوب کا ترجمہ	۲۶	۴	۴۴

استفسارات

نمبر شمار	جواب دینے والے	خطوط و سوالات کا موضوع	جلد	شمارہ	صفحہ
۱	مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی	لٹریچر میں تبدیلی	۶	۵	۶۷
	"	ایک نیا فتنہ	"	"	۶۹
	"	مولانا مدنی سے خط و کتابت کا تتمہ	"	"	۷۰
	"	مولانا قدوسی مرحوم اور مدرسہ مظاہر العلوم	۶	۶	۳۶
	"	کمیونزم کا فتنہ اور علماء	۸	۱	۴۳
	"	مسلمان اور نسلی قومیتیں	"	"	۴۴
	"	حقیقی مرض اور اس کا علاج	"	"	۴۵
	"	محکمہ سی آئی ڈی کی بوالعجبیاں	"	۲	۴۷
	"	کتاب و سنت کی پیروی کا مطلب	"	"	۴۸
	"	نظم جماعت سے متعلق بعض توضیحات	۸	۳	۴۱
	"	کچھ قابل توجہ دینی کام	۹	۱	۴۸
	"	مسلم کنونشن	۹	۶	۵۶
	"	چند شبہات	۱۰	۱	۶۰
	"	دستور جماعت کی نئی تفسیر	۱۰	۲	۴۹
	"	راہ تبلیغ کی مشکلات	۱۰	۲	۵۴
	"	مسلم کنونشن	۱۱	۳	۴۳
	"	طلبہ کی تنظیم	۱۱	۳	۴۷
	"	قادیانی فتنہ	۱۱	۴	۶۱
	"	تحفظ اردو کی جد و جہد	۱۱	۴	۶۳
	"	کیا صحابہ معیار حق ہیں؟	۱۵	۶	۵۲
	"	اقامت دین اور انقلاب قیادت	۲۰ و ۲۱	۶ و ۱	۱۰۱
۲	مولانا محمد ایوب اصلاحی	تاوان اور جرمانہ	۴ و ۵	۶ و ۱	۹۲

نمبر شمار	جواب دینے والے	خطوط و سوالات کا موضوع	جلد	شمارہ	صفحہ
۳	مولانا حامد علی	آفتاب کی گردش اور قرآن	۲	۳	۴۶
		دنیا میں مومن و کافر کا مقام	۳	۳	۲۹
		نیک و بد میں حقیقی امتیاز	۳	۴	۴۶
		پاکستان چلو کی مہم اور ہمارا فرض	۴	۱	۴۳
		قرآن کی ایک آیت کا صحیح مفہوم	۴	۲	۱۹
		کیا خدا ظالم ہے؟	۴	۳	۴۷
		قربانی کے چند پہلوؤں کی تحقیق	۱۷	۱ و ۲	۱۱۱
		بیمہ کا کاروبار	۱۷	۱ و ۲	۱۱۷
		رشوت کی لعنت	۱۷	۳	۴۹
		حکومت کے تعاون سے لائبریریوں کا قیام	۱۷	۳	۵۱
		انبیاء کے والدین کا مسئلہ	۱۷	۳	۵۳
		برے خیالات سے چھٹکارا	۱۷	۴ و ۵	۱۱۵
		غیر اسلامی نظام میں زنا سے توبہ کی صورت	۲۱	۲ و ۳	۱۰۹
		نام نہاد اصلاحی کلچر	۲۱	۲ و ۳	۱۲۷
		مسلمانوں کی خدمت کی خاطر شرک و بدعات کی سرپرستی	۲۱	۴ و ۵	۱۱۹
		جماعت اسلامی ہند کے متعلق کچھ مستند علماء کے فتوے	۸	۵	۴۱
۴	شمس پیرزادہ	کیا ملی تقاضوں کو پورا کرنا قوم پرستی ہے؟	۲۵	۲	۴۹
۵	مولانا صدرالدین اصلاحی	قرعہ اندازی ـــــ قصر نماز	۵	۱ و ۲	۸۶
		جماعت اسلامی ہند اور جماعت اسلامی پاکستان	۸	۱	۴۰
		ہاروت ماروت کیا سکھاتے تھے	۹	۵	۹۱

نمبر شمار	جواب دینے والے	خطوط وسوالات کا موضوع	جلد	شمارہ	صفحہ
۵	مولانا صدرالدین اصلاحی	مسجد حرام کا مفہوم	۹	۵	۶۱
		بیت المقدس کی تعمیر	۹	۶	۵۸
		سلطاناً نصیراً کا مفہوم	〃	〃	۵۹
		علم الٰہی	〃	〃	۶۱
		تناسخ اور مورتی پوجا	۱۰	۴	۶۰
		قرآن کے مصدق تورات ہونے کا مطلب	۱۱	۱	۶۱
		شخصیتوں کا احترام	۱۱	۶	۵۵
		ایمان وابتلاء کا باہمی ربط	۱۲	۱ و ۲	۱۰۶
		کیا کوئی دور نظام جاہلی سے اختیاری تعاون سکھاتا ہے	۱۲	۱ و ۲	۱۰۶
		تعمیر مساجد میں ناجائز کمائی کا صرف	۱۵	۴	۶۱
		قرآن کے مصدق تورات ہونے کا مطلب	۱۵	۵	۴۴
		وجوب زکوٰۃ میں مستقبل کا لحاظ	۱۶	۲	۵۳
		زمینداری بانڈ کا سود	۱۶	۶	۵۴
		حقوق العباد کی اہمیت ناشناسی	〃	〃	۵۶
		اہل بیت رسول	۲۳	۳	۵۹
		اقامت دین کی جدوجہد اور اجتماعیت	〃	〃	〃
		انبیاء کا مقام عمل	۲۳	۶	۵۶
۶	سید عبدالقادر	اجنبی ماحول میں دین کی دعوت	۱۲	۳ تا ۶	۱۰۹ ۲
۷	سید احمد عروج قادری	کیا دنیوی علوم کی تحصیل ناجائز ہے؟	۱۶	۱	۶۲
		ایک خط کے اقتباسات	۲۵	[illegible]	۵۷

نمبر شمار	جواب دینے والے	خطوط و سوالات کا موضوع	جلد	شمارہ	صفحہ
۷	سید احمد عروج قادری	عورتوں کے اخلاقی عیوب	۲۶	۵	۵۳
۸	جناب وحیدالدین خاں	علم کا مفہوم قرآن و حدیث میں	۲۱	۲و۳	۱۱۷
		ابراہیم کی قربانی	۲۳	۲	۶۲
		مختلف مذاہب کے مابین اتحاد	۲۴	۶	۵۸
		ایک خط و کتابت	۲۵	۴	۴۸
		جنگ کا خطرہ	۲۶	۱	۵۸
		غیر مسلموں کا تعاون	۲۶	۳	۴۶
۹	جناب محمد یوسف قیم جماعت	اظہار واقعہ	۱۱	۴	۵۶

اعلانات اور رُوداد اجتماعات

جناب محمد یوسف صاحب قیم جماعت اسلامی ہند اور شعبۂ تنظیم نے جو چیزیں شائع کرائیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے

مندرجات	جلد	شمارہ	صفحہ
ارکان شوریٰ کا جدید انتخاب	۱۵	۱	۴۸
روداد مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۰ تا ۱۳ جنوری ۱۹۵۱ء	۵	۴	۲۸
جماعت اسلامی ہند کا پہلا کل ہند اجتماع (اعلان)	۵	۵	۷۴
روداد مجلس شوریٰ منعقدہ یکم تا ۶ مئی ۱۹۵۲ء	۸	۲	۳۸
جماعت اسلامی ہند کا کل ہند اجتماع (مختصر اعلان)	۸	۵	۷۴

نوٹ

ماہنامہ زندگی کی ابتدائی جلدوں میں جلد ۳ شمارہ ۷ تک منظومات بھی شائع ہوئے ہیں، لیکن منظومات کی فہرست شائع کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

اکتوبر ۱۹۶۸ء سے مستقلاً شائع ہونیوالے علمی

ماہنامہ "کانتی، رامپور"

نے

دوسرے سال کے آغاز میں اشاعت خاص

توحید نمبر

پیش کیا

جس میں توحید و شرک سے متعلق مباحث مختلف انداز میں شائع کئے گئے

-: کانتی کا یہ خاص نمبر :-

دفتر کانتی رامپور سے اب بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

$\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ سائز کے ۱۵۰ صفحات پر مشتمل۔

یہ توحید نمبر صرف ایک روپیہ میں

سالانہ چار روپیہ — عام شمارہ ۳۷ نئے پیسہ

● ایک نادر تحفہ　　● ایک قابل قدر پیشکش

● تنہائی کا رفیق　　● معلومات کا خزانہ

ہندی ماہنامہ "کانتی" رامپور کا

سالنامہ

اسلامی نظام حیات نمبر

★ اسلام مکمل نظام حیات ہے—

★ اس نے مذہب اور سیاست کو زندگی کے دو حصے نہیں بنائے ہیں

★ خدا پرستی پر قائم نظام خلافت ہی بہترین سیاسی نظام ہے—

★ اسلام کا معاشی نظام سرمایہ داری و کمیونزم کے مقابلہ میں کہیں بہتر ہے—

★ اسلام کا معاشرتی نظام پاکیزہ تہذیب و تمدن کو جنم دیتا ہے—

★ اسلام میں اخلاق و کردار کا اہم مقام ہے—

★ اسلام روح و مادہ کا بہترین امتزاج ہے—

یہ اور اسی قسم کے عنوانات پر لکھے گئے مضامین۔ کہانیاں۔ تاثرات۔ خاکے۔ سوال و جواب۔ خطوط و مسائل پر مشتمل یہ نمبر جلد ہی شائع ہو رہا ہے۔

آپ اس کا مطالعہ ضرور فرمائیں اور

زیادہ سے زیادہ خریدار فراہم کرنے میں ہمارا تعاون کریں۔

مستقل خریداروں کو ان کے سالانہ چندہ ہی میں یہ نمبر دیا جائیگا—

صفحات ۱۲۰　سائز $\frac{۳۰ \times ۲۰}{۸}$　قیمت صرف ایک روپیہ

سالانہ چندہ چار روپئے

Title Printed at Shanker Press, Rampur

جلد ۲   صفر ۸۱ء

شمارہ ۲   اگست ۱۹۶۱ء

ماہنامہ

ماہنامہ

زندگی

جلد ۲۷
شمارہ ۲

صفر ۱۳۸۱ھ
اگست ۱۹۶۱ء

مدیر: سید احمد عروج قادری

● خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رام پور یوپی

● زرِ سالانہ: — صر ششماہی: — تین روپیہ۔ فی پرچہ: — پچاس نئے پیسے
ممالکِ غیر سے: — دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

احمد حسن طابع و ناشر نے جماعت اسلامی ہند کی طرف سے ناظم پریس بازار نصراللہ خاں میں چھپوا کر دفتر رسالہ زندگی رامپور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد عروج قادری)

آل انڈیا مسلم کنونشن دہلی کو ختم ہوئے شاید ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا ــــ تمہارے خیال میں اس کنونشن کا حاصل کیا ہے؟ ــــ میں نے انہیں برجستہ یہ جواب دیا تھا: ــــ ڈاکٹر سید محمود صاحب کا خطبۂ صدارت۔

بظاہر یہ کوئی سنجیدہ جواب نہیں معلوم ہوتا اور اس وقت شاید پوری سنجیدگی سے وہ جملہ کہا بھی نہیں گیا تھا لیکن کنونشن پر اظہارِ خیال کے لیے میں نے جب اسے دوبارہ پڑھا اور اسی اثنا میں اس کنونشن پر خود کانگرس کے متعدد سربرآوردہ افراد کے بیانات بھی پڑھے تو مجھے اپنے اس جواب میں خاصہ وزن محسوس ہونے لگا۔

ان سطور میں کنونشن پر سیر حاصل ہمہ جہتی تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ کنونشن کے بارے میں بہت کچھ اخبارات میں آچکا ہے اور آرہا ہے ان باتوں کی تکرار تحصیلِ حاصل ہے، ہاں میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب موصوف کا خطبۂ صدارت کئی پہلوؤں سے اہمیت رکھتا ہے اور ضرورت ہے کہ ان پہلوؤں کو یہاں پیش کیا جائے۔

اس خطبے کا سب سے زیادہ خوش آئند نمایاں اور روشن پہلو وہ اظہارِ خیال ہے جو ڈاکٹر صاحب نے دینِ اسلام پر کیا ہے، چند جزئیات کو چھوڑ کر مجموعی حیثیت سے میرے نزدیک وہ خیالات اسلامی عقائد کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ جو لوگ ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی سے واقف نہیں ہیں انہیں اس میں شاید کوئی خاص بات نظر نہ آئے لیکن جو لوگ ان کی گزشتہ زندگی، ان کی سیاسی مصروفیات وخدمات اور اسلام کے بارے میں ان کے سابقہ خیالات سے واقفیت رکھتے ہیں وہ جب اسلام کے بارے میں ان کے ان خیالات کو پڑھیں گے جو اس خطبۂ صدارت میں موجود ہیں تو انہیں بڑی مسرت حاصل ہوگی اور ان کا دل چاہے گا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو ان خیالات کے اظہار پر مبارک باد پیش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حیاتِ مستعار کی جو مہلت عطا کی ہے اس کے کسی دور میں بھی وہ اگر غلط عقائد وتصورات سے ہٹ کر صحیح عقائد وتصورات اختیار کرلے تو ایسا انسان خوش نصیب وسعادتمند ہے

ڈاکٹر صاحب آزادیٔ وطن کی کانگرسی تحریک کے ممتاز فرد ہیں اور ان کا شمار اگلی صفوں کے لیڈروں میں ہوتا ہے انہوں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ کانگرس کے ایک خادم کی حیثیت سے بسر کیا ہے اور اس تحریک کے تصورات و خیالات سے مسلمانوں کو قریب کرنے کی سرگرم خدمات انجام دی ہیں۔ آج سے ربع صدی پہلے ۱۹۳۶ء میں جب وہ ریاست بہار کے وزیر تعلیم تھے دین اسلام کو' دین الٰہی اکبر شاہی کی حد تک پہنچا دینا چاہتے تھے اور ان کے نزدیک اسی بات سے ہندوستانی مسلمانوں کی نجات و فلاح وابستہ تھی۔ آج کے خیالات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے اس دور کی ایک جھلک دیکھ لینا مناسب ہوگا۔ ذیل میں ڈاکٹر صاحب کے ایک قدیم مضمون سے دو اقتباسات دیے جا رہے ہیں:-

سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہمارا نصب العین اور مقصد کیا ہے؟ کیا ہم اس سمت میں قدم اٹھانے کو آمادہ ہیں کہ ایک مشترک قومیت کی مع تمام لوازم کے تشکیل کریں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے جس میں ایک سے زیادہ اقوام بستی ہیں۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر "قوم" علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند میں صرف انسانی اور مادی امداد کیا کرے اگر مسئلہ ہند کا یہی حل ہے تو ہماری اس وقت تک کی کوششیں اس کے برعکس بالکل ناکام رہی ہیں .... لیکن اگر ہمارے سوال کا جواب اثبات میں ہے اور ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی راہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے ازمنۂ وسطی کے حکمرانوں نے بنا دی تھی تب تو ہمیں عزم و استقلال کے ساتھ ہمیشہ صرف اسی راہ پر چلنا چاہیے بلکہ ہمارے پیشوں اور رسوم میں بھی یکسانیت ہونی چاہیے۔ بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت کے لیے ایک مضرت ہے لیکن اس کا کوئی چارۂ کار نہیں اور چونکہ کوئی تیسرا حل موجود نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے قبول کر لینا چاہیے۔ (جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

بات اسی حد پر ختم نہیں ہوئی وہ اسی مضمون میں لکھتے ہیں:-

ہندی کو زبان کے لیے نہیں بلکہ "اہل ہند" کے لیے اختیار کرنا چاہیے دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ایک ایسا ملک ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس بر اعظم کی علیحدہ علیحدہ "مذہبی اقوام" ہیں۔ اسی لیے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کر لیں۔

ڈاکٹر صاحب کے یہ قدیم خیالات کسی تبصرے کے لیے یہاں نقل نہیں کیے گئے ہیں بلکہ اس لیے نقل کیے گئے ہیں کہ ان کے سامنے رکھ کر ان کا خطبۂ صدارت پڑھیے تو عبرت کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"اپنی مشکلات کا حل بڑی حد تک مسلمان خود کر سکتے ہیں جس اسلام پر وہ ایمان رکھتے ہیں وہ محض چند تصورات اور عبادات کا نام نہیں بلکہ ایک عظیم الشان انقلابی اور اصلاحی تحریک ہے جس نے بنی نوع انسان کے دل و دماغ اور ان کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس انقلابی تحریک نے کمزوروں اور بے بسوں کو طاقت اور عظمت عطا کی، ملوکیت اور شہنشاہیت کے دیوتاؤں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ انسان کو اس کی بھولی ہوئی عظمت یاد دلائی اور بتایا کہ خدا کے بعد انسان ہی کی ذات سب سے افضل و برتر ہے۔ اس عالمگیر انقلابی تحریک نے دنیا کو خدا کا آخری اور سب سے بڑا پیغام سنایا کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں اور سب ایک آدم کی اولاد ہیں۔" صفحہ ۹

جماعت اسلامی سالہا سال سے اسلام کے بارے میں اسی خیال کا پرچار کر رہی ہے لیکن اس کا جرم یہ ہے کہ وہ صرف قولاً ہی نہیں عملاً بھی اسی اسلام پر چلنا چاہتی ہے اور وہ اس اعتقاد کے عملی تقاضوں کو بھی پورا کرنا چاہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کل اس انقلابی تحریک نے کمزوروں اور بے بسوں کو طاقت اور عظمت عطا کی تھی تو کیا آج اس سے یہ صلاحیت چھن گئی ہے؟ یہ کیسی عجیب صورت حال ہے کہ ہمارے رہبران قوم ایک طرف ہندستان کی مسلم اقلیت کی کمزوری و بے بسی کا اپنی تحریروں اور تقریروں میں نقشہ کھینچتے ہیں۔ دوسری طرف وہ اسلام کی انقلابی و اصلاحی تحریک کے بارے میں اس عقیدے کا اظہار کرتے ہیں کہ اس نے کمزوروں اور بے بسوں کو طاقت اور عظمت عطا کی تھی اور تیسری طرف جب وہ اس کمزور و بے بس اقلیت کے مصائب و مشکلات کو حل کرنے کی تدابیر سوچتے اور تجاویز مرتب کرتے ہیں تو ان میں اس انقلابی و اصلاحی تحریک کا نام بھی نہیں آنے پاتا حالانکہ اس عقیدے کی رو سے مسلم اقلیت ہی نہیں بلکہ ہندستان کے تمام کمزوروں اور بے بسوں کو صحیح عظمت عطا کرنے والی چیز صرف یہی انقلابی و اصلاحی تحریک ہو سکتی ہے جسے اسلام کہتے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے رہبران قوم قول و عمل کے اس تضاد کی کیا توجیہ کرتے اور کس طرح اپنے دلوں کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"اسلام کو ایک مذہب کی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے دنیا کی ایک اصلاحی و انقلابی تحریک کی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے انسان کی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کو ترقی دے کر اسے انسانیت کے بلند ترین مقام پر پہنچانے میں جو گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے وہ

زندگی زندہ ولی غائب ہے

دنیا کی تاریخ میں آپ اپنی نظیر ہے۔ آج انسان فطرت کے پوشیدہ رازوں کو کھولنے اور فطرت کی بے پناہ طاقتوں سے دنیا کو فائدہ پہنچانے کی جو کوشش کر رہا ہے وہ اس عالم گیر انقلابی و اصلاحی تحریک ہی کا توفیض ہے، اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات اور زمین پر خدا کا نائب قرار دیا۔ اسی تصور میں انسان کی عظمت کا سارا راز پوشیدہ ہے۔ (صفحہ ۱۰)

یہ کیسے گراں قدر خیالات ہیں۔ لیکن جب جماعت اسلامی اسی عقیدۂ نیابت و خلافت کی بنیاد پر یہ کہتی ہے کہ جو لوگ اس زمین پر اس کے اصل مالک ۔ خدا ۔ کی مرضی کے خلاف اپنے احکام چلا رہے ہیں، وہ اس کے باغی ہیں اور انسان کے لیے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ خدا کی زمین پر اسی کے احکام نافذ کرے ورنہ خلافت و نیابت کی عظمت خاک میں مل جائے گی تو اس جماعت پر فرقہ پرستی کا ذلیل اور بے بنیاد الزام لگایا جاتا ہے اور اس کنونشن میں جہاں صدارت کی کرسی سے ان خیالات کا اظہار کیا گیا ۔کمیونسٹ تک بلائے جاسکتے اور شریک کیے جاسکتے ہیں لیکن جماعت اسلامی کو دعوت نہیں دی جاسکتی کہ کہیں پنڈت نہرو کی جبین اقتدار پر شکن نہ پڑ جائے[1]

ــــ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کے بنیادی عقائد توحید، رسالت، آخرت کی بھی توضیح کی ہے اور بس اغنیمت کی ہے۔

اس خطبے کا دوسرا روشن پہلو یہ ہے کہ اب ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں بھی مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا اصل سبب آگیا ہے اور وہ مرض کی جڑ تک پہنچ گئے ہیں، لکھتے ہیں:۔

"اگر مسلمان اس انقلابی تحریک کے مبلغ کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرتے اور اپنی زندگیوں کو اس کے سانچے میں ڈھالتے اور اپنے اعمال و کردار سے یہ ثابت کرتے کہ ان کا وجود اہل وطن کے لیے موجب صد رحمت اور باعث ہزار خیر و برکت ہے تو آج انہیں ناخوش گوار حالات کا یوں ماتم نہ کرنا پڑتا۔ (صفحہ ۱۰)

یہی بات ہے جو ہم مسلمانوں سے مسلسل کہہ رہے ہیں اور طرح طرح کے الزامات و اتہامات سن سن کر کہہ رہے ہیں۔ کاش جناب ڈاکٹر صاحب خود بنفس نفیس اس انقلابی تحریک کے مبلغ کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش فرماتے، ان جیسے اشخاص و افراد کا اقدام سینکڑوں، ہزاروں اشخاص کو ادھر متوجہ کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ان کی زندگی کے یہ تھوڑے سے قیمتی ایام جو

---

[1] ان سطور کی تحریر کے بعد بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی پریس کانفرنس میں مسلم کنونشن پر جو اظہار خیال فرمایا ہے اس سے اندازہ ہوا کہ ان کی جبین اقتدار پر شکن تو نہیں پڑی لیکن قوم پرور رہبران ملت ان کی خوشنودی کا مقام حاصل نہیں کرسکے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک کی اہم شکایت کی تردید کر دی اور بعض اہم تجاویز کو بھی

ناقابل قبول قرار دے دیا

بچ رہے ہیں وہ اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے وہ عملی اقدام کر گزریں، وہ اپنے کچھ ساتھیوں کو ناخوش کر کے خدا کو خوش کرلیں تو یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ گزشتہ احساس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :۔

"جہاں تک مسلمانوں کے بنیادی مسئلہ کا تعلق ہے۔ یہ میری سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے کہ اس کا حل اسلامی اسپرٹ کو اپنانے اور اسلامی نصب العین پر مشنری جذبہ کے ساتھ عمل پیرا ہونے میں مضمر ہے۔" صفحہ ۱۳

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو اس سوچی سمجھی رائے پر سب سے پہلے خود عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس خطبۂ صدارت کا تیسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں مسلم قوم کو ایک ایسی اقلیت کی طرح پیش نہیں کیا گیا ہے جو صرف اپنے وجود کے تحفظ کا سب کچھ سمجھتی ہو بلکہ اسے ایک امن پسند اور خیر پسند طاقت اور ملک کی تعمیر و ترقی میں ایک موثر عامل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے :۔

اس خطبے کا عبرتناک پہلو وہ نقشہ ہے جو ڈاکٹر صاحب نے پورے ملک کے انتشار اور بالخصوص مسلمانوں کی تباہی اور ان کے مصائب و مشکلات کا کھینچا ہے۔ یہ باتیں اس شخص کے قلم سے نکلی ہیں جو کانگرس کی تحریک آزادی کو نہ صرف پورے ملک کی نجات و فلاح کا ذریعہ سمجھتا تھا بلکہ مسلم قوم کی فلاح بھی اسی تحریک سے وابستہ جانتا تھا اور جانتا ہی نہ تھا بلکہ عملاً اپنی پوری زندگی اس تحریک کو کامیاب بنانے میں کھپا دی۔ یہ حصول فلاح و سعادت کے خواب شیریں کی کیسی تلخ تعبیر ہے۔

اس خطبے کا آخری اور الم ناک پہلو یہ ہے کہ کنونشن کی منظور کردہ تجاویز سے اس کی روح بالکل غائب ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ کسی اجتماع کے خطبۂ صدارت کے بنیادی نکات اور اس کی تجاویز میں ایسی عدم مطابقت آج تک میں نے نہیں دیکھی تھی بلکہ خطبۂ صدارت میں کہی ہوئی باتوں سے بالکل متضاد تجویز بھی منظور کی گئی ہے۔ خطبۂ صدارت میں پورے زور کے ساتھ اس کی تردید کی گئی ہے کہ مسلمان فرقہ پرست ہو سکتا ہے، لکھتے ہیں :۔

کیا ایسی تعلیمات سے بنے ہوئے دماغ فرقہ پرست کہے جانے کے مستحق ہیں، کیا ایک مسلمان جو دن رات میں ۲۴ بار رب العالمین کو یاد کرتا ہے۔ (رب المسلمین کو نہیں) اور ۲۴ بار روزانہ رب العلمین کے معنی و مطلب ذہن نشین کرتا رہتا ہے کیا ایسا دماغ فرقہ پرست بن سکتا ہے ؟ (صفحہ ۱۰)

لیکن اس کنونشن نے جو سب سے اہم تجویز پاس کی ہے اس میں اقلیتوں کے اندر بھی فرقہ پرستی کا اعتراف موجود ہے اور

اکثریت کی فرقہ پرستی کے ساتھ ساتھ اقلیت کی فرقہ پرستی کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ کمیونسٹوں نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں مسلم لیگ کے ساتھ جماعت اسلامی ہند کا نام بھی شامل تھا۔ اگرچہ کنونشن کی منظور کردہ تجویز میں کسی جماعت کا نام نہیں ہے لیکن کمیونسٹوں کی تجویز پریس میں آچکی ہے اور کنونشن کے سربراہوں کی طرف سے کوئی تردید پریس میں نہیں آئی اس لیے قدرتی طور پر لوگوں کے ذہن میں وہ نام آئیں گے۔ کنونشن ختم ہونے کے بعد بھی قوم پروروں ہی کی صفوں سے اس سلسلے میں متضاد خیالات سامنے آرہے ہیں۔ جمعیۃ العلماء ہند کے آرگن الجمعیۃ نے ۲۰ جون ۱۹۶۸ء کے اداریے میں بڑے زور و شور سے مسلم فرقہ پرستی کی تردید کی ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

"فرقہ پرستی کو ہندو فرقہ پرستی اور مسلم فرقہ پرستی میں تقسیم کرنا حقیقت واقعہ، عقل اور منطق سب کے خلاف ہے"

اور مدینہ بجنور کے ایک اداریے میں لکھا گیا ہے کہ مسلمانوں میں دو فرقہ پرور جماعتیں موجود ہیں۔ ایک مسلم لیگ اور دوسری جماعت اسلامی ہند۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود جمعیۃ العلماء کی صفوں میں کس درجہ انتشار فکر موجود ہے۔

یہ ایک ضمنی بات تھی جو بے ساختہ زبان قلم پر آگئی۔ اصلاً میں یہ کہہ رہا تھا کہ خطبۂ صدارت اور کنونشن کی تجاویز میں کوئی جوہری ربط دکھائی نہیں دیتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب نے اپنا خطبہ خلوص کے ساتھ لکھا تھا اور یقیناً خلوص کے ساتھ لکھا ہوگا تو انہیں خود کنونشن کی منظور کردہ تجاویز سے اطمینان حاصل نہ ہوا ہوگا اور اگر اسلام کی یہ قصیدہ خوانی محض برائے بیت اور عام مسلمانوں کو خوش کر دینے کے لیے تھی تو پھر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم خیال دوسرے رہبران قوم کو ہندستان کی مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے کوئی شکایت نہ ہونی چاہیے اس لیے کہ بھارت کے دستور نے خوبصورت الفاظ میں اس ملک کی اقلیتوں کو بھی اکثریت کے مساوی حقوق دے رکھے ہیں اور حکومت کے سربراہ اس کی قصیدہ خوانی بھی کرتے رہتے ہیں۔ پھر آخر آپ دستور کی ان دفعات کی تلاوت اور ان کی قصیدہ خوانی کو کافی کیوں نہیں سمجھتے؟ —— آپ نے الٰہی دستور و قوانین کے ساتھ جو رویہ اختیار کر رکھا ہے ٹھیک وہی رویہ اس ملک کی اکثریت یا حکمراں طبقہ دستور ہند کے ساتھ اختیار کیے ہوئے ہے۔ اگر اس کے رویے پر غور کرنے کے لیے ایک کنونشن منعقد کرنے کی ضرورت تھی تو پھر آپ کے رویے پر غور کرنے کے لیے ایک دوسرے کنونشن کی ضرورت ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے ساتھ ہمارا یہ رویہ ہی ہمارے مصائب کی جڑ ہے۔ جب تک ہم اسلام کے حقوق ادا نہیں کرتے اس وقت تک نہ دنیا کا کوئی دستور ہمارے حقوق ادا کر سکتا ہے اور نہ کوئی حکومت۔

کنونشن کے بعد کانگریس کے تین ممتاز لیڈروں، ڈاکٹر سمپورنانند، مسٹر اجیت پرشاد جین اور ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ

نے جو بیانات دیے ہیں وہ کنونشن منعقد کرنے والوں کے لیے بالخصوص اور عام مسلمانوں کے لیے بالعموم قابلِ غور ہیں۔ ان بیانات پر مسلمانوں کے کئی لیڈروں نے جوابی بیانات دیے ہیں۔ میں صرف مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند و صدر مجلس استقبالیہ مسلم کنونشن دہلی کے جوابی بیان کے چند اقتباسات نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں :-

"اگر مسلمان حکومت کے چند افراد یا فرقہ واریت پھیلانے والے ایک طبقے کے خلاف اپنی شکایات کا اظہار کریں تو کوئی سچا اور ایمان دار آدمی اسے قابلِ مذمت نہیں گردانے گا۔ ان شکایات کو غیر ملکوں میں پروپگنڈہ کرنے کا ذریعہ بنانا اور اس طرح دردکی چیخوں کو دبانا کم سے کم زخموں پر نمک پاشی کرنا ضرور ہے۔ کیا ہمیں ڈاکٹر سمپورنانند کے الفاظ سے یہ مطلب نکالنا چاہیے کہ ہندوستان کے مسلمان دوسرے درجے کے شہری ہیں اور یہ کہ پاکستان بن چکنے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو جنھوں نے اس ملک میں رہنے کو ترجیح دیا جہاں وہ پیدا ہوئے تھے غلام بن کر رہنا ہوگا۔ مولانا آگے چل کر کہتے ہیں کہ مسٹر اجیت پرشاد جین اور ڈاکٹر رام سوبھاگ سنگھ ایم۔پی کے بیانات بھی اتنے ہی تکلیف دہ ہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان صاحبان نے قومی اتحاد کمیٹی کے ممبر ہوتے ہوئے جس کی چیرمین مسز اندرا گاندھی ہیں۔ یہ بیانات دیے۔ قومی اتحاد کمیٹی کی رپورٹ کنونشن منعقد ہونے سے پہلے شائع ہو چکی تھی اور درگا پور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس نے اسے منظور کر لیا تھا ...... اگر ان تینوں صاحبان نے اپنے مذکورہ بالا بیانات میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ کنونشن کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں تو میں شاید یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں گا کہ کیا یہ رپورٹ سرسری طور پر منظور کر لی گئی تھی تاکہ ایک اور بے معنی کاغذ کی طرح وہ بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جائے۔

(قومی آواز ۱۹ر جون ۱۹۶۱ء) -

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے اس جوابی بیان میں جو روحانی کرب جھلک رہا ہے، اس پر تبصرہ بے کار ہے۔ مولانا نے مذکورہ بالا تین صاحبان سے جو دو سوالات کیے ہیں ان کا اثبات میں جواب دینے کی اخلاقی جرأت ان صاحبان میں نہیں ہے لیکن تیرہ سال کا تجربہ اثبات میں سر ہلا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بند آنکھیں اس کے اشارۂ سر کو نہ دیکھ سکیں۔ ابھی تو الکشن باقی ہے اس لیے قومی اتحاد کمیٹی کی رپورٹ شاید کچھ چلتی پھرتی نظر آئے۔ الکشن گزر جانے دیجیے پھر اس کا حشر دیکھ لیجیے گا۔ ڈاکٹر سمپورنانند نے جو بیان دیا ہے اس کا ایک حصہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیے بالعموم اور حکومت کے مسلمان عہدہ داروں کے لیے بالخصوص اہم ہے لیکن افسوس کہ اس حصہ کا اب تک کسی مسلمان لیڈر نے (باقی صفحہ ۱۱۴ پر)

ارشاداتِ رسول ؐ :-

غیظ و غضب

(سید احمد عروج قادری)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِیْ قَالَ لَاتَغْضَبْ فَرَدَّدَ مِرَاراً قَالَ لَاتَغْضَبْ۔

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ ایک شخص (جاریہ بن قدامہ) نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: "غصہ نہ کرو" انھوں نے کئی بار یہی سوال کیا اور ہر بار آپ نے یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کرو۔　　(بخاری کتاب الادب)

غصہ نہ کرو انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے طبعی طور پر جو قوتیں ودلیعت رکھی ہیں ان میں کی ایک اہم قوت "قوتِ غضبیہ" ہے۔ یہی قوت انسان کو جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اور دشمنوں سے بچاؤ پر آمادہ کرتی ہے' اسی قوت کے ذریعہ وہ خدا کے باغیوں سے جہاد کرتا اور نافرمانی کرنے والوں پر شریعت کی مقرر کردہ حدیں نافذ کرتا ہے۔ جب بات یہ ہے تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت و وصیت کا مفہوم کیا ہوگا؟

یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں ایک تو یہ کہ "غصہ نہ کرو" کی ممانعت آیا بالکل مطلق اور عام ہے یا اس نہی کا تعلق کسی خاص حیثیت سے ہے۔ دوسری یہ کہ تکلیف دہ اور ناخوش گوار صورت حال میں غصہ طبعاً آتا ہے اور اس کو روکنے پر انسان قادر نہیں ہے تو پھر ایک طبعی چیز سے روکنے کا مقصد کیا ہے؟

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ غصے کی نہی و ممانعت مطلق اور عام نہیں ہے بلکہ مقید اور خاص ہے۔ اس کا تعلق دنیوی امور اور اپنے نفس کے ایسے حقوق سے ہے جن کا اثر دوسروں پر نہیں پڑتا۔ حقوق اللہ کی ادائیگی غیرت سے جہاد، حدود و قصاص کی تنفیذ، ظالموں کے مقابلے میں جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت

ازالۂ منکرات اور اس طرح کے دوسرے دینی امور سے غصے کی نہی و ممانعت کا تعلق نہیں ہے۔ ایسے مواقع پر (شرعی حدود کے اندر) قوت غضبیہ کا استعمال محمود بلکہ ضروری ہے۔ اس معاملے میں بھی ہمارے لیے اسوہ اور نمونہ وہی ذات گرامی ہے جس نے "غصہ نہ کرو" کی نصیحت فرمائی ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حال یہ تھا کہ اپنی ذات کے لیے آپ نے نہ کسی پر کبھی غصہ کیا اور نہ انتقام لیا لیکن دینی امور میں صحابۂ کرام اور ازواج مطہرات کی نگاہوں نے چہرۂ مبارک کے جمال میں غصے کا جلال بھی دیکھا ہے۔ یہاں زیر بحث حدیث کی توضیح کے لیے یہ بات محض اشارۃً کہی گئی ہے ورنہ سیرت نبوی کا یہ باب بھی ایک مستقل اور وسیع باب ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ایک طبعی شے سے ممانعت کا مقصد کیا ہے؟ محدثین نے اپنے فہم و ذوق کے مطابق اس سوال کے چار جوابات دیے ہیں اور ان میں کا ہر جواب اپنی جگہ صحیح ہے:۔

(۱) غصہ نہ کرو کا مقصد یہ ہے کہ غیظ و غضب کے اسباب سے اجتناب کرو اور کسی ایسی چیز سے تعرض نہ کرو جس سے غصہ پیدا ہوتا ہو۔

(۲) اس کا مقصد یہ ہے کہ کبر و غرور سے پرہیز کرو کیونکہ غصے کی آگ کو بھڑکانے والے اسباب میں دوسروں کو اپنے مقابلے میں حقیر و پست اور اپنے کو دوسروں کے مقابلے میں بہتر و بلند سمجھنے کا مالیخولیا بہت بڑا سبب ہے۔

(۳) غصہ جن افعال و اقوال کا تقاضا کرتا ہے ان سے احتراز کرو۔

(۴) غصہ آنے کے بعد ہر ایسا اقدام سے بچو جس سے خدا و رسول نے روک دیا ہے۔ تیسرے اور چوتھے جواب میں محض تعبیر کا فرق ہے ورنہ بات ایک ہی ہے۔ اس مختصر توضیح کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وصیت و نصیحت پر غور کیجیے تو محسوس ہوگا کہ لا تغضب کا ایک جملہ اپنے اندر ایک کتاب چھپائے ہوئے ہے ـــ یہ دراصل نفس انسانی کی ایک عظیم قوت پر قابو پانے اور اسے دائرۂ اعتدال میں رکھنے کی نصیحت ہے کیونکہ یہ قوت اگر معتدل رہے تو انسان کے لیے بڑے خیر و صلاح کا ذریعہ بن سکتی ہے اور اپنے حدود سے تجاوز کرے تو اس کے لیے شر و فساد کا انتہائی خطرناک سبب بن سکتی ہے اس وقت دنیا کو قتل و غارت اور بدامنی کا جہنم بنانے میں اس قوت کی بے لگامی کو جتنا دخل ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔

انفرادی طور پر یوں تو ہر مسلمان اس وصیت نبوی کا مخاطب ہے لیکن ایک داعیِ حق سے غصہ نہ کرو کی مخاطبت عام مسلمانوں سے بھی زیادہ ہے۔ عام مسلمانوں کا ذاتی معاملات میں غصہ کرنا ان کی ذات کو یا کسی دنیاوی مفاد کو نقصان پہنچاتا ہے اور دعوت اسلامی کی راہ میں داعیِ حق کا اشتعال اور غصہ اس دین کو نقصان پہنچاتا ہے جسے

پھیلانے کا داعیہ اس کے دل میں ہے۔ شیطان دنیاوی معاملات میں غصہ دلانے کی جتنی سعی کرتا ہے، دعوت اسلامی کی راہ میں اس کی یہ سعی ہزار گونہ بڑھ جاتی ہے اس لیے داعیٔ حق کو ہر وقت اس سے چوکنا رہنا چاہیے۔

غیظ و غضب سے احتراز جس قدر انفرادی زندگی کو خطرات اور نقصانات سے بچانے کے لیے ضروری ہے اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ اجتماعی زندگی کی حفاظت و بقاء کے لیے لازمی ہے۔ کسی تنظیم یا ادارے کو چلانے اور ترقی دینے کے لیے مختلف تجویزیں، تدبیریں، پالیسیاں اور پروگرام سامنے آتے ہیں اور مقصد میں متحد ہونے کے باوجود اس کے افراد و ارکان اس سلسلے میں مختلف رائے رکھتے اور رکھ سکتے ہیں، اب اگر اس کے افراد و ارکان میں، اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی قوت نہ ہو، بلکہ ایسے موقع پر وہ غیظ و غضب سے بھر جائیں، ایک دوسرے کو الزام دینے اور نیتوں پر حملے کرنے لگیں تو کھلی بات ہے کہ وہ تنظیم یا ادارہ ترقی تو کیا کرے گا، شکار انتشار ہونے سے بھی نہیں بچ سکتا اور اگر معاملہ کسی دینی تنظیم یا دینی ادارے کا ہو تو اس شیطانی حربے غصہ سے بچاؤ اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ دنیوی تنظیمیں یا ادارے تو لڑ جھگڑ کر اور ان کے افراد ایک دوسرے پر کرسیاں پھینک کر بھی کسی نہ کسی طرح کام چلا لیتے ہیں لیکن جہاں معاملہ صرف دین و اخلاق کا ہو تو وہاں یہ صورت حال اس اخلاق اور اس دین ہی کو رسوا کر کے رکھ دے گی جسے پھیلانے اور سربلند کرنے کے لیے جماعت کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ

ترجمہ :۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں لوگوں کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو پائے۔

(بخاری، کتاب الادب)

اسی مفہوم کی حدیث امام مسلم نے بھی روایت کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے :۔

حضرت ابن مسعود سے روایت ہے حضور نے پوچھا تم لوگ اپنی جماعت میں پہلوان کسے شمار کرتے ہو، ہم نے جواب دیا۔ ہم لوگ اسے پہلوان سمجھتے ہیں جسے کشتی میں کوئی دوسرا پچھاڑ نہ سکے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ پہلوان نہیں ہے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو پاتا ہے۔

محدث بزار نے یہی حدیث کچھ مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے :۔

حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک گروہ کے پاس سے گزرے وہاں لوگ ایک پتھر

کشتی لڑ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے جواب دیا، فلاں شخص کا حال یہ ہے کہ جس سے بھی کشتی لڑتا ہے اسے پچھاڑ دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا کیا میں اس سے زیادہ قوی آدمی کا پتہ نہ بتاؤں؟ یہ وہ ہے جس سے کوئی شخص اشتعال انگیز باتیں کرتا ہے اور وہ اپنے غصے کو پی جاتا ہے، اس پر غالب آجاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے شیطان کو مغلوب کرلیتا ہے اور اپنے ساتھی کے شیطان پر بھی غالب آجاتا ہے۔"

جہادِ نفس کی اہمیت

ان حدیثوں سے جو سبق حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اندرونی دشمن۔ نفس۔ سے جہاد، اس پر کنٹرول اور اس کی شکست و ریخت، بیرونی دشمنوں کو پچھاڑنے اور ان پر غالب آنے سے زیادہ سخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے پر قابو حاصل کرنے والے کو کشتی کے پہلوان سے زیادہ قوی انسان اور حقیقی معنی میں پہلوان قرار دیا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر وقت مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے نامی پہلوان، غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو پانے میں ناکام ہوجاتے ہیں۔

تعلیم و تربیت کا ایک مؤثر طریقہ

ان حدیثوں سے ایک طرف غصے پر قابو حاصل کرنے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا ڈھنگ بھی معلوم ہوتا ہے، آپ کی تعلیم و تربیت کا ایک عام انداز یہ بھی تھا کہ صحابہ کرام سے بہت سے دنیوی امور کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے اور پھر جواب سن کر ان کے ذہن کو دینی و اخروی امور کی طرف پھیر دیتے تھے۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ چلتے پھرتے روزانہ کے واقعات میں سے کسی واقعہ کو دینی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنالیتے تھے محدث بزار نے حضرت انس سے جو روایت کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو کشتی کی مشق کرتے دیکھ کر آپ نے اسے ایک اہم تعلیم کا ذریعہ بنالیا۔ اس طریقۂ تعلیم و تربیت کے کئی فائدے سمجھ میں آتے ہیں:۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ استفہام و استفسار سے مخاطب کا ذہن خود کام کرنے لگتا ہے۔ ایک طرف وہ سوال کا جواب تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے اور دوسری طرف استاذ کے جواب کا منتظر و مشتاق بھی ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انتظار و اشتیاق کے بعد جو چیز حاصل ہوگی وہ ذہن میں جڑ پکڑے گی۔ دوسرا فائدہ، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح درس و تدریس اور وعظ و نصیحت کا بار ذہن پر نہیں پڑتا اور ہنستے کھیلتے تعلیم و تربیت ہوجاتی ہے۔ تیسرا فائدہ، یہ سمجھ میں آتا ہے کہ روزانہ کے پیش پا افتادہ حالات و واقعات سے گزرتے ہوئے ذہن کو، دین، دینی امور اور آخرت

کی طرف موڑنے کی مشق پیدا ہوتی ہے اور دنیوی امور سرانجام دیتے ہوئے بھی ذہن سے غفلت پیدا نہیں ہوتی،
احادیث میں اس طریقۂ تعلیم و تربیت کی متعدد مثالیں ملتی ہیں ۔

غصہ پر قابو پانے کی تدابیر

غصہ، چونکہ ایک طبعی شے ہے اس لئے تکلیف دہ اور ناپسند خاطر صورت حال میں بے اختیار آتا ہے' انسان کو
قدرت حاصل نہیں ہے کہ وہ اسے آنے ہی سے روک دے ۔ اوپر گزر چکا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کا مقصد
بھی یہ نہیں ہے کہ اس طبعی شے پر قدغن لگائی جائے بلکہ غرض یہ ہے کہ اس کے اثرات پر قابو حاصل کیا جائے اور
غصہ آنے کے بعد ایسی حرکات سرزد نہ ہوں جو ظلم و زیادتی قرار پائیں اور شریعت کی نگاہ میں ناروا ثابت ہوں ۔ یہ چیز
انسان کی قدرت کے اندر ہے اور وہ مناسب تدابیر اختیار کرنے تو غصے پر قابو حاصل کرسکتا ہے ۔ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس پر قابو پانے کی متعدد تدابیر بتائی ہیں ۔ ذیل میں الگ الگ انہیں لکھا جارہا ہے ۔

فضیلت اور ثواب کا استحضار | امام بخاری نے اپنی صحیح میں "غضب سے احتراز" کا جو باب درج کیا ہے اس کی ابتدا قرآن کی درج ذیل دو آیات سے کی ہے ۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ
(سورۂ شوریٰ ۳۷)

اور جو لوگ بڑے گناہوں اور بے حیائی سے بچتے ہیں اور جب غصہ آئے تو معاف کردیتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران ۱۳۴)

جو خوشی اور غم میں خرچ کرتے ہیں، جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کردیتے ہیں اور اللہ ایسے نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے ۔

یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ غصہ آنے کے بعد غصہ دلانے والے کو معاف کردینا اور غصے کو پی جانا ایمان اور تقوے
کی صفت ہے کیونکہ سورۂ شوریٰ کی آیت میں مومنوں کی صفات شمار کی گئی ہیں اور سورۂ آل عمران کی آیت میں متقیوں
کی معلوم ہوا کہ مومن و متقی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیتے بلکہ وہ عالی ظرف ہوتے اور قصور
کرنے والوں کو معاف کردیتے ہیں۔ اس طرح یہ احساس و شعور غصہ پر قابو پانے اور پی جانے کی ایک مستقل اور دائمی تدبیر
بن جاتا ہے۔ اوپر جو احادیث گزری ہیں وہ بھی کظم غیظ (غصہ پی جانا) کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں ۔ یہاں دو مزید

حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:۔

سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَسْتَطِيعُ اَنْ يُنْفِذَهُ دَعَاهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رُؤُسِ الْاَشْهَادِ حَتّٰى يُخَيِّرَهُ فِيْ اَيِّ الْحُوْرِ شَاءَ

ترمذی-ابوداؤد

سہل بن معاذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا، جس شخص نے غصے کو پی لیا حالانکہ اسے قدرت تھی کہ اپنے غصے کو نافذ کر دے (یعنی غصہ دلانے والے سے انتقام لے لے) تو قیامت میں اللہ تعالیٰ اسے مجمع عام میں بلائے گا یہاں تک کہ وہ اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے پسند کر لے

مجمع عام میں بلانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسے خلق خدا کے سامنے ایک محترم و مکرم ہستی کی طرح پیش کیا جائے گا کہ دیکھو یہ ہے وہ بندہ جس نے خدا کو خوش کرنے کے لیے اپنے نفس سے مجاہدہ کیا، غصے پر قابو پایا اور قدرت رکھنے کے باوجود قصور وار کو معاف کر دیا۔ "جس حور کو چاہے پسند کر لے" اس فقرے کا مفہوم یہ ہے کہ میدان حشر میں اس کی عزت افزائی کے بعد نہ صرف یہ کہ اسے جنت میں داخل کیا جائے گا بلکہ وہاں بلند درجات عطا کیے جائیں گے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ

(مسلم ج ۲)

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معاف کرنے کے صلے میں اللہ بندے کی عزت میں اضافہ ہی کرتا ہے اور جو بھی اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس کو بلند کر دیتا ہے۔

اس حدیث میں جو جامع الفاظ اختیار کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عفو و تواضع دنیا اور آخرت دونوں جگہ انسان کو عزت اور رفعت عطا کرتے ہیں قرآن و حدیث میں نیکیوں کے اجر کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ خدا کے بندے ادھر مائل ہوں اور خوش دلی کے ساتھ انہیں اختیار کریں۔ غصہ پی جانے اور معاف کرنے کا یہ اجر اگر ذہن میں تازہ ہو تو غصہ آنے کے بعد اس پر قابو پا لینا آسان ہو جائے گا۔

شیطان سے استعاذہ غصے پر قابو پانے کی دوسری حقیقی اور مستقل تدبیر شیطان سے استعاذہ ہے۔

سُلَيْمَانُ بْنُ صُرَدٍ قَالَ اسْتَبَّ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ عِنْدَهُ جُلُوسٌ فَأَحَدُهُمَا يَسُبُّ صَاحِبَهُ مُغْضَبًا قَدِ احْمَرَّ وَجْهُهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ لَوْ قَالَ أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ فَقَالُوا لِلرَّجُلِ أَلَا تَسْمَعُ مَا يَقُولُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنِّي لَسْتُ بِمَجْنُونٍ۔

(بخاری کتاب الادب)

سلیمان بن صرد کہتے ہیں، ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ دو شخص جھگڑنے لگے ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو غصے میں گالی دی اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر حضور نے فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اسے کہہ لے تو وہ کیفیت دور ہو جائے جسے وہ محسوس کر رہا ہے اگر وہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہہ لے (تو غصہ دور ہو جائے) لوگوں نے اس شخص سے کہا، کیا تم وہ بات نہیں سن رہے ہو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں اس نے جواب میں کہا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔

یہ حدیث تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ بخاری مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ میں نے اس کے الفاظ بخاری سے نقل کیے ہیں۔

بعض محدثین کا خیال ہے کہ غصے کو رفع کرنے کا سب سے قوی اور زود اثر علاج' توحید حقیقی کا استحضار ہے حضور نے اس موقع پر شیطان سے استعاذہ کی جو تعلیم دی ہے وہ اسی استحضار کی ایک تدبیر ہے۔ بے جا غصہ شیطان کے اغوا سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے شر سے بچانے والی ذات صرف خدا کی ہے۔ اس موقع پر انسان جب اپنے آپ کو شیطان کے شر سے خدا کی پناہ میں دے دیتا ہے تو شیطان اس طرح غائب ہو جاتا ہے جس طرح آفتاب کی روشنی سے تاریکی غائب ہو جاتی ہے۔ استعاذہ کرنے والے کی زبان سے جیسے ہی شعور کے ساتھ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کا کلمہ نکلتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک ایسی طاقت کی پناہ میں پاتا ہے جس کے اقتدار کی گرفت سے کائنات کی کوئی شے باہر نہیں ہے وہ اپنے معاملے کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور غیظ و غضب کی بجلیاں سرد پڑ جاتی ہیں۔

جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو قبول نہیں کیا اور جواب میں یہ کہا کہ میں پاگل نہیں ہوں اس کے بارے میں محدثین کا خیال یہ ہے کہ وہ یا تو کوئی منافق تھا یا کوئی نا تربیت یافتہ دیہاتی۔ راقم الحروف کا خیال

یہ ہو کہ یہ جواب اس شخص کے ایسے شدید غصے کی علامت ہو جب انسان تھوڑی دیر کے لیے واقعی پاگل ہو جاتا ہو اس کا یہ کہنا کہ "میں پاگل نہیں ہوں" اس کے غصے میں پاگل ہو جانے کی دلیل ہے۔ اس جواب سے یہ سبق ملتا ہو کہ شدت اختیار کرنے سے پہلے ہی غصے پر قابو پالینے کی فکر کرنی چاہیے ورنہ خطرہ ہے کہ غصے کی شدت ذہنی توازن کو بگاڑ دے اور پھر کوئی تدبیر کارگر نہ ہو۔

سکوت اگر کسی کی حرکت یا اس کی گفتگو سے غصہ پیدا ہو تو سب سے پہلی تدبیر یہ ہے کہ اس سلسلۂ کلام کو چھوڑ کر انسان خاموش ہو جائے اور مخاطب کی بات کا جواب نہ دے

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَفَعَهُ وَ اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ وَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ وَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ

ابن عباس سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے خاموش ہو جانا چاہیے۔ یہ بات آپ نے تین بار فرمائی (احمد بحوالہ جمع الفوائد)

وضو غصے پر قابو پانے کی حقیقی اور دائمی تدبیر تو یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو نگاہ میں رکھے، شیطان سے پناہ مانگے اور اس فضیلت و اجر کو حاصل کرنے کی سعی کرے جو اللہ نے غصہ پی جانے والوں اور معاف کر دینے والوں کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ احادیث میں ہمیں ایسی تدابیر بھی ملتی ہیں جو غصے کے وقت کی حالت کو بدل دینے کی وجہ سے خارجی اور نفسیاتی طور پر موثر ہوتی ہیں ان میں کی ایک تدبیر "سکوت" کا ذکر اوپر گزرا دوسری تدبیر "وضو" ہے

ابو وائل قَالَ دَخَلْنَا عَلٰى عُرْوَةَ بْنِ مُحَمَّدٍ السَّعْدِيِّ فَكَلَّمَهُ رَجُلٌ فَاَغْضَبَهُ فَقَامَ فَتَوَضَّاَ فَقَالَ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ عَنْ جَدِّيْ عَنْ عَطِيَّةَ قَالَ قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطَانِ وَاِنَّ الشَّيْطَانَ خُلِقَ مِنْ نَارٍ وَاِنَّمَا تُطْفَئُ النَّارُ بِالْمَاءِ فَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّاْ۔ (ابوداؤد)

ابو وائل کہتے ہیں کہ ہم لوگ عروۃ بن محمد سعدی کے پاس گئے، ان سے ایک شخص نے گفتگو کی اور انہیں غضب ناک کر دیا وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور انھوں نے وضو کیا، پھر یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو غصہ شیطان کا اثر ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے تو جب تم میں سے کسی شخص کو غصہ آئے تو اسے وضو کر لینا چاہیے۔

یہ حدیث ان احادیث میں سے ہے جن میں حکم کے ساتھ اس کی علت و مصلحت بھی بتا دی جاتی ہے۔ یہاں حکم آخر میں دیا گیا ہے اور اس کی علت پہلے بتائی گئی ہے اور طریقہ اتنا منطقی ہے کہ وہ نتیجہ آپ سے آپ نکلتا ہے جو حکم میں موجود ہے۔ اصل میں تو پانی کا استعمال مفید ہے کیونکہ غصہ ہیجانِ خون کی ایک کیفیت ہے جو حرارت سے پیدا ہوتی ہے لیکن وضو کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ وضو عبادت کا وسیلہ اور خود ایک عبادت بھی ہے اور مومن کا ذہن اس کی وجہ سے خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح وضو خارجی اور داخلی دونوں طرح کی چیزوں سے مرکب تدبیر بن جاتا ہے۔

تغیرِ حال غصے کی حالت پیدا ہوتے ہی اگر اس وقت کے حال و ہیئت میں تبدیلی پیدا کر لی جائے تو اس کا بھی اچھا نفسیاتی اثر مترتب ہوتا ہے

اَبُوْ ذَرٍّ رَفَعَهٗ اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ فَاِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَاِلَّا فَلْيَضْطَجِعْ

(ابو داؤد)

حضرت ابو ذر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی ہے کہ حضور نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اس حال میں کہ وہ کھڑا ہو تو اسے بیٹھ جانا چاہیے اگر غصہ دفع ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے لیٹ جانا چاہیے۔

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے :-

فَمَنْ اَحَسَّ بِشَيْءٍ مِنْ ذٰلِكَ فَلْيَلْصَقْ بِالْاَرْضِ۔

جو شخص ذرا بھی غصہ محسوس کرے، اسے زمین سے چمٹ جانا چاہیے۔

"زمین سے چمٹنا" اس حقیقت کی طرف بھی ذہن کو متوجہ کرے گا کہ انسان خاکی ہے اور خاک کا خاصہ تواضع ہے غرور و استعلا نہیں ہے۔ اگر کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور یہ کافی نہ ہو تو لیٹ جائے۔ اس تعلیم میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ جب تک غصہ فرو نہ ہو اس کو دفع کرنے کی تدبیر ہونی چاہیے۔

ان احادیث کی اہمیت اور ماحصل۔ غیظ و غضب اور اس کو دور کرنے کی تدابیر سے متعلق تمام احادیث کا استقصاء نہیں کیا گیا ہے اس کے باوجود یہاں جو حدیثیں پیش کی گئی ہیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چھ صحابیوں سے مروی ہیں۔ کسی حکم کا متعدد صحابہ سے مروی ہونا اہمیت کی ایک دلیل ہوتی ہے۔ ان احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ غصے پر قابو پانا ایمان و تقویٰ کی تکمیل کے لیے ایک ضروری کام ہے اگر کوئی مسلمان اپنے غصہ پر قابو حاصل نہیں کرتا تو ایک طرف وہ داعیِ اسلام بننے کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور دوسری طرف اپنے آپ کو دنیا و آخرت کے سخت نقصانات و خطرات کا ہدف بنا لیتا ہے۔

قرآن — محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں

(سید جلال الدین عمری)

قرآن خدا کا کلام ہے۔ حضرت مسیح کو دنیا سے رخصت ہوئے پانچ سو سال گذر چکے تھے کہ جزیرہ نمائے حجاز کے سب سے متمدن شہر مکہ کے اعلیٰ خاندان کے ایک شخص نے تیئیس سال کی لمبی مدت میں اس کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ یہ خدا کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔ قرآن کا نزول چھٹی صدی میں ہونے والا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا اور سب سے اہم واقعہ ہے۔ اس کی صدا مکہ کی پہاڑیوں سے بلند ہوئی اور دنیا کے بڑے حصے میں گونجنے لگی۔ قرآن ایک با عظمت اور تاثیر سے بھرا ہوا کلام ہے۔ اس میں آسمان کی بلندی اور جادو کا اثر ہے۔ وہ بجلی کی کڑک اور دریا کی روانی رکھتا ہے جس نے اسے توجہ سے سنا وہ اس کا گرویدہ ہو گیا اور جو اس کا منکر اور باغی ہوا وہ اس کی عظمت کا انکار نہ کر سکا۔

اس کلام کے ماننے والوں نے بھی اور نہ ماننے والوں نے بھی اس کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن اس کا صحیح تعارف وہی ہو سکتا ہے جو اس کے پیش کرنے والے کی زبان سے سنا گیا۔ ذیل کے صفحات میں آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں قرآن کا تعارف ملے گا۔

۱۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے:۔

إِنَّ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
قَدْ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ	اللہ اس کتاب کے ذریعہ بعض قوموں کو اوپر
أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ ٥ (مسلم)	اٹھائے گا اور بعض کو پستی میں پھینک دیگا

یہ قرآن کا مقصدِ نزول ہے۔ قرآن خدا کی زمین پر خدا کی قائم کردہ عدالت ہے۔ جو قوم اس کتاب کو اپنائے گی دنیا کی قوموں میں اس کا وزن بڑھ جائے گا۔ کوئی قوت اور کوئی طاقت اس کو نیچا نہیں دکھا سکتی۔

جو بھی اس سے ٹکرائے گا پاش پاش ہو جائے گا۔ قرآن یہ فیصلہ کرنے آیا ہے کہ یہاں عزت و سربلندی کس کے لیے ہے اور ذلت و رسوائی کس کے حصے میں آنے والی ہے۔ قرآن خدا کی حکومت کا منشور ہے۔ وہ جس کے ہاتھ میں ہوتا ہے خدا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس شخص کو خدا کی مدد حاصل ہو کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا۔ اس سے جنگ خدا سے جنگ کے ہم معنی ہے اور جو خدا سے پنجہ آزمائی کرنا چاہے اس کا پنجہ سلامت نہیں رہ سکتا۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ (اے محمد) جس وقت تم (دشمن پر) تیر چلا رہے تھے اس وقت تم نہیں تیر چلا رہے تھے بلکہ اللہ تیر چلا رہا تھا۔

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ (جو لوگ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں) وہ حقیقت میں تمہاری تکذیب نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کر رہے ہیں

پیغمبروں کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ خدا کا کلام اس زمین پر خدا کی قوت بن کر آتا ہے۔ جو قوم آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتی ہے وہ اگر کمزور ہے تو اس کی کمزوری قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے وہ پستی میں پڑی ہوئی ہے تو اس کو بلندی نصیب ہوتی ہے۔ اس پر جن افراد اور جن قوموں کی بالادستی قائم ہوتی ہے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے قدموں کے نیچے آجاتے ہیں حکومت و اقتدار اس کے قبضہ میں چلا آتا ہے اور قوموں اور جماعتوں کے درمیان فیصلہ کا حق اس کو حاصل ہوتا ہے

وَنُرِيْدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۔ ہم ان لوگوں پر احسان کرنا چاہتے ہیں جو زمین میں کمزور پڑے ہیں اور ہم ان کو امام بنائیں گے اور وہ خدا کی زمین کے وارث ہوں گے۔

۲۔ حضرت عثمان بن عفان رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ (بخاری و دیگر کتب حدیث) تم میں بہتر انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔

وہ افراد انسانیت کے محسن ہیں جو اس کو خدا کی راہ دکھاتے ہیں اور اس کو حق و باطل میں تمیز کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ جہاں ہوتے ہیں حق کی شمع جلتے ہیں۔ انسانی سوسائٹی کے لیے ان سے زیادہ کارآمد اور

مفید کسی کا وجود نہیں ہوسکتا۔ انسانیت کے محسن اور خیر خواہ بہت سے دوسروں کے فائدے کے لیے کوئی اگر کنواں
کھدوا دے یا نہر تعمیر کرادے تو وہ بلا شبہ انسانوں پر احسان کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص بھوکے کو کھانا اور ننگے
کو کپڑا دے وہ بھی محسن ہے حتیٰ کہ راستے سے کانٹا اور پتھر ہٹانے والا بھی انسانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد
ہے لیکن جو شخص انسانوں کو خدا کی راہ دکھائے وہ سب سے بڑا خیر خواہ اور سب سے بڑا محسن ہے۔ اس روئے
زمین پر اس سے زیادہ سعید وجود کا تصور ممکن نہیں جو خدا تک انسانوں کے پہنچنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

قرآن انسانوں کے نام ان کے خالق کا پیغام ہے۔ جو شخص قرآن سناتا ہے وہ اپنی زبان سے خدا کا
پیغام نشر کرتا ہے۔ یہ سب سے بڑا اور بہتر بات ہے جو کسی انسان کے کان میں پڑ سکتی ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔

اس شخص کی بات سے زیادہ بہتر بات اور کس کی ہو سکتی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے اور اچھے کام کرے اور کہے کہ میں خدا کے فرماں برداروں میں سے ہوں۔

جو شخص خدا کی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے وہ دوسروں ہی کے فائدے کا کام نہیں کرتا بلکہ خود اپنی
کامیابی اور بھلائی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ کسی کو سیدھی راہ پر لگانے والا اپنے آپ کو خدا کی رحمت کا مستحق بناتا ہے۔
جو شخص آپ کے ذریعہ ہدایت پاتا ہے وہ آپ کے لیے جنت کی راہ صاف کرتا ہے۔ انسانوں کے جنگل میں جو شخص
قرآن کا داعی بن کر کھڑا ہو وہ خیر و خوبی کے بلند ترین مقام پر فائز ہے۔ اس سے بڑا خوش نصیب کوئی نہیں جس کے
متعلق خدا کے چند بندے قیامت میں یہ کہیں کہ خدایا اس نے ہمیں تیری راہ دکھائی اور تیرے عذاب سے بچایا
وہ خدا کی ان ساری رحمتوں کا مستحق ہوگا جن کا استحقاق فرداً فرداً دوسرے انسانوں نے پیدا کیا۔ یہ ان کے حسن عمل
کا ذریعہ بنا تھا اس لیے ان کے ہر اچھے عمل کا اجر اسے بھی برابر ملے گا۔

اس امت کو خیر امت کہا گیا کیونکہ وہ حامل قرآن ہے اور بھلائیوں کی طرف بلاتی اور برائیوں سے روکتی
ہے۔ کامیاب ترین انسان وہ ہے جو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو کسی بلند تر مقصد کے لیے وقف کر دے۔ جو
شخص قرآن کے سیکھنے اور سکھانے میں لگ جائے اس نے سب سے بڑے مقصد کو پا لیا۔ قرآن اس دنیا میں
عزت و سربلندی کا ذریعہ اور آخرت میں نجات کی سبیل ہے۔ جو شخص قرآن کے لیے اپنی قوتیں صرف کرتا ہے وہ کامیابی
کی راہ میں آگے بڑھتا ہے اس کو کبھی اس کا افسوس نہ ہوگا کہ اس نے اپنے وقت اور صلاحیت کا کوئی حصہ ضائع

کیا ، البتہ قرآن کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹ کر جس راہ میں بھی انسان کی قوتیں صرف ہوں گی اس کا نتیجہ سوائے افسوس اور ندامت کے کچھ نہیں نکلے گا ۔

۳ ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں :-

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا حَسَدَ اِلَّا عَلَی اثْنَتَیْنِ رَجُلٍ اٰتَاہُ اللّٰہُ الْقُرْاٰنَ فَھُوَ یَقُوْمُ بِہٖ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَاٰنَاءَ النَّھَارِ وَرَجُلٍ اٰتَاہُ اللّٰہُ مَالًا فَھُوَ یُنْفِقُ مِنْہُ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَاٰنَاءَ النَّھَارِ[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رشک تو دو آدمیوں پر ہو سکتا ہے ۔ ایک وہ جس کو اللہ قرآن کا علم دے اور وہ شب و روز اس کو لیکر کھڑا ہو جائے دوسرا وہ جس کو اللہ مال دے اور وہ رات دیکھے نہ دن بلکہ ہر وقت اس کو خدا کی راہ میں خرچ کر رہا ہو ۔

قرآن اس بات کا علم عطا کرتا ہے کہ انسان خدا کے انعامات کا کیسے مستحق ہوتا ہے ۔ جس شخص کے پاس قرآن ہے اس کے پاس ایسا ذریعہ ہے جس سے وہ خدا کی مرضی معلوم کر سکتا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں وہ کلید ہے جس سے خدا کی رحمت کے دروازے کھلتے ہیں ۔ وہ زندگی گزارنے کے خدائی آداب سے واقف ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ کائنات کا رب کن کاموں سے خوش ہوتا ہے اور کون سے کام اس کو ناخوش کرنے والے ہیں ۔ قابلِ رشک ہے وہ انسان جس کو کامیابی کا سب سے بڑا گُر ہاتھ آئے اور وہ اس کو شب و روز کام میں لائے ۔ جو شخص رات کو اس حال میں ہو کہ اس کا سینہ خدا کے کلام سے بھرا ہوا ہو اور اس طرح اٹھے کہ اس کے دل و دماغ پر خدا کے کلام کی حکومت ہو ، اس پہ شاہانِ تخت و تاج کو رشک کرنا چاہیے کیونکہ کل خدا کی بے پایاں نعمتوں کی اس پر بارش ہونے والی ہے ۔

جو شخص قرآن کو لے کر کھڑا ہو وہ پہلے اپنی زندگی میں اس کو راہنما بنائے گا ۔ پھر اس کی زبان اس کی شہادت دے گی اور اگر اس کو اقتدار حاصل ہے تو وہ انسانوں کے درمیان قرآن کی حکومت قائم کرے گا اور اس کے مطابق فیصلہ کرے گا ۔ اب اس کا مقام ایک صالح اور خدا ترس انسان سے بڑھ کر امامِ عادل اور مصلحِ انسانیت کا ہو گا ۔ اس کو صرف اس کی انفرادی نیکیوں ہی کا اجر نہیں ملے گا بلکہ وہ اس عظیم ثواب کا حقدار ہو گا جو خدا کے ہاں ان افراد کے لیے مخصوص ہے جو دنیا سے ظلم کو مٹانے اور عدل کو قائم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں ۔ اسی حدیث کے بعض دوسرے الفاظ یہ ہیں " رجل اٰتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بہ بین الناس " (مسلم) وہ شخص قابلِ رشک ہے

---

[1] مسلم اور بخاری ۔ الفاظ مسلم کے ہیں ۔

جس کو اللہ حکمت سے نوازے اور وہ اس کے ذریعہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے۔

حدیث میں دوسرا شخص جس کو قابلِ رشک قرار دیا گیا ہے وہ ہے صاحب مال جو اپنے مال کو خدا کی راہ میں بے دریغ لٹا رہا ہے۔ اگر انسان کے پاس دولت ہے تو عیش دنیا کی ہر چیز اس کو ملی ہوئی ہے کیونکہ مال و دولت عیش و عشرت کے حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جو شخص اپنے اس قوی ترین ذریعہ کو خدا کی راہ میں صرف کرتا ہے گویا وہ ان ساری چیزوں کو خدا کی راہ میں لٹاتا ہے جن کا حصول مال کے ذریعہ اس کے لیے ممکن تھا۔ ایک شخص جو اپنا روپیہ خدا کی راہ میں لگاتا ہے وہ دیکھنے میں صرف روپیہ صَرف کرتا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اپنے ہاتھ آئے ہوئے سارے اسباب عیش کو قربان کر رہا ہے۔ وہ اس شخص کی مانند ہے جو خدا کے لیے اپنی شاندار کوٹھی چھوڑ دے، اپنی جائداد وقف کر دے، اپنی اچھی غذا اور عمدہ پوشاک ترک کر دے۔ اپنے اونچے سے اونچے کاروبار سے دست بردار ہو جائے کیونکہ یہ ساری ہی چیزیں مال صَرف کر کے وہ پا سکتا تھا۔ اس طرح مال کا دینے والا کوئی ایک چیز نہیں دیتا بلکہ بہت سی چیزیں دیتا ہے۔ اسی سے آپ اس کے بے پایاں ثواب کا تصور کر سکتے ہیں۔

صاحب قرآن اور صاحب دولت کے قابل رشک ہونے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا نے ان کو جو نعمت دی ہے اس کو وہ اس طرح لٹا رہے ہیں کہ ان کی زندگی اللہ والوں کے لیے قابل رشک بن گئی ہے۔ کوئی خدا کا بندہ ان کو دیکھتا ہے تو بے اختیار تمنا کرنے لگتا ہے "کاش مجھے بھی یہ سعادت حاصل ہوتی!" وہ خدا کے کسی مقرب انسان کا تصور کرتا ہے تو اس کے ذہن میں ان کی تصویر آجاتی ہے۔ وہ اگر خدا سے اپنے لیے کسی بلند مرتبہ کی دعا کرتا ہے تو اس کی دعا میں ان کا ذکر شامل ہو جاتا ہے اور بے اختیار اس کی زبان بولنے لگتی ہے، خدایا مجھے بھی ان کا سا درجہ اور مقام عطا فرما اور ان کی طرح حسن عمل کی توفیق دے۔ حضرت عمرؓ جب شہید ہو گئے تو حضرت علیؓ نے ان کو دیکھ کر کہا کہ اس زمین پر صرف یہی ایک شخص تھا جس کو دیکھ کر میں تمنا کرتا تھا کہ میں خدا کے حضور پہنچوں تو میرے نامۂ اعمال میں اسی کے سے اعمال ہوں۔ اس ٹکڑے کی یہ تشریح خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے چنانچہ یہ حدیث ذرا تفصیل کے ساتھ ان الفاظ میں آئی ہے۔

"قابل رشک تو دو آدمی ہیں۔ ایک وہ جو قرآن کا علم رکھتا ہو اور اوقات شب و روز میں اس کی تلاوت کرتا ہے۔ اس کی تلاوت کو سن کر اس کا پڑوسی کہتا ہے۔ کاش میں بھی قرآن پڑھ سکتا، اور اس کی طرح عمل کر سکتا۔ دوسرا قابل رشک آدمی وہ ہے جس کو اللہ نے دولت دی ہے اور

اس کو حق کی راہ میں لٹا رہا ہے۔ اس کو دیکھنے والا انسان کہتا ہے کاش مجھے دولت ملتی اور میں بھی اس کی طرح خدا کی راہ میں خرچ کرتا۔ (بخاری)

اس جملے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ کے پڑھنے والے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے کا درجہ کل قیامت کے دن اتنا اونچا ہوگا کہ لوگ ان پر رشک کریں گے اور تمنا کریں گے کہ کاش یہ مقام ہمیں بھی حاصل ہوتا۔

۴۔ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَوْصِنِیْ قَالَ عَلَیْکَ بِتَقْوَی اللّٰہِ فَاِنَّہٗ رَأْسُ الْاَمْرِ کُلِّہٖ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ زِدْنِیْ قَالَ عَلَیْکَ بِتِلَاوَۃِ الْقُرْاٰنِ فَاِنَّہٗ نُوْرٌ لَّکَ فِی الْاَرْضِ وَذُخْرٌ لَّکَ فِی السَّمَاءِ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ)

حضرت ابوذرؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ مجھے نصیحت فرمائیے آپ نے فرمایا تقویٰ کا دامن تھام لو کیونکہ یہ سارے دین کی جڑ ہے۔ میں نے کہا اللہ کے رسول کچھ اور نصیحت کیجیے۔ آپ نے فرمایا۔ قرآن کی تلاوت نہ چھوڑو کیونکہ قرآن تمہارے لیے زمین میں نور ہے اور آسمان میں کامیابی کا ذخیرہ ہے۔

انسان اگر خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ کسی سے نصیحت کی درخواست کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اس کو بہتر اور مفید مشورہ دے سکتا ہے۔ ساتھ ہی درخواست نصیحت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ درخواست کرنے والا اپنے اندر کوئی خلا محسوس کر رہا ہے۔ وہ اس زعم اور گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہے کہ اس کی زندگی ہر پہلو سے مکمل ہے اور کسی کی نصیحت اور مشورے سے قطعاً وہ بے نیاز ہے۔

حضرت ابوذرؓ کی درخواست ظاہر کر رہی تھی کہ وہ دوسروں کی نصیحت کے پیاسے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ بات بتائی جو دین کا حاصل ہے۔ آپ نے فرمایا "تقوے کا دامن تمہارے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے کیونکہ یہ سارے دین کی جڑ ہے۔" تقویٰ دین کی روح ہے۔ دین سے اگر تقوے کو نکال دیا جائے تو وہ چند رسوم اور مظاہر کا مجموعہ ہوگا۔ انسان کو دین کے تمام اعمال سے جو چیز ملتی ہے وہ تقویٰ ہے۔ تقویٰ اگر حاصل نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ابھی دین نہیں ملا ہے۔ تقویٰ کیا ہے؟ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے اور پھر بھی اس کو یہ خوف کھائے جا رہا ہو کہ حق نعمت ادا نہ ہوا۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی پر خدا کا خوف اس قدر چھا جائے کہ معصیت کا تصور اس کے جسم پر کپکپی طاری کر دے۔ تقویٰ یہ ہے کہ انسان کی خواہشات

خدا کی مرضی کے تابع ہو جائیں اور وہ اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کے سارے اثاثے کو خدا کے ہاتھ بیچ چکا ہو۔ دنیا انسان کو ہر طرف سے کھینچ رہی ہے۔ جس شخص کے دل میں خدا کا تقویٰ ہو وہ دنیا سے اس طرح گزر جاتا ہے کہ اس کے پیر میں لغزش نہیں آتی۔

تقویٰ اسلام سے الگ کوئی چیز نہیں۔ انسان اگر خدا کے سامنے پوری طرح جھک جائے تو یہی تقویٰ ہے۔ اسلام اور تقویٰ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہے۔ تقویٰ دل کی ایک کیفیت ہے اور جب وہ عمل کی صورت اختیار کرتی ہے تو اسلام بن جاتی ہے۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت اس حال میں آئے کہ تم فرماں برداروں کی زندگی گزار رہے ہو۔

تقویٰ کی نصیحت کے بعد جب آپ نے حضرت ابو ذر کے اندر مزید طلب اور تشنگی محسوس کی تو فرمایا "قرآن کی تلاوت کا التزام کرو اسے نہ چھوڑو کیونکہ یہ زمین میں تمہارے لیے نور ہے اور آسمان میں تمہارے لیے ذخیرہ ہے۔"

قرآن ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ قرآن ہی سے وہ راہ معلوم ہوتی ہے جس سے آدمی تقوے کی زندگی گزار سکتا ہے۔ قرآن حق و باطل میں تمیز کا ذریعہ ہے۔ جو شخص اس ذریعہ سے محروم ہے وہ جان نہیں سکتا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، قرآن خدا کی روشنی ہے جو آدمی کو خدا تک پہنچاتی ہے جو شخص اپنے آپ کو قرآن سے بے نیاز سمجھتا ہے۔ خدا تک اس کی رسائی کی کوئی سبیل نہیں۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب مبین پہنچ گئی۔ اللہ اس کے ذریعہ اس شخص کو سلامتی کی راہ دکھاتا ہے جو اس کی مرضیات کی اتباع کرنا چاہے)

ہر انسان فطرتاً بعض چیزوں کو پسند کرتا ہے اور بعض چیزوں کو ناپسند کرتا ہے۔ ایک شخص کا رجحان دوسرے کے رجحان سے مختلف ہے جو عادتیں اور جو نظریات آپ کے مزاج کا جز بن چکی ہیں اور جن کے خلاف آپ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میرے لیے قابل قبول نہ ہوں۔ انسان خدا ترس اور متقی اسی وقت بن سکتا ہے جب کہ وہ اپنے رجحانات کو خدا کے حکم کے تابع کر دے۔ وہ کسی کام کو اس لیے نہ کرے کہ اس کی طبیعت کا جھکاؤ اس طرف ہے اور نہ کسی کام کو اس لیے چھوڑ دے کہ وہ اپنے اندر اس کا میلان نہیں پاتا بلکہ وہ ہر اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہو جائے جس کا حکم خدا کی طرف سے اس کو ملا ہے خواہ وہ اس کے رجحان طبع اور ذوق کے خلاف ہو یا موافق۔ خدا کا اگر حکم ہے تو وہ ان چیزوں کو پھینک دے جن کو وہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے

اور جن کے بغیر وہ زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص اپنے محبوب جذبات اور عزیز ترین مفادات کی اس طرح قربانی دینے کے لیے تیار نہیں ہے تو وہ خدا ترس نہیں ہے۔ ایسا شخص صرف اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے خواہ وہ اپنی دانست میں خدا کو خوش کرنے ہی کی کوشش کیوں نہ کر رہا ہو۔ جب اس کو قیامت کے دن خدا کے حضور بلایا جائے گا تو وہ دیکھے گا کہ وہ خدا کی تلاش میں اپنے جذبات کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

خدا کی کتاب وہ میزان ہے جس سے آدمی معلوم کر سکتا ہے کہ وہ واقعتاً خدا کی مرضی پوری کر رہا ہے یا ہوائے نفس کی اتباع میں لگا ہوا ہے۔ خدا کی کتاب سے بے نیاز ہو کر خدا کو تلاش کرنے والا انسان جنگل کا مسافر ہے۔ وہ ہر طرف بھٹکتا پھرے گا لیکن منزل سے کبھی ہم کنار نہ ہوگا۔

خدا کے پیغمبر جن قوموں میں آئے وہ سب کی سب خدا کو ماننے والی تھیں اور اپنے اپنے ڈھنگ پر خدا کی عبادت کرتی تھیں لیکن ان کی یہ عبادت خدا کی رضا کا سبب نہ بنی کیونکہ خدا انسانوں کے خود ساختہ طریقوں کے مطابق اپنی عبادت نہیں چاہتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی غلامی کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو اس نے اپنی طرف سے مقرر کیا ہے۔ جو شخص اس کے لیے تیار نہیں ہے اللہ کو اس کی عبادت کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو تلاش کرے اس کا یہ دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔

۵۔ عَنْ اِبْنِ عُمَرَ رض قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ قِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا جِلَاؤُهَا قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ[1]

حضرت عبداللہ بن عمر رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ دلوں پر زنگ آجاتا ہے جس طرح لوہے کو اگر پانی لگ جائے تو اس پر زنگ آجاتا ہے۔ آپ سے سوال کیا گیا دلوں کو اگر زنگ لگ جائے تو اس کو صیقل کیسے کیا جائے۔ آپ نے جواب دیا اس کے دو ذریعے ہیں۔ موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کا پڑھنا۔

دل نہ تو ہیرا ہے اور نہ سیاہ پتھر بلکہ اس کی مثال لوہے کی سی ہے۔ اگر اس کو صیقل کیا جاتا ہے تو اس میں آب

[1] رواہ البیہقی مشکوٰۃ ج ۲ ص۱۸۹

اور چمک پیدا ہوگی اور اگر اس کو پانی میں پھینک دیا جائے تو وہ زنگ آلود ہو جائے گا۔ قرآن کی تلاوت اور موت کے بار بار ذکر سے دل کو جلا نصیب ہوتی ہے اور اس کا زنگ دور ہوتا ہے۔ دل محض ایک گوشت کے ٹکڑے کا نام نہیں ہے جو ہمارے سینے کے اندر دھڑک رہا ہے بلکہ وہ ایسا طاق ہے جس میں حق کی شمع روشن ہوتی ہے اگر انسان کا دل خارج کے اثرات سے غبار آلود نہیں ہوا ہے تو اس میں حق و باطل کی تمیز کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے اور آدمی خدا کی راہ کو صاف دیکھ سکتا ہے۔

دل کا زنگ آلود ہونا یہ ہے کہ وہ دنیا میں گم ہو جائے۔ اس پر دنیا کی محبت اس طرح چھا جائے کہ وہ دنیا کے علاوہ اور کچھ نہ دیکھ سکے۔ وہ اس حقیقت کو بھول جائے کہ موجودہ زندگی آخری زندگی نہیں ہے بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی شروع ہونے والی ہے۔ جو شخص آنے والی زندگی کو فراموش کر جائے دنیا اس کا مطمح نظر بن جائیگی اس کی ساری جدوجہد دنیا کے لیے وقف ہوگی وہ دنیا کے لیے جیے گا اور دنیا کے لیے مرے گا۔ وہ دنیا کی تمنا لیے ہوئے سوئے گا اور جب اٹھے گا تو اس کے ذہن پر دنیا کی فکر سوار ہوگی۔ جس شخص کا یہ حال ہو جائے اسلام کی نگاہ میں اس کا دل مر چکا ہے۔ اس کے اندر حق کی چمک باقی نہیں رہی۔ وہ دنیا کا بندہ ہے اس لیے دنیا سے باہر کی حقیقتوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی موت کو بار بار یاد کرے۔ موت دنیا کا ایک یقینی واقعہ ہے جس کا مشاہدہ ہر انسان کرتا رہتا ہے۔ جب کسی کو موت آتی ہے تو یہ اعلان کرتی ہے کہ زمین پر بسنے والے ہر فرد کو لازماً اس سے دوچار ہونا ہے۔ موت کی یاد انسان کو اس دنیا میں کھونے نہیں دیتی۔ دنیا کی ساری رنگینیاں انسان کی نگاہ میں پھیکی پڑ جاتی ہیں جب وہ یہ تصور کرتا ہے کہ معلوم نہیں موت کب آئے اور اسے دوسرے عالم میں پہنچا دے۔ موت سے کوئی شخص بھاگ نہیں سکتا لیکن انسان کی غفلت یہ ہے کہ وہ موت کے بارے میں سوچنے کے لیے آمادہ نہیں ہے وہ موت کا تصور کرنا نہیں چاہتا کیونکہ موت کا تصور دنیا کی ہر دلچسپی کو غیر یقینی اور بے لطف بنا دیتا ہے۔

دل کے زنگ کو دور کرنے کی دوسری تدبیر قرآن کی تلاوت ہے۔ قرآن دل کی بیماریوں کے لیے نسخۂ شفا ہے۔ وہ نور بن کر دلوں میں داخل ہوتا ہے۔ اس سے مردہ دل زندگی پاتے ہیں اور ان میں حق کی معرفت کی روشنی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن آنے والی زندگی کے لیے انسان کو تیار کرتا ہے وہ اس پر آخرت کی حقیقتوں کو کھولتا ہے قرآن اس دنیا پر انسان کی نگاہ کو جمنے نہیں دیتا اور اس کے اندر آخرت کی فکر پیدا کرتا ہے۔ قرآن سے انسان کو صراط مستقیم ملتی ہے جو شخص قرآن کو تھام لے اس کا ہر قدم اس کو منزل سے قریب کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ اندھیروں کی طرح دائیں بائیں

بھٹکتا نہیں پھرے گا ۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (جو شخص مرچکا ہو اس کو ہم نے زندہ کیا ہو اور اس کو روشنی دی ہو جس سے وہ انسانوں کے درمیان اطمینان سے چلتا پھرتا ہے کیا اس شخص کے مانند ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے جن سے وہ نکلنے والا نہیں ہے۔)

۶۔ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰهِ اَهْلِيْنَ مِنَ النَّاسِ قَالُوْا مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ اَهْلُ الْقُرْاٰنِ هُمْ اَهْلُ اللّٰهِ وَخَاصَّتُهٗ

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اہل اللہ ہیں۔ صحابہ نے پوچھا، حضورؐ وہ کون ہیں؟ آپ نے جواب دیا قرآن والے اہل اللہ اور اس کے خاص بندے ہیں

"قرآن والا" وہ ہے جس کی زندگی قرآن کے سانچے میں ڈھل چکی ہے ۔ جو شخص ایسے قرآن کو قائد اور رہنما بتلائے اور عمل کے میدان میں اس کی راہنمائی کو قبول کرے وہ قرآن کے ساتھ مذاق کرتا ہے ۔ آپ کے صاف الفاظ ہیں" اَهْلُهُ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا " (مسلم، ترمذی) اہل قرآن وہ ہیں جو قرآن سے ہدایت حاصل کرتے ہیں اور اس دنیا میں اس پر عمل کرتے ہیں ۔

دنیا نے اللہ والوں کی بہت سی علامتیں مقرر کر رکھی ہیں لیکن خدا کے رسول کے نزدیک ان کی علامت صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کا جلوہ ان میں دکھائی دیتا ہے ۔ قرآن سے بے نیاز ہو کر کوئی شخص آسمان پر پرواز بھی کرجائے تو خدا تک اس کی رسائی ممکن نہیں جس عمل کے پیچھے قرآن کی سند نہ ہو وہ کبھی خدا کے ہاں مقبول نہیں ہوسکتا۔ اہل اللہ کی پہچان نہ تو کوئی خاص لباس ہے اور نہ کوئی خاص غذا بلکہ ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ خدا کی کتاب کو حکم بناتے ہیں۔ ان کا ہر کام کتاب اللہ کی روشنی میں ہوتا ہے ۔ وہ اپنے آپ کو قرآن کے نقشہ میں اس طرح فٹ کرلیتے ہیں کہ ان کی زندگی پر ہر طرف سے قرآن کی حکومت قائم ہوجاتی ہے ۔ جس شخص پر کتاب اللہ کی حکومت قائم نہیں ہے وہ ابھی خدا سے دور ہے اور خدا اس سے دور ہے ۔

۷۔ عَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْقُرْاٰنُ شَافِعٌ مُّشَفَّعٌ وَمَاحِلٌ مُّصَدَّقٌ مَنْ جَعَلَهٗ اَمَامَهٗ قَادَهٗ اِلَى الْجَنَّةِ

حضرت جابرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا قرآن قیامت کے دن سفارش کریگا اور اس کی سفارش قبول کی جائے گی وہ انسانوں کے حق میں کوشش کرے گا

---

۷ رواہ النسائی وابن ماجہ والحاکم

وَ مَنْ جَعَلَهٗ خَلْفَ ظَهْرِهٖ سَاقَهٗ اِلَى النَّارِ[1]

اور اس کی کوشش بارآور ہوگی۔ جو شخص اس کو اپنے آگے رکھے وہ اس کو جنت میں پہنچائے گا اور جو شخص اس کو اپنی پیٹھ کے پیچھے ڈال دے وہ اس کو جہنم میں پھینک دے گا۔

صحیح حدیثوں میں قرآن کو "شفیع" کہا گیا ہے چنانچہ مسلم کی روایت ہے" اِقْرَءُوا الْقُرْاٰنَ فَاِنَّهٗ يَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيْعًا لِاَصْحَابِهٖ " (قرآن پڑھو۔ کیونکہ جو لوگ قرآن کے پڑھنے والے ہیں قیامت کے دن قرآن ان کی سفارش کرے گا۔)

ان الفاظ سے قرآن کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ قیامت ایک ہولناک دن ہے جب کہ کائنات کا مالک انسانوں کے بارے میں فیصلہ کے لیے اپنے تخت پر بیٹھے گا۔ انسان اپنے رب کے سامنے بے بس کھڑا ہوگا۔ اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف اس کے اعمال ہوں گے وہ جدھر دیکھے گا اپنے اعمال کو دیکھے گا۔ اس کے پاس نہ کوئی وکیل ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ ایسی حالت میں اگر اس کے پاس قرآن ہے تو وہ اس کے لیے خدا سے جنت کی سفارش کرے گا۔ قرآن جس کی سفارش کرے وہ جہنم میں نہیں جا سکتا۔ قرآن ایسا وکیل ہے کہ وہ جس کے لیے بحث کریگا خدا کی عدالت سے اس کے حق میں فیصلہ ہوگا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں صاحب قرآن سے کہا جائے گا۔ "قرآن پڑھو (جلدی نہ کرو) ٹھہر ٹھہر کر پڑھو جس طرح تم دنیا میں پورے اطمینان سے پڑھتے تھے اور جنت کے منازل طے کرتے جاؤ جس منزل پر پہنچ کر تم اپنی قرأت ختم کروگے وہی تمہاری منزل ہوگی" (ترمذی، ابوداؤد وغیرہ)

قرآن۔ صاحب قرآن کی سفارش کرے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے مطابق عمل انسان کے لیے سفارش کرنے والا ثابت ہوگا اگر انسان قرآن کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کرتا ہے تو اس کی زندگی قرآن کا عملی ظہور ہوگی۔ جس شخص کی زندگی قرآن کا قالب اختیار کرے جہنم کی آگ اس کو چھو نہیں سکتی۔

اس بات کے ماننے میں بھی کوئی قباحت نہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں قرآن کو قوت گویائی عطا فرمائے گا۔ آج جو چیز ہمارے درمیان حروف و اصوات کی شکل میں ہے۔ کل وہ خدا چاہے تو اپنے مناسب وجود بھی اختیار کر سکتی ہے۔ جس عالم کے تفصیلی احوال سے ہم واقف نہیں ہیں اس کے بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتے۔ "جو شخص قرآن کو اپنے آگے رکھے وہ اس کو جنت میں پہنچائے گا اور جو شخص اس کو اپنی پیٹھ کے پیچھے ڈال دے وہ

---

[1] رواہ ابن حبان فی صحیحہ

اس کو جہنم میں پھینک دے گا ۔

یہ اس بات کا اعلان ہے کہ نجات کا ذریعہ اب صرف قرآن مجید ہے۔ آخرت کی کامیابی اس شخص کے لیے ہے جو اپنے آپ کو بالکل قرآن کے حوالے کر دے۔ جو شخص قرآن کی پیروی کے لیے آمادہ نہیں ہے جنت کی راہ اس کے لیے مسدود ہے۔ قرآن سے پہلے جو کتابیں اللہ کی طرف سے آئی تھیں وہ اپنے اپنے دور میں ہدایت کا ذریعہ تھیں۔ جس نے ان کے مطابق عمل کیا وہ نجات پائے گا اور جس کا عمل ان کے خلاف ہوگا وہ خدا کے عذاب سے دوچار ہوگا۔ قرآن کے نازل ہونے کے بعد ساری آسمانی کتابیں منسوخ ہو گئیں۔ اب قیامت میں انسانوں کے ساتھ معاملہ اسی کتاب کی بنیاد پر ہوگا۔ قرآن کے ساتھ آج انسان کا سلوک جس نوعیت کا ہوگا کل اسی نوعیت کا انجام اس کے سامنے آئے گا۔ اگر اس نے اپنا ہاتھ قرآن کے ہاتھ میں دے دیا ہے تو وہ اس کو جنت میں پہنچائے گا۔ قرآن ایسا قائد ہے جس کی قیادت ہر خطا سے پاک ہے لیکن اگر اس نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس کو اپنا قائد اور رہنما ماننے کے لیے تیار نہیں ہے تو آخرت میں جہنم اس کی منزل ہے۔

۸۔ حضرت ابوسعید رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:۔

يَقُولُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ عَنْ ذِكْرِي وَمَسْأَلَتِي أَعْطَيْتُهُ أَفْضَلَ مَا أُعْطِي السَّائِلِينَ وَفَضْلُ كَلَامِ اللهِ عَلَىٰ سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللهِ عَلَىٰ خَلْقِهِ[۱]	اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص قرآن میں اس قدر مشغول ہو جائے کہ وہ میری یاد کے لیے الگ سے وقت نہ نکال سکے اور مجھ سے اپنی حاجت نہ طلب کر سکے تو میں مانگنے والوں کو جتنا دیتا ہوں اس سے زیادہ اس کو دوں گا۔ خدا کے کلام کا درجہ دنیا کے تمام کلاموں کے مقابلے میں ایسے ہی بلند ہے جیسے کہ خود خدا کا درجہ اس کی مخلوق کے مقابلہ میں۔

دین کی حقیقت خدا کی یاد اور بندے کی طلب کا نام ہے۔ قرآن ان ہی دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ خدا کی یاد جس پر چھا گئی اس نے خدا کو پا لیا اور جو خدا کے سامنے مجسم طلب و احتیاج بن گیا وہ اپنی حقیقت سمجھ گیا۔ خدا کی یاد کا بہترین طریقہ قرآن کی شکل میں انسانوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو شخص قرآن پڑھے وہ خدا کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔ وہ خدا کو خدا کے بتائے ہوئے الفاظ میں یاد کرتا ہے۔ قرآن خدا کی یاد کے لیے سب سے زیادہ موثر الفاظ فراہم کرتا ہے۔ اس سے ذکر الٰہی کے صحیح ترین آداب معلوم ہوتے ہیں۔ رسول اکرم ؐ کا ارشاد ہے۔ ما[۲]

[۱] رواہ الترمذی والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان

كَلَامٍ أَعْظَمَ عِنْدَ اللهِ مِنْ كَلَامِهِ وَمَا رَدَّ الْعِبَادُ إِلَى اللهِ كَلَامًا أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ كَلَامِهِ (دارمی)
(خدا کے نزدیک اس کے اپنے کلام سے زیادہ باعظمت اور کوئی کلام نہیں۔ اس کے بندے جن الفاظ میں اس کے پاس اپنے جذبات واحساسات بھیجتے ہیں ان میں سب سے زیادہ محبوب اس کو وہ الفاظ ہیں جو اس کے کلام میں ہیں)

یہی حال دعا کا ہے۔ قرآن بندۂ مومن کی دعا ہے۔ دنیا اور آخرت کی کوئی طلب ایسی نہیں ہے جو ایک بندۂ مومن خدا سے طلب کر سکتا ہو۔ اور قرآن میں اس کا ذکر نہ ہو۔ وہ انسان کے جذبات و احساسات کا بہترین ترجمان ہے۔ انسان کے باطن میں جو جذبات ابلتے ہیں اور جن احساسات سے وہ دوچار ہوتا ہے، قرآن میں ان کو ایسے الفاظ میں ڈھال دیا گیا ہے کہ جن سے بہتر الفاظ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کا پڑھنے والا اپنے جذبات و احساسات کو خدائے تعالیٰ کے الفاظ میں دہراتا ہے۔ جب انسان قرآن کھولتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی طلب والتجا کے لیے بہترین اور موزوں ترین الفاظ اس کے ہاتھ آگئے ہیں وہ قرآن پڑھتا ہے تو قرآن اس کے لیے دعا بن جاتا ہے۔ وہ خواہ اپنی کوئی مراد الگ سے طلب کرے یا نہ کرے جب تک قرآن پڑھ رہا ہے خود بخود اپنی طلب خدا کے سامنے پیش کر رہا ہے اور یقینی ہے کہ خدا کی طرف سے در اجابت اس کے لیے کھلا رہے گا۔

۹۔ عمران بن حصین رضؓ نے ایک قاری کو دیکھا کہ وہ قرآن سنانے کے بعد لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہا ہے تو انھوں نے إِنَّا لِلّٰهِ پڑھا اور کہا۔

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ قَرَءَ الْقُرْاٰنَ	سنا ہے کہ جو شخص قرآن پڑھے وہ اللہ سے مانگے۔
فَلْيَسْأَلِ اللهَ فَإِنَّهُ سَيَجِيْئُ أَقْوَامٌ يَقْرَءُوْنَ	اس کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن پڑھ کر
الْقُرْاٰنَ يَسْأَلُوْنَ بِهِ النَّاسَ [1]	لوگوں سے سوال کرتے پھریں گے۔

قرآن کے پڑھنے والے کی نظر اتنی بلند ہونی چاہیے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسان کے سامنے سر جھکانے کی ذلت نہ گوارا کرے۔ قرآن سے خدا کا جو تصور ملتا ہے وہ انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ خدا کے سوا کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ کائنات کے سارے خزانے خدا کے ہاتھ میں ہیں جس کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا دیا ہوا ہے۔ وہ جس پر رزق کے دروازے کھولنا چاہتا ہے کھول دیتا ہے اور جس پر رزق کی راہیں بند کر دے

---

[1] رواہ الترمذی واحمد

دنیا کی کوئی طاقت اس کو روزی نہیں پہنچا سکتی۔

رزق کے معاملے میں انسان کی آزمائش بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ جب انسان بھوکا ہوتا ہے تو وہ اپنا ایمان بھی بیچ کھاتا ہے۔ اسی وقت اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ایمان کس درجہ کا ہے۔ خدا کا سچا بندہ ہر حال میں خدا ہی سے چمٹا رہے گا وہ کبھی اس کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اپنی تمناؤں اور خواہشات کو کچل دے گا مگر کسی دوسرے در کی طرف رخ نہ کرے گا۔

جو شخص قرآن کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ پڑھے اس کا ملجا و ماویٰ خدا کی ذات ہوگی لیکن جو اس کے حروف والفاظ کو صرف دہراتا جانتا ہے وہ اس کی قدر و قیمت کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ زبان سے خدا کی قدرت اور اس کے احسانات کا ذکر کرے گا لیکن دوسروں کو اپنا محسن اور آقا سمجھے گا۔ جس شخص کے نزدیک قرآن معاش کا ذریعہ ہو قرآن کی عظمت کا جاننے والا اس کو دیکھے گا تو بے اختیار کہے گا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

۱۰۔ عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ
قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِیْ يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ
الْاُتْرُجَّةِ رِيْحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا طَيِّبٌ
وَمَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِیْ لَا يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ
كَمَثَلِ التَّمْرَةِ لَا رِيْحَ لَهَا وَطَعْمُهَا حُلْوٌ
وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ
الرَّيْحَانَةِ رِيْحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ
وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ لَا يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ
كَمَثَلِ الْحَنْظَلَةِ لَيْسَ لَهَا رِيْحٌ
وَطَعْمُهَا مُرٌّ [1]

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ راوی ہیں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو صاحب ایمان قرآن
کی تلاوت کرتا ہے اس کی مثال ترنج کی ہے جس
کی بو بھی پسندیدہ ہے اور وہ مزیدار بھی ہے۔ جو
صاحب ایمان قرآن نہ پڑھے اس کی مثال کھجور کی ہے
کھجور میں خوشبو تو نہیں ہوتی البتہ اس کا مزا اچھا ہے
جو منافق قرآن پڑھتا ہے وہ بظاہر گلاب
ہے کہ ہے تو وہ خوشبودار لیکن اس کا مزا خراب ہے
انسان اگر منافق بھی ہے اور قرآن بھی نہیں پڑھتا
تو وہ اندرائن ہے کہ کڑوا کسیلا بھی ہے اور خوشبو
سے بھی محروم ہے۔

قرآن ایک دعوت ہے کوئی دعوت انسان کے اندر چپکے سے نہیں داخل ہوتی بلکہ وہ انقلاب بنکر آتی ہے اور اس کے فکر و نظر میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔ انسان جب کسی دعوت کو قبول کرتا ہے تو اس کی پوری زندگی شکست و ریخت

---

[1] رواہ البخاری ومسلم والنسائی وابن ماجة

اور توڑ پھوڑ کے ایک لمبے عمل سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کو اپنے پرانے نظریات کے قلعوں کو منہدم کرنا پڑتا ہے اور ان کی جگہ نئے نظریات کی تعمیر کرنی ہوتی ہے۔ وہ اپنی مرغوب و محبوب چیزوں سے دست کش ہوتا ہے اور ان کی جگہ کچھ نئی چیزوں کو اپنی زندگی میں شامل کرتا ہے۔ اس کا کام یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ مجبور ہوتا ہے کہ وہ جن چیزوں سے محروم ہوا ہے ساری دنیا کو ان سے محروم کر دے اور جو دولت اسے ملی ہے اس کو عام کر دے۔ جن افکار و نظریات کی اس کی ذات پر حکومت ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ زمین کے ایک ایک حصہ پر اس کی حکومت قائم ہو جائے۔

کسی دعوت کو قبول کرنے والے سب کے سب اس اعلیٰ معیار پر نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو دعوت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں وہ اسی کے لیے جیتے ہیں اور اسی کے لیے مرتے ہیں۔ ان کی فکر اور ان کا عمل دونوں اس دعوت کے ترجمان بن جاتے ہیں ان کی زبان اسی کے لیے گویا ہوتی ہے اور ان کے قدم اسی کی راہ میں بڑھتے ہیں۔ وہ پوری طرح دعوت کے لیے وقف ہوتے ہیں ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کا کوئی ذرہ کسی دوسری راہ میں صرف نہیں ہوتا۔ ایسے ہی افراد دعوت کے پیش رو اور اس کے قافلہ سالار ہوتے ہیں۔ ان ہی کے بل پر دعوت آگے بڑھتی ہے اور اپنی صحیح حیثیت میں باقی رہتی ہے۔

اس کے بعد ان افراد کا نمبر آتا ہے جو دعوت کو اپنی ذات کی حد تک اپناتے ہیں اور اس کو ایک پیغام کی حیثیت سے انسانوں کے درمیان لے کر کھڑے نہیں ہوتے وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا کوئی عمل دعوت کے خلاف تو نہیں ہے اس سے آگے ان کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں ہو رہا ہے۔ وہ کسی تحریک کے داعی نہیں ہوتے البتہ دنیا ان کو دیکھ کر سمجھ سکتی ہے کہ وہ کس عقیدہ و مسلک کے حامل ہیں۔

تیسرا طبقہ ان افراد کا ہوتا ہے جن کے سینے دعوت کی محبت سے خالی ہوتے ہیں۔ لیکن دنیا ان کو خیر خواہ اور مخلص سمجھتی ہے۔ وہ اصلاً دعوت کے دشمن ہوتے ہیں لیکن ہمیشہ دوستی کے روپ میں لوگوں کے سامنے آتے ہیں وہ خود کو داعی ظاہر کرتے ہیں لیکن اپنے آپ کو دعوت کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ دعوت کے حق میں لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں لیکن ان کی زندگی پر دعوت کا اثر کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی زبان سے دعوت کی تعریف میں آواز بلند ہوتی ہے لیکن یہ ان کے دل کی آواز نہیں ہوتی البتہ اس سے سننے والوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کا باطن دعوت کی روح سے خالی ہوتا ہے لیکن دعوت کے حق میں ان کی مدح و توصیف سے دوسرے افراد دعوت سے قریب ہوتے ہیں۔ وہ ایسے اندھے ہیں جن کے ہاتھوں میں چراغ ہیں اس سے راہ گیر تو فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن وہ خود راہ نہیں دیکھتے۔

سب سے آخر میں ان افراد کا نمبر آتا ہے جو نہ تو دعوت کے حق میں مخلص ہوتے ہیں اور نہ ان سے دعوت کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کا وجود بنجر اور چٹیل زمین ہے۔ بارش سے اس میں نہ تو روئیدگی آتی ہے اور نہ اس میں اتنا پانی ہی جمع ہوتا ہے کہ جنگل کے جانور اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

قرآن کی دعوت پر ایمان کا اظہار کرنے والے بھی ان چار گروہوں میں بٹے ہوئے تھے [illegible] ان ہی چار گروہوں کی زندگی اور عمل کو تمثیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

قرآن کے ماننے والوں میں ایک گروہ وہ تھا جو اس کی دعوت کے لیے مومنِ قانت تھا۔ ان کے سینوں میں بھی قرآن تھا اور زبان پر بھی قرآن تھا۔ ان کے فکر و عمل پر بھی قرآن کی حکومت تھی اور وہ اس کے داعی بن کر اس کو پھیلا بھی رہے تھے۔ ان ہی کو حدیث میں ترنج سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ کچھ افراد وہ تھے جو اپنی حد تک قرآن پر عمل تو کرتے تھے لیکن اس کے داعی نہ بن سکے تھے۔ ان کی زندگی قرآن کے نقش و نگار سے آراستہ تھی لیکن وہ قرآن کی دعوتی اور انقلابی حیثیت کو نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ وہ کھجور کی طرح عمدہ اور لذیذ تھے لیکن خوشبو سے خالی تھے اس کے بعد ان افراد کا نمبر آتا ہے جو اس حقیقت کو بھولے ہوئے تھے کہ کسی دعوت کو قبول کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اس کے اولین مخاطب بن گئے۔ دعوت کے مطالبوں کو دوسروں تک پہنچانے سے پہلے یہ ان کا اپنا فرض ہے کہ وہ ان مطالبوں کو پورا کریں۔ یہ منافقین تھے۔ منافقین قرآن کی حقانیت پر ایمان نہیں رکھتے تھے لیکن ان میں کا ایک طبقہ اپنے بعض مفادات کی وجہ سے قرآن کے داعیین کی صف میں نظر آتا تھا۔ یہ دوسروں کو جو فائدہ پہنچاتا تھا اس سے خود محروم تھا۔ ان میں دوسرا طبقہ وہ تھا جس کو اندرائن کا پھل کہا گیا ہے، نہ تو اس کے سینہ میں قرآن کی چمک تھی اور نہ اس کی زبان قرآن کی صداقت کی گواہی دے رہی تھی۔

۱۱۔ ترمذی اور دارمی کی روایت ہے۔ معمولی سے اختلاف کے ساتھ یہ روایت مسند احمد اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔ جبیر بن نفیر راوی ہیں۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے ان سے فرمایا کہ ہم چند اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ آسمان کی طرف دیکھنے لگے اور فرمایا کہ (میں آسمان سے فتنوں کو اترتے دیکھ رہا ہوں لیکن) یہ اس وقت ہوگا جب کہ لوگوں سے علم چھین لیا جائے گا حتیٰ کہ ان کے پاس علم کا ایک ذرہ باقی نہیں رہے گا۔ اس پر ایک انصاری صحابی زیاد بن لبید نے سوال کیا کہ علم کیسے چھین لیا جائے گا جب کہ ہم نے قرآن پڑھا ہے۔ قسم خدا کی ہم اسے چھوڑیں گے نہیں اس کو ہمیشہ پڑھتے رہیں گے اور اپنی عورتوں اور بچوں کو پڑھائیں گے اور پھر وہ اپنے بچوں کو پڑھائیں گے اس طرح قیامت تک قرآن کی

تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہے گا۔ آپ نے فرمایا۔ زیاد تمہارا بھلا ہو کیسی نادانی کا سوال کر رہے ہو؟ میں تم کو مدینہ کے سمجھدار آدمیوں میں شمار کرتا تھا۔ یہ دیکھو توریت اور انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود ہیں بتاؤ کیا وہ کچھ بھی ان کے کام آتی ہیں؟ حدیث کے راوی جبیر بن نفیر کہتے ہیں۔ میں نے عبادہ بن صامت سے اس حدیث کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا۔ ابوالدرداء نے سچ کہا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں بتاؤں کہ لوگوں کے سینوں سے پہلے کون سا علم ختم ہوگا؟ یاد رکھو وہ خشوع ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ تم بڑی سے بڑی اور جامع مسجد میں جاؤ گے اور اس میں (نمازیوں کی کثرت کے باوجود) ایک بھی خدا سے ڈرنے والے تم کو نہ ملے گا۔

جب خدا کی طرف سے حق آتا ہے تو اس کو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کا عزم رکھتے ہیں وہ حق کو ہدایت اور راہنمائی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں اور اسی حیثیت سے اس کو اپناتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ کیفیت ختم ہوجاتی ہے۔ اور حق ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے جو اس کو محض اپنا آبائی مسلک سمجھتے ہیں۔ حق ان کے لیے ہدایت کا سرچشمہ نہیں ہوتا بلکہ ایک علم بن کر رہ جاتا ہے جو مناظروں کے لیے مواد فراہم کرتا ہے۔ جس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک پہلو پر لمبی لمبی بحثیں ہوتی ہیں لیکن کوئی اس کی طرف اس لیے رجوع نہیں کرتا کہ اس سے راہنمائی حاصل کرے۔ ماضی کے اس طویل تجربے کو حضور نے اس حدیث میں پیش کیا ہے

قرآن کتاب ہدایت بن کر نازل ہوا جن لوگوں نے اسے قبول کیا انہوں نے اسے اپنا راہنما بنایا اور اس کی روشنی میں حق کی راہ طے کی۔ وہ قرآن کو کتاب ہدایت سمجھتے تھے اور قرآن سیدھی راہ کی طرف ان کی راہنمائی کرتا تھا، لیکن بعد میں آنے والوں نے قرآن کی اس حیثیت کو بھلا دیا۔ وہ ان کو اگلوں سے جوڑنے کا ذریعہ بن کر رہ گیا وہ ان کے پاس محض اس بات کی علامت شمار ہونے لگا کہ وہ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو کسی زمانے میں اس سے روشنی حاصل کرتا تھا۔ ان کے اگلے قرآن کو خدا کی کتاب مانتے تھے اس لیے وہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ اب وہ قرآن سے ہدایت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس لیے قرآن سے ان کو ہدایت بھی نہیں مل رہی ہے۔ قرآن حق کی روشنی ہے لیکن اگر کوئی شخص اس سے فائدہ نہ اٹھانا چاہے اور اپنے گھر کے طاق کی زینت بنائے رکھے تو یہ روشنی اس کے لیے بے کار ہے۔ روشنی رکھتے ہوئے بھی اس کے چاروں طرف تاریکی ہی ہوگی۔ آپ کے پاس تلوار ہے تو اس کو کام میں لاکر آپ دشمن پر غالب آسکتے ہیں لیکن اگر آپ اس کو نیام میں رکھ لیں اور استعمال نہ کریں تو گو آپکے ہاتھ میں ایک تیز دھار کا آلہ قوت ہوگی لیکن دشمن آپ پر چھا جائے گا۔

قرآن سے ہدایت نہ حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن پر ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کی زبانیں بھی اس کے ذکر سے ناآشنا ہوں گی اور ان کے گھروں میں اس کا چرچا نہ ہوگا۔ بلاشبہ وہ قرآن پڑھیں گے۔ اس کی تعلیم و تعلم کے مدارس ان کے درمیان قائم ہوں گے۔ وہ پوری خوش الحانی کے ساتھ اس کی تلاوت کریں گے۔ اس کے الفاظ و معانی کی تحقیق پر وہ گرم گرم بحثیں کریں گے لیکن یہ سب کچھ محض دماغی عیاشی ہوگی۔ وہ قرآن پڑھیں گے لیکن قرآن سے ان کو خدا پرستی کی تعلیم نہ ملے گی البتہ قرآن ان کو مناظرے کا مواد فراہم کرے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں ایک وقت وہ بھی آئے گا جب کہ قرآن کے پڑھنے والوں میں ایک گروہ کا یہ حال ہوگا۔ یَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَایُجَاوِزُ تُرَاقِیَهُمْ یَقُوْلُوْنَ مِنْ قَوْلِ خَیْرِ الْبَرِیَّةِ یَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّیْنِ کَمَا یَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِیَّةِ (ترمذی) (کہ وہ قرآن پڑھیں گے لیکن قرآن ان کے حلقوں سے گزر کر ان کے سینوں میں نہیں اترے گا ان کی گفتگو ایسی معلوم ہوگی گویا وہ دنیا کے سب سے بہتر انسان ہیں۔ وہ دین داری کا دعویٰ کریں گے لیکن دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے) بیہقی کی روایت ہے: "یُوْشِكُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِیَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰی عُلَمَاءُهُمْ شَرٌّ مِنْ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَاءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِیْهِمْ تَعُوْدُ" (ایک وقت آنے والا ہے جب کہ اسلام کا صرف نام باقی رہ جائے گا اور قرآن صرف تحریر میں ہوگا۔ مسجدیں آباد ہونے کے باوجود ویران ہوں گی کیونکہ وہ مرکز ہدایت نہیں رہیں گی۔ آسمان کے نیچے بدترین مخلوق علماء ہوں گے۔ ان کا وجود فتنوں کا سرچشمہ ہوگا۔ فتنے ان ہی سے نکلیں گے اور ان ہی کی ذات کی طرف لوٹیں گے)

اسی بات کو اوپر کی حدیث میں عبادہ بن صامت نے ان الفاظ میں کہا تھا کہ دلوں سے خشوع نکل جائے گا مسجد میں جماعت کی جماعت داخل ہوگی لیکن خدا سے ڈرنے والا ایک بھی نہیں ملے گا۔ (دارمی)

خدا کی کتاب ان لوگوں کی راہنمائی کرتی ہے جن کے دل خدا کے خوف سے معمور رہیں۔ وہ اس احساس کے ساتھ اس کتاب کو کھولیں کہ وہ ان کے رب کا فرمان ہے۔ وہ اس کی ہر بات کو قبول کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔ جس کے اندر یہ احساس ہو خدا کی کتاب اس کے سامنے اپنے حقائق و معارف کھول دیتی ہے۔ اس کی ایک ایک سطر سے اس کو روشنی ملتی ہے۔ ایسا شخص قرآن کے الفاظ میں اس کی حقیقی روح کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس احساس کے بغیر جو شخص خدا کی کتاب کو پڑھے گا وہ اس کے لیے تقریر و تحریر اور ریسرچ کا موضوع تو بن سکتی ہے لیکن کتاب ہدایت نہیں بن سکتی۔

۱۲۔ عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ   سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ

سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ نَزَلَ بِحُزْنٍ فَإِذَا قَرَأْتُمُوهُ فَابْكُوا فَإِنْ لَمْ تَبْكُوا فَتَبَاكَوْا وَتَغَنَّوْا فَمَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا (رواہ ابن ماجہ)

صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ یہ قرآن غم اور حزن کو لے کر نازل ہوا ہے جب تم اس کو پڑھو تو تمہیں رونا چاہیے اور اگر تمہیں رونا نہ آئے تو اپنے اوپر رونے کی کیفیت طاری کرو۔ قرآن کو غنا کے ساتھ پڑھو۔ جو شخص قرآن کو غنا کے ساتھ نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

قرآن کوئی تفریحی کتاب نہیں ہے کہ اس کو آدمی وقت گزارنے کے لیے پڑھے اور نہ وہ ادب اور فلسفہ کی کتاب ہے اگر کوئی شخص قرآن کو اس لیے پڑھتا ہے کہ اس میں اعلیٰ ادب ہے، زور بیان اور خطابت ہے، یا اس کو مابعد الطبیعاتی مسائل سے دلچسپی ہے اور قرآن میں ان مسائل کا ذکر ہے تو وہ قرآن کی عظمت سے ناواقف ہے۔ قرآن کا مقصدِ نزول ان میں سے ایک چیز بھی نہیں۔ وہ ایک دوسرے ہی مقصد کو لے کر اترا ہے۔ وہ انسان کے اندر آخرت کی فکر پیدا کرتا ہے اگر آدمی قرآن کو شعور سے پڑھے تو اس کا دل اس دنیا سے اچاٹ ہو جانا چاہیے۔ اس کو اس دنیا کے عیش و آرام کو بھول کر آخرت کے غم میں ڈوب جانا چاہیے۔ قرآن انسان کو آخرت کے لیے تیار کرتا ہے جو شخص آخرت کو اپنا مقصد بنالے اس کو آج کا غم نہیں ستائے گا بلکہ وہ کل کی فکر میں مبتلا ہو گا اس کے چہرے پر آپ سرور و شادمانی کی وہ کیفیت نہیں دیکھیں گے جو بے فکر انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتی ہے۔ ایسا شخص جب قرآن پڑھے گا تو اس کو آخرت کی یاد آجائے گی۔ آخرت کی گھبراہٹ اور خوف اس سے اس کا سکون چھین لے گی۔ وہ جب قرآن میں قیامت کا ہولناک منظر دیکھے گا تو اپنے آپ کو اس میں کھڑا ہوا پائے گا۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے خود کو عالم آخرت میں پائے گا۔ وہ محسوس کرے گا کہ اس کے سامنے اس کے اعمال کا دفتر کھلا ہوا ہے جس سے اس کی زندگی کا کوئی واقعہ غائب نہیں ہے اور اس کا رب اس دفتر کے مطابق اس سے معاملہ کر رہا ہے۔ قرآن پڑھتے ہوئے کسی کے اندر یہ احساس جاگ اٹھے تو وہ اپنی جگہ سے ہل جائے گا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگے گی۔ قرآن کی آیات سے وہ جیسے جیسے گزرتا جائے گا اس کا دل پھٹنے لگے گا اور وہ تڑپتا ہوا خدا کے دربار میں پناہ لینے پر مجبور ہوگا۔ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا۔ (جب ان کو رحمٰن کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔

جس ذات پر قرآن مجید نازل ہوتا تھا قرآن کی آیتوں سے اس کی کیا کیفیت ہوتی تھی اس کا اندازہ آپ

ایک واقعہ سے کر سکتے ہیں جو حضرت عائشہؓ نے بیان کیا ہے۔ کہتی ہیں کہ ایک رات حضورؐ نے مجھ سے فرمایا۔ عائشہ!
اب مجھے چھوڑ دو۔ آج کی شب میں اپنے رب کی عبادت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا قسم خدا کی میں آپ کا قرب چاہتی ہوں
اور جس میں آپ کی خوشی ہو اس کو پسند کرتی ہوں۔ اس کے بعد آپ اپنے بستر سے اٹھے، وضو کیا اور نماز کے لیے
کھڑے ہوگئے۔ آپ کی آنکھوں سے اشک باری ہونے لگی، یہاں تک کہ آپ کا دامن بھیگ گیا۔ آپ بیٹھ گئے ابھی
آنسوؤں کی بارش نہ تھمی اور ریش مبارک تر ہوگئی۔ اس کے بعد بھی آنسو نہ رکے اور سامنے کی خشک زمین گیلی ہوگئی اسی
حالت میں صبح ہوگئی اور حضرت بلالؓ نماز فجر کی خبر دینے پہنچ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں تو کہا اے
اللہ کے رسول آپ رو کیوں رہے ہیں جب کہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کیا میں
خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ آج کی رات مجھ پر ایسی آیات نازل ہوئی ہیں۔ افسوس ہے اس شخص پر جو ان کو پڑھے
اور غور نہ کرے۔ اور وہ آیات یہ ہیں اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ (آل عمران کی آخری آیات) ابن حبان

" اگر تمہیں رونا نہ آئے تو اپنے اوپر رونے کی کیفیت طاری کرو۔ کسی کتاب سے آپ اسی وقت فائدہ
اٹھا سکتے ہیں جب کہ آپ اس کتاب میں گم ہوجائیں۔ وہ جن جذبات کو آپ کے اندر پیدا کرنا چاہتی ہے ان کو اپنے
اوپر طاری کرنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے ہوں اور کتاب اپنے خیالات کا درس
دے رہی ہو تو آپ اس کے مقاصد کی تہہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

مجھ سے میرے ایک استاد نے ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا ایک واقعہ سنایا کہ وہ جرمنی کے کسی کتب خانہ میں
تشریف لے گئے وہاں انھوں نے ایک مستشرق کو دیکھا کہ وہ امام ابن تیمیہ کی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے اس
دوران اگر سگریٹ پینے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ کتاب بند کر دیتا اور کمرے سے باہر جاکر سگریٹ استعمال کرتا۔ ڈاکٹر
صاحب کو یہ بات مغربی ذوق اور مزاج کے خلاف معلوم ہوئی۔ انھوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے
جواب دیا کہ ابن تیمیہ تمباکو کے استعمال کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے ان کی کتاب پڑھتے وقت میں سگریٹ کے
استعمال کو مناسب نہیں سمجھتا۔ اس نے کہا کسی کتاب سے استفادے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس کے مطالعہ
کے دوران اپنے جذبات کو لکھنے والے کے جذبات سے ہم آہنگ کر دے۔

قرآن ایک انقلابی کتاب ہے۔ اس انقلابی کیفیت کے بغیر آپ قرآن کی علمی سیر کر سکتے ہیں لیکن اس کی حقیقی روح
اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے۔ یہ کیفیت آپ کے اندر سے ابھرنی چاہیے لیکن اگر وہ ابھر نہیں رہی ہے تو آپ کو اپنی توجہ
اس کے پیغام پر اس طرح مرکوز کر دینی چاہیے کہ آپ ساری دنیا سے غافل ہو کر اس میں کھو جائیں۔ اس طرح آپ

شعوری طور پر اپنے آپ کو ان جذبات سے قریب کریں گے جو جذبات قرآن آپ کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ رفتہ رفتہ یہ جذبات آپ پر اس قدر چھا جائیں گے کہ وہ آپ کے حقیقی جذبات بن جائیں گے اور آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ وہ آپ کے اندر سے اُبل رہے ہیں۔

"قرآن کو غنا کے ساتھ پڑھو، جو شخص قرآن کو غنا کے ساتھ نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے" قرآن کو لَے سے پڑھنے کا حکم اور اچھی آواز سے قرآن کے پڑھنے کی تعریف صحیح حدیثوں میں اس کثرت سے صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ اس کی کوئی دوسری توجیہ نہیں کی جا سکتی ۔ قرآن کو لے کے ساتھ پڑھنے سے مراد کوئی خاص قسم کی لَے نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو پوری توجہ اور اہتمام کے ساتھ پڑھا جائے ۔ اس کے حروف و الفاظ کو بہتر طریقہ سے ادا کرنے کی کوشش کی جائے ۔ قرآن کے پڑھنے سے مقصود یہ نہ ہو کہ قرآن کے الفاظ کو زبان سے دہرا دیا جائے بلکہ قرآن اس طرح پڑھا جائے کہ اس کے مطالب دل میں اترتے چلے جائیں۔ یہی حقیقت ہے جسے رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ۔ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اس طرح پڑھتے تھے کہ اس کا ایک ایک حرف واضح طور پر ادا ہوتا تھا (ترمذی، ابوداؤد، نسائی) آپ کا فرمان ہے جس نے تین دن سے کم میں قرآن پڑھا اس نے قرآن کو سمجھا ہی نہیں (ترمذی، ابوداؤد، دارمی) قرآن خدا کا کلام ہے جو شخص قرآن کو سمجھے بغیر پڑھتا ہے وہ اس کی عظمت کو محسوس نہیں کر رہا ہے ۔ انسان کسی اہم بات سے یوں ہی سرسری طور پر نہیں گزر جاتا بلکہ اس پر غور کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے ۔

۱۳ ۔ "حضرت ابوہریرہ رض کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند افراد کو کسی مہم پر بھیجنے کا ارادہ کیا تو ہر ایک سے قرآن پڑھوا کر سنا (آخر میں) آپ ان میں سب سے کم سن شخص کے پاس پہنچے اور اس سے سوال کیا کہ تمہیں قرآن کی کون سی سورتیں یاد ہیں؟ اس نے جواب دیا مجھے فلاں فلاں سورتیں اور سورہ البقرہ یاد ہے؟ آپ نے حیرت سے پوچھا کیا تمہیں سورہ بقرہ یاد ہے؟ اس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا ۔ اچھا تو تم اس جماعت کے امیر ہو اس پر سردار جماعت نے کہا کہ میں نے سورہ بقرہ کو اس خوف سے یاد نہیں کیا کہ میں اس کا حق ادا نہیں کر سکوں گا ۔ آپ نے فرمایا ۔ قرآن سیکھو اور اس کو پڑھو ۔ جو شخص قرآن کے جاننے کے بعد اسے پڑھتا بھی ہے اس کی مثال مشک بھرے مشکیزے کی ہے جس کی خوشبو ہر جگہ پھیلتی ہے اور اگر کوئی شخص قرآن سیکھے لیکن وہ قرآن کو اپنے پیٹ میں لیئے پڑا سوتا رہے تو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے مشک بھرے مشکیزے کو اوپر سے بند کر دیا گیا ہو۔[1]

---

[1] رواہ الترمذی وابن ماجہ وابن حبان

جس قافلہ کا رخ خدا کی طرف ہو اس کا قائد وہی شخص ہوسکتا ہے جو خدا کی کتاب کا زیادہ سے زیادہ جاننے والا ہو۔ خدا کے ماننے والوں کی رہنمائی کا حق ایسے شخص کو حاصل نہیں ہے جسے یہ نہ معلوم ہو کہ کون سی راہ خدا تک پہنچانے والی ہے اور کس راہ پر چل کر انسان خدا کے بجائے شیطان سے قریب ہوتا ہے۔ اگر سوسائٹی میں ایسے لوگ ابھرتے ہیں جو خدا کی کتاب سے بے بہرہ ہیں اور خدا کی کتاب کے حاملین نظر انداز کیے جا رہے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ سوسائٹی خدا پرستی کی روح سے خالی ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں اللہ کی کتاب ہے وہ خواہ ظاہری نمود کے لحاظ سے کمتر ہی کیوں نہ ہو لیکن خدا کی کتاب کے علم نے اسے سب سے اونچا کر دیا ہے۔ اس لیے خدا کے ماننے والوں کے لیے ضروری ہے کہ ایسے شخص کو اپنی جماعت میں بھی اونچا مقام دیں۔ کسی شخص کی اس وجہ سے توقیر و عزت کرنا کہ وہ خدا کی کتاب کا حامل ہے خود خدا کی عزت کرنا ہے۔ "اِنَّ مِنْ اِجْلَالِ اللہِ اِکْرَامُ حَامِلِ الْقُرْاٰنِ غَیْرِ الْغَالِیْ فِیْہِ وَالْجَافِیْ عَنْہُ" ابوداؤد، بیہقی۔ (یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے کہ ایسے حاملِ قرآن کی تعظیم کی جائے جو قرآن میں نہ تو غلو کرتا ہے اور نہ اس کے احکام کے بجا لانے میں پہلوتہی کرتا ہے)

بلندی و پستی کے سارے معیار جھوٹے اور غیر حقیقی ہیں۔ حقیقی معیار صرف یہ ہے کہ کون خدا سے کتنا تعلق رکھتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ جو شخص قرآن کا علم رکھتا ہے مسلمانوں کی صف میں وہ سب سے آگے ہوگا خواہ وہ حسب و نسب، سن و سال اور مال و دولت کے لحاظ سے پیچھے ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کا فرمان ہے "یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَءُھُمْ لِکِتَابِ اللہِ (ترمذی وغیرہ) قوم کی امامت وہ کرے گا جو کتاب اللہ کا سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔

نظریۂ اوتار اور عقیدۂ رسالت

(۱۰)

(جناب ابو محمد امام الدین رام نگری)

عقیدۂ رسالت

عقیدۂ اوتار کے متعلق اس قدر غور و فکر کے بعد اب وقت آیا ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان عقیدۂ اوتار کی تفصیلات سے قطع نظر اصولی حیثیت سے غور کریں کہ عقیدۂ رسالت سے اس کی کس حد تک مطابقت ممکن ہے اور اس مطابقت کی بنا پر کیا ایسا ممکن ہے کہ عقیدۂ اوتار عقیدۂ رسالت ہی کی بدلی ہوئی یا بگڑی ہوئی صورت ہو، بدھ جی کی مثال ہمارے سامنے ہے، ان کے وقائع اور سوانح موجود ہیں۔ بدھ جی نے کبھی اپنے اوتار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، بودھوں کا جو فرقہ اپنے کو بدھ جی کی حقیقی تعلیمات کا علمبردار کہتا ہے اس کا عقیدہ ہے کہ بدھ جی خدا کو نہیں مانتے تھے اور نہ ان کی تعلیم میں خدا کا عقیدہ موجود ہے۔ اس بودھ فرقہ کے علماء ہندو مذہب کے ویدانت اور علم الٰہیات پر سخت تنقید کر کے اس کا رد کرتے ہیں[1]۔ لیکن خود بدھ جی کے پیرودں کے عالموں اور دانشوروں نے بدھ جی کو کیا سے کیا بنا ڈالا اور ہندو مذہب نے کس طرح ان کو اوتاروں کی صف میں داخل کر دیا، یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اوتاروں کے بارے میں ہندو مذہب کا مزاج اور اس کا رویہ کیسا ہے اور وہ کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ایک انسان کو پربرمھ کا اوتار بنا دیتا ہے

ہندو مذہب کی رو سے عقیدہ اوتار کی بنیاد شری کرشن جی کا یہ قول مشہور ہے جو شری مد گیتا میں آیا ہے۔

یدا یدا ہی دھرمسیہ گلانر بھوتی بھارت
ابھیو تھانم دھرمسیہ تدات ما نم
پرتراتے سادھوناں دیناشائے چ دشکرتام
دھرم سنستھاپنارتھائے سنبھوامی یگے یگے[2]

---

[1] دیکھیے رسالہ بودھ دھرم کے مول سدھانت " مصنفہ راہل سانکرتیاین شائع کردہ برمی بودھدی ہار، سارناتھ، بنارس

[2] ४।७ ४।८

اس سے مراد یہ ہے کہ جب دھرم گلانی ہوتی ہے، دھرم اٹھ جاتا ہے تب ست پرشوں کی حفاظت اور دشٹ کرم کرتاؤں کی ہلاکت کے لیے بھگوان کا اوتار ہوتا ہے۔ (بھارتی ورتو سومنا، پرشوتم شرما چترویدی)

شری پرشوتم شرما چترویدی سناتن دھرمی ہیں۔ شری کرشن جی کے اس قول کی بحث سوامی دیانندجی کی "ستیارتھ پرکاش" میں بھی آئی ہے۔ دیانندجی اوتار کو نہیں مانتے وہ اس قول سے متعلق لکھتے ہیں۔

"یہ بات وید کے خلاف ہونے کی وجہ سے سند نہیں، ہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ شری کرشن دھرماتما تھے اور دھرم کی حفاظت کرنا چاہتے تھے (اس لیے انھوں نے کہا ہو) کہ زمانے زمانے میں جنم لیکر نیکوں کی حفاظت اور بدوں کی ہلاکت کروں تو کچھ دوش نہیں ہے"

کرشن جی کے اس قول میں اوتار لینے کی جو ضرورت بتائی گئی ہے اس کے متعلق یہ لکھنے کے بعد کہ اس کے لیے پرماتما کو اوتار لینے کی ضرورت نہیں، اس کے بغیر نیکوکاروں کی حفاظت اور بدکاروں کی ہلاکت اس کی قدرت کے نزدیک ایک ادنیٰ سی بات ہے۔ دیانندجی لکھتے ہیں:۔

"دلیل سے بھی ایشور کا جنم ثابت نہیں ہوتا۔ یہ بات تو ایسی ہی ہے جیسے کوئی لامحدود آکاش (خلا) کو کہے کہ حمل میں آیا، یا مٹھی میں دھرلیا، ایسا کہنا کبھی سچ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ آکاش لامحدود اور سب میں موجود ہے اس لیے آکاش نہ باہر آتا اور نہ بھیتر جاتا۔ اسی طرح لامحدود سرو دیاپک پرماتما کے ہونے سے اس کا آنا جانا کبھی ثابت نہیں ہوسکتا، جانا یا آنا تو وہاں ہوسکتا ہے جہاں وہ نہ ہو، کیا ایشور حمل میں دیاپک نہیں تھا جو کہیں سے آیا اور باہر نہیں تھا جو بھیتر سے نکلا؟ ایشور کے بارے میں ایسا کہنا علم سے کورے لوگوں کے سوا اور کون کہہ اور مان سکے گا؟ اس لیے پرمیشور کا جانا آنا اور پیدا ہونا مرنا کبھی ثابت نہیں ہوسکتا۔ عیسیٰ وغیرہ بھی ایشور کے اوتار نہیں۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی کیونکہ محبت، نفرت، بھوک، پیاس، خوف، غم، تکلیف، راحت، پیدا ہونا مرنا وغیرہ اوصاف سے متصف ہونے کے باعث وہ انسان تھے" ایضاً

شری پرشوتم شرما چترویدی اور شری جے دیال گوئندکا نے اوتار کے جو مقاصد بیان کیے ہیں وہ ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہاں ہم نے چترویدی جی ہی کی کتاب سے شری کرشن جی کا اصل قول اور اس کا ماحصل پیش کیا ہے اس قول میں اس تشریح و وضاحت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے مثلاً بھگتوں کے سننے اور ذکر کرنے وغیرہ کے لیے اپنی لیلائیں دکھانا جن کے بغیر بھگتی کی تکمیل ہی نہیں ہوسکتی۔ ہم اس تشریح و وضاحت پر تبصرہ بھی کر آئے ہیں۔ کرشن جی کے مذکورہ بالا قول میں اوتار کی غرض صرف اتنی ہی بتائی گئی ہے کہ جب جب اور جس جس زمانے میں بھی دھرم کو زوال

ہوتا ہے اس کے عروج اور نیکوکاروں کی حفاظت اور بدکاروں کی ہلاکت نیز دھرم کے قیام کے لیے ہم اوتار لیتے ہیں اس کے سوا اس قول میں یہ بات کہاں ہے کہ پرماتما بھکتوں کو اپنی لیلا دکھانے کے لیے اوتار لیتا ہے جس کو اوتار کا اصل مقصد قرار دیا گیا ہے۔

سوامی دیانند جی نے اوتار کو نہ مانتے ہوئے بھی اپنے عقیدہ اور مسلک کے مطابق ایک حد تک اس صورت میں اس قول کو قابل قبول قرار دیا ہے کہ اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ شری کرشن ایک نیک انسان تھے ان کا جذبہ یہ تھا کہ وہ بار بار پیدا ہوں اور نیکوکاروں کی حفاظت کریں اور بدکاروں کا استیصال کریں۔

اوپر کے دونوں مسلکوں کے ہندو علماء کی تشریح و توضیح کے اسلوب والفاظ سے قطع نظر اصل قول اور ان دونوں علماء کی تشریح کی روح کو لیجیے تو یہ اسلام کے نظریہ رسالت سے بالکل قریب نظر آئے گی۔ اس قول اور اس کی تشریح کی روح یہ ہے کہ اوتار کی غرض دین کا تحفظ و بقا اور اس کا احیاء و قیام ہے اور ساتھ ہی دینداروں کی حفاظت اور بددینوں کی تباہی و بربادی، اب اسی روح کی روشنی میں نظریہ رسالت اور اس کی تاریخ کا قرآن مجید میں مطالعہ کیجیے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء و مرسلین کا ذکر قرآن میں ہے وہ جس ملک، جس قوم اور جس زمانے میں مبعوث ہوئے اسی حالت میں مبعوث ہوئے کہ دین زوال پذیر ہو گیا تھا اور بددینی نے دین پر غلبہ و اقتدار حاصل کر لیا تھا، یہی حال اہل دین کا تھا کہ وہ شاذ و نادر کس مپرس ہو کر رہ گئے تھے، خدا کے رسولوں اور نبیوں نے مبعوث ہو کر دین کو از سر نو قائم اور برپا کیا، دین کے دشمنوں اور بدکاروں کا خاتمہ ہوا اور جس سرزمین پر دین کے دشمن فاسقوں، فاجروں اور ظالموں کا قبضہ و تصرف تھا اس پر دینداروں اور نیکوکاروں کا غلبہ و اقتدار قائم ہو گیا، اس کی تفصیل تو اس وقت ضروری ہو گی جب ہندو بھائیوں کے غور و فکر کے لیے یہ مقالہ کتابی صورت میں ہندی میں شائع ہو سکے گا۔ یہاں سورۂ اعراف اور سورہ ہود کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہو گا جن میں متعدد انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوتوں کا بیان آیا ہے۔ ان سورتوں کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ خدا کے پیغمبر ایسے ہی حالات میں مبعوث ہوئے ہیں جیسے حالات میں کرشن جی سے منسوب قول میں اوتاروں کا آنا بیان کیا گیا ہے اور خدا کے پیغمبروں نے کام بھی وہی کیے جو اوتاروں کا بتایا گیا ہے۔

جلیل القدر رسولوں میں سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم دین حق اور خدائے کائنات کی عبادت و بندگی کو چھوڑ کر ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو پوج رہی تھی اور اس کے نتیجے میں طرح طرح کی معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں میں مبتلا تھی، خدا نے اس قوم کی تعلیم و ہدایت کے لیے حضرت نوح علیہ السلام

کو مبعوث فرمایا آپ نے جب اپنی قوم کو توحید اور خدا پرستی کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ "میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ تمہاری بداعتقادیوں اور بداعمالیوں کے نتائج سے تمہیں کھلے طور پر خبردار کردوں لہٰذا تم ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت و بندگی نہ کرو، تو ان کی اس دعوت و تنذیر کا ان کی قوم کے سرداروں کی طرف سے جواب یہ ملا کہ "میں تمہاری بات کیوں مانوں؟ تم بھی تو ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو، تم کو ہم پر کون سی فوقیت و برتری حاصل ہے جو ہم تمہارا اتباع کریں؟ تم پر جو لوگ ایمان لائے ہیں ہم ان کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ بھی کوئی ممتاز لوگ نہیں محض ادنیٰ درجے اور راوپری قسم کی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان ہیں" (سورۂ ہود)

حضرت نوح علیہ السلام نے ان بددینوں اور سرکشوں کو دن کو بھی سمجھایا اور رات کو بھی، چپکے چپکے بھی اور علانیہ بھی، اس جدوجہد میں آپ نے اپنی عمر کا طویل ترین حصہ صرف فرما دیا لیکن آپ کی قوم کے سرکشوں اور ناخدا ترسوں کا حال یہ تھا کہ ان کی ضد اور سرکشی ترقی ہی کرتی چلی گئی وہ آپ کی دعوت توحید کے جواب میں اپنی قوم کو للکارتے کہ "دیکھنا ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی پوجا پاٹ کو ہرگز ہرگز نہ چھوڑنا" آخر حضرت نوح پکار اٹھے "مالک! ان کافروں میں سے ایک کو بھی زمین پر آباد نہ چھوڑیو، اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ اس کے سوا اور کچھ نہ کریں گے کہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں، یہ جو اولاد پیدا کریں گے وہ بھی بدکار اور تیری ناشکر گزار ہی ہوگی (سورہ نوح)

حضرت نوح کی پکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے حضرت نوح کو اور ان کے ساتھی مومنین کو کشتی کے ذریعہ بچا لیا اور ظالموں اور سرکشوں کو پانی کے طوفان کے ذریعہ غرق کر دیا (سورۂ نوح، الاعراف اور ہود)

جس سرزمین پر دین حق مظلوم تھا اور اس کے پیرو مظلوم اور بے بس تھے اس پر دین حق قائم ہوگیا، اور وہ سرزمین دین داروں اور خدا پرستوں کے قبضہ و تصرف میں آگئی۔

آگے چل کر ان دینداروں اور خدا پرستوں کی اولاد بھی اسی طرح کی بددینی اور ضلالت میں مبتلا ہوگئی جس میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم مبتلا تھی ان لوگوں کی ہدایت کے لیے انھیں میں سے حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے۔

انھوں نے بڑی دل سوزی سے اپنی قوم کو دعوت دی: "اے میری قوم! اللہ کی عبادت و بندگی اختیار کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور اس بددینی کی پاداش سے ڈرو" قوم کے سرداروں کا جواب تھا: "ہم تمہاری بات کیا مانیں؟ ہم تو دیکھتے ہیں تم نرے احمق اور اپنے دعویٔ رسالت میں محض جھوٹے ہو"

حضرت ہود علیہ السلام نے اسی ہمدردی اور دل سوزی سے مزید سمجھایا: "سوچو تو تمہارے رب نے نوح کی قوم

کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا، اور تمہیں خوب تنومندی عطا کی لہٰذا تم خدا کی ان بخششوں اور عنایتوں کو یاد کرو، تاکہ فلاح یاب ہو۔ لوگوں نے جواب دیا: "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم بس اللہ ہی کی عبادت کریں اور اپنے ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں، اچھا اگر تو سچا ہے تو وہ عذاب لے آ جس کی تو ہم کو دھمکی دیتا ہے۔"

آخر اس قوم پر بھی خدا کا عذاب آیا، حضرت ہودؑ اور ان کے ساتھی دین داروں اور نیکو کاروں کو اللہ نے بچا لیا اور بد دینوں اور ظالموں کو تباہ کر دیا۔ (الاعراف اور ہود) یہی انجام حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا ہوا مصر کے ظالم اور سرکش فرماں روا فرعون اور اس کی قوم کے حالات اور بھی زیادہ عبرتناک ہیں جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین حق کی دعوت دی تھی، فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ فرعون اور اس کا ذکر کہیں تفصیل اور کہیں اجمال کے ساتھ بار بار قرآن مجید میں آیا ہے، خدا کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی ایسی ہی حالت میں ہوئی جیسی حالت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت پر مامور ہوئے تھے یا جیسی حالت کی شری کرشن جی سے منسوب قول میں نشان دہی کی گئی ہے

ہندستان کی حالت

کرشن جی کے زمانے میں ہندستان کی کیا حالت تھی، اس کا سرسری نقشہ ملاحظہ ہو۔ پنڈت سندر لال جی اپنی مشہور تصنیف "گیتا اور قرآن" میں گیتا کے زمانۂ نزول میں ہندستان کے باشندوں کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "لوگ ویدوں کے چرچے میں مگن تھے (۲-۴۲) ان کا ان کے دل پر اور خود ارجن کے دل پر بھی گہرا اثر تھا (۲-۴۳) ویدوں کی باتیں کہنے اور سننے میں انھیں بڑی پیاری لگتی تھیں۔ (۲-۴۲) وہ کہتے تھے کہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ہے ہی نہیں (۲-۴۲) لیکن ویدوں سے انھوں نے جو چیز اپنی زندگی میں لے رکھی تھی وہ صرف اوپری کرم کانڈ (افعال) اور رسم و رواج تھے۔ (۱-۴۳) جیسے یگیہ، یوجن، جپ، تپ، پوجا پاٹھ، دان وغیرہ۔ (۹-۲۰-۲۱-۱۱-۴۸-۳-۵) اس سے ان کا مقصد یا منشا صرف عیش و آرام اپنی دنیوی خواہشوں کا پورا کرنا اور زیادہ سے زیادہ "سورگ" یا "اندر لوک" حاصل کر کے وہاں کے اعلیٰ نعائم کا عیش اٹھانا ہوتا تھا۔ (۲-۴۳-۴۴-۹-۲۰-۲۱)"

"یگیہ کئی طرح کے ہوتے تھے" (۴-۳۲) تینوں ویدوں رگ، سام اور یجر کے علاوہ (۹-۱۷-۴۰) بہت سے لوگ الگ الگ سمرتیوں کے ماننے والے تھے، ویدک یگیوں کے علاوہ سمرتی یگیہ بھی ہوا کرتے تھے (۹-۱۶) اور ویدک اور سمرتی دونوں طرح کے یگوں میں منتر پڑھ پڑھ کر گھی اور طرح طرح کی کھانے کی چیزیں اور دوسری چیزوں کی اگنی کنڈ (آگ کے گڈھے) میں آہوتیاں دی جاتی تھیں۔ (۹-۲۰) اور سوم رس (شراب) پیا جاتا تھا۔

"ایک پرمیشور کے علاوہ بہت سے لوگ الگ الگ دیوتاؤں کی بھی پوجا کرتے تھے ان دیوتاؤں سے طرح طرح کی مرادیں اور منتیں مانگی جاتی تھیں، ان کے خوش کرنے کی طرح طرح سے کوششیں کی جاتی تھیں ان کے نام پر یگ کیے جاتے تھے، اور ان یگوں میں دیوتاؤں کے نام لے لے کر آہوتیاں دی جاتی تھیں۔ پھول پتی، پھل اور جل وغیرہ بھی چڑھائے جاتے تھے۔ دیوتاؤں کے علاوہ پتروں (خاندانی مردوں) اور بھوتوں کی پوجا کا بھی رواج تھا۔ سب کے نام پر الگ الگ یگ ہوتے تھے اور سب کے سامنے طرح طرح کے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ (۹-۲۵ و ۲۶)

جو لوگ صرف ایک پرمیشور کو مانتے تھے وہ لوگ بھی الگ الگ راستے سے اسے جاننے یا حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ غرض اس وقت دیش میں طرح طرح کے پنتھ، فرقے اور دھرم جاری تھے۔ کچھ لوگ سدھیوں (کرامتوں) کے پیچھے بھی دوڑتے تھے اور انھیں حاصل کرنے کے دو راستے مانے جاتے تھے۔ ایک یگ کرم کانڈ اور دوسرا دنیا سے الگ رہ کر سوکھا گیان۔

ان حالتوں سے قدرتی طور پر درشن یا فلسفہ کی نگاہ سے دو الگ الگ خیال ایک دوسرے کے خلاف دیش میں موجود تھے۔ ان دونوں کا گیتا میں بار بار ذکر آیا ہے۔ ایک سانکھیہ یا گیان والے جو یگ وغیرہ کاموں کی جگہ گیان پر زور دیتے تھے اور گیان کو ہی نجات یعنی مکتی کا ذریعہ مانتے تھے وہ سب طرح کے ہی کاموں کو برا اور تیاج (چھوڑ دینے کے لائق) مانتے تھے اور معمولی گھربار کی زندگی سے علیحدگی (سنیاس) کو مکتی کے لیے ضروری بتاتے تھے، دوسرے اوپری کرم والے جو اوپری رسموں جیسے یگ وغیرہ پر زور دیتے تھے۔ گیتا میں گیان اور کرم دونوں کو یوگ بتایا گیا ہے۔ دھیان پرانایام (حبس دم) وغیرہ کے بھی کئی طریقے ان دنوں جاری تھے۔

"گیتا میں صاف لکھا ہے کہ وہ زمانہ اس دیش میں محض پانڈوں کے اوپر کوروں کے ظلم ہی کا

نہیں تھا بلکہ چاروں طرف دھرم کی گلانی اور ادھرم کے گھٹنے اور ادھرم کے بڑھنے کا زمانہ تھا جب کہ ایشور کی طرف سے اوتاروں یا مہان آتماؤں کے جنم لینے، گیتا جیسے امر اپدیشوں کے دیے جانے اور سچے دھرم کے پھر سے قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے"۔ (صفحہ ۱۱۰ سے ۱۱۹ تک)

یہ تو تھی ہندوستان میں دھرم کی وہ حالت جس میں کرشن جی کا ظہور ہوا اور جس میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اس زمانے میں نہ صرف عرب بلکہ شام و مصر، ایران اور ہندوستان غرض ساری دنیا میں دین اور دھرم کی کیا حالت تھی؟ اسے تاریخ سے پوچھیے۔ ہندوستان ہی کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کرشن جی کے زمانے میں جو حالت تھی وہی حالت اس ملک میں پھر پیدا ہو گئی تھی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے بہت پہلے ہندوستان کی مذہبی حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ بدھ جی نے اٹھ کر ہندو مذہب کی تمام بساط ہی الٹ دی۔ آگے چل کر بودھ مذہب بھی اپنی اصلیت کھو کر طرح طرح کی برائیوں کا آماجگاہ بن گیا، اس کے استیصال کے لیے شنکر اچاریہ اٹھے اور انھوں نے بودھ مذہب کو اتنا دبایا کہ وہ ہندوستان سے جلا وطن ہونے پر مجبور ہو گیا۔ گو آگے چل کر بدھ جی بھی اوتاروں میں شامل کر لیے گئے لیکن وہ برائے بیت ہی اوتار ہیں۔ بودھ مذہب آج بھی ہندو مذہب سے ایک الگ مذہب کی حیثیت رکھتا ہے اور بدھ جی کو دوسرے ہندو اوتاروں کے مقابلے میں پاسنگ کے برابر بھی عقیدت و تقدیسیت حاصل نہیں ہے۔ غرض آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانے کے ہندوستان کو دیکھا جائے تو یہاں وہ تمام خرابیاں از سر نو عود کر آئی تھیں جن کی اصلاح کے لیے کرشن جی کا اوتار لینا بیان کیا گیا ہے اور جس کے آثار و شواہد آج بھی ہر طرف موجود ہیں آج کیا نہیں ہے؟ ہولی ہے، دیوالی ہے۔ درختوں، جانوروں، بھوتوں پریتوں کی پوجا ہے لیکن ہم بعثت محمدی کے زمانے کے صرف عرب کے حالات کا ایک اجمالی نقشہ پیش کر رہے ہیں۔

عرب کی حالت

پنڈت سندر لال جی لکھتے ہیں:۔

"محمد صاحب کے جنم کے وقت عرب قوم ہزاروں قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی۔ قبیلوں میں آئے دن لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ ہر قبیلہ اپنے کو اپنی جگہ آزاد سمجھتا تھا، ہر ایک قبیلے کا اپنا ایک الگ بت تھا جسے اس قبیلے کے لوگ پوجتے تھے، کوئی دیوتا لکڑی کا تھا، کوئی پتھر کا اور کوئی گندھے ہوئے آٹے کا، کوئی دیوتا مرد یا عورت کی شکل کا تھا اور کوئی جانور کی شکل کا، اور کوئی بالکل ان گھڑ۔ بہت سے لوگ کئی کئی

دیوی دیوتاؤں کو پوجتے تھے، لیکن زیادہ تر عربوں میں ایک خدا کا خیال تک نہ تھا اور نہ ان کا کوئی دھرم تھا۔ ایک دوسرے کے دشمن ہزاروں قبیلوں کو ایک دھاگے میں پرونے والی کوئی طاقت نہ تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ملک کے ایک بڑے حصے پر باہر کے لوگوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔

"بدچلنی کی یہ حالت تھی کہ شراب پی پی کر اکثر عربوں کی موتیں ہوتی تھیں، شراب کے ساتھ جوا چلتا تھا اور اس درجے تک بڑھا ہوا تھا کہ بہت سے عرب اپنا سارا مال اسباب جوے میں ہار کر آخر میں اپنے تن کی بازی لگا دیتے تھے اور جب ہار جاتے تو باقی زندگی جیتنے والے کے غلام بن کر رہنا منظور کرتے۔

"عرب کے لوگ اپنی بدچلنیوں کا گھمنڈ کے ساتھ سب کے سامنے بکھان کرتے تھے۔

"عورتوں کے ساتھ بھی عام طور پر بہت ہی برا برتاؤ ہوتا تھا، ان کے کوئی کسی طرح کے حق نہ مانے جاتے تھے، مرد جتنی چاہے شادیاں کر سکتا تھا اور جب چاہے اپنی جس عورت کو طلاق دے سکتا تھا، ایک عورت کے کئی کئی خاوند کا بھی رواج تھا، کبھی کبھی ہفتے کے سات دن اس طرح بٹے ہوئے الگ الگ خاوند بندھے ہوتے تھے کہ اتوار کے لیے الگ، سوموار کے لیے الگ، اور منگل کے لیے الگ۔ باپ کے مرنے کے بعد ان کی جتنی بیویاں ہوتی تھیں وہ اس کے بڑے بیٹے کی بیویاں سمجھی جاتی تھیں یعنی ایک ماں کے سوا جس نے کسی کو اپنے پیٹ سے جنم دیا ہو یا اس عورت کے جس کا اس نے دودھ پیا ہو اور کوئی رشتہ عربوں میں پاک سمجھا جاتا تھا۔

"اس طرح کے دیش اور اس طرح کے لوگوں میں محمد صاحب اور قرآن نے جنم لیا۔ قرآن کے آدیشوں (تعلیمات و ہدایات) کو سمجھنے کے لیے عربوں کی ان دنوں کی حالت اپنے اپنے سامنے رکھنا ضروری ہے۔"

(گیتا اور قرآن صفحہ ۱۷۷ تا ۱۸۰)

پنڈت سندر لال جی نے بعثت محمدی کے زمانے کے عربوں کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ خود بالکل سرسری ہے اور ہم نے اسے اور بھی مختصر کر دیا ہے، عربوں کی حالت اس سے کہیں زیادہ خراب تھی، چونکہ اہل عرب بت پرست تھے اس لیے بعض ہندو لیڈر اور علماء مسلمانوں کی ضد میں عربوں کو بھی ہندو قرار دے کر ان سے رشتہ جوڑنے لگے ہیں ان کو اتنی بھی خبر نہیں کہ قریش کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی غیر نہ تھے، وہ آپ ہی قوم اور آپ ہی کے رشتہ ناطہ کے لوگ تھے، آپ ان کی تعلیم و ہدایت پر خاص طور پر مامور تھے، قریش حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد تھے، یہ دونوں بزرگ خدا کے رسول اور نبی تھے۔ ان بزرگوں کا دین بھی اسلام ہی تھا، ان کی تعلیم و ہدایت کی رو سے ایک خدا کے سوا کسی دیوی دیوتا کی عبادت منع کی جا چکی تھی۔ انھیں دونوں بزرگوں نے کعبہ تعمیر کیا تھا کہ وہ

دنیا میں ایک خدا کی عبادت و بندگی کی تعلیم و ہدایت کا مرکز ہو۔ کعبہ کی تعمیر کے بعد اس کی آبادی کے لیے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اس کے پاس بساتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے دعا کی تھی لیکن جیسا کہ ہر ملک اور ہر قوم میں ہوتا رہا کہ لوگ اپنے دینی پیشواؤں کے دنیا سے جانے کے بعد آگے چل کر ان کی تعلیم و ہدایت کو فراموش کر کے ضلالت و بد دینی میں مبتلا ہو گئے قریش بھی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی تعلیم و ہدایت کو یکسر بھلا کر بت پرست بن گئے تھے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کی تعلیم و ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے تھے کہ ساری دنیا میں سچا دین اور دھرم مظلوم ہو رہا تھا لیکن قریش اور اہل عرب کی اصلاح اور تعلیم و ہدایت کے لیے خاص طور پر مامور تھے کہ وہ آپ کی قوم اور ملک کے لوگ تھے آپ انھیں میں پیدا ہوئے تھے اور انھیں کے درمیان مبعوث ہوئے تھے۔ جو ہندو لیڈر اور علماء قریش مکہ اور اہل عرب سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں ان کی واقفیت کے لیے ہم بعثتِ محمدی کے زمانے کے قریش اور اہل عرب کے مذہبی عقائد ان کے دیوی دیوتا اور ان کے سماجی اور اخلاقی حالات کی کچھ مزید تفصیل پیش کرتے ہیں تاکہ ہندو لیڈر اور علماء خود فیصلہ کر سکیں کہ عربوں سے رشتہ جوڑنا کتنی بھدی اور بے جوڑ بات ہے اور ساتھ ہی اس انقلاب کی عظمت و اہمیت کا اندازہ کر سکیں جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت سے عرب میں رونما ہوا اور آگے چل کر ساری دنیا پر اس کا انقلاب انگیز اثر ہوا۔ (باقی)

سب سے بڑی گمراہی

فکر و نظر کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انسان خالق کائنات کے صحیح تصور اور اس کے بارے میں صحیح عقیدے سے ناآشنا ہو جائے۔ عقیدۂ توحید کا سر رشتہ جب انسان کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے تو پھر وہ اس دنیا میں شتر بے مہار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور پھر اس کی زندگی کی کوئی کل سیدھی نہیں رہتی، شرک و الحاد فکر انسانی کا وہ ہمہ گیر انقلاب فاسد ہے جو پوری زندگی کو فساد اور شر سے بھر دیتا ہے۔ تمام شعبہ ہائے حیات الٹ پلٹ ہو جاتے اور انسانیت موت کی نیند سو جاتی ہے۔ اس کے ذہن کا سانچہ اس طرح بگڑ جاتا ہے کہ وہ اچھائی کو برائی اور برائی کو اچھائی سمجھنے لگتا ہے کنکر کو موتی خزف ریزوں کو پارہ ہائے زر اور کانٹوں کو پھول تصور کرتا ہے۔ سیدھی بات بھی اس کے ٹیڑھے ذہن میں جا کر ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔

---

(۲)

(جناب سلطان مبین صاحب ایم اے)

خالقیت والوہیت کبریٰ کے حوالہ جات

اندر :- اندر کے لیے خداوند فلک سجدہ ریز ہے اور بڑی زمین اندر کے لیے سجدہ کرتی ہے۔ رگ۔ ۱۵ ا ۱۳ ا ۱، زمین و آسمان جس (اندر) کی طاقت سے کانپتے ہیں۔ رگ ۲ : ۱۲ : ۱ جس نے کانپتی ہوئی زمین کو قرار بخشا، بگڑے ہوئے کوہستانوں کو جس نے روکا، جس نے وسیع ترین فضا کو ناپ ڈالا جس نے آسمان کو تھام رکھا ہے۔ وہی اندر ہے لوگو! رگ ۲ : ۱۲ : ۲ جس کے زیر حکم گھوڑے، گائیں، آبادی اور رتھ ہیں، جس نے سورج اور فجر کو پیدا کیا۔ جو پانیوں کا رہبر ہے وہی اندر ہے لوگو! رگ ۲ : ۱۲ : ۵۔ اس (اندر) کے لیے زمین وآسمان سجدہ ریز ہیں۔ کوہستان اس کی قوت سے ڈرتے ہیں۔ رگ ۲ : ۱۲ : ۱۳، (اندر نے) بڑے آسمان کو بغیر کھمبے کے تھام لیا زمین، آسمان اور فضا کو معمور کر دیا ہے۔ اس نے زمین کو قائم کیا اور پھیلایا۔ اندر نے ان (کاموں) کو سوم کے نشہ میں کیا ہے۔ رگ ۲ : ۱۵ : ۲۔ زمین، آسمان و کوہستان محکوم کی طرح تیرے قاعدے کی پیروی کرتے ہیں۔ رگ ۳ : ۳۰ : ۴۔ اندر! تو سورج، آسمان و فجر کو پیدا کرتے ہوئے کسی کو مقابل نہیں سمجھتا۔ رگ ۱ : ۳۲ : ۴۔ بجر والا اندر ساکن متحرک سب سے سادے اور سینگ والے جانوروں کا بادشاہ ہے۔ وہ جانداروں پر حکومت کرتا ہے۔ وہ ان سب کو اس طرح احاطہ کیے ہوئے ہے جس طرح پہیہ کا حلقہ تیلیوں پر محیط ہوتا ہے ۱ : ۳۲ : ۱۵ رگ میں (انہوں نے آریوں کو زمین بخشا۔ سخی آدمیوں کو بارش۔ میں شور کرنے والے پانیوں کو لایا۔ سب ہی خداوندوں نے میری مرضی کی پیروی اختیار کی ۴ : ۲۶ : ۲ رگ قاتل برتر (ابر) اندر! کوئی تجھ سے بالاتر اور بزرگ تر نہیں ہے نہ کوئی تجھ جیسا ہی ہے۔ رگ ۴ : ۳۰ : ۱۔ اندر! تو کل مخلوق کو قدرت سے محیط ہے اور تو کل کائنات کو وسیع ہے رگ ۱۰ : ۵۴ : ۵

اگنی۔ (خداوند آتش) اگنی! تجھ بزرگ کے قاعدے بڑے ہیں۔ زمین وآسمان کو تو نے قدرت سے پھیلا دیا۔

رگ ۳: ۶: ۵۔ جس (اگنی) نے تمام عالم کو بنایا۔ ۳: ۱۶: ۴۔ اگنی! تو یہ جو کچھ ہے اس کے مالک ہو۔ جو کچھ آسمان میں جو کچھ زمین میں دولت ہے (اس کے مالک ہو) ۴: ۵: ۱۱۔ اگنی نے خدا کی طرح زمین کو قائم کیا اور بیچ منترول سے آسمان کو تھاما ۱: ۶۲: ۵۔ (اگنی نے) معمار کی طرح دھویں (کی طرح) آسمان کو اوپر روک رکھا ہے ۴: ۶: ۲۔ جس (اگنی) نے آسمان وزمین کو حق سے پھیلایا ہے۔ ۵: ۱: ۷

اپام نپات (آتش آب) خداوند فرزند آب نے یزدانی بزرگی سے سبھی کائنات کو پیدا کیا۔ ۲: ۳۵: ۲ دوسرے عالم اس کے مولود ہیں ۲: ۳۵: ۸

برہسپتی۔ جس برہسپتی نے زمین کے گوشے کو قوت سے سنبھال رکھا ہے۔ ۴: ۵۰: ۲

بات (باد) اس سب کائنات کا بادشاہ (باد) ان کے ساتھ ایک ہی رتھ پر جاتا ہے۔ ۱۰: ۱۶۸: ۲۔ یہ خداوند (باد) خداوندوں کی سانس ہے۔ کائنات کا حمل (علق) ہے۔ ۱۰: ۱۶۸: ۴

مرت (باد طوفان) مرت ہی نے آسمان وزمین کو بڑھنے کے لیے بنایا ہے۔ ۱: ۸۵: ۱

متر (مہر) متر نے زمین و آسمان کو قائم کیا۔ متر بغیر جھپکی مخلوقات کو دیکھتا ہے ۳: ۵۹: ۱ پانچوں رگ اعانت کرنے والے متر کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ وہ سب ہی دیوتاؤں کو پالتا پوستا ہے ۳: ۵۹: ۸

سوتر (خاور) انسان اور جملہ کائنات ہمیشہ سے خداوند سوتر ( ) کے آغوش میں واقع ہے۔ ۱: ۳۵: ۵۔ دیوتا اس پر ٹکے ہیں جس طرح رتھ کے دھوے پر (رتھ) ۱: ۳۵: ۶

سورج۔ بخشندہ اور ہمہ بین سورج طلوع ہوتا ہے۔ ۷: ۶۳: ۲۔ اس نے زمین، آسمان اور فضا کو معمور کر دیا وہ جمادات اور حیوانات کی روح ہے۔ ۱: ۱۱۵: ۱۔ جو (سورج) کل کائنات کو دیکھتا ہے اور انسانوں کے دل کی باتیں جانتا ہے۔ ۷: ۶۱: ۱

وشنو (پہلوئے آفتاب) جس (وشنو) نے زمین کے علاقوں کو ناپ ڈالا ہے۔ جس نے بزم بالا کو تھام رکھا ہے ۱: ۱۵۴: ۱۔ جس نے تنہا زمین و آسمان اور جملہ کائنات کو تین بار میں قائم کر دیا ہے۔ ۱: ۱۵۴: ۴۔ بشنو! ماضی اور حال کا انسان تیری قدرت کی انتہا کو نہیں پہنچتا۔ تو نے فضا بسیط کو اوپر روک رکھا ہے اور زمین کے نشیب و فراز کو قائم کر دیا۔ ۷: ۹۹: ۲

پرجاپتی (برہما) پہلے پرجاپتی تھا وہ تنہا موجودات کا خداوند تھا۔ اس نے زمین و آسمان کو قائم کر دیا، جو سانس لینے والے اور تاکنے والوں جانوروں کا بادشاہ ہے جو دوپایوں اور چوپایوں کا خداوند ہے۔ جس نے آسمان کو بلند کیا

زمین کو مضبوط بنایا، جس نے عالم بالا کو قائم کیا، جس نے فضائے بسیط کو ناپ لیا۔ پرجاپتی! تیرے سوا دوسرا جملہ کائنات کو محیط نہیں ہے۔ رگ ۱۰: ۱۲۱: ۱، ۳، ۵، ۱۰

ورن (   ) اہورمزدہ) اس کی قدرت سے نسلیں ذہین ہیں۔ جس نے وسیع زمین و آسمان کو رکھا ہے جس نے فضائے بسیط کو اور دوبارہ سورج کو اوپر ڈھکیل دیا ہے اور زمین کو پھیلا دیا ہے۔ ۷: ۸۶

متر و ورن (ثنویت) کریم متر و ورن! آپ دونوں نے وسیع زمین اور اونچے بڑے آسمان سے نگراں ہیں جو الگ آباد ہیں اور جنگلوں میں جاتے ہیں آپ دونوں بغیر ... سے نگرانی کرتے ہوئے ۷: ۶۱: ۳

زمین و آسمان: زمین و آسمان اپنے ساکن و متحرک فرزندوں کے مقام کی حفاظت کرتے ہیں ۱: ۱۵۹: ۰

اشون (دو شہ سوار برادر) اے جواں مرد سوارو! آپ دونوں جانوروں میں حمل کو قائم کرتے ہیں۔ آپ دونوں کل کائنات کے اندر۔ آپ دونوں حرکت بخشتے ہیں۔ ۱: ۱۵۷: ۵

وشوکرما (   ) فاعل کل) کہاں مستقر تھا؟ کیا ابتدا تھی؟ کہ سب طرف دیکھنے والے وشوکرما نے زمین کو پیدا کیا اور قدرت سے آسمان کو چھا دیا۔ ۱۰: ۸۱: ۲۔ ہر طرف آنکھ، منہ، بازو اور پیر والے اکیلے خداوند نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور دونوں بازوؤں اور پیروں سے ہوا دیتا ہے۔ ۱۰: ۸۱: ۳

فی الجملہ ان سبھی خداوندوں کو تخلیق و تکوین کی صفات اور الوہیت کبریٰ سے متصف کیا گیا ہے۔ رشی عموماً خداوند بزرگ کی ستائش کرتے تھے اس کو وہ تھوڑی دیر کے لیے الہ اکبر بنا دیتے تھے۔ دائمی طور پر کسی ذات مخصوص کو الوہیت کبریٰ کی مسند پر سرفراز کرنا ان کے مشرکانہ مزاج کے منافی تھا۔ صفات کے اس اشتراک کی وجہ سے دیوتاؤں کی ذوات وصفات زیادہ غیر واضح اور مبہم تر ہو جاتے ہیں۔ ذات وصفات کا یہ تشابہ و اشتباہ، ابہام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ب۔ حل ہر چند کہ دیوتاؤں کی ذات وصفات مبہم تھی مگر ان دیوتاؤں کے ذہنی وجود کے ساتھ ساتھ ان کے ذاتی کارنامہ اور کردار وابستہ ہو گئے تھے اور یہ کردار اتنے ذہن نشین ہو گئے تھے کہ ذات کے نامعلوم و غیر متعین ہونے پر بھی یا ایک دوسرے سے ممتاز تھے اور انہیں کرداروں اور صفات کے سبب سے یا اپنے وجود کو باقی رکھ سکے۔ ان معبود و غیر معلوم اور واضح اور مبہم ارباب متفرقہ کی خوشنودی کے لیے نذر و نیاز (یگیہ، یاگ) کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ جس میں سبھی دیوتاؤں کو نام بنام بلا کر نذر تناول فرمانے اور سوم پینے کی گزارش کی جاتی تھی۔ یہاں ایسی نذر کا تصور نہ پیدا ہو سکا کہ صرف ایک ہی خداوند کو نذر میں مدعو کیا جائے۔ عوام الناس دولت اور حشمت کے لیے یگیہ کرتے تھے اور ...

سے مقصود اگر حاصل ہو جاتا تھا تو یہ سمجھ لیا جاتا کہ یہ گیہ اور ان دیوتاؤں کی بندگی کا ثمرہ ہے۔ اگر مراد پوری نہیں ہوتی تھی تو پروہت دکاہن یہ کہہ دیتے تھے کہ گیہ کی ترتیب و تکمیل میں کوئی نقص اور کمی ہوگئی ہوگی۔ اس طرح عوام کی دلچسپی گیہ سے ہمیشہ باقی رہی۔ گیہ کی انجام دہی میں پروہتوں کو معقول فیس اور اعزاز ملتا تھا۔ اس لیے پروہتوں نے آمدنی وعزت کے اس ذریعہ کو ترک کرنا ہرگز ہرگز مناسب نہیں سمجھا۔ اس طرح گیہ کی وساطت سے ویدک دیوتا عوام وخاص دونوں کے مرکز عقیدت بنے رہے۔ مگر فطرت صالحہ اور ذوق سلیم بار بار مطالبہ کرتا کہ زمین وآسمان اور زندگیوں کا پیدا کرنے والا ان مظاہر قدرت اور مبہم دیوتاؤں کے علاوہ کوئی اور ہونا چاہیے اور چونکہ یہ شہادت انسانوں کے اپنے دلوں سے اٹھتی تھی اس لیے اس کا نظر انداز کرنا بڑا مشکل تھا۔ اس لیے رشیوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے الگ پرجاپتی (رب العلمین) رگ ۱: ۱۲۱، پرش (ذات محضہ) رگ ۱۰: ۹۰، وشوکرما (فاعل کل) رگ ۱۰: ۸۱، کال (زمان) اتھرو ۱۹: ۵۴ کام (خواہش) اتھرو ۱۹: ۵۲ کے تصور پیش کیے۔ مگر عوام نے ارباب متفرقہ سے کٹ کر ایک خدا کی طرف رجوع کا صراط مستقیم اختیار نہیں کیا۔ بلکہ خداوندوں کے حلقہ میں ان متعدد خداوندوں کا اضافہ کرلیا۔ کثرت پسندی کے اس رجحان اور توحید کی معقولیت کو ساتھ ساتھ چلانے کے لیے مصالحت کی جو راہ اختیار کی گئی وہ تھی ایک خداوند کی ذات کو دوسرے خداوند کی ذات پر حمل کرنا" چونکہ اکثر دیوتاؤں کی ذات وصفات میں بڑی حد تک ابہام تھا اس لیے حمل کے رجحان کو ناکامی ونامرادی سے ہمکنار نہیں ہونا پڑا بلکہ اس رجحان کی حوصلہ افزائی ہی ہوئی۔ حمل کی صورت یہ تھی کہ ایک دیوتا کو دوسرے دیوتا کا عین یا جزو قرار دیا جائے۔

حمل عین۔ اگنی، روشن اگنی متر (سورج) ہے متر، ورن، ہوتا (پروہت) آگ ہی ہیں۔ رگ ۳: ۵: ۴

اگنی! آپ پیدائش کے وقت ورن ہیں اور روشن ہونے پر متر ہو جاتے ہیں۔ اے قوت زاد! سبھی خداوند تمہارے اندر موجود ہیں۔ تم سخی انسان کے لیے اندر ہو ۵: ۳: ۱ اگنی! تم سورج ہو۔ رگ ۵: ۳: ۲

اندر: میں (اندر) منو اور سورج ہوں۔ میں ککشی وان رشی ہوں۔ رگ ۴: ۱۲۶: ۱

اشون: آپ دونوں دولت میں سب سے بڑے اندر ہیں اور سب سے بڑے مرت (باد طوفان) ہیں رگ ۱: ۱۸۲: ۲

ادتی: ادتی آسمان ہے، ادتی فضا ہے، ادتی ماں ہے وہ باپ ہے وہ بیٹا ہے۔ جملہ خداوند ادتی ہیں۔ پنجگونہ انسان ادتی ہیں۔ ادتی والد اور مولود ہیں رگ ۱: ۸۹: ۱۰ (رشیوں نے) اندر، متر، برن، اگنی اور آسمانی پرندہ گرتمان ( ) سیمرغ فرمایا ہے۔ ایک حق کو متعدد بیان کرتے ہیں اور (اسے) جم اور ماترشون بھی کہتے ۱: ۱۶۴: ۴۶

حمل جزو: متر، برن اور اگنی کی آنکھ سورج طلوع ہوا۔ رگ ۱: ۱۱۵: ۱

برہمن اس (ذات) کا منہ ہوا۔ دونوں بازو کشتری کیے گئے۔ ویش جو ہے اس کی دونوں رانیں ہیں۔ دونوں قدمو سے شودر پیدا ہوئے۔ رگ ۱۰: ۹۰: ۱۲

(اس ذات کے) من سے چاند پیدا ہوا۔ دونوں آنکھوں سے سورج پیدا ہوا۔ منہ سے اندرا اور اگنی اور سانس سے بایو پیدا ہوا۔ رگ ۱۰: ۹۰: ۱۳

تخلیق کا تصور کرتے ہوئے (اس ذات کی) ناف سے فضا اور سر سے آسمان وجود میں آیا۔ دونوں قدموں سے زمین اور کان سے سمتیں (پیدا ہوئیں) رگ ۱۰: ۹۰: ۱۴

حمل کی اس ٹیکنک سے جملہ خداوندوں کو خوش رکھتے ہوئے اپنے پسندیدہ تر خداوند کو الٰہ اکبر بنانا بڑا آسان ہو گیا مگر ویدک رشی اس راہ پر چلتے چلتے رک جاتے تھے اور کثرت سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ وہ ایسی پرستش و عبادت سے ہرگز ہرگز واقف نہیں تھے جس میں صرف عقیدۃً ایک ہی خداوند کو پیش کی جاتی ہیں۔ تو بھی وہ اپنے بعد آنے والوں کو حمل کی ٹیکنک دے گئے جس سے آب و آتش کا پرستار انسان خود کو موحد سمجھتا تھا اور ان کی خدمت کرتا ہوا جملہ خداوندوں کو راضی رکھ لیتا تھا اور رکھتا تھا "پانی جملہ خداوندوں پر مشتمل ہے اور پانی بشنو پر مشتمل ہے" مہابھارت : ۹۲ ص ۴۷۶

مہابھارت اشومیدھ: ۹۲ ص ۴۷۶ مطبوعہ گیتا پریس گورکھپور

"آگ جملہ خداوندوں پر مشتمل ہے" مہابھارت۔ اشومیدھ : ۹۲ ص ۴۸۳

"میں، برہمن اور گائے بشنو پر مشتمل ہیں۔ مہابھارت اشومیدھ ۹۲، ص ۴۹۲

حمل و اطلاق کی راہ سے ایسی ایسی باتیں فرمائی گئی ہیں کہ مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ خداترس شرک کا یہ کلام نہیں ہے بلکہ ملحدانہ شرک نے یہ صوفیانہ (MYSTIC) نغمہ نوا زنا ہے۔ ذیل کے نغمہ میں گاؤ کے اعضا پر خداوندوں کا حمل کیا گیا ہے۔ اتھرووید ۹: ۷: ۱ — ۷، ۹۱ — ۲۵

"دونوں سینگ پرجاپتی اور پرمیشٹھی ہیں۔ سر اندر ہے، ٹیکا اگنی ہے۔ اور قعا یم راج ہے۔ ۱۔ پیشانی راجہ سوم ہے۔ اوپری جبڑا آسمان اور نچلا جبڑا زمین ہے۔ ۲۔ زبان بجلی ہے۔ دانت مرت ہیں۔ گردن دیوتی تارا ہے۔ کندھا عقد ثریا ہے۔ کوہان دھوپ ہے۔ ۴۔ سقیہ بادر ہے۔ پسلیاں خلا ہیں۔ کوہان کا بالائی حصہ برہسپتی ہے۔ ہڈیاں برہتی ہیں۔ ۵۔ پشت دیوتاؤں کی بیویاں ہیں۔ پہلو دیوتاؤں کی نشست گاہ ہے۔ ۶۔ دونوں پٹھے متر اور ورن ہیں۔ دونوں کلّے توشتا اور اریما ہیں۔ بازو مہادیو ہے۔ رگائے نشست اگنی ہے۔

باقی صفحہ ۵۵ پر

تراجم و اقتباسات

خود اعتمادی کا فقدان

ذیل میں معاصر استقلال رنگون (برما) کے ۵ جون ۱۹۸۲ء کا اداریہ نقل کیا جارہا ہے اس اداریے کے آئینے میں ہندوستان کے مسلمان بھی اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں۔ (ادارہ)

جب سے برما آزاد ہوا ہے یعنی ۱۹۴۸ء سے پہلے اور ۱۹۴۸ء کے بعد برما کے مسلمانوں کی یہ سیاست رہی ہے کہ وہ کسی طاقتور شخصیت یا طاقتور ادارے کا حاشیہ بردار بن جائیں جب ۱۹۴۷ء میں برما کو آزادی ملنے کی بات چیت ہو رہی تھی تو اس وقت برما کے مسلمانوں کے لیے محور آنجہانی بوجیو آنگ سان کی ذات تھی ان کے قتل کے بعد برمی مسلمانوں نے اونو کا سہارا لیا اور جب اونو اسٹیج سے گئے تو اس وقت مسلمانوں کے ایک طبقے نے اونو اور دوسرے طبقے نے اوباسوے کو نجات دہندہ سمجھا اور آج تک یہ عالم ہے کہ مسلمانوں کی اپنی کوئی سیاست نہیں وہ یا تو اونو کے حاشیہ بردار ہیں یا اوباسوے کے اونو کی حکومت برسر اقتدار آئی تو مسلمان اونو پر آس لگائے بیٹھے رہے اور جب اوباسوے کی حکومت برسر اقتدار آئے گی تو ...

دنیا کی سیاسی اور قومی تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حاشیہ بردار بننے کی پالیسی کبھی کامیاب نہیں رہی ہے اپنے اوپر اور اپنے خدا پر اعتماد کرنے کی بجائے مشہور سیاسی شخصیتوں پر اعتماد کرنا اور ان ہی کے رحم و کرم پر جینا ان لوگوں اور قوموں کا شیوہ رہا ہے جن کا شمار "گرنے والی امتوں" میں ہوتا ہے۔ تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی قوم نے غیروں پر اعتماد کرکے زندگی اور کامرانی حاصل کی ہو۔ زندہ رہنے والی قومیں خود اپنے زور بازو پر زندہ رہتی ہیں اور زندگی کے سامان فراہم کرتی ہیں۔

برما کے مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ پر ایک نظر ڈالیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ جب کبھی مسلمانوں نے اپنے اوپر اعتماد نہیں کیا تو ہمیشہ انھوں نے غلطی کی ہے مثال کے طور پر ارکان میں شاہ شجاع کے حالات پڑھیے جس وقت شاہ شجاع اپنے بھائی اورنگ زیب عالمگیر سے شکست کھا کر ارکانی راجہ کے اعتماد پر برما آئے اور انھوں نے اپنے دست و بازو پر اعتماد نہیں کیا تو آپ نے ان کا حشر دیکھ لیا کہ شاہ شجاع اور آل تیمور کا خاندان کس طرح دریائے کلدان کی لہروں کی نذر کر دیا گیا۔

ہمیشہ اپنے زور بازو پر اعتماد نہ کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ایسی قومیں موت کے گھاٹ اتار دی جاتی ہیں۔

اس کے برخلاف وہ قومیں جو اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتی ہیں اور اپنے اندر زندہ قوموں کے اوصاف پیدا کرتی ہیں ان سے اگر کوئی غلطی ہو جائے جب بھی قدرت ان کو معاف کرتی ہے۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا — کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی — معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں (اقبالؒ)

زندہ قوموں کی حالت یہ ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھتیں کہ ان کی تعداد کتنی ہے؟ ان کے پاس دولت اور مال کتنا ہے؟ بلکہ وہ یہ دیکھتی ہیں کہ ان میں زندہ رہنے کے اوصاف ہیں یا نہیں؟

آج برمی مسلمانوں کے پاس سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ ان کے پاس خود اعتمادی کی دولت نہیں، اپنے بل پر زندہ رہنے کا احساس نہیں اور اپنے آپ کو زندہ، طاقتور اور قیمتی بنانے کا جوہر نہیں، اسی لیے کبھی اوروں کا حاشیہ بردار بنتے ہیں اور کبھی اوباسوں کا، یہی وہ احساس کمتری تھا جس کی وجہ سے آج کے سیاسی بتیموں نے آج سے ۴۱ سال پہلے ہمیں اکثریت میں ضم کر کے ہماری ملی اور قومی حیثیت فنا کر ڈالی تھی۔

(بقیہ صفحہ ۵۳) الیسانادہ گا داشون ہیں۔ ۱۹۔ سامنے موجود اندر ہمائی طرف موجود دیم ہے۔ ۲۰۔ پیچھے (مغرب) موجود دھاتا ہے۔ بائیں طرف (شمال) موجود سوربجے ہے۔ ۲۱۔ گھاس چرتی ہوئی سوم راج ہے۔ ۲۲۔ دیکھتی ہوئی مترہے آتی ہوئی آننہ ہے۔ ۲۳۔ جتی ہوئی دشودیو ہے اور جو اپنے ہونے پر جاپتی ہے۔ چھٹی ہوئی گائے سب کچھ ہے۔ ۲۴۔ گائے کی شکل اور جملہ کائنات کی شکل ہے۔ ۲۵

خط کشیدہ الفاظ اسم معرفہ اور دیوتا و خداوند ہیں۔

باب التقریظ والانتقاد

فقہ السنہ جلد اول

مرتبہ:۔ محمد عاصم ۔صفحات ۴۷۸ سائز ۲۲×۱۶ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ مجلد گرد پوش کے ساتھ قیمت آٹھ روپیہ ۔ ناشر۔ مکتبہ چراغ راہ کراچی ملا

یہ مشہور فقہی مذاہب کا مدلل مجموعہ احکام ہے جسے مولانا محمد عاصم الحداد نے مرتب کیا ہے ۔یہ جلد اول ہے جو کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل ہے۔ اس میں اصلاً پانچ مذاہب فقہیہ: حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنبلیہ اور جمہور اہل حدیث کو سامنے رکھا گیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ قاری کو اختصار کے ساتھ ان مسالک اور ان کے مختصر و مشہور دلائل سے واقفیت حاصل ہو اور وہ تعصب کم ہو جائے جو ان مذاہب فقہ کو ماننے والوں کے درمیان ناواقفیت کی وجہ سے موجود ہے۔ یہ نہ کوئی فتوے کی کتاب ہے اور نہ اسے پڑھ کر ان مسالک کے درمیان محاکمہ درست ہے۔ مصنف نے خود اس کی تصریح کی ہے:۔

"ایک مسلک کو دوسرے مسلک پر ترجیح دینے کے لیے جس تحقیق اور تفصیلی مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کتاب سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا جو صاحب اس کا ذوق رکھتے ہوں انہیں تمام مذاہب کی اپنی کتابوں کی طرف الگ الگ رجوع کرنا چاہیے اور پھر پوری تحقیق اور وسیع مطالعہ کے بعد کوئی رائے قائم کرنی چاہیے"

تالیف کتاب کے مقصد اور اس تحریر نے مرتب کے کام کو ہلکا کر دیا ہے اور ان کی پوزیشن بھی محفوظ ہو گئی ہے۔ مذاہب فقہ سے متعلق کوئی تحقیقی تصنیف و تالیف تو بہت بڑا کام ہے واقعہ یہ ہے کہ کسی ایک مسلک فقہ پر کوئی محققانہ تصنیف پیش کرنا بھی چھوٹا کام نہیں ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مرتب کو اپنے علم وفن کے بارے میں غلط فہمی نہیں ہے۔ ان کے پیش نظر عام طور سے صرف نقل مذاہب اور نقل دلائل کا کام ہے۔ اس لحاظ سے وہ اس کتاب کی تالیف میں ایک حد تک کامیاب ہیں۔ اس کتاب سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچے گا جو اپنے مسلک کے سوا دوسرے مسالک فقہ اور ان کے دلائل سے بالکل ناواقف ہیں۔

راقم الحروف اگر چاہتا تو اس کتاب کو بالاستیعاب پڑھے بغیر نثر کا ایک قصیدہ مدحیہ لکھ دیتا لیکن بالخصوص علوم دین سے متعلق کتابوں کے ساتھ تبصرہ نگاروں کا یہ رویہ سخت تکلیف پہنچاتا ہے اور اگر تبصرے میں "تحزب" کا رنگ بھی آجائے تو کریلا نیم چڑھا ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب چونکہ ایک اہم موضوع و مقصد سے متعلق ہے اس لیے راقم نے اسے بالاستیعاب پڑھا اور قابل اصلاح باتوں کی نشان دہی کے لیے محنت کی ہے۔ راقم کو اطمینان ہے کہ ناشر اور مؤلف دونوں ہی قصیدۂ مدحیہ کے بجائے اس تنقید کو پسند کریں گے جو اس کتاب پر کی گئی ہے ——— اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ اس جیسی کتاب کی کامیابی کے لیے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ نقل مذاہب میں بے احتیاطی و غلطی نہ ہو نیز نقل احادیث اور ان کے تراجم میں بھی پوری احتیاط برتی جائے۔ زبان ادبیانہ سہی لیکن اس کی صحت و صفائی ایک ضروری چیز ہے جس کی طرف مؤلف کو دھیان دینا چاہیے۔ اب میں چند عنوانات کے تحت قابلِ اصلاح باتوں کی نشان دہی کروں گا۔

نقلِ مذہب میں بے احتیاطی سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نقل مذاہب میں ہر مذہب کی معتمد علیہ اور مستند ترین کتابوں کو اصل ماخذ کی حیثیت دینی چاہیے۔ بدرجہ مجبوری دوسرے درجے کی کتابوں یا مختلف مسلک رکھنے والوں کی کتابوں سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ بدایۃ المجتہد، نیل الاوطار، الفقہ علی المذاہب الاربعہ سے نقل مذاہب تو بہت آسان ہے لیکن اصل ماخذ کے رہتے ہوئے ان کتابوں سے نقل مذاہب صحیح نہیں۔ اس طرح بہت سے مسائل میں مذہب غلط نقل ہو جاتا ہے یا اس احتیاط سے نقل نہیں ہوتا جس کی ضرورت ہے ۔۔ جہاں تک بدایۃ المجتہد کا تعلق ہے راقم کو ذاتی تجربہ ہے کہ وہ کم سے کم مذہب حنفی کو نقل کرنے میں محتاط نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ فقہ السنۃ کے مؤلف نے مذاہب اربعہ خصوصاً مذہب حنفی کے مسائل نقل کرنے میں، عام طور سے اس کی مستند ترین کتابوں کے بجائے الفقہ علی المذاہب الاربعہ جیسی کتابوں پر اعتماد کیا ہے حالانکہ مؤلف کو معلوم ہوگا کہ خود ائمہ مذہب حنفی کی لکھی ہوئی کتابیں بھی ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر مبسوط سرخسی، مختصر طحاوی، قدوری، ہدایہ، بدائع الصنائع اور فتح القدیر کے مقابلے میں، شرح وقایہ، کنز الدقائق اور در مختار جیسی کتابیں بھی فروتر ہیں اور نقل مذہب میں ان کے درمیان اختلاف ہو تو ترجیح اول الذکر کتابوں کو حاصل ہوگی۔ یہاں تک کہ امام محمد کی تمام تصنیفات بھی ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ ان کی رقیات و جرجانیات وغیرہا کو وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو ان کی کتب ظاہر الروایۃ کو ہے۔ یہاں مقصود کتب مذہب حنفی کے مراتب و درجات کی تفصیل نہیں ہے۔ مقصود صرف اتنا ہے کہ نقل مذہب میں سہل انگاری کو راہ دینا صحیح نہیں ہے بلکہ تھوڑی سی محنت کر کے اصل ماخذ سے مذاہب نقل کرنے چاہئیں یا کم از کم نقل مذاہب میں پوری احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے۔ ذیل میں بے احتیاطیوں کی چند مثالیں درج ہیں :-

صفحہ ۵۰ میں گدھے اور جنگلی جانوروں کے جوٹھے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ متن اور حاشیے میں مرتب سے کئی غلطیاں ہوئی ہیں۔ سب سے پہلی غلطی تو یہ ہے کہ انھوں نے احادیث میں آئے ہوئے لفظ "سباع" کا ترجمہ جنگلی جانوروں سے کیا ہے جو غلط ہے۔ سباع کا ترجمہ چیرنے پھاڑنے والے جانور یا درندے صحیح ہے۔ جنگلی جانوروں میں تو ہرن بھی ہے تو کیا ہرن کے جوٹھے میں بھی کوئی اختلاف پایا جاتا ہے؟ اس غلطی کی وجہ سے حاشیے میں جن ائمہ کے مسلک نقل کیے ہیں وہ سب غلط ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسی امام کے نزدیک بھی مطلق جنگلی جانور کا جوٹھا ناپاک نہیں ہے ہاں اختلاف جنگل کے درندوں کے بارے میں ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک سباع البہائم (چوپائے درندے) کا جوٹھا ناپاک ہے۔ گدھے بھی اہلی اور وحشی یعنی پالتو اور جنگلی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ جنگلی گدھے، ہرن کی طرح حلال ہیں اور ان کا جوٹھا بھی پاک ہے۔ پالتو گدھوں کے جوٹھے میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا جوٹھا مشکوک ہے اور ماءِ مشکوک کا حکم ان کے نزدیک یہ ہے کہ اگر اس کے سوا کوئی دوسرا پانی موجود نہ ہو تو مصلی وضو اور تیمم دونوں کو جمع کرکے نماز ادا کرے گا، اس کو اس کا اختیار ہے کہ پہلے وضو کرے پھر تیمم کرلے یا تیمم کرے اور اس کے بعد وضو کرلے۔ مذہب حنفی میں درندوں کے جوٹھے اور پالتو گدھوں کے جوٹھے میں فرق ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولف نے ان دونوں کے درمیان فرق محسوس نہیں کیا ہے اور مسئلہ اس طرح بیان کیا ہے جیسے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان دونوں کا حکم ایک ہو۔ اس کی توضیح ضروری ہے۔ مرتب نے یہاں نقل مذاہب میں المغنی اور التعلیق الصبیح پر اعتماد کیا ہے۔ اگر وہ فقہ حنفی کی کسی کتاب کا مطالعہ کرتے تو یہ ابہام پیدا نہ ہوتا اور شاید لفظ "سباع" کے ترجمے میں بھی ان سے غلطی نہ ہوتی۔

صفحہ ۱۰ میں گردن کے مسح کے بارے میں حنفیہ کا جو مسلک لکھا گیا ہے مکمل نہیں، ناقص ہے۔ صاحب بدائع نے لکھا ہے کہ مسح رقبہ میں مشائخ احناف کا اختلاف ہے ابوبکر اعمش اسے سنت قرار دیتے ہیں اور ابوبکر اسکاف محض ادب۔ صاحب فتح القدیر نے قیل کے ساتھ بدعت ہونے کا بھی ایک قول نقل کیا ہے۔ اس تفصیل (سے) معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں سے کوئی قول منصوص نہیں ہے۔

صفحہ ۱۱ حنفیہ کے نزدیک وضو میں نیت کی بحث جس انداز میں مرتب نے الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے حوالے سے لکھی ہے۔ مذہب حنفی کی کتابوں میں یہ بحث اس انداز سے نہیں ملتی۔ اس بحث میں سب سے پہلے یہ بات سامنے آنی چاہیے کہ عملی طور پر چند مواقع ایسے ہو سکتے ہیں جہاں حنفیہ اور دوسرے ائمہ کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے (ورنہ عام حالات میں متوضی کے دل میں وضو کی نیت موجود ہی ہوتی ہے) مثلاً کوئی شخص کہیں جا رہا ہے، راستے میں بارش

آ گئی اور وہ سر سے پاؤں تک نہا گیا، یہاں نیت موجود نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس غسل اعضاء سے وہ نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں حنفیہ کہتے ہیں، پڑھ سکتا ہے دوسرے ائمہ کہتے ہیں کہ نہیں پڑھ سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ حنفیہ کے نزدیک وضوء کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت میں تو وہ محض وسیلۂ نماز ہے اور دوسری حیثیت میں خود ایک عبادت ہے اس کو عبادت کی حیثیت نیت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اسی لیے بے نیت کا وضو اجر و ثواب سے محروم ہوجاتا ہے۔ نماز کے جواز کے لیے چونکہ شریعت نے طہارت میں نیت کی شرط نہیں لگائی ہے اس لیے بے نیت کے وضو سے بھی نماز ہوجاتی ہے پھر بھی اس کا ترک یہی نہیں کہ خلاف سنت ہے بلکہ بہت بڑے اجر سے محرومی ہے اور اگر کوئی ترک نیت کی عادت ڈال لے تو ہلکے درجے کا گناہ بھی ہے۔ مرتب خود محسوس کریں گے کہ اس انداز بحث اور اس انداز بحث میں بہت فرق ہے جو انھوں نے اختیار کیا ہے۔ یہ بات کہ وضو میں نیت کا زبان سے ادا کرنا مستحب ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں۔" میں نے اللہ کا تقرب چاہتے ہوئے نماز کے لیے وضو کی نیت کی" پتہ نہیں الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے مولف نے یہ بات کہاں سے لکھی ہے۔ انھوں نے نماز کی نیت کے بارے میں لکھا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اس کا زبان سے ادا کرنا بدعت ہے الا یہ کہ مصلی وسوسے میں مبتلا ہو تو زبان سے نیت کے لیے مستحسن ہوگی، اس موقع پر نیت کے الفاظ بھی انہوں نے نہیں لکھے ہیں، ان کی یہ دونوں تحریریں پڑھ کر قاری الجھن میں مبتلا ہوتا ہے کہ جہاں نیت شرط ہے وہاں اس کا زبان سے ادا کرنا بدعت ہو اور اس کے لیے خاص الفاظ بھی نہ ہوں اور جہاں نیت سنت ہے وہاں اس کا زبان سے ادا کرنا مستحب ہو اور اس کے لیے الفاظ بھی خاص ہوں، آخر یہ کیا تماشا ہے۔ مولف فقہ السنہ اگر حنفیہ کے اونچے درجے کی کتابوں سے یہ مسئلہ لکھتے تو یہ الجھن پیدا نہ ہوتی۔

صفحہ ۴۳۔ مؤلف نے حاشیہ ۱ میں لکھا ہے:" حنفیہ کے نزدیک یہ کافی ہے کہ جب انسان موزے یا جرابیں پہنے تو اس کے پاؤں پاک اور دھلے ہوئے ہوں خود اس کا باوضو ہونا ضروری نہیں"۔ یہ مسلک حنفی کا غیر واضح اور اشتباہ میں ڈالنے والا بیان ہے۔ یہاں مولف نے جس حوالے سے یہ بات لکھی ہے اسے ایجاز مخل کی حد تک پہنچا رہا ہے۔" خود اس کا باوضو ہونا ضروری نہیں" کس قدر ناکافی اور مبہم جملہ ہے حالانکہ الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے مصنف نے یہاں ایک واضح عبارت لکھی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اعضاء وضو کے دھونے میں حنفیہ کے نزدیک ترتیب فرض نہیں ہے اس لیے اگر کوئی شخص پہلے دونوں پاؤں دھو کر موزے پہن لے اور اس کے بعد وضو پورا کرے تو ان موزوں پر مسح کرنا صحیح ہوگا، شرط یہ ہے کہ کوئی حدث لاحق ہونے سے پہلے وضو مکمل کرلے ورنہ مسح صحیح نہ ہوگا۔

مثلاً کسی نے پاؤں دھوکر موزے پہنے اور اس سے پہلے کہ باقی اعضاء وضو کی تکمیل ہو اسے حدث لاحق ہوگیا تو موزوں کا پہننا بے کار ہو جائے گا اور انہیں اتار کر پاؤں پھر دھونے پڑیں گے۔ حنفیہ کے نزدیک خفین پہننے کے لیے طہارت کاملہ پر ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ حدث یعنی وضو ٹوٹنے کے وقت طہارت کاملہ پر ہونا ضروری ہے۔ نقل مذہب میں ایسا اختصار جس سے اشتباہ پیدا ہوتا ہو قابل احتراز ہے۔

صفحہ ۹۸ "وہ مٹی جس سے تیمم کرنا جائز ہے" اس بحث میں مؤلف نے الفقہ...... کے حوالے سے صرف امام مالک کا یہ اختلاف نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک پہاڑوں کی برف سے بھی تیمم جائز ہے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ متن میں جو مسئلہ انھوں نے بیان کیا ہے وہ مذاہب خمسہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ الفقہ...... کے مؤلف نے بھی ائمہ کے اختلافات نقل کیے ہیں اس کے باوجود ائمہ کے اختلافات کس وجہ سے چھوڑ دیے گئے ہیں معلوم نہیں یہاں اس طرف بھی اشارہ مناسب ہے کہ الفقہ...... کے مؤلف نے حنفیہ کا مسلک ناقص نقل کیا ہے اور بعض باتیں غلط بھی لکھی ہیں۔

صفحہ ۱۴۳ موذن سے سنکر کلمات اذان کو دہرانے کا مسئلہ کتب ظاہر الروایۃ اور متون معتبرہ کا مسئلہ نہیں ہے باقی رہے ائمہ احناف کے اقوال تو صاحب فتح القدیر نے اختلاف کا ذکر کیا ہے، دہرانے کے وجوب کا قول اس طرح لکھنا جیسے یہ مذہب حنفی کا متفق علیہ قول ہو، صحیح نہیں ہے۔

صفحہ ۱۵۳ "حنفیہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ نماز کی شرط ہے فرض نہیں"۔ یہ عبارت اصطلاحات فقہاء سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ صحیح عبارت یوں ہوگی "حنفیہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ نماز کی شرط ہے رکن نہیں"۔ الفقہ علی...... کے مؤلف نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ فرض ایک عام لفظ ہے جس کے تحت شرط اور رکن دونوں داخل ہوتے ہیں، شرط کا مقابلہ رکن سے ہوتا ہے فرض سے نہیں، نماز کی بہت سی شرطیں بھی فرض ہیں یہی وجہ ہے کہ قدوری، ہدایہ، عنایۃ فتح القدیر وغیرہا میں تحریمہ کو فرض ہی کہا گیا ہے۔

صفحہ ۱۶۴ "نیل الاوطار کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اقرأ استحقاق امامت میں افقہ پر مقدم ہے" یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اعلم بالسنۃ کا اقرء پر مقدم ہونا فقہ حنفی کا بہت مشہور مسئلہ ہے۔ اس بارے میں امام ابویوسف کا اختلاف ضرور ہے لیکن قدوری نے تو اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

صفحہ ۱۷۴ مغرب سے پہلے نفل کے مسئلے میں امام ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ اکثر سلف "ہمارے اصحاب اور امام مالک نے اس کا انکار کیا ہے اور پھر انھوں نے اس پر مفصل بحث کی ہے لہذا الفقہ علی المذاہب کے مؤلف

نے جو بات لکھی ہے، ان کی اپنی رائے ہوگی، مذہب حنفی نہیں۔

صفحہ ۲۸۰ فجر کی سنتیں اگر چھوٹ جائیں تو ان کی قضا ہے یا نہیں، اس کے بارے میں مذہب حنفی کا بیان ناقص ہے۔ فقہ حنفی کا مشہور قاعدہ یہ ہے کہ فرض کی قضا فرض، واجب کی واجب اور سنت کی سنت ہے۔ جہاں قضائے سنت کی نفی کی گئی ہے وہاں مقصد یہ ہے کہ ان کی قضا ضروری نہیں اس کے سنت ہونے کا مقصود نہیں ہے

صفحہ ۳۴۴ حاشیہ ۲ میں حوالہ غلط نقل ہو گیا ہے مالکیہ کے بجائے شافعیہ ہونا چاہیے۔ تراویح میں صرف شافعیہ ہر دو رکعت میں سلام ضروری قرار دیتے ہیں

صفحہ ۳۴۸ عید کی نماز سے پہلے "الصلوٰۃ جامعۃ" کہہ کر پکارنا حنفیہ کے نزدیک مستحب نہیں ہے۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے مؤلف نے معلوم نہیں یہ بات کہاں سے لکھی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک صلوٰۃ کسوف میں اگر ضرورت ہو تو الصلوٰۃ جامعۃ کی ندا مستحب ہے۔

صفحہ ۳۹۸ سجدہ سہو کے لیے اگرچہ احناف صرف دائیں طرف ایک سلام پھیرتے ہیں لیکن یہ بات کتب ظاہر الروایۃ سے منقول نہیں ہے۔ صاحب بدائع الصنائع کا بیان ہے کہ یہ فخر الاسلام بزدوی کا مسلک ہے ورنہ عامہ مشائخ احناف دونوں طرف سلام کے قائل ہیں اور صاحب ہدایہ نے بھی دو سلام ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ جیسی کتاب میں یہ تفصیل ضرور آنی چاہیے تھی مگر انھوں نے بس ایک قول اس طرح نقل کیا جیسے یہ حنفیہ کا متفق علیہ قول ہو۔ راقم نے اس کتاب کی بڑی شہرت سنی تھی لیکن پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کم سے کم مذہب حنفی کے نقل میں معمولی درجے کی کتاب ہے۔

صفحہ ۴۰۷ حاشیے میں الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"ائمہ اربعہ کے نزدیک اگر بیمار پیدل مسجد نہ آسکتا ہو لیکن سوار ہو کر اس کے لیے آنا ممکن ہو تو اس کے لیے آنا ضروری ہے الا یہ کہ وہ سواری کی اجرت ادا نہ کر سکتا ہو۔"

یہ بات مؤلف نے ائمہ اربعہ کی طرف غلط منسوب کی ہے، حنفیہ کا یہ مسلک نہیں ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ خود الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے مؤلف نے اس کی تصریح کی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک صلوٰۃ جمعہ کے وجوب کی شرطیں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ثالثها ان یکون صحیحا، فلا تجب علی المریض الذی یتضرر بالذهاب لحضورها ماشیا فان عجز عن الذهاب الی المسجد ماشیا سقطت عنه الجمعة وان وجد من یحمله

باتفاق الحنفیۃ (صفحہ ۳۷۸)

اس کے بعد انھوں نے مریض اور اعمیٰ کے درمیان فرق دکھایا ہے۔ مریض کے بارے میں تو حنفیہ متفق ہیں کہ اگر وہ پیدل چل کر مسجد نہ جاسکتا ہو تو جمعہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے اگرچہ کوئی ایسا شخص موجود ہو جو اسے گود میں لے کر یا کاندھے پر بٹھا کر مسجد پہنچا سکتا ہو لیکن اعمیٰ کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہے۔ امام صاحب کے نزدیک مریض ہی کی طرح اس سے بھی جمعہ ساقط ہے اور صاحبین کہتے ہیں کہ اگر تبرعاً یا اجرت پر کوئی شخص اسے مسجد پہنچا سکتا ہو تو اندھے پر جمعہ واجب ہے جبکہ وہ اجرت ادا کرنے پر قادر ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف جب اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو حوالے کی غلطی میں مبتلا پاتا ہے تو بہت افسوس ہوتا ہے۔ علوم دین سے متعلق کتابوں میں اس طرح کی بے احتیاطی بہت ہی قابل افسوس ہے۔

ترجمۂ حدیث میں بے احتیاطی

یہ اصول اپنی جگہ ہے کہ قرآن و حدیث کے ترجمے زیادہ سے زیادہ الفاظ سے مطابق ہونے چاہییں لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کہ ترجمے ایسے کیے جائیں جو عبارت کو مبہم بنا دیں اور مسائل کے فہم میں اشتباہ پیدا ہو جائے ـــــ نہ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ لفظی ترجمے کی پیروی میں اردو زبان کے گلے پر کند چھری پھیر دی جائے۔ ہر زبان کی اپنی الگ سٹنگ اور الگ محاورات ہوتے ہیں ان سے اعراض درست نہیں ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ عاصم صاحب نے جو عربی زبان کے ادیب ہیں ایسے ترجمے کیے ہیں جو ان کے شایان شان نہیں ہیں۔ آخر مادری زبان کی طرف بھی تو توجہ ضروری ہے۔

صفحہ ۳۷ کپڑے میں مذی لگ جانے کے سلسلے میں جو حدیث ہے اس کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے:۔

"ایک چلو پانی لے لو اور جہاں تمہارا خیال ہو کہ مذی لگی ہے وہاں چھینٹے دے لو" اس حدیث میں نضح کا ترجمہ چھینٹیں دے لو مناسب نہیں ہے۔ مذی کی نجاست متفق علیہ ہے اور صرف چھینٹیں دے لینے سے کپڑا یا جسم پاک نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی نجاست اور پھیل جائے گی اس لیے ترجمہ یا تو ایسا ہونا چاہیے جس سے دھونے کا مفہوم پیدا ہو یا پھر قوسین میں یا الگ سے اس کی وضاحت کرنی چاہیے۔ دم حیض کی طہارت کے بارے میں جو حدیث ہے اس میں نضح کا لفظ آیا ہے وہاں مؤلف نے ترجمہ کیا ہے اس پر پانی ڈالے (یعنی دھولے) اسی طرح کا ترجمہ و تشریح اس مقام پر بھی ہونا چاہیے۔

صفحہ ۴۸ "اللہ اور اس کا رسول تمہیں جنگلی گدھوں کا گوشت کھانے سے منع کرتے ہیں" حدیث میں حمر الاھلیۃ والانسیۃ کے الفاظ آتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ مؤلف نے اہلیۃ یا انسیہ کا ترجمہ جنگلی کس طرح کیا اور ان سے اتنی موٹی اور فحش غلطی کیسے ہوئی۔ اس ترجمے سے جنگلی گدھے جو بہترین شکار ہیں اور جن کا گوشت حلال ہے، حرام بن گئے؛

ممکن ہے یہ کاتب کی غلطی ہو۔ اس غلطی کی فوراً اصلاح ہونی چاہیے۔

صفحہ ۴۵ مؤلف نے کئی مقامات پر طہور کا ترجمہ "پاک" کیا ہے اور ہر جگہ قوسین میں طاہر و مطہر کا اضافہ کیا ہے یہ بات عجیب محسوس ہوئی اور اس طول عمل کا سبب سمجھ میں نہ آیا۔ کیا یہ صورت بہتر نہ تھی کہ اس کا ترجمہ طاہر و مطہر ہی کیا جاتا اور قوسین یا حاشیے پر کسی ایک جگہ اردو میں اس کا مفہوم لکھ دیا جاتا۔ صرف پاک کا لفظ طہور کا ترجمہ نہیں ہے اور نہ اس کے مفہوم کو ادا کرتا ہے اسی لیے مؤلف کو ہر جگہ قوسین میں طاہر و مطہر بڑھانا پڑا ہے۔

صفحہ ۵۱ بلی کے بارے میں جو حدیث ہے اس کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ یہ ہے:۔

"یہ ان خادم مردوں اور عورتوں میں سے ہے جو ہر وقت تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں" پتہ نہیں اس عجیب ترجمے کی ضرورت کیا پیش آئی۔

صفحہ ۶۱ وضو کے مسئلے میں یدین کا ترجمہ کئی جگہ مؤلف نے "بازو" کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے: "پھر تین مرتبہ کہنیوں تک بازو دھوئے" یہ ترجمہ غلط ہے اردو میں کہنیوں سے اوپر کے حصے کو بازو کہتے ہیں جو اعضاء وضو میں داخل نہیں ہے۔

صفحہ ۶۴ "ایڑیوں کو آگ سے تباہی ہو" یہ ویل للاعقاب من النار کا ترجمہ ہے اور اردو زبان کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

صفحہ ۹۰ "جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کی طرف آئے تو غسل کرے" یہ جملہ عجیب ہے معلوم نہیں جمعہ کی طرف آنا کس زبان کا محاورہ ہے۔

صفحہ ۱۰۰ تیمم کے مسئلے میں حدیث کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے:۔ "اور جب وہ پانی پالے تو اسے اپنے جسم کے ساتھ لگانا چاہیے" اردو سے ناواقف بنگالیوں جیسا ترجمہ ہے۔

صفحہ ۳۷۲ "تو تم سجدوں کی کثرت کے ذریعہ اپنے نفس کے مقابلے میں میری مدد کرو" اس لفظی ترجمے نے حدیث کے جملوں کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

تراجم کے علاوہ اور بھی ایسی عبارتیں یا الفاظ موجود ہیں جو قاری کے ذوق زبان پر گراں گزرتے ہیں۔

امید ہے کہ فاضل مؤلف اس حصے کے دوسرے اڈیشن کو اور آئندہ لکھے جانے والے حصوں کو موضوع اور مقصد کے شایان شان بنانے کی کوشش کریں گے ورنہ ان کی یہ خدمت اہل علم کی نگاہوں میں وقعت حاصل نہیں کر سکے گی۔ مذاہب خمسہ کی فقہ پر تصنیف و تالیف کے لیے کافی تیاری کی ضرورت ہے۔ یہ تنقید خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ کی گئی ہے اور توقع ہے کہ مؤلف اسی روشنی میں اسے پڑھیں گے۔

بقیہ مقالات تک نہیں کیا اور اس سے اپنا دامن اس طرح بچا گئے جیسے وہ کوئی لائق جواب بات ہی نہ تھی۔ ڈاکٹر سید محمد صاحب

کے خطبۂ صدارت میں جو شکایات پیش کی گئی ہیں ان کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر سمپورنانند کہتے ہیں :-

"میں سوچتا ہوں کہ مولانا/ڈاکٹر صاحب اپنے تخیل سے کام لے رہے تھے یا ان تجربات کی بنا پر یہ بات کہہ رہے تھے جو انہیں ایک زمانے میں ریاستی وزیر کی حیثیت سے حاصل ہوئے جس حکومت کے وہ ایک معزز رکن تھے کیا اس نے دیدہ و دانستہ مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم کیا ؟ کیا اس ریاستی حکومت نے جس کے حافظ محمد ابراہیم لمبی مدت تک رکن رہے مسلمانوں کے ساتھ غیر ذمہ داری برتی ؟"

کیا یہ سوالات ان سوالات سے کم اہم ہیں جو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنے جوابی بیان میں کیے ہیں، کیا محترم ڈاکٹر سید محمود صاحب اور محترم حافظ محمد ابراہیم صاحب کے پاس اس سوال کا کوئی خود دارانہ اور معقول جواب موجود ہے ؟ میں تو کہتا ہوں کہ ڈاکٹر سمپورنانند کا سوال صرف انہیں دو حضرات سے نہیں ہے بلکہ اس کے مخاطب وہ تمام مسلمان گورنر اور وزیر ہیں جن کی حکومت میں مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے گئے اور توڑے جا رہے ہیں، ایسی صورت حال میں وہ ہمیشہ اپنی کرسیوں سے چمٹے رہے ہیں، کیا وہ کسی آئین و قانون کی رو سے ان مظالم کی ذمہ داری سے بری ہوسکتے ہیں ؟ اور دنیا تو خیر چند روزہ ہے سوال یہ ہے کہ کیا وہ آخرت کی عدالت میں اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرسکیں گے اور کیا مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ایک حصہ ان کے نامۂ اعمال میں درج نہ ہوگا۔

اشارات کو ختم کرتے ہوئے ان مسلمان لیڈروں کی خدمت میں جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ اور قوم پرور کے لقب سے ممتاز کرنا ضروری سمجھتے ہیں، ہم چند باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں ——— ہندوستان کے موجودہ حالات اور تیرہ سال کے تجربات صاف بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں کے سامنے عمل کی صرف تین راہیں کھلی ہوئی ہیں :-

(۱) اکثریت کی خواہش اور تمنا کے مطابق متحدہ قومیت میں اس طرح ضم ہوجانا کہ ان کا کوئی ممتاز اجتماعی وجود اور کوئی مستقل قومی تہذیب باقی نہ رہے۔

(۲) مسلم قوم پرستی کی بنیاد پر از سر نو اس طرح کی تنظیم کا قیام جیسی تقسیم ہند سے پہلے قائم ہوئی تھی۔

(۳) اسلامی اصولوں پر کتاب و سنت کے مطابق مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا اور اقامت دین کو نصب العین بنانا۔

آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان، تقسیم ہند سے پہلے بھی پہلی راہ اختیار کرنے پر رضامند نہیں ہوئے اور آج بھی رضامند نہ ہوں گے اور خدا نہ کرے کہ رضامند ہوں۔ اس لیے فی الواقع دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ہمیں خطرہ ہے کہ اگر آپ نے اپنی موجودہ روش اور موجودہ سیاست پر اصرار کیا تو کہیں بھارت کے مسلمان پھر دوسری راہ پر نہ چل پڑیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو سخت تباہی آئے گی اور اس کی ذمہ داری سے آپ بری نہ ہوں گے۔ اس لیے ہماری، آپ کی اور پورے ملک کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اور آپ مل کر تیسری راہ اختیار کریں اس طرح ہم اپنے فریضۂ حیات سے بھی سبک دوش ہوں گے اور ہماری دنیا و آخرت بھی سنور جائے گی۔

ربیع الاول ۱۳۸۱ھ
ستمبر ۱۹۶۱ء

جلد ۲۷
شمارہ ۳

ماہنامہ

زندگی

رامپور

سالانہ پانچ روپیہ
فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

جلد ۲۷
شمارہ ۳

زندگی

ربیع الاول ۱۳۸۱ھ
ستمبر ۱۹۶۱ء

مدیر:۔ سید احمد عروج قادری

• خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی

• زر سالانہ:۔ صہ ر۔ ششماہی:۔ تین روپیہ۔ فی پرچہ:۔ پچاس نئے پیسے
ممالک غیر سے:۔ دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

محمد حسن طابع و ناشر نے جماعت اسلامی ہند کی طرف سے ناظم پریس بازار نصراللہ خاں میں چھپوا کر دفتر رسالہ زندگی رامپور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد عروج قادری)

جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کے اجتماع منعقدہ ۱۵ر جولائی تا ۱۸ جولائی ۱۹۶۱ء نے انڈین مسلم کنونشن دہلی کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اور متعدد مسائل پر جو قرار دادیں منظور کی ہیں وہ اس لائق ہیں کہ ملک کے موجودہ حالات میں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ ہم ذیل کی سطور میں سب سے پہلے ان تاثرات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو اس نے انڈین مسلم کنونشن منعقدہ ۱۰، ۱۱ر جون ۱۹۶۱ء پر ظاہر کیے ہیں

اس کنونشن پر اظہار خیال میں جماعت اسلامی ہند منفرد نہیں ہے۔ بلکہ ہندستان کی شاید ہی کوئی ایسی تنظیم ہو جس کے ممتاز افراد نے جماعتی یا انفرادی حیثیت سے اس پر اظہار خیال نہ کیا ہو اس لیے مجلس شوریٰ کے تاثرات کی قدر و قیمت، حسن و قبح اور زیادتی و اعتدال کا صحیح اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب تمام تاثرات سامنے ہوں۔

اس پر ایسی جماعتوں اور تنظیموں نے بھی اظہار خیال کیا جو سیکولرزم پر یقین نہیں رکھتیں اور جن کی اسلام بیزاری اور مسلم دشمنی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے اور ایسی جماعتوں اور تنظیموں نے بھی اپنے تاثرات ظاہر کیے ہیں جو سیکولرزم اور مغربی جمہوریت کی راسخ العقیدہ مومن ہیں اور جو بحیثیت مجموعی اسلام بیزار اور مسلم دشمن بھی نہیں ہیں۔ پہلی قسم کی جماعتوں یا ان کے افراد کے تاثرات کو زیر بحث لانا کسی وجہ سے لاحاصل اور بے کار ہے اس لیے ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔ ہم صرف دوسری قسم کی جماعتوں اور ان کے ممتاز افراد کے بیانات و تاثرات زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔

سب کو معلوم ہے کہ اس کنونشن میں صرف انہیں لوگوں کو دعوت شرکت دی گئی تھی جو سیکولرزم کے معتقد ہیں سیکولرزم اس کنونشن کا کلمۂ اجتماع تھا۔ یہ بھی لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کنونشن نے جو قرار دادیں منظور کی ہیں ان میں پوری احتیاط کے ساتھ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ وہ سیکولرزم کے دائرے سے باہر نہ نکلنے پائیں جو کچھ کہا جائے

اور جو کچھ مانگا جائے وہ اس کلمۂ اجماع سے اجازت لیکر کہا اور مانگا جائے۔ اس خلوص عقیدہ و عمل کے بعد توقع تھی کہ ہندستان کی تمام سیکولر اور جمہوریت پسند جماعتیں اور خصوصیت کے ساتھ کانگرس (جو ہندستان میں بانیٔ سیکولرزم ہے) اس کنونشن کو سندِ قبولیت عطا کرے گی اور اس کے اس عظیم کارنامے سے خوش ہوگی لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بھارت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے اظہارِ خیال کی طرف گزشتہ ماہ کے اشارات میں اشارہ گزر چکا ہے اور یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کنونشن ان کی خوشنودی حاصل نہیں کر سکا۔ صدر کانگرس شری سنجیوا ریڈی نے متعدد مقامات پر اظہارِ خیال کیا ہے اور سب کا حاصل یہ ہے کہ وہ اس کنونشن کے انعقاد کو مفید نہیں سمجھتے بلکہ ایک اعتبار کے لحاظ سے تو وہ اسے فرقہ وارانہ کنونشن سمجھتے ہیں۔ ایک اخبار لکھتا ہے:۔

نئی دہلی ۔ ۴ر جولائی ۔ صدر کانگرس مسٹر سنجیوا ریڈی نے اخباری نمایندوں کو بتایا کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ریاستی کانگرس کمیٹیوں کے صدروں اور ریاستی وزرائے اعلیٰ کو لکھا ہے کہ فرقہ وارانہ کنونشن اور کانفرنسیں نامناسب ہیں اور کانگرسیوں کو ان میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ دریافت کیا گیا کہ دہلی میں مسلم کنونشن کے موقع پر کیوں نہیں کیا گیا تو مسٹر ریڈی نے اعتراف کیا کہ ہم تجربے سے بہت ساری باتیں سیکھتے ہیں۔ کوئی بھی مسلم کنونشن سے خوش نہیں ہے۔

حکومت ہند کے وزیر داخلہ مسٹر لال بہادر شاستری نے شمالی زونل کونسل کی صدارت کرتے ہوئے جو تقریر سرینگر کشمیر میں کی تھی اس میں مسلم کنونشن پر یوں اظہارِ خیال کیا گیا ہے:۔

مسلم کنونشن کا واضح طور سے تذکرہ کرتے ہوئے مسٹر شاستری نے کہا کہ اتنی بات کافی نہیں ہے کہ ایسے کنونشن قومی یکجہتی کے بارے میں مقدس اور پاکیزہ تجویزیں منظور کریں اور دوسری طرف وہ ایسی باتیں کریں جن سے فرقہ وارانہ جذبات ابھرتے ہوں اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت ملتی ہو۔

اس اظہارِ خیال نے اس خورد بینی احتیاط پر پانی پھیر دیا جو کنونشن نے تجاویز مرتب کرنے میں برتی تھی۔ کانگرس اور حکومت کی ان بڑی شخصیتوں کے حق میں جو ابہام تھا اسے اتر پردیش کی ریاستی کمیٹی کے ارکان عاملہ نے واضح کر دیا ہے۔ ۸ر جولائی ۱۹۶۱ء کو لکھنؤ میں ریاستی کانگرس کمیٹی کی عاملہ کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں ممبران نے دہلی کے مسلم کنونشن پر جو اظہارِ خیال کیا وہ یہ ہے:۔

"ممبران نے خیال ظاہر کیا کہ گزشتہ ۱۳ برسوں میں کسی بات سے ملکی مفاد کو اتنا نقصان نہیں

پہنچا جتنا کہ دہلی میں منعقد کیے گئے مسلم کنونشن سے پہنچا۔ جلسے کے بعد شری بنارسی داس نے جو جلسے کی مختصر روداد اخبار نویسوں کو بتا رہے تھے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اس کنونشن نے صورت حال کو سنبھالنے سے زیادہ خراب کر دیا ہے اور اکثریت پر اس کا بہتر اثر نہیں پڑا۔"

قومی آواز ۱۰ر جولائی ۱۹۶۱ء

اس کے ساتھ بہار ریاستی کانگرس کے مسلمان صدر کا تیز و تند بیان بھی سامنے رکھیے جس میں انھوں نے کنونشن پر فرقہ پرستی کا بلکہ جارحانہ ذہنیت کا الزام لگایا ہے۔ آخر میں یوپی شانتی سینا نے باضابطہ رزولیوشن میں جو اظہار خیال کیا ہے اسے بھی پڑھ لیجیے۔

قوم پرست مسلمانوں نے حال ہی میں دہلی میں ایک کنونشن منعقد کیا تھا تاکہ اس کے ذریعہ قومی اتحاد کے مقصد کو آگے بڑھایا جائے لیکن وہاں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ان سے مسلم فرقہ پرستی کی حوصلہ افزائی ہوئی جس کے نتیجے میں ہندو فرقہ پرستی کو شہ ملی اور مجموعی طور پر ملک کے جذبات مشتعل ہوئے۔

قومی آواز ۱۰ر جولائی ۶۱ء

ان تاثرات و بیانات کا تجزیہ کیجیے تو صرف ایک نتیجہ سامنے آئے گا کہ خود سیکولرزم، قوم پرستی اور مغربی جمہوریت پر یقین رکھنے والے افراد اور جماعتوں نے بھی اس کنونشن کو ملکی مفاد کے لیے نقصان دہ، مسلم فرقہ پرستی کی حوصلہ افزائی کرنے والا اور اکثریت کے جذبات کو مشتعل کرنے والا قرار دیا۔

ان تاثرات کو سامنے رکھ کر اب ان تاثرات کو پڑھیے جن کا اظہار جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ نے کیا ہے۔ موازنے اور جائزے کے لیے ضروری ہے کہ بے کم و کاست وہ تاثرات سامنے ہوں۔ تکرار سے بچنے اور قارئین کی سہولت کے لیے مجلس شوریٰ کی روداد اشارات کے بعد ہی شائع کی جا رہی ہے اس روداد میں پورے تاثرات، قرار داد کے طور پر موجود ہیں انھیں غور سے پڑھ لیجیے۔ مجلس شوریٰ کے تاثرات اور دوسری جماعتوں اور افراد کے تاثرات میں سب سے بڑا اور نمایاں فرق یہ ہے کہ وہاں جو کچھ کہا گیا ہے بس دعویٰ ہی دعویٰ ہے اس کی کوئی دلیل نہیں دی گئی اور یہاں جو کچھ کہا گیا ہے، دلیل کے ساتھ کہا گیا ہے۔ دوسرا فرق جو پڑھنے والا محسوس کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہاں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ مبہم کہی گئی ہیں مثلاً کہا گیا ہے کہ اس سے ملکی مفاد کو نقصان پہنچا وہ کونسا ملکی مفاد ہے جس کو نقصان پہنچا اور کنونشن کی وہ کونسی چیز ہے جس نے وہ نقصان پہنچایا، اس کا کہیں پتہ نہیں اور مجلس شوریٰ کے تاثرات

ہیں اگر کہیں یہ بات ملتی ہے کہ کنونشن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا تو وہیں یہ بات بھی ملتی ہے کہ وہ نقصان کیا ہے اور کس چیز سے پہنچا ہے۔ تیسرا فرق دونوں میں یہ ہے کہ وہاں مثبت طور پر کچھ نہیں کہا گیا کہ کنونشن کو کن لائنوں پر منعقد ہونا چاہیے تھا اور اسے کیا خدمت انجام دینی چاہیے تھی اور یہاں مثبت طور پر یہ بات بتائی گئی ہے کہ کنونشن کو کن اصولوں پر منعقد ہونا چاہیے تھا اور اسے کیا خدمت انجام دینی چاہیے تھی۔ چوتھی خصوصیت ان تاثرات کی — جو سابقہ تاثرات میں ہو ہی نہیں سکتی تھی — یہ ہے کہ کنونشن پر اظہار خیال اصلاً اسلامی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے کیونکہ کنونشن بہرحال مسلم کنونشن تھا۔

اب ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مجلس شوریٰ کے تاثرات یا کنونشن پر اس کی تنقید دائرۂ اعتدال کے اندر ہے یا اس سے متجاوز ہے اور اس تنقید نے کنونشن کو نقصان پہنچایا ہے یا آئندہ کسی مسلم کنونشن کے لیے نشانات راہ متعین کیے ہیں، لیکن ہمارے بعض کرم فرما معاصر اخبار نویسوں نے ان تاثرات کو سخت ترین بلکہ گمراہ کن تنقید قرار دیا ہے اور ان تاثرات اور قرار دادوں پر اپنے اخبار کے تین اداریئے نچھاور کیے ہیں۔ اسے ان سب میں تضاد بھی نظر آیا اور الجھن بھی محسوس ہوئی —— ہمارا معاصر فکر و نظر اور علم و ہنر کے جس پاتال سے باتیں کرتا ہے وہاں تک ہم لوگوں کا گزر کہاں، اس لیے اس کے لاجواب اداریوں کے جواب کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں ضمناً برسبیل تذکرہ یہاں ایک بات کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مجلس شوریٰ نے سیکولرزم کے بارے میں جو قرارداد منظور کی ہے اس کے آخر کی عبارت یہ ہے:-

"لیکن اگر سیکولرزم کا یہ مطلب لیا جائے جیسا کہ بعض حلقوں کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حکومتی کاروبار میں کسی مذہبی فرقہ کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جائے اور اس کے ساتھ بلا امتیاز مذہب و ملت یکساں برتاؤ ہو اور یکساں مواقع حاصل رہیں تو جماعت نے اس تخیل کی کبھی مخالفت نہیں کی" یہ

اس عبارت کو پیش کر کے معاصر رقم طراز ہے۔

"جب کنونشن کی اس بنا پر جماعت، مذمت کر چکی کہ اس کو سیکولرزم کی شرط کے ساتھ بلایا گیا تو اس کے بعد یہ بات بھی کہہ دی کیا جماعت نے کنونشن بلانے والوں سے پوچھ لیا تھا کہ سیکولرزم سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ یا کنونشن بلانے والوں نے خود لفظ سیکولرزم کا کسی جگہ اس مطلب سے مختلف مطلب بتلا دیا تھا؟ جماعت اسلامی نے آخر کس بنا پر فیصلہ کر لیا کہ کنونشن بلانے والے سیکولرزم کا کوئی اور مطلب لیتے ہیں اگر ایسی بات ہے تو جماعت بتلائے تاکہ ذرا ہم بھی تو محسوس کریں کہ جماعت اپنی حدود فکر

اشارات

کون ذمہ دار ہے ؟ (قومی آواز ۲۵ جولائی ۶۲ء)

بظاہر معاصر کا یہ اعتراض کتنا وزنی معلوم ہوتا ہے اور لہجے میں کیسا تحکم اور طنطنہ ہے لیکن اسے محسوس نہیں ہوا کہ ان سوالات کے ذریعہ خود اپنے لیے یا کنونشن بلانے والوں کے لیے جال بن رہا ہے۔ ذیل میں جو سوالات دیے جا رہے ہیں، معاصر کو ان پر غور کرنا چاہیے۔

کیا جماعت اسلامی نے کسی جگہ لفظ سیکولرزم کے اس مطلب سے اختلاف کا اظہار کیا ہے جس کو پیش کر کے معاصر نے یہ اعتراض جمایا ہے؟ اگر کیا ہے تو معاصر نشان دہی کرے اور اگر نہیں کیا ہے تو پھر جماعت اسلامی کو کنونشن میں شرکت کی دعوت کیوں نہیں دی گئی؟ اگر کنونشن کے ذمہ دار لفظ سیکولرزم کے اسی مطلب کو صحیح مانتے ہیں اور جماعت اسلامی بھی اس مطلب کی مخالف نہیں تو پھر کنونشن کا دروازہ اس پر کیوں بند کیا گیا؟ کیا یہ سد باب اس بات کا واضح عملی ثبوت نہیں ہے کہ کھانے کے دانت اور ہیں، دکھانے کے اور؟ اگر جماعت اسلامی نے اس عملی دلیل کی بنا پر سمجھ لیا کہ کنونشن بلانے والے سیکولرزم کا کوئی اور مطلب لیتے ہیں تو اس نے کیا غلطی کی؟ بلکہ اگر سمجھ لیا جائے کہ جماعت اسلامی کو کنونشن میں نہ بلانا اس بات کی دلیل ہے کہ کنونشن کے ذمہ دار سیکولرزم کا وہی مطلب صحیح سمجھتے ہیں جس کی جماعت اسلامی علی الاعلان مخالف ہے تو کیا یہ سمجھنا غلط ہوگا؟

معاصر ان سوالات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے گا تو ان میں اپنے اعتراض کا جواب بھی پا لے گا اور اس کی سطحیت بھی واضح ہو جائے گی۔ جماعت اسلامی سے آگے بڑھ کر میں معاصر سے پوچھتا ہوں کہ سیکولرزم کے جس مطلب کو وہ صحیح سمجھتا ہے مسلمانوں کی کون سی جماعت اس کی مخالف ہے؟ جہاں تک میرا علم ہے ہندستان میں مسلمانوں کی چھوٹی سے چھوٹی جماعت بھی ایسی نہیں ہے جو اس مطلب کے لحاظ سے سیکولرزم کی مخالف ہو تو پھر مسلمانوں کو سیکولرزم کے ماننے اور نہ ماننے والے دو گروہوں میں تقسیم کرنا کس طرح صحیح ہے اور کنونشن کے ذمہ داروں کے پاس اس تقسیم و تفریق کی کیا بنیاد ہے؟

مجلس شوریٰ کے تاثرات پر اظہار خیال کے ضمن میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ انڈین مسلم کنونشن سے حکومت ہند بھی خوش نہیں ہے اور وہ جماعتیں بھی ناراض ہیں جو سیکولرزم، قوم پرستی اور مغربی جمہوریت پر یقین رکھتی ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ تمام جماعتیں فی الواقع جن سنگھ کی طرح اسلام بیزار اور مسلم دشمن ہیں یا ان کی ناخوشی کا سبب کچھ اور ہے؟ کنونشن کے ذمہ داروں اور قومی آواز کے مدیر شہیر کو اس سوال پر غور کرنا چاہیے۔ میرا مشورہ ہے کہ انہیں کم سے کم قومی آواز اس سوال کے جواب میں لکھنے چاہییں۔ ایک بہت ہی قلیل تعداد کو چھوڑ کر مسلمانان ہند کی اکثریت

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

روداد اجلاس مجلس شوریٰ

منعقدہ ۱۵؍جولائی ۶۱ء لغایتہ ۱۸؍جولائی ۶۱ء

مجلس شوریٰ کا اجلاس مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی میں حسب اعلان ۱۴؍جولائی ۶۱ء کو بعد نماز جمعہ ۳ بجے سے شروع ہو جانا چاہیے تھا لیکن بارش اور دیگر موانع کے باعث کچھ ارکان شوریٰ بروقت مرکز جماعت نہ پہنچ سکے تھے اس لیے کورم پورا نہ ہو سکا اور اجلاس کی کارروائی شروع نہ کی جا سکی۔ دوسرے دن صبح جوں ہی بقدر کورم ارکان شوریٰ تشریف لے آئے شوریٰ کا اجلاس زیر صدارت مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی شروع ہو گیا اور ۱۸؍جولائی ۶۱ء کو بحمد اللہ خیر و خوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ مندرجہ ذیل ارکان اجلاس کی جملہ کارروائیوں میں شریک رہے۔

مولانا نظام الدین صاحب۔ جناب محمد مسلم صاحب۔ جناب وحید الدین خاں صاحب۔ جناب انعام الرحمن خاں صاحب۔ مولانا سید حامد علی صاحب، جناب افضل حسین صاحب۔ مولانا شمس پیرزادہ صاحب۔ مولانا محمد عزیز صاحب۔ جناب محمد یوسف صاحب صدیقی۔ جناب سید حامد حسین صاحب اور محمد یوسف قیم جماعت۔

جناب انیس الدین احمد صاحب جو راستہ کی دشواریوں کے باعث تاخیر سے پہنچے تھے ابتدائی چند نشستوں کے علاوہ بقیہ تمام کارروائی میں شریک رہے اور جناب عبد الحی صاحب اپنی معذوری کی وجہ سے صرف آخر کے دو دنوں کی نشستوں میں شریک ہو سکے۔

مولانا صدر الدین صاحب اور جناب کے سی عبد اللہ مولوی اپنی خانگی معذوریوں کی بنا پر شریک نہ ہو سکے۔ اجتماع کی کارروائی امیر جماعت کی افتتاحی تقریر سے شروع ہوئی۔ مولانا نے فرمایا کہ:۔

"شوریٰ کا اجلاس اب سے دو ڈھائی ماہ پہلے ہوا تھا اس کے بعد اتنی جلد شوریٰ کا اجلاس دوبارہ طلب کرنے کے چند خاص محرکات ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ گزشتہ اجلاس کے موقع پر ملکی انتخابات کے مسئلے پر کچھ گفتگو ہوئی تھی وہ گو اس وقت اجمالاً طے کر دیا گیا تھا کہ آئندہ الیکشن میں ہمیں عملاً کوئی حصہ نہیں لینا ہے لیکن پھر بھی ضرورت تھی

تھی کہ کم از کم ذہنی طور پر ہمیں اس کے بارے میں اپنے قطعی رد یا دریا پالیسی کا فیصلہ کر لینا چاہیے اور چونکہ وقت کم تھا اور مسئلہ اپنے اندر گوناگوں پیچیدگیاں رکھتا تھا اس لیے طے کیا گیا تھا کہ خاص اس مقصد کے لیے ایک الگ نشست بعد میں بلائی جائے۔ ہر چند اس مقصد کے لیے اس قدر جلد اجلاس طلب کرنا ضروری نہ تھا لیکن اس مسئلے کے بارے میں ہمارا ذہن جس قدر جلد یکسو ہو سکے بہتر ہی ہو گا اور علاوہ ازیں جو دوسرے محرکات شوریٰ طلب کرنے کے موجب ہوئے ہیں وہ بہرحال تعجیل ہی کے طالب تھے

دوسرا خاص محرک کنونشن اور اس کے متعلقات پر غور کرنا ہے۔ گزشتہ شوریٰ کے موقع پر کنونشن کے موضوع پر پوری تفصیل کے ساتھ غور کیا گیا تھا اور کچھ فیصلے کیے گئے تھے۔ ہر چند کنونشن کے بعد جو حالات سامنے آئے ہیں وہ بحیثیت مجموعی ایسے نہیں ہیں جو اس وقت ہمارے پیش نظر رہے ہوں لیکن پھر بھی اس کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں اور ان سے جماعت کے مفاد و مصالح کے متاثر ہونے کا شدید احتمال ہے اس لیے ان پر غور کر لینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اس کنونشن نے اپنے ابتدائی تصور و نقشہ کے خلاف کچھ مخصوص اسباب و وجوہ کی بنا پر کچھ ایسی شکل اختیار کر لی کہ اس میں جماعت کو مدعو نہیں کیا گیا اور مدعو نہ کرنے کا اثر یہ مرتب ہوا ہے کہ جماعت کا تعارف ایک فرقہ پرست اور اینٹی نیشنل جماعت کی حیثیت سے کرایا جانے لگا ہے جس کے مفاسد واضح ہیں اور اس کی اصلاح و تدارک کی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ممکن ہے جدید حالات میں ہمیں کنونشن کے ذیل میں اپنی طے شدہ باتوں پر بھی مزید غور و فکر کی ضرورت محسوس ہو

تیسرا خاص محرک یہ تھا کہ گزشتہ اجلاس شوریٰ کے موقع پر بھاری ایجنڈے کی وجہ سے ہم ایک ضروری مسئلہ کی طرف توجہ نہیں دے سکے تھے یعنی تحریک و جماعت کے عمومی حالات کا جائزہ اور اس کے مطابق ضروری تدابیر پر غور و خوض موجودہ میقاتی پروگرام کو شروع ہوئے ایک سال ہو گیا ہے اس لیے مناسب ہو گا کہ اس موقع پر یہ کام بھی انجام پا سکے میں چاہتا ہوں کہ عام حالات بالخصوص جماعت کے اندرونی حالات کے بارے میں آپ حضرات کے احساسات اور مشورے کھل کر سامنے آ سکیں تاکہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

آخر میں امیر جماعت نے فرمایا کہ جماعت کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ شوریٰ اپنے مقررہ وقت پر شروع نہ ہو سکی اور اس کی وجہ کورم کا پورا نہ ہونا تھا مجھے یہ توقع تو نہیں ہے کہ رفقاء نے دہلی پہنچنے میں قصداً یا بے وجہ تاخیر کی ہوگی لیکن اگر واقعی اس میں کوتاہی یا تساہل کو دخل ہو تو اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور ہمیں اپنے فرائض کو پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق دے۔ آمین

امیر جماعت کی افتتاحی تقریر کے بعد ایجنڈا ترتیب دیا گیا جس کی پہلی شق گزشتہ اجلاس شوریٰ کی روداد کی

(باقی صفحہ [illegible])

کوئی سننے والا ہے جو سنے؟

(جناب وحید الدین خاں صاحب)

اسلامک یوتھ آرگنائزیشن (رامپور) کے اجتماع میں پڑھا گیا ۱۳ر جولائی ۱۹۶۱ء

دفتر کے صحن میں دوڑنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا، دیکھا تو ہاکر ہاتھ میں اخبار لیے بھاگا چلا آ رہا ہے۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول ہے، صبح کا اخبار اول ترین وقت میں تمام خریداروں کے پاس پہنچانے کا اس کو اتنا خیال ہے کہ وہ دوڑتا ہوا چلتا ہے۔ اور اگر اخبار دینے کے بعد اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ ٹھہر کر اس کا جواب نہیں دے گا بلکہ واپس بھاگتے ہوئے کہتا چلا جائے گا۔ وہ دوڑ رہا ہے تاکہ وہ بھاگتے ہوئے وقت کو پکڑ لے تاکہ وہ وقت کے پیچھے نہ رہ جائے۔

یہ دنیا کے لیے انسان کی دوڑ دھوپ کی ایک مثال ہے جس کو آپ اپنے قریب ترین دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ "صبح کی چائے" میں طویل وقت صرف کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے درمیان بے تکلف باتیں کرتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ اخبار کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ آخرت کے اقرار میں اتنے سنجیدہ بھی نہیں ہیں جتنا وہ شخص اپنے پیشے میں سنجیدہ ہے جس کا آپ انتظار کر رہے ہیں۔ آپ مسلمان ہیں، آپ اسلام کے داعی ہیں لیکن اگر صورت حال یہ ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کا مسلمان ہونا آپ کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ آپ کی اسلامی دعوت محض اس سے ایک روایتی وابستگی کا نتیجہ ہے یا زیادہ سے زیادہ وہ ایک ذہنی موضوع ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ آخرت کے لیے اس سے زیادہ بیتاب ہوتے جتنا ایک دنیا پرست دنیوی فائدوں کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔ آخرت کی طلب میں آپ اس سے زیادہ تیز دوڑنے کی کوشش کرتے جتنا کوئی شخص اپنی ملازمت و کاروبار کے لیے دوڑتا ہے۔ اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کے استعمال میں آپ اس سے زیادہ مستعد ہوتے جتنا کہ ایک اخبار بیچنے والا اپنے کام میں نظر آتا ہے۔

اسلام آدمی کو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کے لیے بلاتاہے۔ جس کے دل میں یہ بات اتر گئی ہو
سکتی ہے کہ وہ شخص غیر متعلق کام میں یا کمتر درجہ کے مقاصد میں اپنا وقت ضائع کرے' اسلام ہم کو
وہ زندگی کی غفلتوں کے بدلے بے پناہ عذاب سے ڈراتا ہے۔ جو شخص فی الواقع اس خبر پر ایمان لایا
ہو کیسے ممکن ہے کہ آپ اس کو بے فکری کے ساتھ قہقہہ لگاتا ہوا پائیں۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارے اوپر ایک
عظیم خدا ہے جو ہر وقت تمہیں دیکھ رہا ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو مانتا ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک لمحے
لیے بھی ایسے مشاغل میں مصروف ہونا پسند کرے جس کی خدائے ذو الجلال کے نزدیک کوئی قیمت نہ ہو'
اسلام کہتا ہے کہ تمہاری زندگی بالکل غیر یقینی ہے' کسی بھی وقت موت کے فرشتے تمہاری گرفتاری کے لیے پہنچ سکتے
ہیں۔ جو شخص حقیقی معنوں میں اس انتہائی نازک صورتِ حال کا احساس رکھتا ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ روزانہ
اپنے اوقات کا ایک حصہ ایسے مشاغل میں صرف کرتا رہے جن کا طلبِ آخرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو شخص
خدا سے ڈرتا ہو اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ ایک کام کو مہینوں اور سالوں کرتا رہے اور اس کو احساس نہ ہو کہ

وہ ایک غلطی کو دہرا رہا ہے۔

"کیا یہی وہ تصویریں ہیں جو خدا اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد بنتی ہیں" یہ فقرہ اکثر ایک دردناک
آہ کے ساتھ میری زبان سے اس وقت نکل جاتا ہے جب میں اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ انسان
کے لیے اس کے معاشی مفادات آخروی تقاضوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ خدا کی مرضی کے لیے سرگرم ہونے
سے زیادہ اس کو یہ بات محبوب ہے کہ وہ اپنے ذوق کی تسکین اور اپنی عادتوں کی تکمیل میں لگا رہے۔ وہ اپنی
زندگی کے مقررہ نقشہ کو نہیں بدل سکتا خواہ اس کی وجہ سے اس کی عبادتیں ناقص ہو جائیں' خواہ وہ اپنی ذمہ داریوں
کو ٹھیک ٹھیک انجام نہ دے سکے' خواہ اس کو بالآخر اپنی بے حسی اور ناکردگی کو چھپانے کے لیے جھوٹے عذرات

کا سہارا لینا پڑے۔

یہ شکایت مجھے صرف ان لوگوں سے نہیں ہے جو لادینہ ماحول میں پرورش پا کر نکلے ہیں۔ وہ لوگ جو
"دیندار" کہے جاتے ہیں۔ جن کی طرف اسلامی مسائل معلوم کرنے کے لیے رجوع کیا جاتا ہے۔ ان کا حال بھی
اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ چند دن پہلے میں ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ ایک پرجوش آواز میرے
کان میں آئی — "ہر آدمی کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھے۔ اس سے دل کو
بڑی تسکین ہوتی ہے" دیکھا تو ایک بزرگ ایک دکان میں بیٹھے تقریر کر رہے تھے۔ چہرے پر داڑھی ایک

دیندار ہونے کی علامت تھی اور زبان اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ یقیناً کوئی عالم ہوں گے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ کوئی ناجائز خواہش ہے مگر جب میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے اندر یہ تمنا بہت زیادہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھیں مگر اسلام کو پھلتا پھولتا دیکھنے کی تڑپ ان میں باقی نہیں ہے تو یہ جائز خواہش بھی مجھ کو ایک عجیب معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک بزرگ کو میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ وہ ایک نوجوان کو اس بات پر تنبیہ کر رہے تھے کہ وہ نماز کے بعد دعا کے لیے نہیں ٹھہرتا بلکہ سلام پھیرنے کے بعد فوراً اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ بے شک یہ نوجوان کی غلطی تھی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ خود ان بزرگ کا حال یہ ہے کہ صبح کی اور دوپہر کی نیند اکثر انھیں فجر اور ظہر کی نمازوں میں وقت پر مسجد پہنچنے نہیں دیتی۔ شام کی گفتگو میں وہ کبھی کبھی اتنا مصروف ہوتے ہیں کہ مسجد اس وقت پہنچتے ہیں جب امام ایک رکعت پوری کر چکا ہوتا ہے۔ آپ کو ایسے کتنے "عالم دین" ملیں گے جن کے سامنے اگر ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر کا ترجمہ "تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے" ــــ کر دیا جائے تو وہ اس پر دو گھنٹے بحث کریں گے کہ یہاں مِنْ "تبعیضیہ" نہیں بلکہ "بیانیہ" ہے۔ یعنی آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "تم کو ایسا گروہ بننا چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے"۔ مگر ان حضرات کے ساتھ آپ مہینوں اور سالوں زندگی گزاریں، آپ یہ نہ دیکھیں گے کہ ان کے اندر فی الواقع دعوت الی الخیر کی کوئی واقعی تڑپ پائی جاتی ہے۔ صلوٰۃِ وُسطیٰ کا ترجمہ اگر "بیچ کی نماز" یا "عصر کی نماز" کر دیجیے تو وہ آپ کے اوپر جہالت کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔ وہ اصرار کریں گے کہ قرآن میں جو صلوٰۃِ وُسطیٰ کا لفظ آیا ہے اس سے مراد "بہترین نماز" ہے۔ مگر ان کی اپنی نمازوں کو دیکھیے تو آپ کبھی نہ پائیں گے کہ وہ اپنی نماز کو "بہتر" بنانے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ دوسروں پر تبلیغ کرتے ہوئے وہ نہایت جوش کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کریں گے کہ ــ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر غزوۂ بدر کے لیے نکلے، دوسری طرف مشرکین کا لشکر تھا۔ آپ نے فرمایا، بڑھو ایک ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے۔ ایک انصاری عمیر بن حمام نے یہ سنا تو ان کی زبان سے بخ بخ کے الفاظ نکل گئے، یعنی خوب! آپ نے فرمایا، تم نے بخ بخ کیوں کہا۔ انھوں نے جواب دیا۔ خدا کی قسم صرف اس لیے کہ شاید میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں تم انھیں میں سے ہو۔ یہ سن کر انھوں نے اپنے ترکش میں سے کچھ کھجوریں نکالیں اور ان سے کھانے لگے۔ پھر بولے ان کھجوروں کو کھانے کے لیے میں کب تک ٹھہرا رہوں گا۔ اِنَّھَا لَحَیٰوۃٌ طَوِیْلَۃٌ یہ تو بڑی لمبی زندگی

یہ کہہ کر انھوں نے بقیہ کھجوریں ایک طرف ڈال دیں اور جنگ میں کود پڑے اور لڑکر شہید ہوگئے۔" (مسلم)

مگر خود ان مبلّغین کا کیا حال ہے۔ مذکورہ صحابی نے تو خدا تک پہنچنے کے شوق میں اپنی واقعی خوراک پھینک دی تھی مگر یہ حضرات اپنے ذوق اور اپنی عادتوں کو بھی خدا کی خاطر پھینکنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بدر کے میدان میں اسلام اور کفر کا جو معرکہ ہوا تھا وہ آج ہر گلی اور ہر سڑک پر پوری شدت کے ساتھ جاری ہے مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وقت کے اس غزوے میں شرکت کے لیے اپنے موجودہ مفاد کو ترک کرنا تو درکنار مستقبل کی تمناؤں اور اپنی آنے والی پشتوں کے مفاد کو بھی خدا کے دین کے لیے خطرے میں ڈالنا وہ گوارا نہیں کرسکتے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اسلام کے دعوے کے ساتھ اتنے بڑے تضاد کو لوگ کس طرح اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہیں۔ ہر بار مجھے یہی جواب ملا کہ دراصل "تاویل" کے فتنے نے لوگوں کو اس تضاد میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہر آدمی نے اپنے طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کچھ خوبصورت جوابات تراش رکھے ہیں اور ضرورت کے وقت وہ فوراً انھیں پیش کر دیتا ہے۔ ایک مسلمان ڈاکٹر کو میں نے ایک بار دعوتِ دین کی جدوجہد میں حصہ لینے کی ترغیب دلائی۔ انھوں نے فوراً اپنے پیشے کی اہمیت پر تقریر شروع کر دی۔ ان کے نزدیک ان کا پیشہ خدمتِ خلق کا ایک زبردست کام ہے جس کو وہ رات دن کی محنت سے انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے بعض سنگین مریضوں کا ذکر کیا جو ان کے زیرِ علاج تھے۔ انھوں نے کہا "بتائیے میں انھیں چھوڑ کر کیسے کہیں جاسکتا ہوں، میرا ایسا اقدام انسانیت دوستی ہوگی یا انسانیت دشمنی" بظاہر یہ بہت معقول جواب ہے لیکن اگر میں آپ کو یاد دلاؤں کہ اکثر ڈاکٹروں کی "انسانیت دوستی" ہمیشہ ان مریضوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے جو اس کے زیرِ علاج ہوں اور ان میں بھی سب سے زیادہ اس کی توجہ کے مستحق وہ مریض ہوتے ہیں جو زیادہ "Paying" ہوں تو آپ سمجھ جائیں گے کہ اس خدمتِ خلق کی حقیقت کیا ہے۔

اسی طرح ہر شخص کے پاس اپنے طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایک جواب موجود ہے۔ کوئی لوگوں کی ناکردگی کو اس بات کے لیے کافی سمجھے ہوئے ہے کہ وہ خود بھی کوئی کام نہ کرے، کوئی دوسروں کے غلط خیالات کو اپنے لیے رکاوٹ سمجھتا ہے، کوئی دقتوں اور پابندیوں کی ایک فہرست لیے بیٹھا ہے، کسی کو ایک ایسا فقہی اور قانونی پیمانہ مل گیا ہے جس سے ناپنے میں اس کا جامہ بالکل درست اترتا ہے، کسی نے احادیث کے ذخیرے میں سے اپنے مناسب حال چند موزوں حدیثوں کو چھانٹ لیا ہے جو اس کے طرزِ عمل کو صحیح ترین ثابت

کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کے پاس اپنے غیر اسلامی رویّے کی ایک اسلامی توجیہ اور اپنی آخرت فراموش زندگی کی ایک خالص دینی تاویل موجود ہے۔ اور اگر آپ ان تاویلات کی حقیقت کھول دیں تو موجود دور میں شیطان نے چند ایسے الفاظ مہیا کر دیے ہیں جن کے ذریعہ کسی بھی صحیح ترین تنقید کو نہایت آسانی سے رد کیا جا سکتا ہے —— "یہ شدت پسندی ہے"۔ "یہ تمہارا انتہا پسندانہ ذوق ہے"۔ "تم یک رُخے انداز پر سوچتے ہو"۔ "تم اعتدال کے راستے سے ہٹ گئے ہو"۔ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ آپ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ کیونکہ خدا کے رسول پہلے ہی اعلان فرما چکے ہیں کہ اَلدِّیْنُ یُسْرٌ !

مگر یاد رکھیے آج آپ ایک ناصح کو ان جوابات سے خاموش کر سکتے ہیں۔ مگر خدا کے یہاں اس قسم کے جوابات ہرگز کافی نہ ہوں گے۔ وہاں تو آپ کی پوری زندگی کا کچا چٹھا ڈھیر کر کے رکھ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تم خود دیکھ لو کہ دنیا کی زندگی میں تم جن مشاغل میں مصروف تھے ان کے پیچھے کیا کیا محرکات کام کر رہے تھے۔

میرے ایک محترم دوست نے ایک مرتبہ بہت عمدہ بات کہی —— "آخرت میں خدا کا انعام اسی کو ملے گا جس نے دنیا میں خدا کے انعام کو پا لیا ہو"۔ اس بات پر غور کیجیے تو اس میں نصیحت کے بہت سے پہلو چھپے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، آپ دین حق کے علم بردار ہیں، یہ دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ آپ خدا کی جنت کے امیدوار ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ انعام "جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا" وہ محض دعووں اور خوش گمانیوں کے ذریعہ تو کسی کو نہیں مل سکتا۔ یہ انعام صرف اس کے لیے ہے جس نے دنیا میں اپنی آخرت طلبی کو نمایاں طور پر ثابت کر دیا ہو، جس نے اپنے مسلسل رویّے سے یہ دکھا دیا ہو کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں وہ اس کے پانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ جب دوسرے لوگ دنیا کی لذتوں میں کھوئے ہوئے تھے تو وہ خدا کے انعام کے تصور میں اتنا محو ہوا کہ اسے دنیا کی لذتیں بھول گئیں۔ جب دوسرے لوگ اپنے ذوق کو تسکین دینے میں مصروف تھے تو وہ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا، جب دوسرے لوگ سوتے تھے تو وہ جاگتا تھا، جب دوسرے آرام کرتے تھے تو وہ تکلیف اٹھاتا تھا، جب دوسرے لوگ ہنسی اور تفریح میں دل بہلا رہے تھے تو وہ آنسو بہا رہا ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ جب دوسرے لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو گم کیے ہوئے تھے تو وہ آخرت کی زندگی کے لیے اپنا ایک ایک لمحہ صرف کر رہا تھا۔

جنت کا مستحق ہونا دوسرے لفظوں میں آخرت میں کسی کا ممتاز مقام حاصل کرنا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں صرف وہی شخص کسی ممتاز مقام کو پاتا ہے جس نے اس کے لیے بے پناہ جدوجہد کی ہو۔ ٹھیک اسی

[illegible] ہو ۔
آخرت کے درجات عالیہ بھی وہی لوگ پائیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو اس کے لیے کھپا دیا ہو۔ اگر کوئی شخص
سمجھتا ہے کہ محض سطحی زندگی کے نتیجے میں وہ آخرت کے انعامات کو حاصل کرے گا تو یہ محض خوش فہمی ہے۔
ٹھیک ویسی ہی خوش فہمی جیسے کوئی شخص سمجھ لے کہ وہ بستر پر لیٹے لیٹے وہ مقام حاصل کر سکتا ہے جب کہ دنیا
اسے فاتح ایورسٹ کے نام سے پکارے اور اس کو وہ اعزازات نصیب ہوں جو ہلیری اور تین زنگ کو لمبی
جدوجہد کے بعد حاصل ہوئے۔

تین سو سال پہلے ۱۶۴۲ء میں انگلینڈ کے دیہات میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ پیدائش کے وقت وہ اتنا
کمزور تھا کہ دائیوں نے اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی ظاہر کی۔ اس کا کمزور سر حفاظت کی خاطر چمڑے کی
پٹی سے لپیٹ دیا گیا۔ اس کے بعد جب وہ بڑا ہو کر ہائی اسکول پہنچا تو اپنے ساتھیوں میں سب سے پیچھے تھا۔ مگر
یہی کمزور لڑکا جب پچاسی سال کی عمر میں مرا تو وہ نیوٹن کے پرعظمت نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ نہ صرف انگلینڈ
میں اس کو بلند ترین اعزازات حاصل ہوئے بلکہ ساری دنیا میں اپنی ذہنی عظمت کا اس نے ایسا سکہ بٹھایا کہ
اس کے مرنے کے سو سال بعد جب دوربینی مطالعہ میں سائنسدانوں نے دیکھا کہ سیارہ یورے نس نیوٹن کے
قانون تجاذب کے بتائے ہوئے راستے سے کچھ ہٹا ہوا ہے تو انھوں نے نیوٹن کے اصول کی غلطی تسلیم کرنے
سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کوئی اور سیارہ ہونا چاہیے جس کی کشش سے اس کی رفتار میں یہ
فرق پیدا ہوا ہے۔

نیوٹن کو یہ عظمت کیوں کر حاصل ہوئی اس کا جواب خود اس کی زبان سے سنیے۔ ایک مرتبہ اس کے کارناموں
کی تعریف کی گئی تو اس نے کہا:۔

"I had no special sagacity——
only the power of patient thought"

یعنی میرے اندر کوئی خصوصی قابلیت نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ ملا وہ صرف اس وجہ سے ملا کہ میں نے
کائنات کو سمجھنے کے لیے انتھک جدوجہد سے کام لیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب **PRINCIPIA** کی تیاری
کے دوران میں اٹھارہ مہینے تک اس کا یہ حال تھا کہ وہ گھنٹوں بے حس و حرکت بیٹھا سوچتا رہتا۔ اس کے بعد
یکا یک اپنی ڈسک پر جا کر کھڑا ہو جاتا اور گھنٹوں مسلسل لکھتا رہتا۔ اس کو اتنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا کہ قریب
کی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ جائے۔ اس کے سکریٹری کی رپورٹ ہے کہ اس دوران میں بہت کم ایسا ہوا کہ و[illegible]

دو بجے سے پہلے بستر پر گیا ہو۔ اور بعض اوقات تو پانچ اور چھ بج جاتے تھے۔ کھانا بھی وہ اکثر بھول جاتا تھا۔ اس کی زندگی کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا کہ تم سگریٹ کیوں نہیں پیتے۔ اس نے جواب دیا:

"Because I do not want to acquire any new necessities"

یعنی میں سگریٹ اس لیے نہیں پیتا کہ اس کی وجہ سے میری ضروریات زندگی میں ایک خواہ مخواہ کی ضرورت کا اضافہ ہو جائے گا۔

ولیم ہرشل (William Harschell) ایک جرمن سائنس داں گزرا ہے۔ اس نے فلکیات کے مطالعہ میں انسان کے علم کو بہت آگے بڑھایا۔ اس کا حال یہ تھا کہ معاشی تنگی کی وجہ سے سکول کے بعد وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ایک ملازمت کر لی لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے انیس سال کی عمر میں یہ ملازمت بھی چھوڑنی پڑی۔ اس کے بعد اس نے اپنے خاندانی پیشے کو اختیار کیا اور وائلن بجانے لگا۔ اسی دوران میں اس کو فلکیات کے موضوع پر ایک کتاب ملی۔ اس کتاب کو اس نے بہت غور سے پڑھا۔ اس کے بعد ہرشل کو ستاروں کے مطالعہ سے گہری دل چسپی پیدا ہو گئی۔ اس کا یہ شوق اتنا بڑھا کہ کبھی کبھی رات کے وقت جب اس کی ٹولی ساز و نغمہ میں مصروف ہوتی تھی وہ مجلس چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل جاتا تا کہ آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کی ایک جھلک دیکھ آئے۔

ستاروں کے مطالعہ کے لیے دوربین ضروری تھی۔ مگر یہ اٹھارھویں صدی کا زمانہ تھا جب کہ دوربین ابھی جلد ہی ایجاد ہوئی تھی اور نہ صرف یہ کہ ناقص تھی بلکہ اس کا ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ ہرشل نے خود اپنی دوربین بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے متعلق فنی واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس نے ریاضی پڑھنی شروع کی اور لمبی محنت کے بعد خود اپنے ہاتھ سے دوربین تیار کی۔ ظاہر ہے کہ اس کی پہلی دوربین ابھی بہت ناقص تھی۔ مگر وہ ہمت نہ ہارا۔ دوربین کو ترقی دینے اور اس کو بہتر بنانے میں اس کا انہماک اتنا بڑھا کہ اس کا پورا گھر دوربین کا ایک کارخانہ بن گیا۔ اس زمانے میں ہرشل کی مشغولیت کا یہ حال تھا کہ وہ کھانے کے لیے بھی اپنی ورکشاپ سے نہیں نکلتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بہن کو اکثر اس طرح اسے کھانے کے لیے آمادہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنے کام میں لگا رہتا اور بہن اس کے پہلو میں کھڑی ہوئی اس کے منہ میں لقمہ ڈالتی جاتی۔

صاف راتیں جب کہ آسمان پر بادل نہیں ہوتے تھے، بہت کم ایسا ہوتا کہ ہرشل بستر کے اوپر نظر آئے

کوئی بتانے والا ہو جو بتائے

ایسی راتوں کا بہترین مصرف اس کے نزدیک تھا کہ اس کو ستاروں کا مشاہدہ کرنے میں بسر کرے۔ اس کی انھیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس کو تاریخ میں وہ مقام حاصل ہوا جس کو ایک مصنف نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:۔

"...he had looked farther into space
than any other eye had yet seen"

یعنی اس نے کائنات میں اتنی دور تک دیکھا جتنا اس سے پہلے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا تھا۔

نومبر ۱۸۴۷ء کی ایک تاریخ کو جب ایک یڈوبین ڈاکٹر کے کمرے میں اس کا ملازم داخل ہوا تو ڈاکٹر اور اس کے دو ساتھی اپنی کرسیوں سے گر کر فرش پر اوندھے منھ بیہوش پڑے ہوئے تھے۔ ملازم نے سمجھا کہ شاید ان لوگوں نے کوئی تیز قسم کی شراب پی لی ہے۔ اس نے ان کے کپڑے درست کیے اور خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ یہ دراصل جیمز سمپسن اور اس کے دو اسسٹنٹ تھے جنھوں نے پہلی بار کلوروفارم کے اثرات کا تجربہ کرنے کے لیے اس کو سانس کے ذریعہ اپنے اندر داخل کر لیا تھا۔ سمپسن ایک دیہاتی نانبائی کے سات لڑکوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ چار سال کی عمر میں اس نے دیہات کے سکول میں تعلیم شروع کی اور اس میں اتنی دلچسپی اور توجہ دکھائی کہ اس کا باپ اور بھائی اس پر راضی ہو گئے کہ نہایت ضروری مصارف پر قناعت کر کے اس کو اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر بھیجیں۔ اس طرح وہ اڈنبرا یونیورسٹی پہنچا۔ اسی نانبائی کے لڑکے کے سر اس بات کا سہرا ہے کہ اس نے آپریشن کے موقع پر کلوروفارم کا استعمال دریافت کر کے انسانیت کو ایک طویل اور جانکاہ مصیبت سے نجات دی ہے۔ اس نے انسان کو وہ چیز دی جس کو ڈاکٹر جان براؤن نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

"...one of God's best gifts
to His suffering children"

یعنی دکھی انسانوں کے نام خدا کے تحفوں میں سے ایک بہترین تحفہ ——— مگر سمپسن یہ تاریخی کام صرف اس وقت کر سکا جبکہ اس کی تحقیق میں اس نے اپنے آپ کو پوری طرح لگا دیا اور اس کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

یہ ان لوگوں میں سے صرف چند کا ذکر ہے جنھوں نے دنیا میں عزت کا مقام حاصل کیا۔ آپ اس طرح کے بہت سے واقعات کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جنتِ دنیوی میں صرف وہ لوگ داخل ہو سکے

جنھوں نے بے پناہ مشقت اٹھائی جنھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو اس کے پیچھے جھونک دیا۔ دنیا اپنی پشت پر چلنے والے کروڑوں اور اربوں انسانوں میں سے صرف ان تھوڑے سے لوگوں کو عزت اور سربلندی کا مقام دینے کے لیے منتخب کرتی ہے جو اس کے لیے اپنے آپ کو فنا کر دیتے ہیں، جو اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ پھر خدا کی جنت جو اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے، کس قدر خام خیالی ہوگی اگر کوئی شخص سمجھے کہ محض سطحی قسم کے عمل کے ذریعہ وہ اسے حاصل کرلے گا۔

لَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ؀	(اے مسلمانو!) کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ تمہیں جنت میں داخل ہو جائے گا۔ حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات گزرے ہی نہیں جو اس سے پہلے کے لوگوں پر گزر چکے ہیں ان کو تکلیفیں اور مصیبتیں لاحق ہوئیں، وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئے۔ سن لو (ایسے لوگوں کے لیے) خدا کی مدد قریب ہے۔

آخر میں آپ کو میں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں جو دس سال سے میری یادداشت کا بہترین حصہ رہا ہے یہ ایک انگریز مسٹر آرنلڈ کا واقعہ ہے جو علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۹۲ء میں جب مولانا شبلی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا تو جہاز میں پورٹ سعید تک مسٹر آرنلڈ کا بھی ساتھ رہا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

"۱۰ مئی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بےکار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو خبر بھی ہے۔ بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں۔ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا موقع ہے۔ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابل قدر وقت کو ضائع کرنا بالکل بے عقلی ہے۔"

سفرنامہ روم و مصر و شام صفحہ ۱۲ (باقی صفحہ پر)

نظریۂ اوتار اور عقیدۂ رسالت

(قسط ۱۱)

(جناب ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری)

مذہبی حالت عرب میں بت پرستی کا اتنا زور تھا کہ تین سو ساٹھ بت صرف کعبہ کے اندر رکھے، زیادہ تعداد دیواروں پر بنی ہوئی رنگین تصویروں کی تھی جیسی تصویریں ہندوستان کے بُت خانوں میں ہوتی ہیں، ان تصویروں میں حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی ماں حضرت مریمؑ کی تصویریں بھی تھیں حالانکہ خود ان کو بت پرستی سے کوئی تعلق نہ تھا، یہ بزرگوار ایک خدا کے پرستار اور دینِ حق اسلام کے معلم اور رہنما تھے۔

کعبہ کے علاوہ عرب کے مختلف خطوں میں بہت سے بت نصب تھے ان میں بعض مشہور بت یہ ہیں:۔

۱۔ ہبل یہ قریش کا سب سے بڑا معبود (مہادیو) تھا۔ یہ سرخ رنگ کے عقیق تھا۔ قریش کو کہیں پڑا ہوا مل گیا تھا، ایک ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا، قریش نے سونے کا ہاتھ لگوا دیا تھا۔ یہ خاص کعبہ میں نصب تھا۔ قریش جنگ میں اسی کے نام کا نعرہ لگاتے تھے۔ مہا پنڈت راہل سانکرتیاین نے اپنی کتاب "اسلام دھرم کی روپ ریکھا" میں سنگ اسود کو مکیشور لکھ دیا ہے یعنی خدائے مکہ جو بالکل غلط ہے۔ البتہ اسلام سے پہلے ہبل مکیشور یا خدائے مکہ مانا جاتا تھا، لیکن اسلام نے اسے نیست و نابود کر دیا

۲۔ لات۔ یہ گول سفید پتھر تھا، اس پر عمارت بنی ہوئی تھی۔

۳۔ عُزّیٰ۔ ایک درخت، اس کے نیچے ایک بُت تھا۔ چاروں طرف چہار دیواری تھی۔

۴۔ مناۃ۔ پتھر کی ایک چٹان تھی۔

۵۔ وَدّ۔ انسانی صورت کا ایک دراز قد بت تھا، ایک تہمد کمر سے لپیٹے ایک چادر اوڑھے گلے میں

تلوار حمائل تھی، کمان بھی لٹکی ہوئی تھی۔ ایک طرف ترکش پڑا ہوا تھا سامنے نیزہ تھا جس میں جھنڈا بندھا ہوا تھا، جبار ستارے کی بھی تقریباً یہی شکل بتائی گئی ہے۔

۶۔ سواع۔ اس کی شکل عورت کی تھی۔ یہ قبیلہ ہذیل کا دیوتا تھا۔

۷۔ یغوث، اس کی شکل شیر کی تھی۔

۸۔ یعوق، اس کی شکل گھوڑے کی تھی

۹۔ نسر، اس کی شکل پرندے کی تھی۔ نسر کے معنی گدھ کے ہیں۔

۱۰۔ اساف

۱۱۔ نائلہ

۱۲۔ مناۃ

آخر کے تینوں بت مکہ میں نصب تھے۔ لات، منات، عُزّیٰ یہ سب دیویاں مانی جاتی تھیں۔ ان خاص بتوں کے علاوہ اہل عرب اپنی پسند کا جو پتھر بھی پاتے اسے دیوتا بنا کر پوجنے لگتے اور اگر اس سے اچھا پتھر مل جاتا تو پہلے والے کو پھینک دیتے، اسی دوسرے کو دیوتا بنا لیتے، اگر کہیں ان کو کوئی بت نہ ملتا اور کوئی پتھر بھی دستیاب نہ ہوتا تو مٹی کا گولہ بنا کر اس پر بکری کا دودھ ڈالتے اور اس طرح دیوتا بنا لیتے۔

اہل عرب ان پتھر اور مٹی کے بتوں کے علاوہ فرشتوں، جنوں اور بھوت پریت کو بھی پوجتے تھے۔ عربوں کو ایک خدا کے نام سے چڑ تھی، وہ قرآن میں ایک خدا کا ذکر سنتے تو ان کو بڑی کڑھن ہوتی، وہ نفرت کے ساتھ منہ پھیر لیتے اور وہاں سے چلے جاتے۔ وہ خدا کے منکر نہ تھے، خدا کو مانتے تھے اور یہ بھی مانتے تھے کہ وہ سب سے بڑا ہے یہ بھی مانتے تھے کہ اس نے آسمان و زمین اور ساری کائنات کو پیدا کیا ہے، لیکن اس کے باوجود بت پرستی کے چکر میں پڑ کر عملاً خدا سے بہت دور جا پڑے تھے، وہ ڈرتے تھے تو بتوں سے، امیدیں رکھتے تھے تو بتوں سے، منتیں مانتے تھے تو بتوں کی، نذریں دیتے تھے تو بتوں کو، پوجا بندگی کرتے تھے تو بتوں کی، خدا کو محض نام کے لیے مانتے تھے، البتہ جب وہ کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہوتے اور سارے دیوی دیوتاؤں سے ناامید ہو جاتے تو ایک ہی خدا سے فریاد کرتے، اور جب مصیبت دور ہو جاتی تو پھر خدا کو بھول جاتے۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ عربوں نے اپنی اس حد سے بڑھی ہوئی بت پرستی کے زمانے میں بھی سنگ اسود کو نہ دیوتا مانا اور کبھی اس کی پوجا کی جس کے متعلق ہندوستان میں مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ شیو [illegible]

اور آج تک اس کی پوجا ہوتی ہے۔ وہ تو پتھر کی ایک سل ہے جو کعبہ کی دیوار میں لگی ہوئی ہے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ گول یا لمبا پتھر ہو۔

سماجی اور اخلاقی حالت

کوئی قوم ہو، بڑی ہو یا چھوٹی، متمدن ہو یا غیر متمدن، جب اس کی مذہبی حالت خراب ہو تو اس کی سماجی اور اخلاقی حالت بھی بگڑ جاتی ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں کی سماجی اور اخلاقی حالت یہ تھی:۔

۱۔ شراب خواری عام تھی، شراب کا پینا پلانا فیاضی کا ذریعہ خیال کیا جاتا۔ ہر طبقے کے لوگ شراب پیتے تھے۔

۲۔ شراب کی طرح جوا بھی عام تھا اور وہ بھی سخاوت و فیاضی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ کئی کئی اونٹ ایک ساتھ ذبح کر کے ان کا گوشت دس حصوں پر تقسیم کر دیا جاتا۔ دس تیر تھے جن کے الگ الگ نام اور حصے مقرر تھے، کچھ تیر بے حصے کے تھے۔ ایک شخص جو دیانتدار سمجھا جاتا ان تیروں کو ایک تھیلے میں ڈال کر ملا جلا دیتا اور ایک ایک شخص کا نام لے کر ایک ایک تیر نکالتا۔ جتنے حصے کا تیر جس کے نام نکلتا وہ اتنے حصے کے گوشت کا حق دار سمجھا جاتا، جس شخص کے نام خالی تیر نکلتا اسے اونٹوں کی قیمت ادا کرنی پڑتی، جیتنے والے اپنے حصے کا گوشت خود نہ کھاتے، محتاجوں کو تقسیم کر دیتے اس لیے یہ جوا فیاضی کی علامت سمجھا جاتا تھا، جو لوگ جوا نہ کھیلتے وہ سماج میں بخیل اور ذلیل سمجھے جاتے، لوگ ان سے رشتہ اور قرابت داری پسند نہ کرتے۔

۳۔ سود خواری۔ اس کے متعدد طریقے تھے، ایک طریقہ یہ تھا کہ مقررہ مدت کے لیے ایک رقم سود پر دیتے، وہ رقم وقت پر ادا نہ ہوتی تو اسے دگنا کر دیتے، مثلاً سو کا دو سو، پھر اس کی مدت مقرر ہوتی اور اس مدت پر دو سو ادا نہ ہوتے وہ چار سو ہو جاتے۔ طائف کے مشرک، مدینہ کے یہودی اور نجران کے عیسائی بڑے پیمانے پر سودی کاروبار کرتے تھے۔

۴۔ اہل عرب کی کوئی حکومت نہ تھی، قبیلوں کے سردار ہی مقدمے فیصل کیا کرتے تھے، وہ رشوت لیتے اور غلط فیصلے کرتے۔

۵۔ بدکاری۔ اس کے کئی طریقے رائج تھے۔ کچھ لوگ لونڈیوں سے پیشہ کراتے تھے اور اس کمائی کو کھایا کرتے تھے۔ کم درجہ کے لوگ اپنی بیویوں کو حیض کے بعد شرفا کے یہاں بھیج دیتے تاکہ ان سے شریف اولاد پیدا ہو۔ اس درمیان میں خود بیوی سے علیحدہ رہتے۔ جب وہ حاملہ ہو جاتی تو اس سے اپنا تعلق قائم کر لیتے۔

ایک عورت کئی کئی مردوں سے ایک ساتھ تعلق رکھتی، جن کی تعداد دس سے کم ہوتی۔ اس کے بچہ پیدا ہوتا

تو وہ محلے کے تمام مردوں کو جمع کرتی اور ان کو آنا پڑتا، وہ بچے کو جس کا بتاتی وہ اسی کی اولاد قرار پاتا اور اس کی کفالت اس کے ذمے ہوتی۔

ایک طبقہ ایسی پیشہ ور عورتوں کا تھا جن کے دروازوں پر جھنڈیاں لگی ہوتیں جو اس بات کی علامت تھیں کہ ان کے یہاں جو چاہے آزادانہ جا آ سکتا ہے۔ ان کی اولاد کا فیصلہ اس طرح ہوتا کہ عورت اپنے آشناؤں کو جمع کرتی اور قیافہ شناس ان میں سے بچے کو جس کی اولاد قرار دیتے اس بچے کو اپنی اولاد ماننا پڑتا۔

بیویوں کے تبادلے کا بھی رواج تھا۔ ان سب شرمناک اور ناجائز طریقوں کے ساتھ شادی بیاہ کا جائز اور شریفانہ طریقہ بھی رائج تھا جسے اسلام نے بھی جائز رکھا۔

اہل عرب ہمیشہ جنگ و جدال کرتے رہتے تھے اس لیے وہ بڑے ہی سنگدل ہو گئے تھے۔ دشمن کے بچوں پر بھی رحم نہ کرتے۔ ان کو بھی بڑی سنگدلی سے ہلاک کر دیتے۔ دشمن کو باندھ کر تیروں کا نشانہ بناتے اور تلوار سے بھی کام لیتے۔ انتقام کے جوش میں مقتول کے اعضا کاٹ ڈالتے، سزا اس طرح دیتے کہ درخت کی دو ڈالیوں کو جھکا کر دونوں ڈالیوں میں انسان کے اعضا باندھ دیتے اور ڈالیوں کو چھوڑ دیتے، ان کے جھٹکے سے بدن بیچ سے چر جاتا، عورت کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر اسے سرپٹ دوڑا دیتے جس سے جسم کے ٹکڑے اڑ جاتے۔

جانوروں کے ساتھ بھی بڑی بے رحمی کا سلوک کرتے، زندہ اونٹوں کی کوہان اور زندہ دنبوں کی چکی کاٹ کر کھاتے، قحط کے زمانے میں کچھ خاص قسم کی گھاس کے گٹھے گائے کے دم میں باندھ کر اس میں آگ لگا دیتے اور اسے پہاڑ پر دوڑاتے اور بارش کی دعا مانگتے۔ جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا تو اس کی اونٹنی یا اونٹ کی گردن کو اس کی دم کی طرف الٹ دیتے، اور اس کو ایک گڑھے میں ڈال کر اس کا دانہ پانی بند کر دیتے اور اسی حالت میں اسے مار ڈالتے۔ بعض لوگ مرنے کے بعد اسے جلا دیتے اور بعض کھال کھینچ کر اس میں بھس بھر دیتے۔

اہل عرب انتقام لینے میں بڑے سخت تھے، مقتول کا انتقام لینا ایک فرض بن گیا تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے اس کی روح پرندہ بن کر چلاتی رہتی ہے کہ "مجھ کو پلاؤ، میں پیاسی ہوں"۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ جب تک خون کا بدلہ نہیں لیا جاتا مقتول کی قبر میں اندھیرا رہتا ہے۔ ان عقیدوں کا نتیجہ یہ تھا کہ مقتول کے ورثہ جب تک خون کا بدلہ نہ لیتے شراب پیتے، نہ خوشبو لگاتے اور نہ عورتوں کے پاس جاتے۔ اگر وہ خون کا بدلہ نہ لے سکتے تو اپنی اولاد کو اس کے لیے وصیت کر جاتے اور وہ موقع پاکر وہ بدلہ لیتے۔ چوری اور ڈکیتی تو عرب کا ایک عام پیشہ تھی، دن کو قافلوں پر حملہ کرتے اور رات کو بستیوں پر شبخون مار کر لوٹ لیتے۔

یہ تھا اس زمانے کا عرب کہ جہاں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھیک ایسے زمانے میں مبعوث ہوئے تھے زمانہ میں شری کرشن جی نے اوتار لینے کا ہونا بیان کیا ہے، ذرا عرب کی بد دینی اور ادھرم کا اندازہ کیجیے۔ کتنا برا ماحول تھا اور ایسی قوم کو راہ راست پر لانا، اس کی اصلاح کرنا اور اس میں دین قائم کرنا کتنا مشکل کام تھا؟ پھر یہ بھی دیکھیے کہ بد دینی و بداخلاقی اور وحشت و بربریت کہاں زیادہ تھی۔ ہندوستان میں یا عرب میں؟ پھر ہندوستان میں حکومت تھی، تمدن تھا، علم تھا، وید اور شاستر تھے، علما اور فلاسفر تھے۔ ہندوستان کے برعکس عرب میں طوائف الملوکی تھی، نہ حکومت تھی، نہ تمدن تھا، نہ علم تھا، نہ کوئی مذہبی و اخلاقی تعلیم و ہدایت تھی، نہ مکتب اور مدرسے تھے، عرب اُمّی تھے، قریش جیسے معزز و ممتاز قبیلے میں بھی چند اشخاص معمولی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، خود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حروف شناس تک نہ تھے۔

اصلاح و انقلاب

ایسے ملک اور ایسی قوم میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امیت کے باوجود قرآن مجید جیسی کتاب پیش کی جو اپنے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت آپ ہے۔ جس کے خدائی صحیفہ ہونے کا انکار تو کیا گیا اور آج بھی کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے لیکن اس کے خدائی کتاب ہونے کے دعوے کا بدلائل رد نہ کیا جا سکا اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب نے عرب کی کایا پلٹ دی، ان کی ایسی ہمہ جہتی اور ہمہ گیر اصلاح کی اور ایسا عظیم الشان انقلاب کیا جس کی مثال تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ عرب کا مذہبی اخلاقی اور معاشرتی نقشہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کیا تھا اور اب دیکھیے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت سے وہی عرب کیا سے کیا ہو گیا۔

۱۔ عرب سے بت پرستی، توہم پرستی اور مخلوق پرستی کا نام مٹ گیا۔ کعبہ بتوں سے پاک ہو کر پھر توحید الٰہی کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و ہدایت کا مرکز بن گیا۔ اہل عرب جو اپنے بتوں کے ذکر کے بغیر خدائے واحد کا ذکر سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے، توحید الٰہی کے داعی اور معلم بن گئے۔

۲۔ ایک گندے اور انتہا سے زیادہ گرے ہوئے معاشرے کی جگہ ایک پاکیزہ اور معیاری معاشرہ وجود میں آگیا جس میں نہ شراب خواری تھی، نہ جوا تھا، نہ سودی کاروبار تھا اور نہ زنا اور فسق و فجور تھا، نہ خیانت و بددیانتی تھی، نہ بدمعاملگی اور نہ جھوٹی مقدمہ بازی اور نہ اس طرح کی کوئی اور خرابی۔ وہ ہر پہلو اور ہر اعتبار سے ایک آدرش سماج تھا۔ یہ اصلاح اور تبدیلی محض قانون کے زور سے نہیں ہوئی اور نہ ہوا کرتی ہے۔ [illegible] خدا کے

عقیدے، خدا کی طاعت و عبادت، اس کی محبت، اس کے خوف اور اس کی جزا و سزا دہی کے یقین کے ذریعہ لوگوں میں پاکیزہ اور بلند اخلاق پیدا کیا گیا اس کے بعد اخلاق کے تحفظ کے لیے قانون دیا گیا تاکہ وہ صدق دلی اور خلوص کے ساتھ قانون کی پابندی کر سکیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کو ایک ایسا جامع اور پاکیزہ نظام زندگی دیا گیا جو اعلیٰ انسانیت اور پاکیزہ اعمال و اخلاق کا سرچشمہ ہے جس کے پاکیزہ اور بلند اخلاق پیدا ہوتا ہے اور قائم و برقرار بھی رہتا ہے

۳ - وہی عرب جو قبیلوں قبیلوں میں تقسیم تھا اور جس کے ہر قبیلے کا سردار ہی حاکم، فرماں روا، مقنن اور جج سب کچھ ہوتا تھا ایک ایسی زبردست سلطنت میں تبدیل ہو گیا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے شام اور مصر سے روم جیسی وقت کی عظیم سلطنت کو بے دخل کر دیا اور وقت کی دوسری عظیم سلطنت ایران کا تختہ الٹ دیا۔

یہ انقلاب کیسے زمانے میں ہوا اور یہ انقلاب کس نوعیت کا تھا؟ یہ چیز بھی جاننے اور غور کرنے کے لائق ہے دنیا جمہوریت کے نام سے ناآشنا تھی، ساری دنیا میں شخصی اور خاندانی حکومتیں قائم تھیں۔ سلاطین اور راجا مہاراجہ ارضی خدا مانے جاتے تھے، یا خدا کے نمائندے، مٹھی بھر حکمراں طبقہ اور اس کے درباری اور حکام حکومت و فرمانروائی اور دولت و ثروت کے مزے لوٹتے تھے اور عوام انتہائی تباہ اور مفلوک الحال تھے، لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ اف کرے اور حکمراں طبقہ کے خلاف زبان کھولے، یہی نہیں عوام کا عقیدہ سا بن گیا تھا کہ بادشاہ اور راجہ کو حق ہے کہ وہ کر و فر، شان و شوکت اور عیش و عشرت کی زندگی گذارے اور عوام کا فرض ہے کہ ان کو جس حال میں رکھے رہیں اس کے خلاف لب کشائی نہ کریں، وہ انسان ہوتے ہوئے بھی دیوتا کی حیثیت رکھتا تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو ایک ایسا نظام حکومت دیا جس سے وہ واقف نہ تھی اس نظام کی رو سے شخصی حکومت و ریاست کا یکسر خاتمہ ہو گیا، نہ شاہی رہی اور نہ شاہی تاج و تخت رہے اس نظام حکومت کے ماننے والے حکومت میں برابر کے حصہ دار قرار دیے گئے اور فرائض حکومت انجام دینے کے لیے خلافت اور خلیفہ کے انتخاب کا طریقہ رائج کیا گیا یعنی قوم کے اہل علم اور اہل الرائے قوم میں سے جس شخص کو سب سے زیادہ خدا ترس، نیک سیرت اور صاحب استعداد سمجھ کر خلیفہ منتخب کریں وہ قوم کے اہل علم اور ذی فہم طبقہ کے مشورہ سے خلافت کے فرائض انجام دے۔ دستور حکومت وہ رکھا گیا جو خدا کے نازل کردہ اوامر و احکام پر مبنی ہو، اور قوانین خلیفہ اور عوام کے لیے یکساں رکھے گئے اور عوام کو خلیفہ پر جائز تنقید کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔

یہ دنیا کا پہلا دستور اور پہلا نظام حکومت تھا جس نے عوام کو اس آزادی کی نعمت سے بہرہ ور کیا جس کا زمانے نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا اور وہ حکومت اس دستور و نظام کا اولین عملی نمونہ تھی جو خلافت راشدہ کے

سے مشہور ہے۔ اس نظام پر مبنی خلافت راشدہ نے شام، مصر، ایران و عراق کے عوام کے پیروں میں پڑی ہوئی انسانی بیت و غلامی کی زنجیر کو کاٹ کر پھینک دیا اور انسان انسان کی محکومیت و غلامی سے آزاد ہو گیا۔ ان خلفاء نے انسان کا وہ نمونہ پیش کیا جس کی مثال کتھا کہانیوں میں ہو تو ہو مگر تاریخ کے صفحات میں موجود نہیں۔ یہ خلفاء بیک وقت حکمران و فرماں روا بھی تھے اور زاہد و درویش بھی۔ انھوں نے اپنے لیے معمولی درجے کا امتیازی ایوان حکومت بھی نہ بنایا۔ مسجد میں کھجور کی چٹائی پر بیٹھ کر خلافت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ معمولی غذا کھاتے تھے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور اسی لباس میں مسجد کے فرش پر بیٹھ کر حکومتوں اور سلطنتوں کے سفیروں سے ملاقات کرتے تھے۔ ان سے زیادہ خوش حالی اور راحت و آسائش کی زندگی عوام گزارتے تھے۔ وہ دن کو تو فرائض خلافت انجام دیتے ہی تھے راتوں کو بھی بہت کم آرام کرتے تھے۔ راتوں کو گشت کر کے عوام کی خبر گیری کرتے اور جو ضرورتمند کے علم میں آجاتا اس کی ضرورت پوری کرتے۔ اس کے علاوہ وہ راتوں کو جاگ کر خدا کی عبادت کرتے اور اس کے سامنے روتے گڑگڑاتے۔

ان خلفاء پر عوام میں سے کوئی تنقید کرتا تو وہ اس کی تنقید کا خیر مقدم کرتے اور ان کی کسی رائے یا عمل میں کوئی معمولی سی خامی بھی ہوتی تو بڑی خوش دلی سے اس کی اصلاح کر لیتے۔ اگر ان پر عوام میں سے کوئی دعویٰ کرتا تو وہ جواب دہی کے لیے مدعی کی حیثیت سے بذات خود عدالت میں جاتے اور وہاں اپنے لیے کسی طرح کے امتیاز یا رعایت کے نہ صرف خواہشمند نہ ہوتے بلکہ اس کو ناجائز سمجھتے۔ ان کی عدالت کے جج بھی ایسے تھے کہ مدعی برسر حق ہوتا تو وہ خلیفہ کی کوئی رعایت روا رکھے بغیر مدعی کے حق میں فیصلہ صادر کر دیتے اور خلیفہ جج کی تحسین اور اس کی قدر افزائی کرتے۔

اس خلافت کے سپاہی اور سپہ سالار ایسے ہوتے کہ غیر جنگجو بستی پر ہاتھ بھی نہ اٹھاتے۔ لوگوں کی اجازت کے بغیر ان کے درخت سے مسواک کی ٹہنی چھونا بھی جائز نہ سمجھتے۔ جہاں کے باشندے بھی ان کی اطاعت و حفاظت میں آجاتے بلا تفریق قوم و مذہب وہ ان کی جان و مال، آبرو اور مذہبی مقامات کی حفاظت کرنا اپنا دینی فرض تصور کرتے۔ وہ دن کو میدان جنگ میں مقابلہ و محاربہ کرتے اور رات کو جب دشمن سپاہی اور سپہ سالار اپنے کیمپوں میں شراب پی کر رنگ رلیاں مناتے ہوتے، وہ مصلے پر کھڑے نماز پڑھتے اور خدا کے سامنے گریہ وزاری کرنے میں مصروف ہوتے۔ ان کی نیک کرداری اور خدا پرستی کے ان کے دشمن بھی قائل تھے۔ قیصر روم نے شام میں مسلمانوں کے بالمقابل اپنی فوج کو مسلسل و متواتر شکست کھاتے دیکھ کر ایک جنگ میں اپنی پوری طاقت جھونک دی، لیکن رومیوں کو پھر شکست

ہوگئی، اس پر قیصر روم نے اپنے سپہ سالاروں کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔ آخر کیا بات ہے کہ تم اس جنگ میں بھی شکست کھا گئے حالانکہ تم مسلمانوں سے پانچ گنا زیادہ تھے اور اسلحہ اور سامان جنگ میں ان پر کہیں فوقیت رکھتے تھے، جواب میں ایک بوڑھے سپہ سالار نے کہا مسلمانوں کی فتح اور ہماری شکست کی وجہ یہ ہے کہ ہماری سپاہ انتہائی بداخلاق ہے اور مسلمان اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں، ہماری فوج رات بھر شراب پیتی اور عیاشی کرتی ہے، مسلمان رات بھر نماز پڑھتے ہیں، ہماری فوج جس راستے سے گزرتی ہے اپنی ہی رعایا کو لوٹتی اور عورتوں کی عصمت دری کرتی چلتی ہے، مسلمان سپاہی نہ کسی کی چیز کو ہاتھ لگاتے ہیں اور نہ کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھاکر دیکھتے ہیں، ایسی فوج کو ہماری فوج کیونکر شکست دے سکتی ہے۔

اسلامی معاشرہ اتنا خداپرست، خداترس ہوگیا تھا اور اتنا سدھر سنور گیا تھا کہ اس میں جرائم کا ارتکاب نفی کے درجے تک کم ہوگیا تھا۔ عدالتوں میں بہت کم مقدمے آتے تھے اور جو مقدمے آتے بھی تھے وہ عموماً معمولی درجے کے ہوتے تھے، گویا لوگوں پر ایک اخلاقی کنٹرول قائم ہوگیا تھا اور یہ نتیجہ تھا اس تعلیم کا جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دی تھی اور ثمرہ تھا اس تربیت کا جو آں حضرت نے ان کی فرمائی تھی۔

ہم نہیں چاہتے کہ شری کرشن اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا مقابلہ کریں یا ان مذہبی اور اصلاحی کارناموں کا مقابلہ کریں جو کرشن جی اور آں حضرتؐ نے انجام دیے، ہم اس کو اپنے ہندو بھائیوں ہی پر چھوڑتے ہیں، ہم اس پر بھی کوئی بحث نہ کریں گے کہ بد دینی کہاں زیادہ تھی، اور کہاں اپنی بہترین صورت میں دین قائم ہوا، ہم نے جتنا لکھ دیا ہے وہ اس بات کے سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ ہم اپنے ہندو بھائیوں سے صرف اس بات پر غور کرنے کی درخواست کریں گے اگر دھرم قائم کرنے پر شری کرشن جی کو اوتار مانا جائے تو شری کرشن جی کے دل کے مطابق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا مانا جائے گا؟ صاف بات تو یہی ہے کہ ان کو بھی اوتار ماننا پڑے گا، لیکن آپ کو اوتار ماننا خود آپ کی تعلیم کے خلاف ہوگا، پھر کیا یہ صورت نہیں ہے کہ عقیدۂ اوتار کو عقیدۂ رسالت ہی کی بدلی ہوئی صورت مانا جائے؟ تاریخ گواہ ہے کہ جس مقصد سے اوتاروں کا ہونا بتایا جاتا ہے انبیاء و مرسلین بھی اسی مقصد سے مبعوث ہوئے، اور انھوں نے بھی یہ کام کیا جو اوتاروں کا کام بتایا جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اوتاروں میں ایشور کا سب سے زیادہ انش یا جزو ہوتا ہے تو یہ ایک طرز تعبیر ہے، دونوں زمینوں کو بھی خدا سے خاص قرب و تعلق ہوتا ہے، ایسا قرب و تعلق جو ان کے سوا کسی انسان کو نہیں ہوتا، کوئی انسان ایشور کی طاقت اور اس کی دوسری صفات کا مظہر تو ہوسکتا ہے لیکن ایشور کا انش اور جزو نہیں ہوسکتا۔

ایشور کوئی ایسی چیز نہیں جس کے حصے بخرے کیے جاسکیں، اس کی ذات اس سے پاک ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ دھرم وہی ہے جس کی بنیاد وید پر ہو تو یہ انسانیت کے ساتھ ایک زیادتی اور بہت بڑی بھول ہوگی، ساری دنیا ایشور کی ہے۔ تمام انسان اسی کی مخلوق اور اسی کے بندے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایشور اپنی شکچھا کے لیے کسی ایک قوم کو خاص کر لے، اس کی طرف سے تعلیم و ہدایت ملے تو اسی خاص قوم کو، وہ ایشور اوتار بھی لے تو اسی سرزمین پر جس پر وہ خاص قوم بستی ہو، ایسی صورت میں تو ایشور ساری انسانیت اور ساری دنیا کا ایشور نہ رہ کر اسی خاص قوم کا ایشور بن جائے گا۔ یہ بات تاریخ کے بھی خلاف ہے، نیک اور بد انسان ہر ملک اور ہر قوم میں ہوئے یعنی ہر ملک اور ہر قوم میں دھرم بھی رہا اور ادھرم بھی، حق بھی رہا اور باطل بھی۔ انصاف بھی رہا اور ظلم بھی۔ ایشور کو ماننے والے بھی ہر ملک اور ہر قوم میں رہے اور ایشور کو نہ ماننے والے بھی۔ اس کے فرماں بردار اور بھکت بھی ہر ملک اور ہر قوم میں رہے اور اس کے نافرمان اور باغی بھی، ہر ملک اور ہر قوم میں ایسے انسان بھی ہوئے جنھوں نے خدا پرستی اور نیکی کو قائم و برپا کرنے کے لیے خدا کے منکروں اور بدکاروں سے کشمکش اور جنگ کی اور انھوں نے حق پرستی اور نیکی کو قائم کیا اور کفر و ناستکتا اور بدی کو مٹایا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیں دھرم اور ادھرم اسی طرح ہر ملک اور ہر قوم میں نظر آتا ہے جس طرح ہندوستان میں اور دھرماتما اور ادھرمی بھی ہر ملک اور ہر قوم میں نظر آتے ہیں۔ اس لیے دھرم اور ادھرم اور خدائی تعلیم و ہدایت اور خدا کی طرف سے آنے والے ہادیان و معلمین کو ہندوستان کے ساتھ خاص کرنا عقل و نقل اور حق و انصاف کسی پہلو سے بھی درست نہیں ہو سکتا، دھرم اور ادھرم صحت و بیماری کی طرح انسانوں کے ساتھ رہنے والی چیز ہے چاہے وہ کسی ملک اور قوم کے انسان ہوں اور خدائی تعلیم و ہدایت تمام انسانوں کے لیے ایسی ضروری ہے جیسے سورج کی دھوپ، چاندنی، روشنی اور ہوا پانی

عربوں کے دیوی دیوتاؤں کے بارے میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ نہ ان کی کوئی کتھا تھی اور نہ ان کے متعلق کوئی پران تھا۔ نفع و نقصان کے کچھ تصورات تھے جو ان کے بارے میں عربوں نے قائم کر لیے تھے اور انھیں کی بنا پر ان کو پوجتے تھے۔ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر تو وہ بت تھے جن کو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے مشرک پوجتے تھے، نہ جانے وہ عربوں کے کیسے دیوی دیوتا بن گئے تھے۔ ہندوستانی دیوی دیوتاؤں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ (باقی آئندہ)

قرآن مجید کی حیرت انگیز جامعیت

(جناب محمد فاروق صاحب)

قرآن کی جامعیت

قرآن ایک جامع اور مکمل کتاب ہے۔ قرآن کی آیتوں میں معنی و مفہوم کے لحاظ سے اتنی وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے کہ ہمارے تجربات اور زمانہ کی علمی سطح کی بلندی کے ساتھ ان میں بھی پھیلاؤ پیدا ہوتا رہے گا۔ قرآن کے الفاظ زمانہ کی ترقی کا ساتھ دیتے رہیں گے۔

قرآن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک زندہ آواز (Strong Living voice) ہے اس کی پکار فطرت کی مضطرب صدا ہے جس کی تکذیب ممکن نہیں۔ قرآن اس علیم و خبیر خدا کا کلام ہے جس کے دائرۂ علم سے کوئی چیز باہر نہیں ہو سکتی۔ قرآن بنی نوع انسان کے لیے دائمی نصاب ہے۔ اس سے ہر طبقہ اور ہر دور کے لوگ اپنی ذہنی و فکری سطح اور اپنی معلومات کے لحاظ سے ہدایت پاتے رہیں گے۔ علامہ ابن الحاج اپنی کتاب "مدخل" میں لکھتے ہیں:۔

قال علیہ الصلوٰۃ والسلام فی القرآن لا تنقضی عجائبہ ولا یخلق علی کثرۃ الرد فعجائب القرآن الی یوم القیامۃ فکل قرن لابد لہ ان یاخذ منہ فوائد جمۃ خصہ اللہ تعالیٰ بہا

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کے باب میں فرمایا کہ "اس کے عجائب ختم نہ ہوں گے اور وہ بار بار دہرانے سے پرانا نہ ہوگا" پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے کے نہیں ہیں اس لیے ہر دور کے لوگوں کا فرض ہے کہ اس سے کثیر فوائد جو ان کے حصہ میں آئے ہیں حاصل کریں

قرآن سے ہر شخص اپنی ذہنی سطح اور علمی وسعت اور بلندی کے مطابق فائدہ اٹھا سکتا ہے نصیحت اور ہدایت

یہ خدا نے اس کتاب کو ہر فرد بشر کے لیے آسان کر دیا ہے :-

يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ — ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے

قرآن مجید کی کچھ آیتوں میں احکام و شرائع بیان ہوئے ہیں ۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ — اے ایمان والو! جب نماز کے لیے
إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ — کھڑے ہو تو اپنے چہروں کو دھو و اور کہنیوں
وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ — تک اپنے ہاتھوں کو بھی ۔

اس طرح کی آیتوں کا ایک متعین مفہوم ذہن میں آتا ہے البتہ احکام غامضہ میں اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے ہر شخص کا فہم کافی نہیں ہو سکتا۔

قرآن کی وہ آیتیں جن کے اندر حقائق و شواہد کائنات کا ذکر ہے یا وہ آیتیں جن میں قرآنی احکام کی حکمت و غایت کی طرف اشارے کیے گئے ہیں ان کا انداز بیان ایسا اختیار فرمایا گیا ہے کہ علم و تحقیق کی سطح جوں جوں بلند ہوتی جائے گی ان کے مفہوم و مطالب کی گہرائیوں اور وسعتوں کا احساس بڑھتا جائے گا ۔

قرآنی آیات کی جامعیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ان آیتوں کی حیثیت بھی قرآن میں محض تاریخی نہیں ہے جنھیں علماء نے منسوخ قرار دیا ہے ۔ ان کی افادیت اب بھی باقی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے تطبیق سے کام لیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ قرآن میں صرف گنتی کی چند آیتیں ہیں جنھیں منسوخ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ قرآن ناسخ و منسوخ آیتوں سے بالکل خالی ہے ۔ قرآن میں احکام و شرائع کے لحاظ سے بھی دو مختلف باتیں نہیں بیان نہیں ہوئی ہیں ۔ احکام و شرائع کا نزول تدریجی طور پر یقیناً ہوا ہے ان میں باہم کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں ہے ۔ گویا قرآن کا یہ ارشاد ہر پہلو سے درست ہے کہ

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ — اور اگر یہ (قرآن) خدا کے علاوہ کسی
لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا — دوسرے کی جانب سے ہوتا تو اس
كَثِيرًا (۴ : ۸۲) — میں بکثرت اختلاف پاتے

قرآن ہمیں غور و فکر کی تعلیم دیتا ہے۔[ف] قرآن قوانین فطرت کی بیاض ہے ۔ اس میں فطرت انسانی کا بڑی حد تک عکس ملتا ہے۔ قرآن کے اندر جس نفسیاتی بصیرت کی کارفرمائی نظر آتی ہے اس کے اندر حیرت انگیز

ف حاشیہ صفحہ پر ہے

نیا پن اور تنوع پایا جاتا ہے۔ اس سے جو پائیدار سرور و طمانیت انسان کے دل و دماغ کو حاصل ہوتی ہے اس کی مثال کسی اور کلام میں نہیں ملتی۔ قرآن کی آیتیں عظیم رفعتوں کی حامل ہیں۔ ان سے آسودہ ہو کر بھی ہم آسودہ نہیں ہو سکتے۔ قرآن ہمیں سیرابی ہی عطا نہیں کرتا تشنگی بھی اس کی بخشش ہے۔ اس کی بخشی ہوئی سیرابی ہماری طمانیت کا سبب ہے اور اس کی عطا کردہ تشنگی سے ہمارے اندر "مزید" کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے: "سنے ہوئے نغمے شیریں معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں وہ شیرینی کہاں جو ان نغموں میں پائی جاتی ہے جو ابھی پردۂ ساز میں مستور ہیں۔" ہمارے محدود ذہن کے اندر اتنی سمائی نہیں کہ وہ لامحدود دانائیوں اور حکمتوں کا احاطہ کر سکے البتہ ذہنی و فکری ارتقاء کی راہ ہمارے لیے بند نہیں ہے۔ اگر ہم قرآن میں فکر و تدبر سے کام لیتے رہیں تو وہ ہمارے دل و دماغ کو تازگی بخشتا رہے گا۔[1]

آیتوں کا ربط و نظم

قرآن کی آیتیں اپنی جامعیت کی وجہ سے باہم مختلف پہلوؤں سے مربوط ہوتی ہیں۔ یہی خاص وجہ ہے کہ قرآن میں ہمیں اس طرح کا ربط و تسلسل نہیں ملتا جو ربط و نظم ہمیں انسانی کلام میں نظر آتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کی آیتیں باہم منظم اور سلسلہ وار ہیں لیکن ان کے ربط و نظم اور ترتیب میں جو محاسن، حکمت اور انفرادی شان پائی جاتی ہے وہ ہمیں کسی دوسرے کلام میں نہیں ملتی۔ آیتوں کا ایک نادر اسلوب کے ساتھ مرتب ہونا، قرآن کا ذاتی وصف ہے۔ قرآن میں ظاہری بے ربطی اور بے نظمی کا احساس درحقیقت ہماری حیرانی و سرگشتگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ حیرت و سرگشتگی ہی تھی جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے قرآن کے منظم کلام ہونے کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ آیتوں کے ربط و نظم کی نفی کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

"البتہ تناسب کی نفی کی جاتی مگر وہ بھی کسی دلیل سے متعین نہیں اجمالاً ایک دلیل سے ثابت ہے

---

[1] جو چیزیں غور و فکر سے سمجھ میں آنے کی ہوتی ہیں وہ اگر غور و فکر سے پہلے ہی بتا دی جائیں تو ان سے وہ فائدہ ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا جو غور و فکر کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی دماغی و ذہنی صلاحیتوں کی تربیت اور نشو و نما کا تقاضا بھی یہی تھا کہ انسان کو غور و فکر کی راہ پر لگایا جاتا۔ قرآن اپنے بیان کے اعتبار سے ایک جامع و بلیغ کلام ہے جس کلام میں فکر و تدبر سے کام لینا ناگزیر ہوتا ہے اس کے بغیر کلام کے مختلف پہلو اور گوشے ہمارے لیے کھل نہیں سکتے۔ قرآن میں فکر و تدبر سے کام لینے کی دعوت خود قرآن نے دی ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد: ۲۴) — تو کیا یہ لوگ فکر و تدبر سے کام نہیں لیتے یا ان کے دلوں پر قفل لگ گئے ہیں۔

جو وہ دلیل تلاوت کی ترتیب کا نزول کی ترتیب سے مختلف ہونا ہے۔ توقیفاً آیتوں کے مواقع بتلائے جاتے تھے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع سے خاص مناسبت ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔[1]

ایک دوسرے بزرگ کا ارشاد ہے :-

"قرآن مجید بیس سال سے کچھ زیادہ کی طویل مدت میں مختلف حالات کے لئے گوناگوں احکام لیکر نازل ہوا جس چیز کا نزول اس طرح ہوا ہو اس میں کسی قسم کا ربط و نظم نہیں ہو سکتا۔[2]

نظم آیات کے بارے میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے مولینا حمیدالدین فراہیؒ نے تحریر فرمایا ہے:

"شاہ ولی اللہ صاحب نے قرآن کو شاہی خطوط سے مشابہ مانا ہے جو مختلف احکام و ہدایات پر شامل ہو اور حسب ضرورت وقت مختلف ہدایت کی گئی ہو، مگر چونکہ عنوان نہیں لکھا گیا اس لیے منتشر معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت میں چونکہ لوگ واقف تھے کہ فلاں امور در پیش ہیں اس لیے ان کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام باتیں بالکل حسب موقع و ضرورت ہیں، مگر آج ان کا حسب موقع ہونا مخفی ہے۔ گویا شاہ صاحب ترتیب کو نہیں مانتے اور ضروری بھی نہیں سمجھتے۔ یہ خیال ایک حد تک بالکل ٹھیک ہے، لیکن یہ امر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ عنوان قائم کیا جائے اور وہی رکوع کی بنیاد ہو۔"[3]

مولانا فراہیؒ نظم آیات کے حامیوں اور مؤیدین میں سے ہیں۔ انھوں نے نظم کلام کو اپنی تفسیر کا بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود شاہ صاحبؒ کی ایک حد تک تائید فرماتے ہیں۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآنی آیات کے ربط و تسلسل میں ایک ایسی انفرادی شان پائی جاتی ہے جو دوسرے کلاموں میں نہیں ملتی۔

قرآن کی سورتیں خطبہ کے انداز میں نازل ہوئی ہیں۔ ان کا نزول تحریر کے انداز میں نہیں ہوا ہے۔ اس کا بھی قرآن کی آیتوں کے ربط و نظم پر کافی اثر پڑا ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آیتوں کے ربط و نظم کی انفرادیت میں اصل دخل قرآن کی حیرت انگیز جامعیت کو ہے۔ جامعیت کی وجہ سے جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں قرآن کی آیتیں اپنے

---

[1] ملفوظات مولانا اشرف علی تھانویؒ جلد ۳ ص ۱۴۲

[2] شیخ عز الدین بن عبدالسلام بحوالہ مقدمہ تفسیر نظام القرآن

[3] بحوالہ "الاصلاح" جلد اول ص ۱

قبل وما بعد کی آیتوں سے مختلف پہلو لیے ہوئے مربوط ہوتی ہیں۔ جس طرح قرآن کی آیتیں جامع ہیں اسی طرح ان کا ربط و نظم بھی جامعیت کا حامل ہے۔ اگر ہر آیت کا کوئی ایک ہی متعین پہلو ہوتا تو اس صورت میں آیتوں کا ربط و نظم بالکل واضح ہوتا۔ اور اس میں کسی قسم کے شبہہ کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

نظم قرآن کے اندر بہت سے قرآنی حقائق ودیعت ہیں۔ نظم کلام، کلام کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ قرآن میں نظم کلام سے بے پروائی آیات قرآنی کے مفہوم و مطالب کے ایک بڑے حصہ سے اپنے کو محروم رکھنے کے مترادف ہے۔ ربط و اتفاق اور تکمیل ہی تہذیب کا سنگ بنیاد ہیں۔ ان کی ضرورت سے انکار درحقیقت محاسن تہذیب کا انکار ہے۔

قرآن کا اسلوب بیان

قرآن ہماری زندگی کو پاکیزگی اور بالیدگی عطا کرنے کا ضامن ہے اس کے ذریعہ ہمارے دل و دماغ کے سارے مطالبات پورے ہوتے ہیں۔ اس میں قرآن کے دوسرے اوصاف کے علاوہ آیات قرآنی کی جامعیت کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ قرآن کی جامعیت میں جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے قرآن کے اپنے اسلوب بیان کا خاص دخل ہے۔ کنایہ و استعارہ اور تشبیہ و تمثیل کے علاوہ قلب، تقدیم و تاخیر، اخفار، اظہار، تعریض، افصاح، حذف، تکرار، خاص لفظ سے عام مراد لینا اور عام لفظ سے خاص مراد لینا۔ واحد کو جمع کے صیغہ میں خطاب کرنا اور جماعت کو واحد کے صیغہ میں۔۔۔ غرضیکہ بہت سے اسالیب ہیں جن میں قرآن کا نزول ہوا ہے۔ قرآنی مطالب کی وسعتوں کو سمجھنے کے لیے ان سب کا علم ضروری ہے۔

انگریزی میں ایک خاص طرز ادا ہے جسے (Suggestion.) کہتے ہیں۔ شاعر کبھی شعر میں ایک شعر کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ توجہ خود بخود ان باتوں کی طرف جا پڑتی ہے۔ شعر میں جنھیں سمیٹنا مقصود ہوتا ہے شعر پڑھتے ہی ذہن فطری طور پر ان باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے جنھیں ہمارے سامنے پیش کرنا شاعر کے پیش نظر ہوتا ہے۔ شاعر خیال کے ایک پہلو کو ہمارے سامنے لاتا ہے اور اس کے دوسرے پہلوؤں کی طرف صرف اشارہ کر کے گزر جاتا ہے اور یہ اشارہ بھی ایسا ہوتا ہے کہ نہ تو اس کا کوئی رخ متعین ہوتا ہے اور نہ کسی پہلو کی آخری حد تک نگاہ پہنچ پاتی ہے۔ خیال کی تصویر میں صرف وسعت ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ سامع کو اپنی قوت تخئیل سے کام لینے کا پورا موقع حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنی وسعت نظر اور ذوق طبیعت کے مطابق اس سے پورا لطف اٹھاتا ہے۔ شاعر کے پیش کردہ خاکہ میں رنگ بھرنے کا اسے موقع ملتا ہے۔ اس طرز ادا کو انگریزی میں

Suggestion کہتے ہیں۔ Suggestion کا مفہوم کنایہ سے زیادہ وسیع اور قوی ہوتا ہے اس طرز ادا میں کائنات، جذبات اور خیالات کے اتنے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لیتے ہیں جو صورت تفصیل میں ممکن نہ ہو سکتا۔ غالب کا ایک شعر ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

غالب نے اس شعر میں ناامیدی کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں خیال کے حدود قائم نہیں ہو سکے ہیں۔ یہاں تخیل کو بلند پروازی کا پورا موقع حاصل ہے۔ اپنی وسعت نظر اور ذوق طبیعت کے مطابق ہر شخص اس سے لطف اٹھا سکتا ہے یہاں ہمیں اپنی قوت تخیل سے کام لینے کا پورا موقع حاصل ہے۔

Suggestion کی جتنی کامیاب اور حیرت انگیز مثالیں قرآن میں ملتی ہیں، دنیا کے کسی ادب میں نہیں پائی جاتیں۔ قرآن کے بارے میں یہ بات محض عقیدت کی بنا پر نہیں کہی جا رہی ہے۔ جو شخص بھی اس پہلو سے قرآن پر غور کرے گا یہ حقیقت اس سے چھپی نہیں رہ سکتی کہ قرآن نہ صرف اپنے بیان کی پاکیزگی کے لحاظ سے بلکہ اپنی وسعت، گہرائی اور بلندی کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیں اپنی آیتوں پر فکر و تدبر کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ فکر کے بغیر آیتوں کے بہت سارے پہلو ہمارے سامنے نہیں آ پاتے۔ کتاب الٰہی کے نزول کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ اہل بصیرت کے لیے غور و فکر کا سامان مہیا ہو۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ	یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے تم پر
مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ	اس لیے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں
اُولُوا الْاَلْبَابِ	پر فکر و تدبر سے کام لیں اور تاکہ فہم و بصیرت
(۳۸: ۲۹)	رکھنے والے ان سے تذکیر حاصل کریں۔

برسبیل تذکرہ یہاں دو آیتیں نقل کی جا رہی ہیں۔ دیکھیے کس فطری اسلوب کے ساتھ قرآن ہمارے ذہن کو فکر و تدبر کی راہ پر لگاتا ہے۔

۱۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ	اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ
مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا	اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں
اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً	بنائیں تاکہ تمہیں ان کے پاس سکون و آرام
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	ملے اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی

يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿ پیدا کی۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں

اہل بصیرت کے لیے کیا نشانیاں ہیں؟ آیت میں اس کا تعین نہیں کیا گیا صرف سوچنے کے لیے کچھ بنیادیں فراہم کر دی گئی ہیں تاکہ آدمی خود اپنی قوت فکر سے کام لے اور ان بالا حقیقتوں کی زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل کرے جنکی طرف آیت میں مذکورہ بنیادی حقائق ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ نشانی کے بجائے آیت میں نشانیاں فرمایا گیا جس کی وجہ سے فکر کا دائرہ کار صد درجہ وسیع ہو گیا ہے

قرآن فکر و تدبر سے کام لینے کی انسانی ذہن کو تربیت دیتا ہے اور اس تربیت کا وہ صد درجہ اہتمام کرتا ہے۔ فکر و تدبر کی راہ سے آدمی استدلال کی دنیا سے نکل کر کشف کی فضا میں آجاتا ہے۔ اسے ایسا یقین مل جاتا ہے جو ہر طرح کے شک و ریب سے پاک ہوتا ہے۔ قرآن انسان سے جو کچھ منوانا چاہتا ہے علی وجہ البصیرۃ منوانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق کو صاف الفاظ میں بیان کرنے کے باوجود وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ آدمی ان تک فکر و تدبر کے ذریعہ بھی رسائی حاصل کرے۔ تاکہ حقیقتوں کو جاننے کے ساتھ ساتھ وہ انہیں پا بھی لے۔

۲۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي	اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات
الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ	کو پروان چڑھاتا ہے۔ اللہ ان کو پسند نہیں
كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿ (۲:۲۷۶)	کرتا جو ناشکرے اور بدعمل ہیں۔

اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو پروان چڑھاتا ہے" یہ ایک عظیم تر حقیقت کا اظہار ہے جس کی تفصیل کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے ذہن و فکر کو مصروف میں لائے۔

سود کی مضرتوں کو سورۂ روم میں بھی ایک جامع فقرہ میں سمیٹا گیا ہے:۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا	تم جو سود لوگوں کو دیتے ہو تاکہ وہ ان
فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ	کے اموال میں شامل ہو کر بڑھ جائے اللہ کے
اللّٰهِ (۳۰:۳۹)	نزدیک اس میں کوئی بڑھوتری نہیں ہوتی۔

یہاں بھی قرآن نے ہمیں فکر و تدبر کی دعوت دی ہے۔ قرآن کے نزدیک سود ہر اعتبار سے بے برکت ہے

خش ہے۔ اخلاقی اور روحانی نقطۂ نگاہ سے ہی نہیں بلکہ معاشی اور مادی نقطۂ نظر سے بھی اس سے کسی فلاح اور
کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ سود ترقی کی راہ میں مانع ہی نہیں بلکہ وہ سوسائٹی کے تنزل بلکہ ہلاکت کا موجب ہے۔
سائٹی کی دولت جب سمٹ سمٹ کر ایک محدود طبقہ کے پاس چلی آتی ہے تو غالب اکثریت کم سے کم تر
کے وسائل زندگی سے بھی محروم ہونے لگتی ہے۔ سماج کا معاشی ارتقاء رک جاتا ہے۔ انسانی معاشرہ ایک
ہے طبقاتی کشمکش کے حادثہ سے دوچار ہوتا ہے جس کے خطرناک نتائج کی زد سے سرمایہ دار بھی نہیں
سکتے، بلکہ بسا اوقات ان ظالموں کو تو اپنے اموال کے ساتھ اپنی جان اور آبرو تک سے ہاتھ دھونا
جاتا ہے۔

بخلاف اس کے صدقات میں خیر ہی خیر ہے آخرت ہی کی فلاح اس سے وابستہ نہیں ہے دنیا کی زندگی میں
صدقات کی برکتیں بے انتہا ہیں۔ صدقات سے فیاضی، ہمدردی، فراخدلی اور بلند حوصلگی جیسی صفتیں انسان کے اندر
ونما پاتی ہیں۔ صدقات اور زکوٰۃ کی پابند سوسائٹی کے افراد میں باہمی بغض و حسد اور بے دردی و بے تعلقی کے
ئے محبت، ہمدردی اور ایثار کے جذبات پرورش پائیں گے۔ ایسا معاشرہ اخلاقی، روحانی، معاشی اور تمدنی اعتبار
سے ترقی کرتا چلا جائے گا۔

اوپر صرف دو مثالیں دی گئی ہیں۔ قرآن کی جس آیت پر بھی آپ غور کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قرآن
س طرح وسیع اور پھیلے ہوئے مطالب کو جامع انداز میں پیش کر کے ہمارے ذہن و فکر کو ان کے حل کرنے کی دعوت
یتا ہے۔ سرسری طور پر ہمیں قرآن کی جامعیت کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن جس قدر ہم غور و فکر سے کام لیتے ہیں اس کی جامعیت
ور گہرائی کا ہمیں زیادہ احساس ہونے لگتا ہے۔ ہم پر حیرت و استعجاب اور سکون و اطمینان کی ملی جلی کیفیت طاری ہو جاتی
ہے۔ ہم جتنا زیادہ غور کرتے ہیں ہماری حیرانی بڑھتی جاتی ہے اور ہمارے ذہنی اور قلبی سکون میں اضافہ ہونے لگتا ہے
سچے کلام کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ بظاہر تو وہ نہایت سادہ ہوتا ہے لیکن آدمی جتنا زیادہ فکر اور تامل سے کام لیتا
ہے اس کی وسعت اور گہرائی کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا	اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ	مدد لو۔ بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

یہ قرآن کا ایک نہایت سادہ سا فقرہ ہے لیکن یہ کتنے گہرے اور پھیلے ہوئے حقائق اور مطالب کو اپنے اندر
سموئے ہوئے ہے اس کا صحیح اندازہ اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔ مدد لینے سے کیا مراد ہے؟ یہ مدد صبر اور نماز سے کس طرح

حاصل ہوتی ہے؟ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ کس طرح دیتا ہے؟ آیت میں اس کا تعین نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے آیت کی جامعیت اور معنویت میں انتہائی وسعت اور گہرائی پیدا ہو گئی ہے اور ہمارے فکر و نظر کا دائرہ کار حیرت انگیز حد تک وسیع ہو گیا ہے۔ قرآن نے اپنے اندر ان تقاضائے فکر و نظر اور خیال کی بلند پروازی کی پوری رعایت رکھی ہے۔ دریا میں کسی پتھر کے ٹکڑے کے پھینکنے سے دریا میں ایک لہر نمودار ہوتی ہے۔ یہ لہر دوسری لہروں کو بیدار کرنے کا سبب بنتی ہے۔ لہروں کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ لہریں پھیلتے پھیلتے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال قرآنی کلمات کا ہے۔ ان سے ہمارے دریائے تخیل میں ایسی معنوی لہریں پیدا ہوتی ہیں جن کے پھیلاؤ کا اندازہ کرنے سے ہم عاجز ہو جاتے ہیں۔ جس کلام میں تخیل کی پرواز کا موقع حاصل ہو اور ساتھ ہی اس کا بھی پورا اہتمام پایا جاتا ہو کہ فکری و نظری گمراہیوں سے اس کی حفاظت ہو سکے اس کلام کی وسعت، ہر دلعزیزی اور اثر اندازی کی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

یہاں قرآن سے بلا تخصیص صرف دو مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جو قرآن کے انداز بیان اور اس کی وسعتوں کا اندازہ کرنے کے لیے انشاء اللہ کافی ثابت ہوں گی۔

پہلی مثال

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○ (۶۴:۳)

اس نے آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تمہاری صورت گری کی تو نہایت خوب تصویر گری کی اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے۔ بظاہر اس آیت میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے جسے سن کر آدمی چونک اٹھے اور اس کے ذہن کی کھڑکیاں یکایک کھل جائیں لیکن اگر آپ رک کر اس کے معانی و مطالب پر غور کریں گے تو ذہن کی کھڑکیاں بھی کھلیں گی اور اس کی باریکیوں کا بھی اندازہ ہو گا۔ ایک خیال دوسرے خیال کی تحریک کرے گا ایک جذبہ دوسرے جذبات کو ابھارے گا۔ ایک نقش ظاہری دوسرے بہت سے پوشیدہ نقوش کی یاد دلائے گا آپ کی نگاہ بصیرت تیز ہو جائے گی۔ آپ پر حیرت اور استعجاب کی کیفیت بھی طاری ہو گی۔ قرآن کی یہی خصوصیت ہے کہ بظاہر اس کا بیان نہایت آسان اور سیدھا سادہ ہوتا ہے لیکن اس میں ایسی گہرائی، پیچیدگی اور باریکی ہوتی ہے کہ غور کرنے سے استعجاب بڑھتا جاتا ہے۔ عام ذہنوں کے لیے تو اس کا سادہ سا تاثر ہی کافی ہے لیکن جن کی نگاہیں حقیقت کی جویا ہیں، جو اپنے ذہن و دماغ سے پورا صرف لیتے ہیں زندگی کی عام ضروریات کے علاوہ کوئی ذہنی اور روحانی ضروریات بھی رکھتے ہیں ایسے ارباب فکر کے لیے بھی اس آیت کے اندر طمانیت کا

ساتھ موجود ہے۔ اختصار کے ساتھ بیان چند اشارے کیے جا رہے ہیں جن سے آیت کی جامعیت
اس کی حکیمانہ ترکیب کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔

اس آیت کے اندر پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ خدا نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ آسمانوں اور زمین سے مراد جیسا کہ انداز بیان بتا رہا ہے پوری کائنات ہے۔ حق کے ساتھ پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش میں کسی حکمت و مصلحت کی کارفرمائی ہے۔ کائنات یوں الل ٹپ وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ خدا نے کسی عظیم مقصد کے تحت وجود بخشا ہے۔ کائنات کے اندر صرف تخلیق کا نہیں بلکہ تخلیق بالحق کا قانون کارفرما ہے۔ تخلیق بالحق سے قرآن کی مراد کیا ہے۔ قرآن نے مختلف مقامات پر اس کی تشریح کی ہے۔ خود اس آیت کے اندر بھی اس کی تشریح موجود ہے چنانچہ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے "اس نے تمہاری صورت گری کی تو نہایت خوب صورت صورت گری کی" یہ خوب تر صورت گری اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ کائنات کی تخلیق بے معنی ہرگز نہیں ہے۔

جس طرح انسان کو بہترین صورت سے نوازا گیا ہے اسی طرح تخلیق کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کارفرما ہے[1]۔ تخلیق کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون ہمیں کسی معنوی حسن و کمال کا پتہ دیتا ہے۔ قانونِ تخلیق کے پیچھے جس طرح یہ اصول کام کر رہا ہے کہ جو کچھ بنے اس میں خوبی و کمال اور جمال و رعنائی ہو اسی طرح اسی

---

[1] تحسین و آرائش کے قانون کی کارفرمائی کے سبب کائنات کی تخلیق کو بالحق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں اجرام سماوی کے افادہ و فیضان کے سبب ان کی تخلیق تخلیق بالحق قرار دی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ
ضِيَاءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ
مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ
وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ
اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝
(۱۰:۵)

وہ (کارفرمائے قدرت) جس نے سورج
کو درخشندہ اور چاند کو روشن بنایا اور پھر
اس کے لیے (چاند کے لیے) منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ
تم برسوں کی گنتی اور (اوقات کا) حساب معلوم
کر لو۔ اللہ نے یہ تمام چیزیں صرف حق کے ساتھ
(حکمت و مصلحت کے ساتھ) پیدا کی ہیں۔ وہ
ارباب علم و دانش کے لیے (علم و معرفت کی)
نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔

اصول سے اپنے آپ منظر عام پر ایک دوسرے قانون کا بھی اثبات ہوتا ہے کہ جو کچھ چاہا جائے اس میں خوبی و کمال اور جمال و رعنائی ہو۔ اس لیے لازمی طور پر تخلیق کائنات کے پیچھے کسی مقصدی و معنوی حسن کی کارفرمائی ہے۔ کائنات یوں ہی بے مقصد اور مہمل طریقہ پر نہیں وجود میں آگئی ہے۔ بلکہ اسے کسی ذی شعور ہستی نے کسی حکمت و مصلحت کے تحت وجود عطا فرمایا ہے۔ اس طرح تخلیق بالحق سے اس خدا کے وجود کا بھی اثبات ہوتا ہے۔ ملحدین جس کے منکر ہیں۔

ایک دوسرے پہلو سے بھی اس پر غور کیجیے۔ انسان اس کائنات کا حاصل اور گل سرسبد ہے۔ انسان کے بغیر یہ دنیا بالکل بے نور ہو کر رہ جاتی ہے۔ ساری کائنات انسان کے لیے ہے۔ ساری کائنات کا محور و مرکز انسان ہے۔ اس حقیقت کا اظہار قرآن کی مختلف آیتوں میں کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ	اسی نے، جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں
وَالْاَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ اِنَّ فِيْ	ہے اپنی طرف سے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے
ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ	بے شک اس میں ارباب فکر و نظر کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

آیت زیر غور خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ سے بھی انسان کی فضیلت کا اثبات ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون، تحسین و آرائش کا قانون اسی لیے قرار پاتا ہے کہ اس سے انسان کے ذوق جمال پسندی کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ انسان کے بغیر حسن و زیبائش کی ساری کرشمہ سازیاں بے معنی ثابت ہوتی ہیں۔ کائنات اور اس کی تمام چیزوں سے ہماری ضرورتیں وابستہ ہیں خواہ وہ ضرورتیں ظاہری ہوں یا باطنی، اسی لیے ان کی تخلیق کو قرآن تخلیق بالحق قرار دیتا ہے۔

وجود انسانی کا اگر کائنات کے اندر کوئی حقیقی مقصد اور غرض و غایت نہیں ہے تو پھر یہ ساری کائنات بے معنی ثابت ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی مقصد و معنویت سے خالی نہیں ہے۔ آیت زیر غور میں اسی حقیقت کا اثبات کیا گیا ہے۔ جب خدا نے انسان کے ظاہری وجود کو حسن و کمال سے نوازا ہے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ اس نے انسان کی زندگی کو کوئی معنوی و مقصدی رعنائی نہ عطا فرمائی ہو۔ جس ذات نے انسان کے ظاہر کو نظر انداز نہیں فرمایا وہ مہربان ہستی انسانی وجود کے معنوی و مقصدی پہلو کو کیونکر نظر انداز کر سکتی

ں لازماً انسان کو خدا نے کسی حقیقی مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔ اس کی پیدائش بے مقصد اور بے معنی
نہیں ہو سکتی۔

"تمہاری صورت گری کی تو نہایت خوب تر صورت گری کی" کے بعد ارشاد ہوا ہے "اور اسی کی طرف
ٹ کر جانا ہے" پہلی دونوں باتوں ـــــــ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور
ری صورت گری کی تو نہایت خوب تر صورت گری کی ـــــ سے اس تیسری بات اور اسی کی طرف لوٹ
ہے' کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ اور یہ تعلق مختلف پہلوؤں سے ہے۔ چونکہ تعلق کی جہتیں مختلف ہیں اس لیے
ری بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔

ربط و نظم کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ جب انسان کی زندگی با معنی و با مقصد ہے تو پھر موت سفر حیات کی
ی منزل نہیں ہو سکتی۔ حقیقی معنویت و مقصدیت کو مٹنا نہیں۔ اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے' سے اسی
یقت کا اظہار مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں کرتی وہ ہمارا رخ اس خدا
جانب پھیر دیتی ہے جو ہماری حیات کا اصل منبع ہے۔ موت ہم سے ہماری زندگی نہیں چھینتی یعنی وہ ہم پر
یقی زندگی کا دروازہ کھولتی ہے جس سے زندگی کی معنویت و مقصدیت کا حقیقی اظہار ممکن ہوتا ہے۔

ربط و تعلق کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب انسان کو دنیا میں محدود زندگی حاصل ہے تو یقیناً اس کا حقیقی
ٹھکانا کہیں اور ہے لیکن دنیا کی یہ محدود زندگی بھی اپنا کوئی مقصد رکھتی ہے۔ ورنہ تخلیق بالحق کا وہ قانون
معنی ہو جائے جس کی کارفرمائی کائنات میں ہر چہار جانب نظر آ رہی ہے۔ دنیا میں اگر انسان اپنے ارادہ و عمل
ی آزادی کو مقصد کے حصول میں صرف کرتا ہے تو وہ کامیاب ہے خدا کے نزدیک وہ انعام و اکرام کا
ستحق قرار پاتا ہے۔ لیکن اگر وہ ارادہ و عمل کی آزادی کو کسی ایسے مقصد کے حصول میں صرف کرتا ہے جو اس
ں زندگی کا اصل مقصد نہیں، تو اس کا یہ رویہ ایک ناقابل عفو جرم ہوگا جس کی اسے سزا ملنی چاہیے۔ اس لیے
س زندگی کے بعد لازماً انسان کو خدا کے حضور پہنچنا ہے۔ جہاں اسے یا تو انعامات سے نوازا جائے گا یا
پھر اسے وہاں اپنے جرموں کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

ربط و نظم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جس طرح انسان کے ظاہری حسن و کمال کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ
س کے جسمانی اعضا کی ترتیب میں آراستگی اور تناسب کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس کے رنگ و روپ میں نفاست
اور دل کشی پائی جاتی ہے۔ اس کے چہرہ بشرہ میں تازگی، لطافت، وقار اور جاذبیت کا سامان رکھا گیا ہے۔

ٹھیک اسی طرح اس کے معنوی حسن وکمال اور مقصدی رعنائی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زندگی کا تسلسل کبھی منقطع نہ ہو۔ کوئی ایک معبود ومطلوب بھی ہو جس سے عبودیت کا رشتہ قائم کرکے انسان اپنی مقصدی ومعنوی حیات کی تکمیل کرسکے۔ اس کے اندر اگر ایثار وقربانی، رقت ودردمندی، سپردگی ونیازمندی، سوز ودرد اور تسلیم ورضا کے جذبات واحساسات پائے جاتے ہیں تو کوئی ایسی ہستی ہو جو اس کے ان جذبات واحساسات کا صحیح معنوں میں جواب بن سکے۔ جس کی یاد کے شایان اس کے بہترین لمحات ہوں۔ جس کی طاعت وبندگی میں اس کے دل کو زندگی مل سکے۔ جس کے حضور وہ اپنی خدمات پیش کرسکے جو حقیقت میں اس کی قدر کرنے والا ہو۔ اس زندگی کے بعد جس کے پاس پہنچ کر براہ راست اس کی عنایت اور اس کی قربت سے سرفراز ہوسکے۔ انسان کے انھیں فطری مطالبات کی تکمیل کی خبر آیت کے آخری جزء میں دی گئی ہے جو موقع کے عین مطابق ہے۔

قرآن کی دوسری آیتوں سے مذکورہ تمام پہلوؤں کی تائید ہوتی ہے۔ معانی ومطالب کی ان تمام جہتوں کو قرآن نے اپنے انفرادی اسلوب بیان کے ذریعہ ایک فقرہ میں سمیٹ لیا ہے۔ مسٹر ڈوٹس نے کتنا صحیح لکھا ہے کہ

"ان تبدیلات مضامین میں جو برق کے مثل تیز وطرار ہیں اس کتاب کی ایک نہایت خوبصورتی پائی جاتی ہے اور گوئٹے (ایک مشہور ترین جرمن فاضل) کا یہ قول بجا ہے کہ جس قدر ہم اس کے قریب پہنچتے ہیں یعنی اس پر زیادہ غور کرتے ہیں وہ ہمیشہ دور کھنچتی جاتی ہے یعنی نیا ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ بتدریج فریفتہ کرتی ہے پھر متعجب کرتی ہے اور آخر کار ایک فرحت آمیز تحیر میں ڈال دیتی ہے۔"

دوسری مثال

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ	انسان کے لیے زینت قرار دی گئی محبت
الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ	مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے
وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ	سونے چاندی کے ڈھیر ہوئے، چیدہ گھوڑے ہوئے
الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ	مویشی ہوئے اور کھیتیاں ہوئیں۔ یہ دنیوی زندگی
وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ	کی متاع ہیں۔ اور اللہ تو ہے جس کے پاس بہتر
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ	ٹھکانا ہے۔ آپ کہیے: میں تمہیں ایسی چیز بتادوں
الْمَآبِ ۝ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ	جو ان سے زیادہ بہتر ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش
ذَٰلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ	اختیار کریں ان کے لیے ان کے رب کے پاس
جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ	باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان کا
خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ	[illegible] کہ زندگی حاصل ہوگی [illegible] کے لیے

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝

پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے، ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں آتش دوزخ سے بچا لے۔ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں، راستباز ہیں، فرماں بردار اور فیاض ہیں اور اوقات سحر میں مغفرت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔

قرآن میں جو حقائق و معارف بیان ہوئے ہیں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ قرآن کی آیتوں کی اہمیت اور ان کی وسعتوں کا اندازہ کرنے کے لیے قرآن کے اس ٹکڑے پر غور کیجیے۔

قرآن کے اس ٹکڑے میں پہلے ان نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کو اس کی موجودہ زندگی میں حاصل ہیں پھر اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ خدا کے پاس ان نعمتوں سے بہتر نعمتیں موجود ہیں۔ اور سب سے بڑی چیز تو یہ ہے کہ وہاں خدا کی خوشنودی کا اظہار ہونے والا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے اوصاف بیان ہوئے ہیں جو ان نعمتوں کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ ان آیتوں کا سادہ مفہوم اور خلاصہ ہے لیکن اگر انسان فکر و تدبر سے کام لے تو ان آیتوں کے اندر اسے اپنی قوت تخلیل سے کام لینے کا پورا موقع حاصل ہے۔ آیتوں کا ربط و نظم اور ان کی جامعیت حقائق کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

پہلی آیت میں ان نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے جو انسان کو دنیا میں حاصل ہیں فرمایا گیا ہے کہ "یہ دنیا میں برتنے کا سامان ہیں اور بہترین ٹھکانا اللہ کے پاس ہے"۔ یہ ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے۔ اس سے ہم پر زندگی کی مختلف حقیقتیں روشن ہوتی ہیں۔

اس سے ہمیں پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ خدا کی عنایات اسی دنیا تک محدود نہیں ہیں۔ دنیا کی نعمتیں خدا کی بے پایاں نعمتوں کا محض ابتدائی اظہار ہیں۔

دوسری بات یہ کہ ہمارے لیے یہ دنیا اصلی جائے قرار کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہمارا اصل ٹھکانا اللہ کے پاس ہے جس سے بہتر کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں ہو سکتا۔

اس سے لازمی اور منطقی طور پر تیسری چیز یہ ثابت ہوتی ہے کہ جب خدا ہی کے پاس لازوال اور اعلیٰ نعمتیں ہیں تو

اسی کی ذات اس کی مستحق ہے کہ انسان اپنی تمام نیازمندیاں اور سعی و جہد اس کے لیے خاص کر دے۔ دنیا میں بھی ہمیں جو کچھ حاصل ہے وہ اسی کا عطا کردہ ہے اور آئندہ کی زندگی میں بھی وہ ہمارا رب ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں جس کی پرستش کی جائے جس کے سامنے انسان اپنا سر جھکا سکے۔

انسان کی زندگی کے لیے جو چیزیں زینت قرار دی گئی ہیں وہ اس دنیا کے اعتبار سے ہیں۔ انجام کار اسے ایک ایسی زندگی عطا ہونے والی ہے جس کا سامان زینت یہاں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس ابدی و سرمدی حیات میں انسان خدا کی رضا سے سرفراز ہوگا۔ وہاں کی نعمتیں خدا کی رضا کا بہترین اظہار ہوں گی۔ جبکہ دنیوی نعمتیں محض حقیقت کے تعارف اور امتحان کے لیے ہیں۔ قرآن کا یہ ٹکڑا "وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ" (اور اللہ اپنے بندوں پر گہری نظر رکھتا ہے) ایک اہم فقرہ ہے۔ جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ بہترین ٹھکانے (جنت) کے مستحق قرار پانے والے ہیں اللہ کو ان کا بہترین علم ہے اور جو لوگ اس کے اس بے پایاں انعام کے مستحق نہیں ہوتے ان سے بھی وہ بخوبی واقف ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کے جو خدا کے بے پایاں انعامات کے مستحق قرار پانے والے ہیں یہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں کہ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے رب سے ان الفاظ میں ہم کلام ہوتے ہیں کہ "خدایا! ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ آپ ہماری خطاؤں سے درگذر کیجیے تاکہ ہم آتش دوزخ سے بچ سکیں۔ وہ راستباز ہیں فرماں بردار اور فیاض ہیں۔ ان تمام اوصاف کے باوجود وہ اوقات سحر میں اپنے رب سے مغفرت کے طالب ہوا کرتے ہیں۔

ان اوصاف کے ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ انسان اگر رضائے حق اور خدا کی جنت کا طالب بننا چاہتا ہے تو اس دنیا میں اسے ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ اسی میں اس کی کامیابی کا سارا راز پوشیدہ ہے۔ اس کے بغیر وہ خدا کی بے انتہا مہربانیوں کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

بندوں سے جن نعمتوں کا وعدہ فرمایا جا رہا ہے وہ کوئی ایسا وعدہ نہیں ہے جسے انسان کی عقل باور نہ کر سکے۔ انسان کی موجودہ زندگی بھی خدا کی عطا و بخشش سے خالی نہیں ہے۔ دنیوی زندگی کے سامان زیب و زینت خدا کی عطا و بخشش کے نمونے ہیں۔ یہ اہل و عیال اور مال و زراعت دنیوی زندگی کی زینت اللہ برتنے کا سامان ہی نہیں ہیں بلکہ یہ اخروی زندگی اور اس کی نعمتوں کے ممکن الحصول ہونے کی بین شہادت بھی پیش کرتے ہیں۔ اس سے انکار وہی کر سکتا ہے جو بصیرت کی نگاہ سے بالکل محروم ہو چکا ہو جس کے اندر تعصب جنا

غفلت کے سبب حقائق زندگی کے ادراک کی حس ہی نہ پائی جاتی ہو۔

اگر موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے تو دنیا کی ساری آرائش اور زندگی کی ساری خوش نمائیاں اور دل ربائیاں بے معنی قرار پاتی ہیں۔ اگر ابدی حیات پر ایمان نہ ہو تو موجودہ زندگی کی ساری متاع حساس طبیعتوں کے لیے ایک سانحہ غم کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہو سکتی۔ لیکن سبزہ زاروں کی شادابی اور کائنات کے حسین و دل کش مناظر ایک ثابت شدہ حقیقت ہیں۔ حسین و دل کش مناظر کو حسین و دل کش ہی کہا جائے گا اور حسین و دل کش مناظر کسی دل نواز حقیقت ہی کی خبر دے سکتے ہیں۔ شادابی بہر حال شادابی ہے جو حسرت و غم کا نہیں کسی راحت بخش حقیقت ہی کی ترجمان ہو سکتی ہے۔ قرآن دنیوی نعمتوں کو ہمارے لیے علم و معرفت کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ کائنات کے مطالعہ میں جس اشکال سے ہمیں سابقہ پیش آتا ہے۔ واللہ عندہ حسن المآب کے فقرہ سے وہ اشکال رفع ہو جاتا ہے۔

خدا کی قدرت کے کرشمے کائنات کے ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس نے چاند سورج جیسے کروں کو فضا میں معلق کر رکھا ہے اور انھیں ایک خاص ضابطہ کا پابند بنا کر ہماری اور جملہ کائنات کی مصلحتوں کو ان سے وابستہ کر دیا ہے۔ خدا ہماری راتوں کو چاند تاروں سے سجاتا ہے، چاند تارے اور سورج سب ہماری خدمت بجا لاتے ہیں۔ یہ چاند تارے ہم فانیوں کے لیے چمکتے ہیں۔ لیکن ان کی روشنی مدھم نہیں ہوتی اور ہم ان کے سامنے موت کی تاریکیوں میں چھپا لیے جاتے ہیں۔ کیا زندگی کا یہ چراغ آسمان کے تاروں سے کم تر اور کم قیمت ہے کہ تارے تو آسمان پر چمکتے ہیں لیکن زندگی کا چراغ ان کے سامنے ہی ہمیشہ کے لیے بجھ کر رہ جائے۔ فرمایا جا رہا ہے "بہترین جائے قرار تو خدا کے پاس ہے" مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کی ناپائدار ی سے تمہیں مایوس نہ ہونا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہیں دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت پسند آتی ہے لیکن بہترین ٹھکانا تو خدا کے پاس ہے۔ تمہارے مرنے کے بعد بھی آسمان پر چاند تاروں کا چمکتے رہنا اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ موت کسی دائمی فنا کا نام نہیں ہے۔ یہ دنیا تو اسی لیے ہے کہ مٹا دی جائے۔ یہ ناپائیدار نقش ہستی حیات کے ارتقائی امکانات کا محض اظہار ہے۔ حیات کی ارتقائی شکل نہیں ہے۔ حیات کا انتہائی ارتقاء کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ اسے بقا حاصل ہو جائے بلکہ اس کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ غیب کے پردے ہٹا لیے جائیں اور حقیقت کے مشاہدے کی قدرت اسے حاصل ہو جائے۔ اس لیے تمہیں یہ حیات ایک ایسی دنیا میں حاصل ہوگی جہاں تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان کوئی پردہ نہ ہوگا۔

دنیا کی زندگی انسان کے لیے یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے کو اس لازوال حیات کا مستحق ثابت کر سکے۔ وہ اس لائق ہو سکے کہ خدا اسے سرمدی ابدی حیات سے نواز سکے۔ خدا کی لازوال نعمتوں کا حصول اس کی رضا کے حصول پر موقوف ہے۔ خدا کی رضا اور خوشنودی انھیں لوگوں کے حصے میں آتی ہے جن کے دل خدا کی عطا اور بخشش کا بہترین ردعمل پیش کرتے ہیں۔ خدا کی عنایتوں اور مہربانیوں کا بہترین ردعمل کیا ہو سکتا ہے۔ وہ صحیح ترین جوابی کیفیت کون سی ہے جو اس کی بے انتہا شفقتوں اور محبتوں کے سبب ہمارے دلوں میں پیدا ہونی چاہیے۔ اس کی وضاحت بھی قرآن کی مذکورہ عبارت میں کر دی گئی ہے۔ خدا کی نعمتوں کو پاکر جن کے قلوب بہترین ردعمل پیش کرتے ہیں انھیں اہل تقویٰ کا خطاب دیا گیا ہے ان کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں وہی دراصل خدا کی بخشش اور عطا کا بہترین جواب ہیں۔

ان اوصاف کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ ایسے انسانوں کی اس سے بہتر تعریف نہیں کی جا سکتی کہ وہ خدا کے شکر گزار بندے ہیں۔ وہ خدا پر ایمان لاتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ انھیں خدا کے وجود کا اقرار ہے بلکہ خدا کے تمام حقوق کا انھیں پاس ولحاظ ہوتا ہے۔ وہ خدا کے بے پایاں احسانات کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ خدا کی مزید بخششوں کے آرزومند ہوتے ہیں۔ اس سے اپنی مغفرت کے طالب ہوا کرتے ہیں۔ زندگی کے عملی میدان میں انھیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس ہوتا ہے۔ ان کے آقا کی جانب سے جو خدمت بھی ان کے سپرد ہوتی ہے اسے انجام دینے میں مصائب ومشکلات کی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی ہے۔ وہ راہ حق پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ راست بازی ان کا نمایاں وصف ہوتا ہے۔ ان کے ایمان ویقین میں کوئی کمزوری نہیں پائی جاتی۔ وہ خدا کے صحیح معنوں میں فرماں بردار بندے ہوتے ہیں۔ فیاضی اور ایثار ان کی صفت ہے۔ کوئی دنیا کی حرص وہوس خدا کی راہ میں ان کے لیے رکاوٹ نہیں ثابت ہو سکتی۔ وہ سکون اور تنہائی کے اوقات میں جس کا بہترین موقع رات کی آخری گھڑیوں میں حاصل ہوتا ہے اپنے رب سے اس بات کے خواستگار رہا کرتے ہیں کہ وہ اپنی رحمت سے انھیں ڈھک دے۔

ان اوصاف کے حامل انسانوں کو خدا اس دنیا میں بھی پاکیزہ اور پرلطف زندگی عطا فرماتا ہے اور آخرت میں انھیں وہ سب کچھ مل جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ یعنی جو شخص بہترین روش اختیار کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اگر وہ مومن

ہے تو ہم اسے (دنیا ہی میں) پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور آخرت میں ایسے لوگوں کو ان کے کاموں کا اچھا بدلہ دیں گے۔

یہی زندگی ہمارے ظاہر کو پُر وقار بناتی ہے۔ اور اسے حسن و خوبی عطا کرتی ہے۔ خدا کا اقرار اور اس کی جانب دل کا جھکاؤ یہی ہماری اندرونی زندگی کا بھی حاصل ہے۔

اوپر قرآنی آیات کی روشنی میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے اندر غور و فکر کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ ایسے جامع و مانع کلام میں اس طرح کے ربط و تسلسل کی تلاش صحیح نہیں جو کلام انسانی کا خاصہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کا انداز بیان نہایت سیدھا سادا ہوتا ہے وہ بالکل فطری انداز میں ہم سے مخاطب ہوتا ہے وہ کوئی مصنوعی اور اختراعی طریق استدلال اختیار نہیں کرتا لیکن وہ اپنی ایک انفرادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ ہمارے تمام روحانی اور عقلی مطالبات کا جواب ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ ہماری نفسیاتی، ذہنی اور فکری تمام ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

مسٹر رینن نے اسلام کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"برخلاف ان قوی اور بلند برجوں کے جو طوفان کا مقابلہ کرتے اور فوراً گر پڑتے ہیں اسلام کی نرمی اور سادگی میں (زمانۂ حال کے علوم و فنون کی معقولیت اور نکتہ چینی کے) مقابلہ کی طاقت پوشیدہ طور پر مشتمل ہے۔"[1]

یہی بات قرآن کے بارے میں بجا طور پر کہی جا سکتی ہے۔ قرآن اسلام ہی کا ترجمان ہے۔ قرآن کے اندر اس کی وسعت اور گہرائی کے سبب اپنی قوت تخیل سے کام لینے کا وسیع میدان ہے۔ یہی قرآن کا وہ امتیازی وصف ہے جس کی وجہ سے وہ ہر دور میں جدید (اپٹوڈیٹ) ثابت ہوتا رہے گا۔

---

[1] دیکھیے رینن کی کتاب Studies of Religous History P.201

باب التقریظ والانتقاد

(اسلامی فقہ حصّہ اول)

اس کتاب کے مؤلف جناب مولینا مجیب اللہ صاحب ندوی ہیں اور مکتبہ الحسنات رامپور یوپی نے شائع کیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ (جدید اڈیشن) سامنے ہے۔ یہ حصّہ صرف طہارت و صلوٰۃ پر مشتمل ہے۔ اگر اس کتاب کی نوعیت یہ ہوتی کہ فقہ حنفی کی متداول عربی اور اردو کتابوں سے مسائل نقل کر دیے جاتے تو معاملہ آسان تھا لیکن مولف نے اپنی تالیف کے بارے میں جو چند خاص باتیں دیباچے میں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے چونکہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان زیادہ تر حنفی المسلک ہیں اس لیے بقول مؤلف اصلاً یہ کتاب اسی مسلک کے مطابق لکھی گئی ہے مگر اس کے باوجود دو باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ ان دو باتوں کے بارے میں مؤلف کی صراحت یہ ہے:

(الف) ایک یہ کہ اہم اور اصولی مسائل کے بیان میں حنفی مسلک کے ساتھ دوسرے متداول فقہی مسلک مثلاً مالکی، شافعی اور حنبلی وغیرہ کا ذکر بھی متن یا حاشیے میں کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ حق صرف حنفی مسلک تک محدود ہے اور دوسرے مسلک ناحق و باطل ہیں یا ان کے لیے کتاب و سنت میں کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔

(ب) دوسرے یہ کہ بعض مسائل میں اور خاص طور پر معاملات میں راقم نے حنفی مسلک کے بجائے دوسرے کسی فقہی مسلک کو یا حنفی فقہ کے مشہور اماموں میں سے کسی ایک کی رائے کو ترجیح دی ہے مگر یہ ترجیح کسی جدت کی خاطر نہیں دی گئی ہے بلکہ ایسا یا تو کسی ضرورت کی بنا پر کیا گیا ہے یا پھر کتاب و سنت کے واضح وجوہ و دلائل سے مجبور ہو کر عموماً ان ہی دونوں باتوں کے پیش نظر فقہائے اسلام کسی رائے کو راجح اور کسی رائے کو مرجوح قرار دیتے ہیں۔

گویا ماشاءاللہ مؤلف بھی فقہائے اسلام کے گروہ میں داخل اور اصحاب الترجیح کے زمرے میں شامل ہیں۔ اس نوعیت کی فقہی کتاب جس فنی مہارت تحقیق اور احتیاط کی متقاضی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ جہاں تک عبادات کی

حیثیت اور ان کے فضائل و فوائد کا تعلق ہے اردو زبان میں بہت ہی اچھی کتابیں موجود ہیں اس لیے اس پہلو سے کسی نئی تالیف کی کوئی ضرورت نہ تھی ہاں جہاں تک خالص فقہی نوعیت کی کتاب کا تعلق ہے اردو زبان میں کوئی جدید انداز کی تحقیقی اور تسلی بخش کتاب موجود نہیں ہے اور اسی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ قاری جب دیباچے کی عبارت پڑھتا ہے تو اسے خوشی ہوتی ہے کہ شاید یہ ضرورت پوری ہو گئی۔ لیکن کیا اس کی یہ مسرت دیرپا ہے؟ فنی مہارت تحقیق اور احتیاط کا حال تو بعد کو معلوم ہو گا پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ (الف) میں مؤلف نے نوعیت کتاب کے بارے میں جو خبر دی ہے کیا وہ صحیح ہے؟ صحت مقال کا اندازہ اس سے کیجیے کہ طہارت کے پورے بیان میں صرف ایک جگہ صفحہ ۴ کے حاشیے میں ائمہ ثلاثہ میں سے صرف امام شافعی کا مسلک نار کثیر کی تعریف میں بیان کیا گیا ہے اور وہ بھی ان کی دلیل کے بغیر ـــــ اس کے بعد نماز کے پورے بیان میں صرف ایک جگہ صفحہ ۹۰ کے حاشیے میں تکبیر تحریمہ کے سلسلے میں ائمہ ثلاثہ کے مذاہب دلائل کے بغیر لکھے گئے ہیں۔ دو جگہ مؤلف نے یہ نصیحت فرمائی ہے کہ اگر کوئی آمین زور سے کہے تو اسے ملامت نہ کی جائے اور کوئی سینے پر ہاتھ باندھے تو برا نہ کہا جائے' اللہ اللہ خیر سلا طہارت و صلوٰۃ کے جیسیوں مسائل میں شاید مؤلف کو دو ہی مسئلے اہم اور اصولی نظر آئے اور ان دو کی طرف بھی انھوں نے بس اشارہ ہی کافی سمجھا حالانکہ طہارت و صلوٰۃ کے مسائل روزانہ کے مسائل ہیں اور ان میں سخت ضرورت تھی کہ مختلف مسالک کا مختصر دلائل کے ساتھ ذکر کیا جاتا۔ اس طرح کتاب کا یہ حصہ ایفاءِ وعدہ اور صحت مقال کی ایک نادر مثال بن گیا ہے ـ (ب) کی عبارت پڑھ کر قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مؤلف اپنی ترجیحات کو نمایاں کر کے پیش کریں گے اور جو کچھ لکھیں گے مدلل لکھیں گے لیکن اس لحاظ سے بھی یہ کتاب سخت مایوس کن ہے۔ اب رہ گئی فنی مہارت، تحقیق اور احتیاط کی بات تو کتاب کے اس حصے میں جو طہارت و صلوٰۃ پر مشتمل ہے کچھ زیادہ فنی مہارت اور تحقیق کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ ان مسائل پر اردو زبان میں متعدد مستند کتابیں موجود ہیں جن کا ذکر بھی مؤلف نے دیباچے میں کیا ہے لیکن اس کے باوجود فقاہت تحقیق اور احتیاط کا جو ثبوت اس کتاب میں مہیا کیا گیا ہے اسے افسوسناک ہی کہا جا سکتا ہے۔ سرسری مطالعہ میں جن مسائل پر میں نے نشانات لگائے تھے ان سب کو یہاں پیش کرنا موجب طوالت ہے اس لیے صرف وہی باتیں پیش کی جا رہی ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا کسی نہ کسی پہلو سے ضروری سمجھا گیا ہے۔

صفحہ ۷ اعبادات کا مفہوم ـ یہ بھی ایک سانحہ ہے کہ اس کتاب کے شروع ہی میں فقہ سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے قاری کے سامنے ایسی عبارتیں آتی ہیں جو مؤلف کتاب کے تفقہ کے بارے میں کوئی اچھا تاثر پیدا نہیں کرتیں۔ متن کی عبارت میں بھی ایک جگہ تضاد ہے اور حاشیہ تو ایسا ہے جو سخت الجھن پیدا کرتا ہے۔ متن میں مؤلف نے لکھا ہے:

اس کے برخلاف جو کام اسلامی شریعت یعنی قرآن وسنت کے مطابق نہ ہو یا خدا کی مرضی کے بجائے ملک قوم خاندان کی خوشنودی یا اپنے نفس کی خواہش کی تکمیل ہو، وہ اسلام کے نزدیک عبادت نہیں ہے، البتہ اگر وہ کام انسانی فائدے کے لیے کیا گیا ہے اور اس سے فائدہ پہنچ رہا ہے تو اس کو اسلام اچھا ضرور کہے گا مگر اس کو عبادت کا درجہ نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد مولف نے ایک یتیم کی کفالت کو مثال میں پیش کیا ہے اور اس میں عبادت کا رخ واضح کرنے کے بعد دوسرے رخ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

لیکن اگر آپ نے اس نگہداشت اور تعلیم و تربیت میں ان حدود کا خیال نہ رکھا جو اسلامی شریعت نے بتائے ہیں یا آپ کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اس سے آپ کی انسانیت دوستی، غریبوں اور یتیموں کی حاجت روائی کی شہرت ہوگی تو آپ کا یہ سارا کام عبادت نہیں بلکہ معصیت ہوگا۔

یہاں وہ یاد نہیں رکھ سکے کہ پہلے لکھ گئے کہ اس کو اسلام اچھا ضرور کہے گا۔ سوال یہ ہے کہ جس کام کو اسلام اچھا ضرور کہے گا وہ پھر معصیت کیسے ہو جائے گا، کیا کسی معصیت کو بھی اسلام "اچھا" کہہ سکتا ہے ۔ عبادت کا مفہوم بتاتے ہوئے مولف نے لکھا ہے :۔

"اور اس کام سے اس کا مقصود خدا کی رضامندی حاصل کرنا ہو" اس عبارت پر انھوں نے ایک لمبا حاشیہ تحریر فرمایا ہے۔ حاشیے کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ قید ذیل تین باتوں کے اظہار کے لیے لگائی گئی ہے۔ اس موقع پر سب سے پہلا سوال تو یہ ہوتا ہے کہ عبادت کی شرعی تعریف میں تقرب الی اللہ یا حصول رضائے الٰہی کی نیت تو لازمی جز ہے اس کے بغیر تو عبادت کی حقیقت ہی وجود میں نہیں آتی تو پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ یہ قید فلاں اور فلاں فائدے کے اظہار کے لیے لگائی گئی ہے۔ گویا ان باتوں کا اظہار ہی اس قید کا سبب ہے اگر ان باتوں کا اظہار مقصود نہ ہوتا تو یہ قید نہ لگائی جاتی حالانکہ وہ عبادت شرعی کے مفہوم کا لازمی جزو ہے اگر مولف وہ قید چھوڑ دیتے تو عبادت کا مفہوم ہی غلط ہو جاتا۔ جن تین باتوں کے اظہار کے لیے مولف نے وہ قید لگائی ہے ان میں ہر پچھلی بات پہلی سے زیادہ عجیب و غریب ہوتی چلی گئی ہے۔ ان میں کی پہلی بات تو تکرار محض ہے جو بات وہ متن میں کہہ چکے ہیں اسی کو دوسرے لفظوں میں دہرا دیا ہے۔ دوسری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی اعمال کو دو حصوں ظاہر و باطن میں تقسیم کرنے کی وجہ سے مسلمانوں میں مستقل طور پر دو طریقۂ فکر اور دو طریقۂ اصلاح جاری ہو گئے ہیں جن سے بڑا نقصان پہنچا ہے بغور دیکھیے کہ اس بات کا عبادت کے مفہوم اور اس قید سے کیا تعلق ہے؟ اور اصحاب شریعت و ارباب طریقت کے دو

گروہوں کے ذکر کا یہ کون سا موقع ہے؟ کیا کسی بھی فقیہ و عالم دین کے نزدیک کوئی کام نیت کے بغیر عبادت بن جاتا ہے اگر ایسا ہوتا جب تو اس تقسیم اور دو طریقہ فکر و اصلاح کا ذکر کچھ مناسبت رکھتا اور جب ایسا نہیں ہے بلکہ اصحاب شریعت اور ارباب طریقت دونوں متفق ہیں کہ کوئی کام حسن نیت کے بغیر عبادت نہیں بنتا تو پھر یہاں ان باتوں کا ذکر کس قدر بے محل ہے۔ مولف شاید سمجھتے ہیں کہ دو طریقہ فکر و اصلاح اس لیے جاری ہو گئے ہیں کہ اصحاب شریعت عبادت کے لیے تقرب الی اللہ کی نیت ضروری نہیں سمجھتے اور ارباب طریقت اس کو ضروری سمجھتے ہیں اور اسی لیے مولف نے عبادت کے مفہوم میں وہ قید بڑھا دی ہے تاکہ ظاہر و باطن کی تقسیم ختم ہو جائے اور دو طریقۂ فکر و اصلاح کے بجائے ایک ہی طریقہ فکر و اصلاح جاری ہو جائے۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مؤلف کا یہ خیال بالکل غلط ہے، ظاہر و باطن کی تقسیم اور دو طریقہ فکر و اصلاح جاری ہونے کی وجہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ نے عبادت کے مفہوم میں سے حصول رضائے الٰہی کی نیت کو حذف کر دیا ہے اور اس کے بغیر ہی عبادت شرعی کی تعریف اس کے نزدیک مکمل ہو جاتی ہے۔

تیسری بات تو انھوں نے ایسی لکھی ہے جسے پڑھ کر حیرت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں انھوں نے تعبدی اور غیر تعبدی کی بحث چھیڑی ہے اور یہ تیسری بات انھیں نے لاہور کے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی تردید میں لکھی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس ادارے کی طرف سے اس مسئلے میں کیا شائع ہوا ہے، اگر ثقافت اسلامیہ والے "تعبدی" ایسے احکام کو سمجھتے ہیں جو مقصود بالذات نہیں ہوتے تو وہ فقہاء کی اس اصلاح سے جاہل محض ہیں۔ ان کو اس اصطلاح کا مفہوم بتانا چاہیے تھا لیکن حیرت ہے کہ مؤلف نے ان کے اس مفہوم کو صحیح سمجھ لیا ہے لکھتے ہیں:۔

"فقہاء نے جن احکام کو تعبدی کہا ہے اس سے ان کا مقصود یہ نہیں ہے کہ دوسرے احکام کی اہمیت کچھ کم ہے یا وہ تعبدی نہیں ہیں اور ان میں خدا کی مرضی حاصل کرنا ضروری نہیں۔ مثلاً جو فقہاء وضو میں نیت ضروری نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ وضو تعبدی نہیں ہے یعنی وہ بجائے خود عبادت نہیں ہے بلکہ وہ اس لیے عبادت ہے کہ ایک عبادت کا وسیلہ اور ذریعہ ہے اس لیے اگر کوئی نیت نہ کرے تو وضو ہو جائے گا۔ یہ خالص ایک قانونی بحث ہے اس کا مقصود یہ نہیں ہو سکتا کہ نیت وضو کے لیے ضروری نہیں ہے یا اسلام میں اس کی اہمیت وضو سے کم ہے یا وہ خدا کی رضامندی کا ذریعہ نہیں ہے"

اس الجھی ہوئی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ مؤلف نے خود تعبدی کی اصطلاح پر غور نہیں کیا ہے۔ تعبدی کی اصطلاح کا مفہوم بتانے سے پہلے چند اور باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وضو میں فقہاء احناف نیت کو

ضروری نہیں سمجھتے اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ کسی ایک حنفی فقیہ نے بھی یہ بات نہیں کہی ہے کہ "وضو تعبدی نہیں ہے"۔ یہ جملہ تو وہی شخص لکھ یا بول سکتا ہے جو اس اصطلاح سے ناواقف ہو۔ دوسری بات یہ کہ ان کے نزدیک وضو کی دو حیثیتیں ہیں، اس کی ایک حیثیت مفتاح صلوٰۃ ہونے کی ہے یعنی جس کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوتی اور اس کی دوسری حیثیت عبادت ہونے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحت نماز کے لیے وضو میں نیت فرض نہیں ہے سنت مؤکدہ ہے بے نیت کے وضو سے بھی نماز ہو جاتی ہے لیکن ایسا وضو اجر سے محروم ہو جاتا ہے۔ حنفیہ ایسا کیوں کہتے ہیں اور ان کے دلائل کیا ہیں یہاں ان کے پیش کرنے کا موقع نہیں۔ وضو کی دوسری حیثیت جو عبادت کی ہے اس کے لیے نیت فرض ہے، نیت کے بغیر کوئی وضو عبادت نہیں ہوتا۔ تیسری بات یہ کہ ایک طرف مؤلف کا یہ لکھنا "اگر کوئی نیت نہ کرے تو وضو ہو جائے گا" اور دوسری طرف یہ لکھنا کہ "اس کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ نیت وضو کے لیے ضروری نہیں ہے" متضاد باتیں ہیں۔ اب میں "تعبدی" کی اصطلاح کے بارے میں مختصر تشریح کرتا ہوں۔ فقہاء "تعبدی" یا "تعبد محض" کے الفاظ ان احکام شرعی کے لیے استعمال کرتے ہیں جو مدرک بالعقل نہیں ہوتے یعنی انسانی عقل ان کی علتوں کا ادراک نہیں کرتی بلکہ انہیں صرف اس لیے تسلیم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ہمیں مکلف گردانا ہے اس اصطلاح کو کسی حکم میں حصول رضائے الٰہی کی نیت کی بحث سے یا کسی عبادت کے مقصود بالذات ہونے نہ ہونے کی بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے نیت اور مقصود بالذات ہونے نہ ہونے کے لحاظ سے کسی عبادت کو تعبدی یا غیر تعبدی کہنا اس اصطلاح سے یکسر ناواقفیت کی دلیل ہے۔ تعبدی کی جو تشریح بیان کی گئی ہے اس کے اثبات کے لیے متعدد عبارتیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے عنایہ شرح ہدایہ کی ایک مختصر عبارت اور علامہ شامی کی ایک بحث پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ہدایہ میں ایک جگہ امر تعبدی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کی شرح کرتے ہوئے صاحب عنایہ لکھتے ہیں:-

امر تعبدی ای امر تعبدنا بہ	امر تعبدی یعنی ایسا امر ہے جس کا ہمیں اللہ
ای کلفنا اللہ بہ من غیر معنی یعقل	تعالیٰ نے مکلف گردانا ہے بغیر کسی ایسے معنی
	(حکمت یا علت) کے جو عقل میں آ سکے۔

علامہ شامی نے رد المحتار میں "فائدہ" کے تحت ایک مستقل فصل لکھی ہے جس کا عنوان ہے: - "امر تعبدی افضل ہے یا معقول المعنیٰ" وہ لکھتے ہیں:-

فتاویٰ ابن حجر کے مصنف سے سوال کیا گیا، تعبدی افضل ہے یا معقول المعنیٰ؟ انہوں نے جواب دیا

میں اس مسئلے میں علمائے احناف کی صراحت سے ناواقف ہوں۔ ہاں ان کی یہ اصولی بات معلوم ہے کہ نصوص میں تعلیل (ان میں کسی علت کا موجود ہونا) اصل ہے۔ ان کی اس اصولی بات سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ وہ نصوص افضل ہیں جو معقول المعنی ہوتے ہیں۔ پھر مجھے یہ بحث فتاوی ابن حجر میں ملی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ابن عبدالسلام کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تعبدی افضل ہے اس لیے کہ تعبدی عبادتیں محض جذبۂ اطاعت و انقیاد سے ادا کی جاتی ہیں بخلاف ان عبادتوں کے جن کی علت و مصلحت معلوم ہو کیونکہ ان عبادتوں کو ادا کرنے والا محض اس مصلحت اور فائدے کے لیے بھی ادا کر سکتا ہے جو ان عبادتوں میں معلوم ہوتی ہیں۔ بلقینی نے ان کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ بحیثیت مجموعی معقول المعنی افضل ہے اس لیے کہ شریعت کے اکثر احکام معقول المعنی ہی ہیں اور حلبیہ میں فرائض وضو پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

وقد اختلف العلماء فی ان الامور التعبدیة ہل شرعت لحکمة عند اللہ وخفیت علینا او لا۔ والاکثرون علی الاول وہو المتجہ للدلالة استقراء عادة اللہ تعالیٰ علی کونہ جالبا للمصالح دارئا للمفاسد فما شرعہ ان ظہرت حکمتہ لنا قلنا انہ معقول والا قلنا انہ تعبدی واللہ سبحانہ العلیم الحکیم

ردالمحتار جلد اول ص[illegible]

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ امور تعبدیہ کیا کسی ایسی حکمت کی وجہ سے مشروع ہوئے ہیں جس کا علم خدا کو ہے اور ہم سے مخفی ہے یا ایسی بات نہیں ہے (یعنی امور تعبدیہ میں کوئی حکمت پائی ہی نہیں جاتی) اکثر علماء پہلی بات کے قائل ہیں اور یہی کی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دستور و عادت کا استقرار اس بات پر دلیل ہے کہ اس کے احکام بندوں کے لیے یا تو جلب منفعت کا سبب ہیں یا دفع مضرت کا۔ اس نے جو کچھ مشروع کیا ہے اگر اس کی حکمت ہم پر ظاہر ہو گئی تو ہم نے کہا یہ معقول ہے اور اگر ظاہر نہیں ہوئی تو کہنے لگے یہ تعبدی ہے اور اللہ پاک علیم و حکیم ہے

ان عبارتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تعبدی کا لفظ صرف ایسے احکام کے لیے بولا جاتا ہے جن کی علتیں سمجھ میں نہیں آتیں، چاہے وہ مقصود بالذات ہوں یا نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء ان عبادات کے لیے بھی تعبدی کا لفظ استعمال کرتے ہیں جن کے مقصود بالذات ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ مثال کے طور پر وہ ہر رکعت میں سجدوں کی تکرار کو

تعبدی کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اصول فقہ کا یہ مسلم مسئلہ ہے کہ جو نصوص یا احکام تعبدی ہوتے ہیں ان پر دوسرے امور کا قیاس درست نہیں ہے۔ صحت قیاس کے لیے مقیس علیہ کا معقول المعنی ہونا ضروری ہے۔ مؤلف نے اپنا حاشیہ اس عبارت پر ختم کیا ہے۔

"عام طور پر تعبدی اعمال کے لیے فقہاء مدرک بالقیاس اور غیر تعبدی اعمال کے لیے غیر مدرک بالقیاس کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔"

خاتمے پر بھی مؤلف نے بات بالکل الٹی لکھی ہے مدرک بالقیاس یعنی مدرک بالعقل کو فقہاء تعبدی نہیں کہتے بلکہ تعبدی اس حکم کو کہتے ہیں جو مدرک بالعقل نہ ہو۔ صفحہ ڈیڑھ صفحہ کا یہ حاشیہ جو غلطیوں اور متضاد باتوں سے پُر ہے شروع ہی میں یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ مؤلف دوسرے علوم و فنون میں چاہے جتنی مہارت رکھتے ہوں لیکن فقہ و اصول فقہ سے ان کی واقفیت اس درجے کی نہ تھی کہ وہ اس نوعیت کی تصنیف و تالیف کا اقدام کرتے۔

صفحہ ۳۲ "حدث اکبر کا حکم" اس عنوان کے تحت مؤلف نے شدید ضرورت کی صورت میں جُنبی (جس پر جنابت کی وجہ سے غسل فرض ہو) کے لیے مسجد میں داخل ہونے کی چند مثالیں دی ہیں اور آخر میں لکھا ہے "تو ان صورتوں میں اس کو مسجد کے اندر جانے یا صحن سے گزر کر جانے کی اجازت ہے۔"

عرض ہے کہ فقہ حنفی میں یہ اجازت غیر مشروط نہیں ہے بلکہ تیمم کے ساتھ مشروط ہے یعنی شدید ضرورت کی حالت میں بھی جنبی جب تک تیمم نہ کرے مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ فقہاء احناف اس صورت میں تیمم کو واجب کہتے ہیں، اس لیے غیر مشروط طور پر مسجد میں داخلے کی اجازت دینا مذہب حنفی کے لحاظ سے غلط ہے۔ اگر مؤلف نے کسی دوسرے مسلک کو ترجیح دی تھی تو اس کا اظہار ضروری تھا ورنہ پڑھنے والا اسے مسلک حنفی ہی کا قول سمجھے گا اور دھوکا کھائے گا۔

صفحہ ۳۳ عورتوں کو جو ہدایت دی گئی ہے اسے مفصل ہونا چاہیے، جب تک عورت سیلان الرحم کی وجہ سے معذور نہ ہو جائے ہر نماز کے لیے تازہ وضو ضروری قرار دینا صحیح نہیں ہے اس موقع پر حالت عذر کی توضیح کرنی چاہیے تھی ورنہ جس طرح مردوں پر محض مرض جریان کی وجہ سے ہر وقت تازہ وضو ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا اسی طرح عورتوں پر محض سیلان الرحم کی وجہ سے ہر وقت تازہ وضو ضروری قرار دینا غلط ہے۔

صفحہ ۲۹ "اسی طرح اگر (کتا) برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو سات بار دھونا چاہیے اور اسی سات بار میں ایک بار مٹی سے ملنا ضروری ہے۔" یہاں بھی مؤلف نے مسلک حنفی کی وضاحت نہیں کی، فقہ حنفی میں سات بار دھونا ضروری نہیں ہے، تین بار دھونا کافی ہے اور ان میں کا ایک بار مٹی سے ملنا ضروری قرار دینا معلوم نہیں کس کا مسلک ہے

امام شافعی رحمہ اللہ سات بار دھونے کو تو ضرور قرار دیتے ہیں لیکن مٹی سے ملنے کو وہ بھی ضروری نہیں کہتے، صاحب عنایہ لکھتے ہیں :-

والتعفیر لیس بواجب بالاتفاق - مٹی سے مل کر دھونا بالاتفاق واجب نہیں یعنی عدم وجوب پر حنفیہ اور شافعیہ کا اتفاق ہے -

صفحہ ۵۳ حرام، مکروہ، مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی کی اصطلاحات کے بارے میں مولف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اکثر باتیں نظر ثانی کی محتاج ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ کہ ان اصطلاحات کی جو تعریفیں انھوں نے لکھی ہیں وہ معلوم نہیں کہاں سے لکھی ہیں، اصطلاحات کی تعریفیں بہت ہی محتاط اور ہر پہلو کا لحاظ کرتے ہوئے لکھی جاتی ہیں تاکہ وہ جامع اور مانع بن سکیں، ایسا نہ ہو کہ ناقص رہ جائیں یا دوسری چیزیں ان میں داخل ہو جائیں - میں پہلے فقہ و اصول فقہ کی متداول کتابوں سے ان اصطلاحات کی تعریفیں لکھتا ہوں اس کے بعد مولف کی چند باتوں کے بارے میں اظہار خیال کروں گا -

حرام - جس چیز کی ممانعت دلیل قطعی یعنی قرآن، حدیث متواتر اور اجماع سے ثابت ہو اور جس کا کرنے والا سزا و عقوبت کا مستحق ہو -

مکروہ تحریمی - جس چیز کی ممانعت دلیل ظنی یعنی غیر متواتر، غیر مشہور حدیث اور قیاس سے ثابت ہو اور جس کا کرنے والا سزا کا مستحق ہو -

مکروہ تنزیہی - جس چیز کے کرنے پر کوئی شخص سزا کا مستحق نہ ہو بلکہ اس کا ترک اس کے فعل سے اولیٰ ہو -

مکروہ تحریمی کی مثال دیتے ہوئے مؤلف لکھتے ہیں :- "مثلاً حرام جانوروں کا جوٹھا مکروہ تحریمی ہے اب اس کے پاک ہونے پر کوئی اصرار کرے تو یہ کافرانہ بات ہوگی "

اتنی سخت بات کے لیے مؤلف نے جو مثال دی ہے وہ کئی وجوہ سے نامناسب ہی نہیں بلکہ غلط ہے، پہلی وجہ تو یہ کہ فقہ حنفی میں تمام حرام جانوروں کے جوٹھے کا حکم ایک نہیں ہے اس لیے مثال میں اس قدر عموم صحیح نہیں، دوسری یہ کہ سور، کتا اور درندوں کے جوٹھے کو فقہاء احناف نجس کہتے ہیں مکروہ تحریمی نہیں، ہو سکتا ہے کہ یہاں میں نجس اور مکروہ دو الگ قسمیں ہی ہیں، تیسری یہ کہ کسی بھی جانور کے جوٹھے کی نجاست یا کراہت تحریمی پر ائمہ اربعہ کا اتفاق نہیں ہے اور جہاں تک درندوں یعنی شیر، بھیڑیے اور چیتے وغیرہ کے جوٹھے کا تعلق ہے تو وہ حنفیہ کے علاوہ دوسرے ائمہ کے نزدیک پاک ہے اس لیے اتنی سخت بات کہتے ہوئے آدمی کو خدا سے ڈرنا چاہیے ـــــ مکروہ تحریمی کی جو

مؤلف نے کی ہے اور پھر اس کی جو مثال دی ہے اس پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے کیونکہ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ بلی کے جوٹھے سے اجتناب ثواب ملے گا اور اگر بار بار اسے کھانے یا وضو میں استعمال کیا جائے تو گناہ کا اندیشہ ہے یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ بلا شبہ امام ابو حنیفہ بلی کے جوٹھے کی کراہت منقول ہے اور حنفی متون میں اسی کو نہ ملی مثال میں پیش کیا گیا ہے لیکن اس مسئلے میں امام یوسف کا اختلاف موجود ہے ان کے نزدیک بلی کا بلا کراہت جائز ہے اور رجحان تک قوت دلیل کا تعلق ہے انہیں کا قول مرجح ہے۔ صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام نے بلی کے جوٹھے پانی سے وضو بھی کیا ہے اور اس کا جوٹھا کھانا بھی کھایا ہے اس لیے اس کے جوٹھے کو اگر بار بار بھی استعمال کیا جائے تو ہرگز کسی گناہ کا اندیشہ نہیں ہے۔ صاحب فتح القدیر کا رجحان بھی امام ابو یوسف ہی کی طرف معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کی کراہت تنزیہی کو ایک خاص صورت میں محدود مانتے ہیں

صفحہ ۲۴ "اگر کوئی گڈھا یا کنواں یا حوض ساڑھے پانچ گز لمبا اور اتنا ہی چوڑا اور کم سے کم ایک ہاتھ گہرا ہو تو ماء کثیر یعنی زیادہ پانی سمجھا جائے گا"

اس عبارت پر حاشیہ لکھ کر فقہ حنفی کے مشہور مسئلہ دہ در دہ کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے جیسے یہ ایک لطیفہ تھا جو بے سوچے سمجھے چل پڑا حالانکہ فقہ حنفی میں اس کی نوعیت کسی مزاح اور لطیفہ کی نہیں ہے۔ یہ اس کا ایسا مفتی بہ قول ہے جس پر فقہ حنفی کے ماننے والے لاکھوں افراد آج بھی عمل پیرا ہیں۔ فتح القدیر، عنایہ اور بدائع الصنائع میں جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام محمد کا مسلک یہی تھا جس سے انھوں نے رجوع کر لیا لیکن بعد کو بہت سے ائمہ احناف نے سہولت کی وجہ سے اسی کو اختیار کیا اور فتوے دیے۔ صاحب ہدایہ نے دہ در دہ کے مسئلے کے بارے میں لکھا ہے وعلیہ الفتویٰ اور اسی پر فتویٰ ہے۔ صاحب فتح القدیر نے عدم تقدیر کو ترجیح دی ہے۔ اگر مؤلف بھی امام ابو حنیفہؒ کے قول کو ترجیح دیتے اور ماء کثیر کا کوئی اندازہ متعین نہ کرتے تو بات ٹھیک تھی لیکن انھوں نے ایک متعین اندازہ بیان کیا ہے اور حاشیے میں اسے بلا دلیل صحیح قرار دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اندازہ کیوں صحیح ہے جو مؤلف نے اختیار کیا ہے اور دہ در دہ کا وہ اندازہ کیوں غلط ہے جسے جلیل القدر ائمہ احناف نے اختیار کیا ہے اور جس پر عام طور سے عمل بھی کیا جا رہا ہے نیز یہ کہ صدر الشریعہ نے شرح وقایہ میں کسی درجے میں اس کے لیے مستند شرعی بھی پیش کیا ہے اور علامہ شامی نے اس بحث کے آخر میں لکھا ہے۔

ولا یخفی ان المتاخرین الذین	یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جن متاخرین نے
افتوا بالعشر کصاحب الهدایة	دہ در دہ کا فتویٰ دیا ہے جیسے صاحب ہدایہ، قاضی خاں
وقاضی خان وغیرهما من اہل الترجیح	اور دوسرے اصحاب الترجیح مذہب حنفی کے ہیں

هم اعلم بالسنن منا زیادہ جاننے والے تھے۔

ان باتوں کی موجودگی میں مؤلف کا اپنے اختیار کردہ قول کو صحیح قرار دینا دعویٰ بلا دلیل کا مصداق ہے۔

صفحہ ۲۵ مولف نے سنت غیر مؤکدہ کے بارے میں لکھا ہے "اس کو سنت زائدہ اور سنت عادیہ بھی کہتے ہیں"۔ کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ المنار اور اس کی شرح نور الانوار میں مطلق سنت کی دو قسمیں کی گئی ہیں: سنۃ ہدیٰ اور سنۃ زوائد۔ سنۃ ہدیٰ آپ کے وہ اعمال و افعال ہیں جو آپ نے بطور عبادت اور بقصد قربت کیے ہیں جیسے جماعت، اذان و اقامت وغیرہ اور سنت زوائد آپ کے وہ اعمال و افعال ہیں جو آپ نے عبادۃً نہیں بلکہ عادۃً کیے تھے۔ جیسے آپ کا مخصوص لباس اور قیام و قعود وغیرہ پھر فقہا اور اصولیین نے سنۃ ہدیٰ کی دو قسمیں کی ہیں، سنت مؤکدہ اور سنت غیر مؤکدہ۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سنت غیر موکدہ کا تعلق بھی سنت ہدیٰ سے ہے اس لیے اس کو سنت زوائد اور سنت عادیہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا اصول فقہ کی مشہور اصطلاح کے خلاف جب انھوں نے ایک بات لکھی تھی تو حوالہ بھی دینا چاہیے تھا اور دلیل بھی۔

اسی صفحے میں سنت کی تعریف مولف نے یہ لکھی ہے "وہ فعل جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا ہو یا کرنے کا حکم دیا ہو"۔ یہ تعریف لکھنے کے بعد حاشیے میں لکھتے ہیں کہ بحر الرائق کے مصنف نے یہی تعریف کی ہے معلوم نہیں یہ بات بحر الرائق کی کس جلد میں اور کہاں ہے۔ راقم الحروف کو جلد اول مبحث سنن وضوء میں تو یہ ملتا ہے کہ مصنف بحر الرائق نے مؤلف کی لکھی ہوئی تعریف کو شرح النقایہ کی طرف منسوب کیا ہے اور متعدد ائمۂ احناف کی تعریفیں لکھ کر اپنی رائے یہ لکھی ہے:

والذی ظهر للعبد الضعیف
ان السنة ما واظب النبی صلی اللہ
علیہ وسلم علیها لکن ان کانت
لا مع الترک فهی دلیل السنة
المؤکدة وان کانت مع الترک
احیانا فهی دلیل غیر المؤکدة
وان اقترنت بالانکار علی من لم
یفعله فهی دلیل الوجوب فافهم

عبد ضعیف پر جو بات ظاہر ہوئی وہ یہ ہے
کہ سنت وہ فعل ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
مداومت فرمائی ہو اب اگر اس کی نوعیت یہ ہو
کہ آپ نے اسے کبھی ترک نہیں کیا ہے تو یہ سنت
مؤکدہ ہونے کی دلیل ہے اور اگر کبھی آپ نے
اسے ترک کر دیا ہے تو یہ سنت غیر مؤکدہ ہونے
کی دلیل ہے اور اگر مداومت کے ساتھ آپ نے
نہ کرنے والے پر انکار بھی کیا ہو تو یہ واجب ہونے

هذا فان به يحصل التوفيق (بحر الرائق جلد ۱ ص۱۲)

کی دلیل ہے۔ اس کو سمجھ لو کیونکہ اسی سے مختلف اقوال میں تطبیق پیدا ہوتی ہے۔

اس صریح عبارت کے ہوتے ہوئے معلوم نہیں کس طرح مؤلف نے بحر الرائق کے مصنف کی طرف وہ تعریف منسوب کر دی ہے جو انھوں نے متن میں لکھی ہے۔

صفحہ ۵۶ اس صفحہ پر جناب مؤلف نے جو ہدایت لکھی ہے اس میں سب سے بڑی بے احتیاطی یہ ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک جملہ غلط منسوب ہو گیا۔ مولف لکھتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سخت الفاظ میں اس کی ممانعت فرمائی ہے آپ نے فرمایا ہے کہ "عصیٰ ابا القاسم" اس نے میری نافرمانی کی۔

"عصیٰ ابا القاسم" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ نہیں ہے۔ یہ حضرت ابو ہریرہ کا جملہ ہے جو انھوں نے اس وقت کہا تھا جب ایک شخص اذان سننے کے بعد نماز پڑھے بغیر مسجد سے نکل گیا تھا اس موقع پر انھوں نے کہا تھا اما هذا فقد عصى ابا القاسم (رہا یہ شخص تو اس نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی) اس طرح بے احتیاطی میں مؤلف سے دو غلطیاں ہوئی ہیں ایک تو یہ کہ یہ جملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا اور دوسری یہ کہ اس جملے کو بے محل استعمال کیا۔ اعضاء وضو کو تین بار سے کم یا زیادہ دھونے کے بارے میں جو حدیث آئی ہے اس کے الفاظ دوسرے ہیں اور وہ حدیث کی کتابوں کے علاوہ ہدایہ، شروح ہدایہ، بحر الرائق اور شامی وغیرہ میں بھی موجود ہیں (طوالت کے خوف سے نقل نہیں کی جا رہی ہے) اسلامی فقہ لکھتے وقت یہ کتابیں مؤلف کے زیر مطالعہ بھی رہی ہیں اس کے باوجود حیرت ہے کہ ان کی نظر اس حدیث پر نہیں پڑی اور انھوں نے ایک جملہ بالکل بے محل لکھ ڈالا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب کتنی بے پروائی اور بے احتیاطی سے لکھی ہے۔ اعضاء وضو کو تین بار سے کم یا زیادہ دھونے سے متعلق ان کی ہدایت بھی اس اطلاق و عموم کے ساتھ صحیح نہیں ہے جو ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے لیکن مسئلے کی توضیح طوالت کے اندیشے سے ترک کی جا رہی ہے۔

صفحہ ۵۸ "اگر کوئی شخص خود سے پانی دیدے یا وضو کے لیے کنوئیں یا حوض سے پانی نکال دے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس کی توقع رکھنا یا انتظار کرنا کہ دوسرا دے تو وضو کریں یہ بڑا گناہ ہے۔" مؤلف کے نزدیک کسی چیز کو گناہ بلکہ بڑا گناہ قرار دے دینا محض معمولی بات ہے ان کی اس جرأت پر سخت حیرانی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ مؤلف کی غفلت کو معاف فرمائے اس سلسلے میں اگر انھوں نے احادیث و سیر کی کتابوں کو لائق اعتناء سمجھا تھا تو کم سے کم وہ علامہ شامی ہی کی پوری لٹ پڑھ لیتے تو ایسا ہرگز نہ لکھتے۔ بات یہ ہے کہ وضو میں استعانت کے دو مفہوم ہیں، ایک مفہوم تو یہ ہے کہ کوئی شخص

باب التنقید والانتقاد

بلا عذر کسی سے وضو کے لیے پانی طلب کرے یا اپنے اعضاء وضو پر کسی شخص سے پانی انڈیلنے کی خدمت لے اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنے اعضاء وضو خود نہ دھوئے بلکہ بلا عذر کسی دوسرے شخص سے دھلوائے اور اسی سے اپنے سر پر مسح کرائے۔ پہلے مفہوم کے لحاظ سے استعانت بلا کراہت جائز ہے اور ہمارے فاضل مؤلف نے اسی مفہوم کے لحاظ سے وضو میں استعانت کو چھوٹا گناہ بھی نہیں بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۰

فقہا نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس طرح کی استعانت بلا طلب ومع الطلب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ مکروہ نہیں ہے۔ مکروہ دوسرے قسم کی استعانت بلا عذر ہے۔ وعدم الاستعانۃ بغیرہ الا لعذر اور اس طرح کی دوسری عبارتیں جو فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں ان میں مکروہ اسی دوسرے مفہوم کی استعانۃ کو کہا گیا ہے۔ علامہ شامی نے بحث کا حاصل ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

وحاصله ان الاستعانة فی	حاصل بحث یہ ہے کہ وضو میں استعانۃ اگر اعضاء
الوضوء ان کانت بصب الماء	وضو پر پانی بہانے یا پانی مانگنے یا کہیں رکھے ہوئے
او استقاءه او احضاره فلا	پانی کو منگوانے سے ہو تو بالکل کراہت نہیں ہے چاہے
کراهة بها اصلاً ولو	متوضی کی طلب خواہش ہی سے کیوں نہ ہو اور اگر استعانۃ
بطلبه وان کانت بالغسل والمسح	اس طرح ہو کہ بلا عذر وہ کسی شخص سے اپنے اعضاء وضو
فتکره بلا عذر (ج ۱ صفحہ ۱۱۸)	دھلوائے اور سر پر مسح کرائے تو یہ مکروہ ہے۔

صاحب فتح القدیر نے بھی ایک فقیہ کے حوالے سے لکھا ہے:۔

ولا باس بصب الخادم کان علیه	خادم اگر پانی انڈیلے تو کوئی حرج نہیں۔ نبی صلی اللہ
الصلوٰة والسلام یصب الماء علیه	علیہ وسلم پر (یعنی اعضاء وضو پر) پانی انڈیلا جاتا تھا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے آج تک بے شمار صلحائے امت کے یہاں وضو و غسل کے اہتمام کے لیے بھی خاص خدام رہے ہیں اور انھوں نے ان خدام سے بلا طلب ومع الطلب یہ استعانت قبول کی ہے

صفحہ ۱۴ عنوان مکروہات وضو کے تحت مؤلف نے جو عبارت لکھی ہے وہ قابل اصلاح ہے اس کے علاوہ انھوں نے وضو کے بعد ہاتھ کو جھٹک کر پانی صاف کرنے کو مکروہ شمار کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ درمختار جیسی کتابوں میں اسے مکروہ لکھا ہے لیکن علامہ شامی نے اس جزیے کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ ہاتھ کو جھٹک کر پانی صاف کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ لکھتے ہیں:۔

صفحہ ۹ "غسل فرض ہونے کی حالت میں پرہیز" یہ عنوان ہے اس کے تحت جو مسائل لکھے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے (۴) حیض و نفاس کی حالت میں عورتوں کے ساتھ مباشرت کرنا" معلوم نہیں عنوان کے ساتھ اس مسئلے کا کیا تعلق ہے؟ حیض و نفاس کی حالت میں عورتوں سے مباشرت ہر حال میں ناجائز ہے مرد پر غسل فرض ہو یا نہ ہوا اور بالفرض اگر مطلب یہ لیا جائے کہ اس حالت میں عورت پر چونکہ غسل فرض ہے اس لیے اس سے مباشرت ناجائز ہے تو یہ بھی اس لیے صحیح نہیں ہے کہ عدم جواز مباشرت کا سبب محض فرضیت غسل نہیں ہے کیونکہ بعض حالات میں اس پر غسل فرض ہونے کی صورت میں بھی مباشرت جائز ہے مثلاً اگر وہ محتلم ہو گئی ہو اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہی جا سکتی کہ مولف نے یہاں ایک غیر متعلق مسئلے کو اس عنوان کے تحت داخل کر دیا ہے۔ عنوان اس کی تشریح اور بیان کردہ مسائل میں اور بھی کوتاہیاں ہیں لیکن معمولی ہیں اس لیے نظر انداز کی جاتی ہیں۔

صفحہ ۱۸ "ضروری" کا لفظ اردو میں عام طور پر فرض و واجب کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن مولف اسے شاید مؤکد کے معنی میں استعمال کرتے ہیں لیکن مؤکد کا ترجمہ "ضروری" اردو میں معروف نہیں ہے اس لیے پڑھنے والے کو الجھن ہوتی ہے اور صاف بات سمجھ میں نہیں آتی اسی طرح واجب کے لیے مولف نے "بہت ضروری" کا لفظ استعمال کیا ہے یہ خواہ مخواہ بلا ضرورت قاری کو الجھن میں مبتلا کرنا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں: "عصر سے پہلے کوئی سنت ضروری نہیں ہے۔" فوراً ذہن ادھر جاتا ہے کہ کوئی سنت بھی ضروری نہیں ہے۔ اگر عصر سے پہلے ضروری نہ ہوئی تو کیا ہوا۔ کیا ایسے موقع پر "تاکیدی" کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہ تھا؟ ویسے سنت مؤکدہ و غیر مؤکدہ اور واجب کے الفاظ مسلمانوں میں بہت معروف و مشہور ہیں اس لیے ان کو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے

صفحہ ۱۸ مولف نے مغرب کے ختم ہونے اور عشا کے شروع ہونے کا جو وقت لکھا ہے وہ فقہ حنفی کا مفتیٰ بہ قول نہیں ہے اور ہندستان میں احناف اس پر عمل بھی نہیں کرتے اگرچہ امام ابوحنیفہ سے بھی اس کی ایک روایت آتی ہے لیکن وہ روایت ظاہرہ کے خلاف ہے۔ مولف نے اگر صاحبین کے قول کو ترجیح دی تھی تو اس کا ذکر ضروری تھا۔ امام ابوحنیفہ کے مشہور قول کو بالکل حذف کر دینا صحیح نہیں ہے اور اس سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ عام طور پر حنفی یہی جانتے ہیں کہ سفید شفق کے غروب کے بعد عشاء کا وقت داخل ہوتا ہے۔

صفحہ ۲۸ مولف نے لکھا ہے کہ "آپ نے بعض صحابہ کے رویائے صادقہ کی بنا پر ان کے مشورے سے اذان کے وہ الفاظ تجویز فرمائے جو اس وقت اذان میں کہے جاتے ہیں۔"

اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ رویائے صادقہ کے بعد آپ نے صحابہ سے اس بارے میں کوئی مشورہ نہیں دیا تھا

دوسری یہ کہ یہ الفاظ آپ کے تجویز فرمائے ہوئے نہیں ہیں منزل من اللہ ہیں اور فرشتے کے سکھائے ہوئے ہیں۔ ہدایہ میں ہے وھو کما اذن الملک النازل من السماء (یہ اذان ویسی ہے جیسی آسمان سے اترے ہوئے فرشتے نے پکاری تھی)

صفحہ ۳۰۸ "اذان کا حکم" کے تحت جو کچھ مؤلف نے لکھا ہے "ہدایت" کے تحت ان میں کئی باتوں کی خود تردید کی ہے، حالانکہ تردید کے لیے کوئی لفظ اس میں موجود نہیں ہے اس لیے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کے تضاد کو مؤلف نے محسوس نہیں کیا۔

(باقی آئندہ)

بقیہ اشارات) اپنے مستقل قومی وجود، اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور اپنی آئندہ نسل کے دین و اخلاق کے بارے میں متفکر ہے۔ وہ یہ دیکھ کر مزید الجھن اور پریشانی میں مبتلا ہے کہ کانگرس تک جس کی بے تعصبی کی دھوم ہے اور جس کی حکومت ہندوستان پر چھائی ہوئی ہے انڈین مسلم کنونشن جیسے کنونشن کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور اس میں بھی اسے فرقہ پرستی کی بو محسوس ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ الجھن اور پریشانی جسے دور کرنے کی ضرورت ہے لیکن قومی آواز اور اس جیسے دوسرے اخبارات جماعت اسلامی کے خلاف اداریے لکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کے مسائل حل کر دیے اور ان کی ذہنی الجھن دور کر دی۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ روداد) خواندگی تھی۔ پھر ایجنڈے کے دیگر مسائل زیر غور آئے اور ان کے بارے میں فیصلے کیے گئے۔

مسلم کنونشن

مسلم کنونشن منعقدہ جون ۱۹۶۱ء کے بارے میں مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۶۱ء میں ایک تجویز منظور کی تھی جسے پریس میں شائع کیا جا چکا ہے۔ منظور شدہ تجویز کے پیش نظر کنونشن کی کامیابی کے لیے جو کوششیں جماعت کی طرف سے عمل میں لائی گئیں اور اس سلسلہ میں کنونشن کے ذمہ داروں سے امیر جماعت کی زبانی یا تحریری گفتگو ہوئی تھی امیر جماعت نے ان کی تفصیلی روداد سے ارکان مجلس کو باخبر کیا جس کے بعد ارکان شوریٰ نے کنونشن کے بارے میں اپنے اپنے علاقوں کے عام اور سنجیدہ اصحاب کے تاثرات بیان کیے جن کو سامنے رکھتے ہوئے مجلس نے کنونشن کے بارے میں حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

۱۔ مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱ر اپریل ۱۹۶۱ء میں کنونشن کی ضرورت سے اتفاق کرتے ہوئے کنونشن کے مفید اور نتیجہ خیز ہونے کے لیے اس بات کو ضروری قرار دیا تھا کہ اس میں مسلمانوں کے تمام اہم اور قابل لحاظ مکاتب فکر کی نمائندگی ہو اور ساتھ ہی اس بات کی کوشش کی جائے کہ کنونشن میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے حاملین اپنے اپنے مخصوص نظریات پر زور دینے کے بجائے اپنی اپنی پوری توجہ اپنے درمیان زیادہ سے زیادہ مشترک نقاط فکر تلاش کرنے اور مشترک مقاصد کو حاصل کرنے کی طرف مبذول کریں۔

۲۔ مجلس کو افسوس ہے کہ کنونشن کے ذمہ دار کنونشن کے انعقاد اور اس کی کارروائیوں میں ان دونوں باتوں کو مد نظر نہ رکھ سکے۔ کنونشن میں مسلمانوں کے مختلف نقاط فکر کے لوگوں کی نمائندگی کا مقصد صرف اس صورت میں پورا ہو سکتا تھا جب خود مسلمانوں کی اپنی مختلف جماعتوں اور مکاتب فکر کو اس میں نمائندگی کا موقع دیا جاتا لیکن داعیان کنونشن نے مسلمانوں کی متعدد جماعتوں اور ان کے مکاتب فکر کے نمائندوں کو بالقصد اور بالاعلان مدعو نہیں کیا اور جن لوگوں کو مدعو کیا گیا ان کو خود اپنے بقول ان کی کسی جماعتی حیثیت میں نہیں بلکہ محض ان کی ذاتی حیثیتوں میں مدعو کیا گیا اور ان کی اگر کوئی جماعتی حیثیت تھی بھی تو وہ زیادہ سے زیادہ صرف ان پارٹیوں کے نمائندہ ہونے کی جو مسلمانوں کی نہ اپنی پارٹیاں ہیں اور نہ اسلام اور مسلمانوں کا مفاد ان کے پیش نظر ہے۔ اور اس بنا پر ان کے نمائندوں کو نہ تو مسلمانوں کے مسئلوں سے کوئی خاص دلچسپی ہو سکتی تھی اور نہ انھیں مسلمانوں کی نمائندگی کا کوئی حق ہی حاصل تھا۔ مجلس کو اس بات پر شدید افسوس ہے کہ کنونشن میں شریک کرنے یا اس سے علیحدہ رکھنے کا مدار سیکولرزم کے عقیدہ کو ماننے یا نہ ماننے کو قرار دیا گیا تھا جو نہ صرف مسلمانوں میں باہمی تفریق پیدا کرنے کا موجب ثابت ہوا بلکہ جو اپنے اثرات و مضمرات کے ساتھ ان کی وحدت ملی کی اساس کو مجروح کر دینے والا اور اپنے وسیع معنی و مفہوم میں خود اسلام کے بعض بنیادی تصورات سے ٹکرانے والا بھی ہے

۳۔ سیکولرزم کی تائید کی بنا پر کنونشن کی نوعیت عملاً ایک مخصوص نقطۂ نظر کے حاملین کے اجتماع سے زیادہ نہ تھی تو اس میں اس کا موقع ہی کیا تھا کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر کے مابین مشترک نقاط تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی اور اس طرح مسلمانوں کے ملی انتشار کو کم کرنے اور ان میں ایک طرح کی وحدتِ فکر و عمل پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ کنونشن کی کارروائیوں کے ذریعہ ان کے رہے سہے اتفاق و اشتراک کو بھی سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ کنونشن کی اصل غرض یہ تھی کہ تقسیم کے بعد مسلمان جن پے بہ پے فسادات کے بار بار شکار ہوتے رہے ہیں ان سے ان کے تحفظ کی راہیں سوچی جائیں لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ کنونشن میں بے وجہ اور بے محل مسلمانوں کی فرقہ پرستی کا دکھڑا رویا جائے اور اس ضمن میں خواہ مخواہ بالواسطہ طور پر ان کی کچھ جماعتوں کی مذمت بھی کی جائے اور اس طرح اصل مقصد از حیثیت مجموعی مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچائے بغیر خواہ مخواہ رائے عامہ کو گمراہ اور ان جماعتوں کے خلاف حکومت کا ہاتھ مضبوط کیا گیا۔

ثانیاً کنونشن نے کلمہ کی بجائے سیکولرزم کو مسلمانوں کی جمع و تفریق کی بنیاد قرار دے کر نیز مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت اور ان میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کرنے جیسے اہم اور بنیادی مسئلہ کو نظر انداز کر کے اور ان کی بجائے قومی یکجہتی، معاشی تحفظ اور دنیوی ترقی وغیرہ جیسے مسائل ہی کو اصل اور حقیقی مسئلہ قرار دے کر ایسے عناصر کو مسلمانوں کی صفوں میں گھسنے اور ان کو اسلام کے راستہ سے منحرف کرنے اور ان کے اندر انتشار و تفریق پیدا کرنے کا پورا پورا موقع بہم پہنچا دیا گیا جن کی اسلام دشمنی اور مذہب دشمنی ایک معروف حقیقت ہے اور جو رات دن اسی طرح کی سرگرمیوں میں مصروف اور ایسے ہی مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

۴۔ شوریٰ کو اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ کنونشن میں مسلمانوں کے مسائل پر غور کرتے وقت اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا کہ مسلمانوں کی اصل حیثیت ایک عالمگیر اصولی پارٹی کی ہے جس کا اصل مقصد وجود ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے نہ کہ معروف معنی میں کسی اقلیت کی۔ جس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا ہے کہ مسلمانوں کا یہ اجتماع جس میں علماء و مشائخ بھی کثیر تعداد میں شریک تھے مسلمانوں کے اصل فرضِ منصبی کا کوئی حق ادا نہیں کر سکا بلکہ اس کی وجہ سے دنیوی پہلو سے بھی مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ کنونشن سے پہلے وہ اپنے کو جس عدمِ تحفظ کی حالت میں پا رہے تھے اگر اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے تو اس میں کوئی کمی بھی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اور تحفظ کے لیے جن تدبیروں کا سہارا تلاش کیا گیا تھا عملاً اس وقت تک بالکل بے اثر ثابت ہوئی ہیں۔

۵۔ مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ ان کی فلاح کا واحد ذریعہ کتاب و سنت کی کامل اتباع ہے اس لیے شوریٰ کو

یہ توقع تھی کہ شرکائے کنونشن مسلمانوں کے مختلف مسائل پر غور و فکر کرتے وقت اس متفقہ اصل کو اپنے غور و فکر کی بنیاد قرار دیں گے لیکن نہایت افسوس ہے کہ اگرچہ تقریروں اور خطبات میں اسلام کے ایک تحریک اور ایک مستقل اعلیٰ نظام حیات ہونے کا نہایت شدومد کے ساتھ اظہار کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ زندگی کو اپنانے کی مسلمانوں کو دعوت بھی دی گئی لیکن کنونشن نے نہ صرف یہ کہ اپنے فیصلوں میں اس بنیاد کو نظر انداز کر دیا بلکہ سیکولرزم کو کلمۂ اجماع قرار دے کر مسلمانوں کا رخ دین کی بجائے لادینیت کی طرف موڑ دینے کی کوشش کی گئی۔

شوریٰ نے اس مسئلہ پر بھی غور کیا کہ کیا حالات موجودہ کسی کنونشن کا انعقاد مناسب ہوگا۔ شوریٰ کا احساس یہ ہے کہ جب حالیہ کنونشن سے کنونشن کی اصل غرض پوری نہیں ہوئی بلکہ اپنے کچھ اثرات و نتائج کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے بحیثیت مجموعی کچھ مضر ہی ثابت ہوا ہے تو کسی دوسرے کنونشن کی ضرورت جس سے اس کی مطلوبہ غرض پوری ہو سکے علی حالہ باقی ہے لیکن جبکہ خود اس کنونشن کے نتیجہ میں مسلمانوں کی صفوں میں انتشار رونما ہو گیا ہے اور مسلمانوں کے سربراہوں کا ذہن ابھی اس کے لیے پوری طرح آمادہ نہیں ہو سکا ہے کہ وہ ابتک ملت کے مسائل کے حل کے لیے جن پامال طریقوں کے عادی ہو چکے ہیں انھیں چھوڑ کر کوئی ایسا طریقہ اختیار کر سکیں جو کتاب و سنت کے مطابق اور ان کے خیر امت ہونے کے شایان شان ہو، اس لیے بحالات موجودہ کسی کنونشن سے کوئی خاص فائدہ پہنچنے کی توقع نہیں ہے۔"

قومی یک جہتی

مجلس نے ملک کی موجودہ صورت حال پر بھی غور کیا اور ملک کے اندر جو انتشار انگیز قوتیں سر ابھار رہی ہیں بالخصوص لسانی، نسلی، صوبائی اور فرقہ وارانہ عصبیت، ان پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ذیل کی قرارداد منظور کی۔

" ملک میں لسانی، نسلی، جغرافیائی اور فرقہ واری بنیادوں پر جو تعصبات ابھر رہے ہیں مجلس شوریٰ ان کو تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس کے اصلاح و تدارک کی جو فکر حکومت اور مختلف جماعتوں کو لاحق ہو گئی ہے اس پر اظہار اطمینان کرتی ہے اس طرح کے تعصبات کا ابھرنا ملک کی وحدت و سلامتی کے لیے جو ہر خیر خواہ وطن کو عزیز ہونی چاہیئے خطرناک ہونے کے علاوہ ان عالمگیر اصولوں کے بھی منافی ہے جن کے ہم اسلام کے داعی ہونے کی حیثیت سے علمبردار ہیں اس لیے اس صورت حال کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس کے حل کے لیے حکومت اور ان تمام جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے کے خواہش مند ہیں جو ان تعصبات کو مٹا نا اور یکجہتی و اتحاد پیدا کرنا چاہتی ہیں البتہ مجلس شوریٰ یہ یقین رکھتی ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جو مختلف قوموں، مذہبوں کا گہوارہ ہے کسی ایسی یکجہتی کے قائم کرنے کی کوشش کرنا جس سے ان کی جداگانہ حیثیت اور ان کی

کی مخصوص تہذیب برقرار نہ رہے نہ صرف یہ کہ دستور ہند کے خلاف ہوگا بلکہ اس سے اس مقصد کو بھی شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور جس قومی یکجہتی و اتحاد مقصود ہے اس کو حکومت یا اکثریت کے دباؤ کے ذریعہ پیدا کرنا قطعاً غیر مناسب اور غیر مفید ہوگا اس مقصد کیلئے بہتر اور مفید شعور اور احساس کا بیدار کرنا اور ملک کی مختلف تہذیبی اقلیتوں کو یہ اطمینان دلانا ہے کہ مذہب اور تہذیب کی بنیاد پر ان کے جداگانہ وجود اور ان کے اپنے مذہب و تہذیب کو نہ صرف یہ کہ کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ ان کے بڑھنے اور پھیلنے کیلئے کافی مواقع ہیں۔

سیکولرزم کے سلسلہ میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

سیکولرزم

سیکولرزم کی اصطلاح مختلف معنی میں استعمال ہورہی ہے۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے دور میں سائنس اور مذہبی طبقہ کے اختلافات اور ان کے تصادم میں اس اصطلاح کا ایک تاریخی پس منظر ہے جس میں نہ صرف مذہب بلکہ خدا کی مخالفت اس کی اصل روح تھی ہرچند کہ اس وقت پادری طبقہ کا رویہ جس کے ردعمل میں خلاف مذہب جذبات نے شدت اختیار کی ایک بالکل غلط اور مذہب کی روح کے خلاف رویہ تھا لیکن اس کے مقابلہ میں لامذہبیت کا جو تخیل لایا گیا اس نے جو صدمہ اخلاقی اقدار اور انسانیت کے اعلیٰ جذبات کو پہنچایا وہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کو ہر دیکھنے والی آنکھ مغرب کی موجودہ مادہ پرستانہ زندگی اور اس کے مہلک نتائج میں دیکھ سکتی ہے اس معنی میں جماعت سیکولرزم کی مخالف رہی ہے اور رہے گی کیونکہ اجتماعی معاملات سے خدا اور اس کی ہدایت کو بے دخل کردینا اس کی اصلی روح ہے اور یہی انسانی زندگی کی جملہ خرابیوں کی اصل جڑ ہے اور اسلام انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے اور اس نظام کی افادیت عمل کی کسوٹی پر حق ثابت ہوچکی ہے جس کا ریکارڈ تاریخ عالم میں موجود ہے۔

لیکن اگر سیکولرزم کا یہ مطلب لیا جائے جیسا کہ بعض حلقوں کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حکومتی کاروبار میں کسی مذہبی فرقہ کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جائے اور اسی کے ساتھ بلا امتیاز مذہب و ملت یکساں برتاؤ ہو اور سب کو یکساں مواقع حاصل رہیں تو جماعت نے اس تخیل کی کبھی مخالفت نہیں کی ہے۔"

الیکشن کا مسئلہ

الیکشن کے مسئلہ پر بھی تبادلۂ خیالات اور غور وخوض ہوا اور بالآخر طے کیا گیا کہ الیکشن کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی مقرر کی جائے جو اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرکے یہ بتائے کہ اقامت دین کے مقصد کے لیے الیکشن کی راہ کن صورتوں، کس حد تک اور کن شرائط کے ساتھ اختیار کی جاسکتی ہے اور موجودہ حالات میں جماعت کو اس سلسلہ میں کیا موقف اختیار کرنا چاہیے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ کمیٹی اس ذیل میں جماعت کے علماء اور ارباب فکر کی آراء کو سامنے رکھنے کے ساتھ جماعت کے باہر کے علماء کی آراء سے بھی استفادہ کرے۔ چنانچہ مذکورہ فیصلہ کے تحت حسب ذیل افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جو ۱۵ر اکتوبر ۶۱ء تک اپنی رپورٹ مرکز کے حوالہ کردے گی۔

تعداد اراکین شوریٰ ۶
۱۔ مولانا ابو اللیث صاحب امیر جماعت ۲۔ محمد یوسف صاحب قیم جماعت ۳۔ مولانا سید حامد علی صاحب ۴۔ مولانا صدر الدین صاحب ۵۔ جناب فضل حسین و

ریلیف جبلپور اور ساگر وغیرہ میں جماعت نے مظلومین کی امداد کا جو کام انجام دیا ہے اور اس سلسلہ میں جو رقم صرف کی گئی ہے اس کی رپورٹ بھی مجلس میں زیر غور آئی جساب آمد و صرف دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ مظلوم مستحقین کی امداد اور ریلیف کے سلسلے کے دیگر کاموں میں کتنی رقم صرف کی گئی ہے اور کتنی باقی ہے یہ بات بھی سامنے آئی کہ انفرادی مقدمات کے اخراجات اور یتامیٰ و بیوگان کی مستقل امداد میں رقم خرچ کرنے کی ضرورت ہے نیز جو لوگ ماخوذ ہیں ان کے رہا ہو جانے پر ان کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کیلئے کچھ رقم کی ضرورت ہوگی چنانچہ طے ہوا کہ ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے باقی رقم کو مظلوم مستحقین کی مزید امداد پر صرف کر دیا جائے نیز یہ طے کیا گیا کہ ناظم ریلیف کیمپ جناب انعام الرحمٰن صاحب جلد از جلد تفصیلی حساب مرتب کر کے مرکز کے حوالہ کر دیں تاکہ انھیں شائع کیا جا سکے۔

خدمت خلق مجلس میں یہ تجویز زیر غور آئی کہ عام مسلمانوں کو بلا لحاظ مذہب و ملت خدمت خلق اور رحمت و مواسات کے کاموں کی ترغیب دی جائے اور اس کام کو وسیع پیمانے پر انجام دینے کیلئے جماعت ان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے اس تجویز کے بارے میں ارکان شوریٰ کا عام تاثر یہ تھا کہ موجودہ پالیسی پروگرام میں بھی اس طرح کے کاموں کی گنجائش ہے لیکن اس کام کی طرف عام طور سے کما حقہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے اس لئے رفقا کو خصوصی توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔

حلقہائے متفقین کا قیام شوریٰ میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا کہ متفقین کا حلقہ قائم کیا جائے یا نہیں۔ طے ہوا کہ قائم کیا جائے اور اس کیلئے ضروری ضابطے بنائے جائیں۔

ارکان شوریٰ اور ارکان جماعت کی تجاویز اجلاس میں بعض ارکان شوریٰ نے اپنی کچھ تجاویز پیش کیں اور بعض ارکان جماعت کی چند تجاویز کو بھی اہم سمجھتے ہوئے برائے غور پیش کیا گیا تھا ان میں سے جو تجاویز مذکورہ بالا مسائل میں سے کسی مسئلہ سے متعلق تھیں اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ایسی تجاویز کو بھی پیش نظر رکھا گیا تھا بقیہ تجاویز کو اکثریت کی تائید حاصل نہ ہو سکی اس لئے وہ رد ہو گئیں عام ارکان جماعت نے بعض مشورے بھی دئے تھے جو نوٹ کر لئے گئے البتہ ان کی بعض ایسی تجاویز جن کو امیر جماعت یا کسی رکن شوریٰ نے دستور کی دفعہ ۔۔ کے تحت اہم نہیں سمجھا زیر غور نہ آسکیں تحریک و جماعت کے حالات کے جائزہ کیلئے چونکہ وقت کم تھا اسلئے یہ طے کیا گیا کہ ارکان شوریٰ اپنے تاثرات اور مشورے وغیرہ تحریری طور پر بعد کو بھیج دیں گے اس کے بعد دعا پر اجتماع ختم ہوا۔ اللھم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم الخ

صفحہ ۱۷ کا بقیہ سمندر کی لہروں کے درمیان جہاز کی یہ غیر یقینی حالت آٹھ گھنٹے قائم رہی۔ آٹھ گھنٹے کا یہ وقت مسٹر آرنلڈ کے لیے جو حیثیت رکھتا تھا۔ مومن کے لیے وہی حیثیت اس کی پوری زندگی کی ہے۔ آپ ہر وقت اس خطرے میں مبتلا ہیں کہ اچانک آپ کی موت آ جائے ہر لمحہ آپ کے لیے زندگی کا آخری لمحہ ہے۔ اگر آدمی کو اس بات کا واقعی احساس ہو جائے تو وہ اسی طرح ہمہ تن مشغول نظر آئے گا جیسے امتحان میں بیٹھا ہوا وہ طالب علم جس کا وقت ختم ہو رہا ہو اور ابھی اسے کئی سوال کرنے باقی ہوں لیکن اگر آپ غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں اگر آپ اپنے وقت کی اہمیت نہیں سمجھتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اس نازک صورت حال کا احساس نہیں ہے گویا آپ کی زندگی کا جہاز لنگر انداز ہو گیا ہے۔ آپ موت سے بے فکر ہیں۔ آپ آخرت پر یقین نہیں رکھتے سوچیے کہ اپنی زندگی آپ کے بارے میں کہیں یہ کہانی ہی نہ بن جائے

نظامِ دین میں سنت کا مقام کیا ہے؟

اس کا مفصل اور مدلل جواب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم سے

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کے منصب رسالت نمبر میں پیش کیا جا رہا ہے اس میں انکار سنت کے تمام دلائل اور اس کے تفصیلی جوابات آپ کو یک جا مل جائیں گے۔ یہ نمبر ان شاء اللہ ستمبر ۱۹۶۱ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔ ضخامت (اندازاً) ۳۵۰ صفحات۔ قیمت:- تین روپیہ پچاس نئے پیسے

(مندرجات ایک نظر میں)

۱۔ فتنۂ انکار حدیث کا تاریخی و فکری جائزہ از مولانا مودودی

۲۔ ڈاکٹر عبدالودود اور مولانا مودودی کے مابین مراسلت

۳۔ ڈاکٹر صاحب کا آخری خط اور اس کا جواب از مولانا مودودی

۴۔ سنت اور اجتہاد کے بارے میں مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے ایک فاضل جج کے نظریات پر تبصرہ از مولانا مودودی

..... یہ اشاعت خاص سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم موضوع پر ایک تاریخی دستاویز اور ایک مستقل کتاب ہوگی۔

..... یہ نمبر تمام خریداران کو بذریعہ رجسٹری بھیجا جائے گا تاکہ ڈاک میں ضائع ہو جانے کا خطرہ نہ رہے۔ ابھی سے پرچہ محفوظ کرانے کے لیے

صرف اس اشاعت خاص کے خریدار مبلغ چار روپیہ صرف

ترجمان القرآن کے مستقل خریدار مبلغ دو روپیہ چھتر پیسے

نئے مستقل خریدار سالانہ چندہ سمیت مبلغ ۸ روپیہ چھتر پیسے

بذریعہ منی آرڈر دفتر "ترجمان القرآن" لاہور میں روانہ فرما دیں۔ اس رقم میں خاص نمبر کی قیمت اور رجسٹری کا خرچ (پچاس پیسے) دونوں شامل ہیں۔ منیجر رسالہ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

دینی صحافت کے افق پر ایک نیا آفتاب

ماہنامہ "انوار اسلام"

زیر نگرانی:- ابو محمد امام الدین رام نگری ــــ یہ ماہنامہ اسلامی تعلیمات، اسلامی نظام زندگی اور اسلامی سیر و تاریخ کو پوری جامعیت کے ساتھ دلولہ انگیز، ایمان افروز اور مدلل انداز میں جدید علمی مذاق اور ادبی معیار کے مطابق پیش کرتا ہے نیز ہندو مذہب کی روشنی میں اسلام سے متعلق غیر مسلموں کے استفسارات و اعتراضات کے جواب بھی دیے جاتے ہیں۔ سالانہ چندہ للعہ نمونہ مفت

مہتمم ماہنامہ "انوار اسلام" رام نگر بنارس

ZINDGI Monthly Rampur, Sept. 1961 Regd. No. A-688

سیرت پاک پر

روزانہ 'دعوت' دہلی کی طرف سے ایک اور خصوصی پیشکش

—[رہبر عالم]—

جس میں ہند و پاکستان اور عرب دنیا کے
ممتاز علماء کے مضامین شامل ہیں ۔ سیرت اکرم پر ۔

یہ نادر مجموعہ انشاءاللہ

۲۵ اگست ۱۹۶۱ کو شائع کیا جا رہا ہے ۔

۲۰×۳۰/۸ صفحات ۲۵۲ قیمت سوا دو (۲) روپے

جو اصحاب پورے تین روپے بھیج دینگے انہیں یہ نمبر رجسٹری سے روانہ کیا جا سکے گا - پانچ خریدار مل کر گیارہ روپے میں پانچ پرچے منگوا سکتے ہیں - جس کا محصول ڈاک ادارہ کے ذمہ رہیگا - یہ نمبر محدود تعداد میں چھپوایا جا رہا ہے اس لئے اپنی فرمائش سے فوراً مطلع فرمائیں -

'رہبر عالم' کو انشاءاللہ - ۲۲ اگست سے حوالہ ڈاک کرنا شروع کر دیا جائیگا -

منیجر 'روزانہ دعوت' دہلی -

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

(ماہنامہ زندگی)

- عرصہ ۱۳ سال سے تحریک اقامت دین کا نقیب ہے۔
- ایک مکمل ہمہ گیر نظام زندگی کے نظریہ کا علمبردار ہے۔
- اسلامی اخلاقی قدروں کا داعی ہے۔
- امن و سلامتی کا پیغامبر ہے۔
- مشرقی و مغربی علوم کا متوازن امتزاج پیش کرتا ہے۔
- دین اور اس کی حقیقتوں کا شارح ہے۔ اور زندگی کے تمام پیچیدہ اور اہم مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔
- تمام انسانوں کے سامنے ایک خدا پرستانہ نظریۂ زندگی اور اس کے مطابق ایک مکمل نقشۂ عمل رکھتا ہے۔
- الحاد اور خدا بیزاری کی گمراہی اور اس کے ہلاکت آفریں نتائج سے خبردار کرتا ہے۔

اسلام !

اگر آپ ہر حیثیت ایک مسلم کے [illegible]

ماہنامہ زندگی کا مسلسل مطالعہ آپ کے [illegible]

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد ۲۵
شمارہ ۴

ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ
اکتوبر ۱۹۶۱ء

مدیر:۔ سید احمد عروج قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی
● زر سالانہ: [illegible] ششماہی:۔ تین روپیہ۔ فی پرچہ:۔ پچاس نئے پیسے
ممالک غیر سے:۔ دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

[illegible] پبلشر نے جماعت اسلامی ہند کی طرف سے ناظر پریس بازار نصر اللہ خاں میں چھپوا کر دفتر رسالہ زندگی رامپور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(مولانا ابو اللیث صاحب ندوی اصلاحی)

فرقہ پرستی ملک کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے تقسیم سے پہلے بھی ہندوستان کو اس کے نہایت تلخ تجربات اٹھانے پڑے ہیں بلکہ خود تقسیم کو بھی بڑی حد تک اسی کا ایک نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن تقسیم کے بعد بہت سے لیڈروں نے اپنے طور پر یہ فرض کر لیا تھا کہ اب ملک میں فرقہ پرستی کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی ہے اس کے قدرۃً اس کے مقابلے یا تدارک کے لیے کسی سنجیدہ کوشش کا سوال بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ ان میں سے کچھ کا خیال تو یہ تھا کہ ہماری جملہ خرابیوں بالخصوص فرقہ وارانہ لڑائی جھگڑوں کی اصل جڑ محض انگریزوں کی غلامی ہے اس لیے ہندوستان کی آزادی کا مطلب ہی ان کے نزدیک یہ تھا کہ اب اسے از خود ہر بلا سے نجات مل گئی اور بہت سے لیڈر اس تصور میں سرشار تھے کہ سوشلزم ہر مرض کی دوا ہے' اس لیے جب اسے ہندوستان کی منزل مقصود قرار دیا جا چکا ہے تو اب فرقہ پرستی بھی محض چند روز کی مہمان ہے۔ اول تو سوشلزم کے لفظ ہی میں وہ جادو ہے کہ جوں ہی لوگوں کے کان اس سے آشنا ہوں گے ذات پات' رنگ و نسل اور قوم و فرقے کے ساتھ اپنی تمام دلچسپیاں ختم کر کے اس ایک مقصد کے لیے متحد ہو جائیں گے کہ ملک کو کس طرح زیادہ سے زیادہ دولتمند اور خوش حال بنایا جائے اور اگر اس میں کوئی کمی باقی رہ جائے گی تو سوشلزم کی منزل تک پہنچنے کے لیے ملک میں جو عظیم الشان ترقیاتی منصوبے زیر عمل لائے جا رہے ہیں اور ان کے نتیجے میں ملک کی دولت و خوش حالی میں جو زبردست اضافہ ہونے والا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ لوگوں کے معاشی اور معاشرتی حالات میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگا بلکہ ان کے ذہن و دماغ کا سانچہ بھی بالکل بدل جائے گا اور آج کے سارے جھگڑے قصۂ پارینہ بن کر رہ جائیں گے کیونکہ غربت و افلاس ہی ان کا اصل سرچشمہ ہیں۔

یہ تصور ہمارے بہت سے چوٹی کے لیڈروں پر کس طرح سوار تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب پچھلے دنوں جبل پور اور آسام کے لرزہ انگیز واقعات کی تفصیلات اخبارات میں شائع ہوئیں تو [illegible] کے غور تصور

لوگ شروع شروع میں انھیں سچ باور کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ انھوں نے اس طرح ان واقعات کو سنا گویا وہ محض ہندوستان کی بجائے کسی خیالی دنیا کے واقعات ہیں۔ خود وزیر اعظم پنڈت نہرو کا حادثہ جبل پور کے موقع پر جو بیان اخبارات میں شائع ہوا تھا وہ یہ تھا کہ اس سے ظاہر ہو گیا کہ ابھی لوگوں کے سوچنے کے انداز میں بڑی خامیاں ہیں لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہی ہوتی ہے۔ تغافل سے اسے بدلا نہیں جا سکتا اور نہ عقلی موشگافیوں کے ذریعہ اسے چھپا چھڑانا ممکن ہے۔ انگریزوں کو ملک سے رخصت ہوتے پندرہ سال ہو چکے ہیں اور اس مدت میں ملک کی ترقی کے لیے دو پنج سالہ پروگرام بھی زیر عمل لائے جا چکے ہیں اور اب تیسرے پروگرام کو جامۂ عمل پہنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں لیکن فرقہ وارانہ صورت حال نہ صرف یہ کہ جوں کی توں باقی ہے بلکہ اس مدت میں زبان، نسل و نسب اور صوبہ کی بنیاد پر نئے نئے جھگڑوں نے جنم لیا ہے اور آسام اور جبل پور میں تو فرقہ پرستی اور لسانی جھگڑوں کا ظہور اتنی بھیانک اور وحشت انگیز شکل میں ہوا ہے کہ آزادی سے پہلے شاید اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب ان لوگوں کی بھی آنکھیں کھل گئی ہیں جن کے خیال میں حصول آزادی یا سوشلزم کو ہندوستان کی منزل مقصود قرار دے لینے کے بعد اب ملک میں فرقہ پرستی —— اور وہ بھی اکثریت کی فرقہ پرستی —— کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی تھی اب اسے عام طور سے ایک موجود اور زندہ حقیقت تسلیم کیا جانے لگا ہے بلکہ اس سے آگے اسے ملک کی وحدت و سالمیت کے لیے ایک زبردست خطرہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ خود کانگریس نے اس کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اس مسئلہ سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کے لیے مختلف طرح کی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ کانفرنسوں پر کانفرنسیں ہو رہی ہیں اور بیانات اور تقریروں کے ذریعے پورے ملک میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہے کہ وقت کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہی بن گیا ہے اور دیگر تمام مسائل اس وقت پیچھے پڑ گئے ہیں

فرقہ پرستی کے خلاف یہ جذبہ اور اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے لیے یہ فکرمندی ملک کے مستقبل کے لیے یقیناً ایک فال نیک ہے اور ہم اسے ہر پہلو سے اطمینان کا موجب سمجھتے ہیں لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ کسی مرض سے نجات حاصل کرنے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہو سکتی کہ مریض کو اس کا احساس ہو جائے بلکہ اس کے ساتھ اس کی ضرورت ہے کہ صحیح تشخیص اور اس کے لیے مناسب دوا اور علاج کی ہے ورنہ صرف یہی نہیں کہ مرض کا ازالہ [illegible]
[illegible]

کے بعد فرقہ پرستی کے علاج کے سلسلے میں جو دوڑ دھوپ شروع ہوئی ہے اس میں ان ضروری شرطوں کا بڑی حد تک فقدان نظر آرہا ہے۔

فرقہ پرستی کا علاج اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ پہلے یہ بات متعین کی جائے کہ فرقہ پرستی کس چیز کا نام ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مختلف لوگ اس لفظ کو مختلف معنوں میں استعمال کر رہے ہیں جو چیز ایک کے نزدیک فرقہ پرستی ہے، وہی دوسرے کی نگاہ میں عین قوم پرستی ہے۔ ایک کو اس کے ایک ایسے معنی پر اصرار ہے جس کو دوسرا صریحاً دستور ہند ہی کے منافی قرار دے رہا ہے۔ ایک اس کی ایسی تعبیر پیش کرتا ہے جو اس کے خیال میں چند مخصوص جماعتوں ہی پر صادق آتی ہے لیکن دوسرا اسی تعبیر کو لیکر کچھ اور جماعتوں پر بھی اس کا اطلاق کرنا چاہتا ہے غرض اس کے معنی و مفہوم اور اس کے حدود اور دائرہ اطلاق وغیرہ کے بارے میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں جس کا اعتراف ایک بار خود پنڈت نہرو بھی کر چکے ہیں اور یہ تو ابھی تازہ بات ہے کہ حادثہ جبل پور کے بعد وزیر داخلہ ہند نے بہت شد و مد کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ فرقہ پرست جماعتوں پر قانونی پابندی عائد کی جانے والی ہے لیکن خود حکومت کے قانونی مشیروں نے یہ کہکر اس کی مخالفت کی تھی کہ فرقہ پرستی کی تعریف میں جو اشکال پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے اس قانون کا کوئی فائدہ مرتب نہ ہو سکے گا اور حکومت فرقہ پرستی کے جس تصور کو ذہن میں رکھ کر قانون بنانا چاہتی تھی اس کو بھی انھوں نے دستور کی منشا کے خلاف قرار دیا تھا جس کی بنا پر جیسا کہ اخبارات میں شائع ہوا تھا کم از کم اس وقت اس کا خیال ترک کر دیا گیا تھا

پس جب تک یہ متعین نہ ہو جائے کہ فرقہ پرستی کیا ہے جس کا قلع قمع کرنا مقصود ہے اس وقت تک اس جوش و ہنگامے سے جو اس وقت فرقہ پرستی کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے کوئی خاص فائدہ پہنچنے کی توقع نہیں کی جا سکتی، اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ آج جو لوگ اسے ختم کرنے کے لیے میدان میں نکل پڑے ہیں یا تو فرقہ پرستی کی تعبیرات کی کثرت اور ان کے باہمی اختلافات و تضاد کو دیکھ کر حیران و ششدر ہو کر بیٹھ جائیں گے یا ان تعبیرات میں سے کسی ایک کو ذہن میں رکھتے ہوئے دوسری تعبیرات ماننے والوں کے شور مخالفت کے باوجود اس پر بزن بول دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ فرقہ پرستی کو ختم کرنے کے لیے جو فوج اٹھ کھڑی ہوئی ہے وہ آپس ہی میں دست و گریباں ہوگی اور فرقہ پرستی دور کھڑی اس پر خندہ زن ہوگی۔ چنانچہ اس وقت بھی خود تعبیر ہی کے سوال پر باہمی خاصی بحث و تکرار

شروع ہوگئی ہے جب کہ ابتک معاملہ زیادہ تر صرف زبانی جمع خرچ تک محدود رہے، فرقہ پرستی کے انسداد کے لیے کوئی خاص عملی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ جب اس کا وقت آئے گا تو اس وقت صحیح طور سے اندازہ کیا جاسکے گا کہ فرقہ پرستی کی تعبیر کی تعیین کے بغیر اس کو ختم کرنے کا ارادہ کتنے بڑے مفاسد کا موجب ہے

فرقہ پرستی کے ازالے کے سلسلے میں حکومت کی با اقتدار پارٹی ہونے کی حیثیت سے کانگریس پر سب سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ بظاہر اس وقت اپنی اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے کے لیے بے چین بھی ہے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے کہ وہ یا تو سب کچھ اس کے بغیر ہی کرنا چاہتی ہے کہ اس کے ذہن میں فرقہ پرستی کی کوئی متعین تعریف ہو یا اگر ہے تو وہ شاید بالقصد اسے مخفی ہی رکھنا چاہتی ہے دراں حالیکہ فرقہ پرستی کی تعریف کی ضرورت ظاہر ہے اور اس کے مبہم رہنے سے حکومت کے ارادوں کے بارے میں مختلف حلقوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں اور پیدا ہو رہی ہیں اور مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ ایسی حالت میں ہو رہا ہے کہ حکومت نے فرقہ پرستی کے ازالے کے لیے جو پہلا قدم اٹھانا چاہا تھا خود اس کے ممبر اس کی مخالفت خاص اسی بنیاد پر کر چکے ہیں کہ فرقہ پرستی کی تعریف کے بغیر نہ صحیح سمت قدم اٹھ سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی خاص فائدہ پہنچنے ہی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس تجربے سے حکومت کو بہرحال یہ سبق حاصل کرنا چاہیے تھا کہ فرقہ پرستی کے انسداد کے لیے اس کی متعین تعریف بہرحال ضروری ہے۔ بالخصوص اس بات کے پیش نظر جیسا کہ اس کے ممبروں نے اشارہ کیا تھا، اس مسئلے سے دستور ہند کا بھی نہایت گہرا تعلق ہے جسے کسی قیمت پر بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

فرقہ پرستی کے ازالے کے سلسلے میں حکومت کے جو عزائم سامنے آئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دو طرح کی تدابیر بروئے کار لانا چاہتی ہے ایک منفی اور دوسری مثبت۔ منفی تدابیر میں وہ دو تازہ بل شامل ہیں جو پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں برائے غور و فیصلہ پیش ہو چکے ہیں اور جن کا مقصود قانون نمائندگی عوام اور تعزیرات ہند کی کچھ دفعات میں ترمیم کر کے ان کو فرقہ پرستی کے مقابلے کے لیے زیادہ مؤثر بنانا ہے اور مثبت تدابیر سے مراد وہ کوششیں ہیں جو نیشنل انٹگریشن (قومی وحدت) کے نام پر بروئے کار لائی جانے والی ہیں۔

اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ فرقہ پرستی کے ازالے کے لیے قانون سے بھی مدد لینی چاہیے اور شاید کوئی ایسا شخص ہو جو مذکورہ قانون یا ان میں پیش ہونے والی جملہ ترمیموں کو پیش نظر مقصد کے لیے کلیۃً غیر مفید

قرار دے سکی طرح اس سے بھی کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ فرقہ پرستی کے ازالہ کے لیے کچھ مثبت تدابیر اختیار کرنے کی بھی ضرورت ہے بلکہ حقیقۃً اسی نوعیت کی تدابیر پیش نظر مقصد کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں اور اس وقت تک اس ذیل کی جو تدابیر سامنے آئی ہیں ان سب کو بھی بیک قلم غیر مفید یا ناپسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن ان دونوں طرح کی تدابیر اور کوششوں پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالنے سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فرقہ پرستی کے مفہوم کی تعیین نہ ہونے کی جن خرابیوں کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ان کے لیے ان کوششوں میں کافی گنجائش ہے۔

اس وقت اس کا موقع نہیں ہے اور نہ اس بحث میں اس کی ضرورت ہی ہے کہ ہم مذکورہ بالا دونوں طرح کی کوششوں کا جائزہ لے کر ان کا حسن و قبح واضح کرنے کی کوشش کریں البتہ فرقہ پرستی کی تعیین کے بغیر جن خرابیوں کے رونما ہونے کا ہم نے خطرہ ظاہر کیا ہے اس کو نمایاں کرنے کے لیے تھوڑی سی گفتگو مجوزہ ترمیمات یا قومی وحدت پیدا کرنے کی تدابیر پر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ رالف میں جو ترمیمات پیش کی گئی ہیں ان میں کچھ تو لفظی ترمیمیں ہیں مثلاً "مختلف طبقات" کے لفظ کو بدل کر اس کی جگہ مختلف مذاہب، نسلی یا لسانی گروپ، ذاتوں اور فرقوں کے الفاظ رکھ دیے گئے ہیں جو اس لحاظ سے مناسب ہی معلوم ہوتے ہیں کہ اس ترمیم کے بعد مذکورہ دفعہ موجودہ صورت حال سے پوری طرح مربوط ہو جائے گی اور بغیر کسی تاویل و بحث کے اس کا اطلاق ان تمام صورتوں پر ہونے لگے گا جن سے اس وقت عملاً سابقہ در پیش ہے لیکن صرف ان لفظی ترمیموں ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک ترمیم کے ذریعہ اس دفعہ کے تحت آنے والے جرم کے مفہوم میں نہایت وسیع اور دور رس بنیادی ترمیم کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے مذکورہ لفظی ترمیم وضاحت و انطباق کی خوبی کے ساتھ اس دفعہ کو کہیں سے کہیں پہنچا دینے کی موجب ہو گئی ہے۔ یہ دفعہ اپنی موجودہ شکل میں ہندوستان کے باشندوں کے مختلف طبقات میں دشمنی یا نفرت کے جذبات کو ترقی دینے یا ترقی دینے کی کوشش کو جرم قرار دیتی ہے لیکن اب جو ترمیم پیش نظر ہے اس کی رو سے اس سے کہیں زیادہ آگے کسی شخص کے لیے اس بات کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جو مختلف مذہبی، نسلی یا لسانی گروہوں، ذاتوں یا فرقوں کے درمیان یکسانیت باقی رکھنے میں رکاوٹ کا موجب ہو یا ملک کے امن و امان میں خلل ڈالنے والا ہو یا جس سے خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔

ان دونوں طرح کے لفظوں کے باہمی فرق پر غور کریں تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ جو چیز پہلے جرم نہیں تھی اب اسے بھی جرم میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ہندوستان ٹائمز کے بقول اس مجوزہ ترمیم کے پیش نظر ماسٹر تارا سنگھ یا کسی بھی شخص کو جو پنجابی صوبہ کی تشکیل کے لیے جدوجہد کر رہا ہو اس پر بآسانی اس کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی حرکت کا مرتکب ہو رہا ہے جو مختلف مذہبی گروپ میں اتحاد باقی رکھنے میں مزاحم ہو سکتی ہے اور یہ الزام ثابت کر دینا بہ نسبت اس الزام کو ثابت کرنے کے زیادہ آسان ہو گا کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان دشمنی یا منافرت کو عملاً ترقی دے رہا ہے۔"

اس مجوزہ ترمیم کی حمایت میں یہ دلیل ضرور پیش کی جا سکتی ہے کہ اس دفعہ کے تحت الزام کو عدالت میں ثابت کرنا ہو گا لیکن عدالتیں قانون کے صرف الفاظ کو دیکھتی ہیں اور جب الفاظ اتنے وسیع اور مبہم ہیں تو اس دفعہ کے غلط استعمال سے تحفظ کا واحد ذریعہ حکومتوں کی صوابدید ہی ہو سکتی ہے اور حکومتیں اپنے ذاتی و جماعتی اغراض سے بالاتر ہو کر اپنے اختیارات کو بالخصوص اپنے مخالفین کے سلسلے میں جس طرح استعمال کرتی ہیں وہ ظاہر ہی ہے۔

چنانچہ اس مجوزہ ترمیم کے یہی سب پہلو ہیں جن کی بنا پر خود ٹائمز آف انڈیا نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس سے فائدہ سے زیادہ نقصان پہنچے گا اور اس نے وزیر داخلہ ہند سے اپیل کی ہے کہ وہ اسے حذف کر دیں۔

اور قریب قریب یہ سب باتیں قانون نمائندگی کی کچھ مجوزہ ترمیمات پر بھی منطبق ہوتی ہیں کیونکہ وہ بھی اسی وسیع تصور جرم پر مبنی ہیں۔

دیگر مثبت تدابیر جو نیشنل انٹیگریشن کے نام و عنوان سے زیر عمل لائی جا رہی ہیں تو ان کے بارے میں بھی ہماری رائے یہی ہے کہ مذکورہ بالا پہلوؤں سے ان میں بھی بڑا نقص پایا جاتا ہے۔ ذمہ داران حکومت اس پر ملامت کے نہیں بلا تعریف کے مستحق ہیں کہ وہ ملک میں بڑھتے ہوئے انتشار پسندانہ رجحانات کی روک تھام کرنے اور سارے ملک میں ہم آہنگی و یکجہتی کی فضا پیدا کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اس میں اگر کوئی بات قابل شکایت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ مدت دراز میں خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور واقعہ تو یہ ہے کہ جبل پور اور آسام میں زبان اور مذہب و فرقہ کے ملامت کی بنیاد پر جو شرمناک حد تک دہشت انگیز واقعات پیش آ چکے ہیں۔ اگر ان کے بعد بھی ذمہ داران حکومت یہی سمجھتے رہتے جو فرقہ پرستی کے ساتھ ہندوستان سے فرقہ پرستی وغیرہ کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے یا پنج سالہ پلانوں کے ذریعے حالات کا اقتضا از خود ملک کو ہموار تعمیری جذبات سے معمور کر دینے کا موجب ہو گا تو ان سے زیادہ بے خبری اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا لیکن ہمارے خیال میں یہ بات بھی دانشمندی اور دور اندیشی کے خلاف ہے

کی علامت کے بجائے کہ جو خاص نوعیت کے اس موقع پر سامنے آئے ہیں ان سے متاثر ہو کر اور اس سلسلے میں جو غلطیاں یا کوتاہیاں ذمہ داران حکومت سے سرزد ہوئی ہیں ان کی جلد از جلد تلافی کے خیال سے اس طرح سوچنا شروع کر دیا جائے کہ خود اپنے ہی بہت سے مسلمہ اصول پامال ہو جائیں یا اس مقصد کے لیے صحیح و برمحل تدابیر کے ساتھ ایسی تدابیر کو بروئے کار لانے کا ارادہ کر لیا جائے جن سے خود پیش نظر مقصد ہی کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

کسی ملک کی ترقی اور اس میں امن و امان کے قیام کا دارومدار بہت کچھ اس پر موقوف ہے کہ اس ملک کے آئین کا احترام و وقار باقی رکھا جائے اور اس سلسلے میں سب سے بڑی ذمہ داری حکمراں پارٹی پر عائد ہوتی ہے اگر وہ خود ایسی حرکتیں کرنے لگے جن سے ان کی طرف سے آئین کی بے اثری کا شائبہ بھی پیدا ہو رہا ہو تو اس سے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ملک کے آئین میں اگر اس بات کی یہ صراحت تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ ملک مختلف زبانوں، تہذیبوں اور مذہبوں کا گہوارہ ہے اور ان سب کے سلسلے میں اس میں مختلف طرح کے حقوق و تحفظات بھی تسلیم کیے گئے ہیں تو یہ کچھ اس بنا پر نہیں ہے کہ آئین بنانے والے کچھ غافل یا نادان قسم کے لوگ تھے یا انھوں نے محض وقتی طور پر کسی مصلحت کی خاطر ایسا کرنا ضروری خیال کیا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں ان کے لیے اس سے مفر کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور خود ہندوستان کو متحد رکھنے ہی کے خیال سے انھوں نے بظاہر اختلافات کو نمایاں کرنے والی اس صورت کو گوارا کیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اس کا نتیجہ اور زیادہ وسیع اختلافات کی شکل میں نمودار ہوتا اور نہ صرف یہ کہ ترقی و استحکام کی تمام راہیں بند ہو جاتیں بلکہ خود ملک کی آزادی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آزادی سے بہت پہلے بھی ملکی لیڈران کی طرف سے بار بار ان حقوق و تحفظات کا برابر اعلان کیا جاتا رہا ہے اور یہی بات حصول آزادی کی تحریک کی تقویت و کامیابی کی ایک بڑی وجہ ثابت ہوئی ہے اور اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ بات بھی بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ آج ہندوستان میں جو کچھ انتشار و اختلاف پایا جاتا ہے اس میں اس بات کو بھی بڑا دخل ہے کہ ذمہ داران حکومت نے ان حقوق و تحفظات کو کچھ زیادہ لائق احترام نہیں سمجھا اور بے پروائی کے ساتھ ان کو پامال کرتے رہے پس اگر آئندہ ہندوستان کو متحد و منظم دیکھنے کی آرزو ہے تو اس کے لیے یہ صورت تو قطعاً مناسب نہ ہوگی کہ کسی ایسے ہندوستان کا نقشہ ذہن میں قائم کر لیا جائے جس میں زبان، تہذیب اور مذہب کا فرق و اختلاف سرے سے باقی ہی نہ رہے اور وہ ہر لحاظ سے مل کر ایک ہو جائیں۔ ایسا صرف ایسی صورت میں ہو سکتا ہے جب یا تو زور و زبردستی کا زبردست کلہاڑا چلایا جائے یا ملک کے سامنے کوئی ایسا نظریہ زندگی پیش کیا جائے اور وہ اسے قبول بھی کر لے جس میں

اس کی صلاحیت ہو کہ وہ خود اپنے جذب و کشش سے مختلف زبانوں، تہذیبوں اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والوں کے دلوں کو کھینچ کر فکر و خیال کی وحدت کی کڑی میں اس طرح پرو دے کہ اس کے بعد یا تو یہ اختلاف سرے سے باقی ہی نہ رہ جائیں یا وہ عقل و ہوشمندی اور حق و انصاف کے حدود کے پابند بن جائیں۔ جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے اس موقع پر یہ بات تو ضرور دیکھنے میں آ رہی ہے کہ کچھ لوگوں نے اتحاد و یک جہتی کے اسی خیالی تصور کے ماتحت ایسی تجویزیں پیش کرنی شروع کر دی ہیں جن کا مطلب ایک طرح کا جبر و زبردستی ہو سکتا ہے۔ مثلاً روس کے نظام تعلیم کو نمونہ قرار دیتے ہوئے تعلیم کے ذریعہ بچوں کے ذہن کو اس خاص رخ پر لگا دینے کی کوشش لیکن ہم نہیں سمجھ سکتے کہ موجودہ جمہوری ڈھانچے میں اس طرح کے جبر و زبردستی کی گنجائش نکل سکتی ہے اور اہل ملک اسے ہنسی خوشی برداشت کر سکتے ہیں۔ رہی دوسری صورت تو وہ فی الحال اس لیے خارج از بحث ہے کہ ملک کے ارباب حل و عقد اس طرز پر سوچنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ بحالات موجودہ اتحاد و تنظیم ہی کی خاطر ملک میں مختلف زبانوں، تہذیبوں اور مذہبوں کے وجود کو برداشت کیا جائے اور دستور ہند میں ان کے لیے جو حقوق و تحفظات تسلیم کیے گئے ہیں ان کو خلوص و نیک نیتی کے ساتھ زیر عمل لایا جائے ـــــ اس کی خلاف ورزی کا صرف دستور کی خلاف ورزی نہ ہوگی بلکہ اس سے اس مقصد کو بھی سخت نقصان پہنچے گا جس کے لیے اسے گوارا کیا جا رہا ہے چنانچہ اس وقت بھی یہ صورت حال پیدا ہو چکی ہے کہ ملک کی مختلف اقلیتیں اپنے احساس کے باوجود کہ زبان و تہذیب اور مذہب کی رنگا رنگی کے ساتھ ملک کے لیے ایک خاص طرح کی یک جہتی و ہم آہنگی ضروری ہے نیشنل انٹگریشن کا نام اور اس کے نام سے زیر عمل لائی جانے والی کچھ مخصوص تدابیر کا چرچا سن کر اس بارے میں سخت اضطراب و تشویش محسوس کر رہی ہیں کہ آئندہ انھیں کس انجام سے دوچار ہونا پڑے گا اور اگر ملک کی وحدت و سالمیت عزیز ہے تو اس اضطراب و تشویش کی طرف بہرحال توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے خیال میں اقلیتوں اور ان میں خاص طور سے مسلمانوں کے اضطراب کی اصل وجہ یہی ہے کہ ابھی تک یہ واضح نہیں ہو سکا ہے کہ فرقہ پرستی سے اہل ملک بالخصوص ذمہ داران حکومت کیا مراد لیتے ہیں۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ فرقہ پرستی کی مخالفت کا جذبہ اور قومی اتحاد و یکجہتی کی ضرورت کا احساس حادثہ جبل پور کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے اس لیے مسلمانوں کو بجا طور پر یہ توقع ہو چلی تھی کہ اب ان کی جائز شکایات کی طرف خاص توجہ مبذول کی جائے گی لیکن ہو یہ رہا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مسائل پر غور و فکر کرنے کے لیے اکٹھا ہونے کی ضرورت محسوس کی تو اس کے خلاف خود

کانگریس کے ذمہ داروں کی طرف سے اس قدر دھاندلی برپا کیا گیا کہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا اجتماع ایک مخصوص طرز فکر رکھنے والوں کا اجتماع ہو کر رہ گیا اور مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے لوگ اس میں شریک نہیں ہو سکے اور اگرچہ اس اجتماع میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا گیا ہے کہ اس کی بابت اپنا قومی یک جہتی اور سیکولرزم کی تائید اور ہندوؤں کی فرقہ پرستی کے ساتھ خود مسلمانوں کی فرقہ پرستی کی مذمت کی گئی ہے اور مسلمانوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کو نہایت ادب و احترام بلکہ بڑی حد تک بہت منت و سماجت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس پر بھی اس اجتماع پر ہر طرف سے لعن طعن ہو رہا ہے اور اس لعن طعن سے وہ لوگ بھی محفوظ نہیں رہ سکے ہیں جن کی پوری زندگی کانگریس اور اس کے مقاصد و نظریات کی تائید ہی میں گزری ہے اور اب بھی وہ دل و جان سے اس کے ساتھ وابستہ ہیں کیونکہ سمجھا یہ جا رہا ہے کہ کسی فرقے کا محض فرقہ کی بنا پر اکٹھا ہونا اور اپنی شکایات کو اپنے مخصوص اور ملک کے عمومی مسائل سے الگ کر کے پیش کرنا فرقہ پرستی ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ مسلم کنونشن کے بعد ملک کے تمام وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس ہوئی ہے جس کا خاص موضوع بحث ہی فرقہ پرستی اور اقلیتوں کا تحفظ تھا لیکن اس کی جو کارروائیاں منظر عام پر آئی ہیں ان میں نہ مسلمانوں کی شکایات کا کوئی ذکر ہے اور نہ ان کے اطمینان کے لیے کسی قسم کی تجویز [illegible] - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جن شکایات پر بڑے بڑے کانگریسی مسلمان بھی بے چین ہو گئے ہیں وہ بھی ذمہ داران حکومت کے نزدیک کچھ لائق اعتنا نہیں ہیں اور خیر یہ بھی غنیمت تھا اس وقت تو صورت حال کچھ ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ مسلمان مظلوم سے زیادہ ظالم نظر آنے لگے ہیں کیونکہ سیکولر اسٹیٹ میں وہ اپنی ہستی کو متحدہ قومیت میں پوری طرح ضم کر دینے کی بجائے اپنے کو ایک علیحدہ فرقہ کے طور پر باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ کچھ حقوق کے بھی طلبگار رہیں۔

جبل پور کے حادثہ قیامت کا یہ نتیجہ سامنے آنے پر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی۔

بس اصل ضرورت فرقہ پرستی کی تعریف کی ہے کہ وہ کیا ہے اور اس ضمن میں یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ سیکولرزم کے واقعی معنی کیا ہیں۔ اس سلسلے میں ہم اپنا نقطۂ نظر تفصیل کے ساتھ کسی اور صحبت میں ظاہر کریں گے۔ فی الحال اختصار کے ساتھ یہ عرض ہے کہ اس وقت اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ملک سے [illegible] فرقہ پرستی اور قوم پرستی ہر ایک نقطۂ نظر سے ہٹ کر خالص انسانیت کے نقطۂ نظر سے غور کریں [illegible] فرقہ اور ملک کے لیے جو بھی اہمیت قرار دی جائے ان سے انسانیت کے تقاضے [illegible]

مسئلہ یا کسی فرقے یا قوم کے مسائل کو ٹھیک طور سے حل ہی کر سکتی ہیں اور اگر انہی کے نقطۂ نظر سے ہی غور کرنا ہے تو کم از کم ان کی تعریف میں انسانیت کا تصور نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ نقطۂ نظر ابھی ہمارے عام اہل ملک کی دسترس سے بہت اونچا ہے اس لیے ہم اس کی بجائے ایک دوسری اصل کی نشان دہی کرتا ہوں جس کو فرقہ پرستی کی تعریف میں اہل ملک اور بالخصوص ذمہ داران حکومت کو بہر صورت پیش نظر رکھنا چاہیے اور یہاں کا فرض بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ تعریف بہر صورت دستور ہند کے منافی نہیں بلکہ اس کے مطابق ہونی چاہیے اور جب اس ضروری شرط کو ذہن میں رکھ کر آپ غور کریں گے تو اس کی یہ تعریف تو سراسر مہمل ہی معلوم ہوگی کہ وہ شخص یا جماعت جو اکثریت کے جذبات و خواہشات کی ترجمان ہو وہ فرقہ پرست نہیں بلکہ قوم پرست ہے کیونکہ دستور کی رو سے اکثریت ہی تنہا ملک کی مالک نہیں ہے بلکہ یہاں کی اقلیتیں بھی اس کی برابر کی شریک ہیں اور اکثریت کی خواہشات محض خواہشات ہونے کی بنا پر کوئی معنی نہیں رکھتیں بلکہ ان کا صحیح یا غلط ہونا خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کے لیے بھی اور چیزوں کے علاوہ خود دستور ایک معیار کا کام دے سکتا ہے لیکن فرقہ پرستی کی یہ تعریف بھی کچھ کم غلط نہیں ہے کہ کوئی فرد یا جماعت صرف کسی مخصوص فرقے یا طبقے کے مفاد کے لیے کام کرے۔ جب دستور نے ملک میں مختلف فرقوں اور طبقوں کا وجود تسلیم کیا ہے اور ان کے لیے کچھ حقوق و تحفظات بھی تسلیم کیے گئے ہیں تو کسی مخصوص فرقے کی فلاح و بہبود کے لیے جدوجہد کرنا اور اس کے حقوق کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا بذات خود کوئی جرم نہیں ہو سکتا۔ یہ اگر جرم ہو تو پھر وطن پرستی کو بھی ایک جرم ہی قرار دینا پڑے گا کیونکہ ایک وطن پرست بھی صرف اپنے ہی ملک کے فلاح و مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے ہاں اگر کوئی فرد یا جماعت صرف اپنے فرقے کے فلاح و مفاد ہی سے غرض نہ رکھتی ہو بلکہ وہ دوسرے فرقوں کے مفادات کو نقصان بھی پہنچانے کے درپے ہو اور اس کے لیے غلط طریقے اختیار کرتی ہو یا اپنے کسی غلط کام سے ان کے درمیان نفرت و عداوت پیدا کرنے کی موجب ہو تو اس پر ضرور فرقہ پرستی کی تعریف صادق آسکتی ہے اور یہ صرف کسی فرد یا جماعت ہی کے ساتھ مخصوص بات نہیں ہے بلکہ بسا اوقات خود حکومت پر بھی اس کی کچھ خاص طرح کی سرگرمیوں کی بدولت یہ تعریف منطبق ہو سکتی ہے اور ہمارے خیال میں اس کی یہ تعریف بھی سراسر غلط ہی ہے جو اس موقع پر خاص طور سے مذہب دشمن افراد اور جماعتوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے کہ کسی دنیاوی معاملہ میں مذہب کا نام لیا جائے یا اس کا کوئی عنصر رکھا جائے۔ ہندوستان کے دستور میں کسی بھی عقیدہ و مذہب کو اپنانا کرنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کرنے اور اس کے لیے ادارے و تنظیم قائم کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے اور

دنیا میں ایسے مذاہب موجود ہیں جو دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی تفریق کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ دونوں کو ملا کر ایک وحدت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کسی معاملے میں مذہب کا نام لینا یا مذہب کے اس تصور کی تبلیغ کرنا اور اس کے لیے کوئی ادارہ یا جماعت قائم کرنا کس طرح فرقہ پرستی کے مفہوم میں داخل ہو سکتا ہے۔

اس ضمن میں بہت سے لوگ دستور کا نام لیتے ہیں کہ وہ سیکولر ہے اس لیے یہ باتیں دستور کے روح و مزاج کے خلاف ہیں لیکن وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اس دستور میں وہ باتیں بھی مذکور ہیں جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے تو یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ اسے اس معنی میں سیکولر قرار دیا جائے جس سے خود اس کی تردید ہو رہی ہو کیا دونوں باتیں ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہیں؟ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ دستور میں سیکولرزم کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس کی مختلف دفعات یا بحیثیت مجموعی پورے دستور سے جو منشا مترشح ہو رہا ہے اس کی تعبیر بہت سے لوگ سیکولرزم سے کرنے لگے ہیں لیکن ان میں جو لوگ علانیہ مذہب کے منکر یا مخالف ہیں ان میں سے بھی کم از کم ذمہ دار لوگ برابر اعلان کرتے رہے ہیں کہ دستور ہند اس معنی میں سیکولر نہیں ہے کہ وہ مذہب کے خلاف ہو بلکہ اس معنی میں سیکولر ہے کہ حکومت مذہب کی بنیاد پر ملک کے باشندوں کے درمیان کوئی تفریق روا نہ رکھے گی لہٰذا دنیاوی معاملات میں مذہب کا نام لینے کو دستور کے منافی ٹھہرانا ایک خود ساختہ بات ہے جو مذہب دشمنوں، بالخصوص کمیونسٹوں کی طرف سے پھیلائی جا رہی ہے اور آجکل فضا کو کچھ زیادہ سازگار دیکھتے ہوئے اس کا پروپیگنڈا بہت تیز کر دیا گیا ہے۔ ابھی حال میں دستور ساز اسمبلی کے ایک ممبر نے بڑی صفائی کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ دستور بناتے وقت ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہم سیکولر جمہوریت یا سیکولر اسٹیٹ بنانے جا رہے ہیں اور نہ دستور میں ایسی کوئی دفعہ ہے جس سے یہ ثابت ہو سکتا ہو کہ مذہب علی الاطلاق یا کوئی مخصوص مذہب کوئی بری چیز ہے اس کے برعکس دستور میں متعدد ایسی دفعات ہیں جو ہر مذہب کو یکساں طور سے قابل احترام قرار دیتی ہیں اس لیے اس کے خلاف جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ صحیح نہیں ہے چنانچہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ہندستان کی حکومت کی صحیح تعریف یہ نہیں ہے کہ وہ سیکولر ہے بلکہ یہ کہ وہ ایک (NON- DENOMINATIONAL) غیر فرقہ وارانہ حکومت ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس پر حکومت کے ذمہ دار خاص طور سے سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے۔

(جناب وحید الدین خاں صاحب)

"اسلام کی تعبیرات اتنے مختلف طریقوں سے کی گئی ہے کہ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ ان میں سے کون سی تعبیر صحیح ہے" ——— ایک صاحب نے کہا بے شک یہ بات بالکل درست ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آدمی اگر صحیح جذبے کے ساتھ جستجو کرے تو یقیناً وہ راہ راست کو پالے گا۔ آپ کو بھولنا نہیں چاہیے کہ اس کائنات میں ہمارے علاوہ ایک خدا بھی ہے اور وہ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کی تلاش میں نکلتے ہیں:۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا	جو لوگ ہمارے لیے جدوجہد کریں گے ہم
لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ	اپنی راہ انھیں دکھا دیں گے یقیناً اللہ بہترین
لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (عنکبوت، آخر)	عمل کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مگر اس طلب کو کامیابی تک پہنچانے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ آپ کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ آپ کو جو کچھ جاننا تھا وہ آپ نے آخری حد تک جان لیا ہے۔ اکثر صرف یہ بات آدمی کی گمراہی کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ حقیقت مجھے معلوم ہے۔ ارسطو کا خیال تھا کہ عورتوں کے منھ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں وہ اس غلطی میں صرف اس لیے مبتلا ہوا کہ وہ سمجھتا تھا کہ "میں جانتا ہوں"۔ حالانکہ اگر وہ کسی دن اپنی بیوی سے کہتا کہ تم اپنا منھ کھول کر مجھے دکھاؤ تو اسے فوراً معلوم ہو جاتا کہ اس کا یقین حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، مگر اس مشاہدے کی ضرورت اس نے نہیں سمجھی۔ کیونکہ اس نے یقین کر لیا تھا کہ وہ جانتا ہے۔ آپ ہرگز اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ یقین بذات خود برسر حق ہونے کی کوئی دلیل ہے۔ آدمی اکثر اوقات اپنے آپ کو ایک مکڑی خول میں بند کر لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے عالم واقعہ میں بس اتنی قدر موجود ہے، حالانکہ اگر وہ کسی دن باہر نکل آئے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت اس سے وسیع تر ہے جتنا وہ اپنے مکڑی خول کے اندر سے

سمجھ رہا تھا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور اس سے ہمارے تعلق کی نوعیت اتنی پیچیدہ ہے کہ کسی بھی واقعے کے بارے میں صحیح ترین رائے قائم کرنا بے حد دشوار ہے۔ ہر وہ چیز جس کو آدمی "میرا خیال" کہتا ہے وہ بے شمار ایسے اسباب کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے جس کو آدمی سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کسی واقعہ کو آپ نے کس مخصوص وقت میں دیکھا، کس رخ سے دیکھا، کس جذبے کے تحت دیکھا، کن پیشگی معلومات کے ساتھ دیکھا ——— اس قسم کے بہت سے پہلو آپ کی رائے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یہ یقین کر لیتا ہے کہ وہ حقیقت تک پہنچ گیا ہے حالانکہ وہ بالکل اندھیرے میں ہوتا ہے۔ پچھلی صدیوں میں سائنسی مطالعے کے بعد جب انسان کے سامنے یہ حقیقت آئی کہ ہمارے گرد و پیش جو واقعات نظر آتے ہیں وہ الل ٹپ نہیں ہو رہے ہیں بلکہ ایک زبردست سلسلۂ اسباب ہے جس کے تحت تمام واقعات صادر ہوتے ہیں، تو بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ انکشاف اس بات کا یقینی ثبوت بن گیا کہ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں ہے۔ "اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے" ہکسلے اس قسم کی توجیہات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:-

"———————— if events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes."

یعنی واقعات اگر طبعی اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ مگر ہم آپ جانتے ہیں کہ ہکسلے کا یہ یقین ایک دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

پچاس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک روسی شہری نے پنساری کے یہاں سے کوئی چیز خریدی۔ گھر لا کر اس کی پڑیا کھولی تو کاغذ پر چھپی ہوئی عبارت نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ لینن کے خفیہ اخبار کا ایک ٹکڑا تھا۔ وہ اس کو پڑھ کر بہت متاثر ہوا اور اس کے بعد اشتراکی لٹریچر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس مطالعہ نے اس کو اتنا گرویدہ کیا کہ بالآخر وہ روس میں اشتراکی جدوجہد کا سپاہی بن گیا۔ اس طرح کے بے شمار اشخاص ہیں جنھوں نے کسی مفکر کی تحریر کو پڑھا اور اس کے خیالات کو اس طرح قبول کر لیا گویا یہ حقیقت عالم کا انکشاف ہے جو اس مفکر کے ذریعے ان کے اوپر ہوا ہے۔ حالانکہ ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ یہ مفکر اسی طرح کے پر فریب ذہنی گمراہی میں مبتلا تھا اور ان کا ذہنی اطمینان محض ایک فریب تھا جس میں وہ خود مبتلا ہوئے اور دوسروں کو مبتلا کیا۔

یہی حال خود اسلام کا بھی ہے۔ ہمارا اسلام کی کسی تشریح پر مطمئن ہونا اس بات کا یقین حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم نے اسلام کی صحیح تشریح کو پالیا ہے۔ اگر ایسے افکار انسان کو متاثر کر سکتے ہیں جو کھلم کھلا بے دینی کی تبلیغ کرتے ہوں تو ایسے افکار جو دینی اصطلاحات میں پیش کیے گئے ہوں ان سے متاثر ہونا کیا مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں بے شمار قسم کے لوگ ہیں۔ جو طرز فکر بھی یہاں پیش کر دیا جائے، کچھ نہ کچھ ذہن ایسے مل جائیں گے جو اس کو اپنی بات سمجھ کر قبول کر لیں۔ خدا کا دین اگرچہ بذات خود نہایت واضح ہے مگر ہمارا ذہن واضح نہیں ہے۔ اس لیے اس کی سیکڑوں غلط تعبیرات کی جا سکتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک تعبیر ایسی ہوگی جو انسانوں کو دھوکے میں ڈالنے والی ہوگی۔ وہ اسی کی بنیاد پر کچھ لوگوں سے کٹیں گے اور اسی کی بنیاد پر کچھ لوگوں سے جڑیں گے۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

تَفْتَرِقُ أُمَّتِيْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّ	میری امت تہتر گروہوں میں بٹ جائے گی
سَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا	جن میں سے صرف ایک گروہ راہ راست پر ہوگا
مِلَّةً وَّاحِدَةً (ترمذی، احمد، ابوداؤد)	بقیہ سب دوزخی ہوں گے۔

ایک شخص جو ہمارے نقطۂ نظر سے گمراہی میں مبتلا ہو، اگر ہم اس سے بات کریں تو معلوم ہوگا کہ اس نے یوں ہی ایک خیال قائم نہیں کر لیا ہے بلکہ اس کے حق میں وہ بہت سے "قطعی" دلائل رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسی کا تصور حقیقت کے عین مطابق ہے۔ میں نے اکثر سوچا کہ ایسا کیوں ہے۔ حقیقت کئی نہیں ہو سکتی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ حقیقت کی مختلف تعبیریں کرتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت بلاشبہ ایک ہے مگر اس کو دیکھنے کے زاویے مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہی زاویۂ نظر کا اختلاف ہے جو حقیقت کے بارے میں مختلف تصورات پیدا کرتا ہے۔ گمراہی کی تمام صورتیں دراصل تعبیر کی غلطیاں ہیں۔ گمراہی اس کا نام نہیں ہے کہ کسی نے ایک بے سروپا افسانہ گھڑ لیا۔ بلکہ گمراہی ہمیشہ ایک موجود واقعہ کی غلط توجیہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس غلط توجیہ کے تقاضے کے طور پر بہت سی غلطیاں شاخ در شاخ نکلتی چلی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر یہ ایک واقعہ ہے کہ مختلف حیوانات کی جسمانی ساخت میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مینڈک سے لے کر انسان تک اتنی یکسانیت ہے کہ سرجری کے طلبہ کو چیر پھاڑ کی تعلیم دینے کے لیے پہلے مینڈک سے آغاز کیا جاتا ہے۔ یہ مشابہت ایک مومن کے لیے اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا خدا ایک ہے اور اس نے ساری چیزوں کو نہایت حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر اس کے حیوانات کے جسموں میں مشابہت نہ دکھائی دیتی تو ذہن

کے مخصوص حالات میں زندہ رہ کر وہ یکسانیت کے ساتھ اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتے تھے جس طرح مچھلی کو دریا میں تیرنے کے لیے مخصوص اعضا کی ضرورت ہے اسی طرح چڑیا کو ہوا میں تیرنے کے لیے اس سے ملتے جلتے اعضاء کی ضرورت ہے۔ اس صورت حال کا قدرتی تقاضا تھا کہ مچھلی اور چڑیا کی جسمانی ساخت میں یکسانیت رکھی جائے۔ مگر علمائے ارتقاء نے اس واقعہ کو ایک اور زاویے سے دیکھا تو انھیں اس کے اندر بالکل دوسری حقیقت نظر آئی ان کے لیے یہ مشابہت اس بات کی دلیل بن گئی کہ مختلف حیوانات اور انسان الگ الگ وجود میں نہیں آئے بلکہ وہ سب ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔ ایک ابتدائی جرثومۂ حیات پر مختلف مادی اسباب کے تعامل سے حیوانات کی مختلف شکلیں بنتی چلی گئیں۔ چڑیا اور مچھلی میں مشابہت بتاتی ہے کہ مچھلی نے اڑنے کی کوشش میں چڑیا کی شکل اختیار کرلی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو چیز ایک مومن کو خالق کی یاد دلاتی ہے وہی مادہ پرست ذہنوں میں جا کر خالق کی تردید بن گئی۔ ایسا صرف اس لیے ہوا کہ ایک واقعہ جو دراصل حکمت تخلیق کو بتا رہا تھا اس میں انھوں نے اس سوال کا جواب ڈھونڈھنا شروع کر دیا کہ اس کائنات کا خالق کون ہے۔ انھوں نے حقیقت کو ایک ایسے رخ سے دیکھا جو دراصل اس کا صحیح رخ نہیں تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک چیز جو صحیح مشاہدے میں ہاتھی ہو وہی غلط مشاہدہ میں ایک ابھری ہوئی چٹان نظر آئے ——— یہی صورت حال اسلام کے ساتھ بھی پیش آئے گی اگر آپ اس کے نصوص کو صحیح رخ سے دیکھنے میں غلطی کریں۔ یاد رکھیے، ایک تصور کا آپ کی نظر میں پسندیدہ ہونا دوسری بات ہے اور اس تصور کا خدا کی کتاب کے مطابق ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔ ان دونوں میں ہرگز کوئی لازمی رشتہ نہیں۔

آپ کہیں گے کہ پھر کسی تعبیر کے بارے میں کس طرح یقین کیا جائے کہ وہ دین کی صحیح تعبیر ہے۔ اس کا بالکل سادہ جواب قرآن کی اس آیت میں ہمیں مل رہا ہے :-

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ	کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ حالانکہ
كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا	اگر وہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو
فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (نساء — ۸۲)	یقیناً وہ اس کے اندر بہت سے تضاد پاتے۔

اس سے ہمیں یہ اصول ملتا ہے کہ قرآن کی کوئی بات اس کی کسی بات سے ٹکرانے والی نہیں ہو سکتی۔ اگر قرآن کی کسی تشریح پر غور کرنے سے معلوم ہو کہ وہ اس کی دوسری تعلیمات سے ٹکرا رہی ہے تو یہ اس بات کا کافی ثبوت ہوگا کہ وہ من عند اللہ نہیں بلکہ من عند غیر اللہ ہے۔ نظریاتی طور پر کسی تعبیر کی صحت جانچنے کی سب سے زیادہ قطعی پہچان یہ ہے کہ وہ دین کے پورے مجموعے سے مطابقت رکھتی ہو۔ چند فقروں سے تو ہر قسم کا نظریہ ثابت کیا جا سکتا ہے

مگر پورے مجموعے سے صرف وہی نظریہ ہم آہنگ ہو سکتا ہے جو صحیح ترین ہو۔ ہر غلط تعبیر کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کو صرف چند مخصوص آیات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خدا کی کتاب کا جو حصہ ہے وہ ایسے لوگوں کے ایمان کا جز تو ضرور ہوتا ہے مگر وہ ان کے ذہن کا جز نہیں ہوتا، ان کے فکر کو اس سے کوئی غذا نہیں ملتی۔ جب کبھی آپ دیکھیں کہ دین کی کوئی تعبیر پورے قرآن سے اتنی ہم آہنگ نہیں ہے جتنی وہ آپ کے ذہنی سانچے میں ہم آہنگ نظر آتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ قرآن کی بات نہیں ہے بلکہ آپ کی اپنی بات ہے۔ آپ کے دین کا ماخذ اگر قرآن ہے تو وہ سب سے زیادہ قرآن میں بولتا ہوا نظر آئے گا۔ اور اگر آپ نے اپنے دین کو قرآن کے سوا کہیں اور سے اخذ کیا ہے تو آپ کا دین بھی زیادہ نمایاں طور پر وہیں دکھائی دے گا جہاں سے آپ نے اسے پایا ہے۔

مگر کسی تصور کی غلطی معلوم کرنے کے لیے صرف یہی ایک چیز کافی نہیں ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا ذہن اسے دھوکا دیتا ہے۔ ایک ایسا تصور جو حقیقۃً دین کی صحیح تشریح نہ ہو اور اس کے پورے مجموعے میں بیٹھ نہ رہا ہو، وہ جھوٹی تاویلات کے ذریعہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لیتا ہے لیکن اس کے ساتھ اگر چند عملی شرائط کو بھی شامل کر لیں تو اس غلط فہمی کا امکان بھی ختم ہو جائے گا اور آپ بالکل الیقین کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ آپ نے دین کو پا لیا ہے یا ابھی تک آپ اس سے محروم ہیں۔

یہ عملی شرائط دراصل وہ علامتیں ہیں جو آپ کے مومن و مسلم ہونے کو بتاتی ہیں۔ ہر دوسرے تصور کی طرح اسلام کو بھی جب آدمی حقیقی معنوں میں اپناتا ہے تو وہ اس کی زندگی میں کچھ مخصوص نشانات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ خدا کی کتاب پر ایمان لانے کے بعد ضروری ہے کہ زندگی میں وہ نتائج ظاہر ہوں جو قرآن نے اپنے مومنین کے سلسلے میں بتائے ہیں۔ اگر یہ نتائج ظاہر نہ ہوں تو یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ آدمی کا ایمان وہ ایمان نہیں ہے جس کی تعلیم دینے کے لیے خدا کا رسول بھیجا گیا تھا۔ بلکہ وہ کوئی اور ایمان ہے جو کسی جھوٹے رسول کی معرفت اسے حاصل ہوا ہے۔ ایمان کے ان مظاہر کی کوئی ایک لگی بندھی فہرست نہیں ہے۔ ان کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہاں میں صرف چند چیزوں کا ذکر کروں گا۔

پہلی چیز یہ کہ آپ کے ایمان نے آپ کو تقویٰ کا لباس عطا کیا ہو۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ کو سورۂ اعراف کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں جب آدم و حوا نے شجر ممنوعہ کا پھل کھایا تو ان کے لباس ان کے جسموں سے اتر گئے۔ اس کے بعد انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ بالکل ننگے ہو گئے ہیں۔ اس وقت انھوں نے خدا سے معافی مانگی اور اس کی طرف رجوع کیا تو ان کا رب ان کی طرف پلٹ آیا اور ان کا لباس دوبارہ انھیں حاصل ہو گیا۔

یہ معاملہ جو ہمارے جدّ اعلیٰ کو پیش آیا، یہ دراصل ایک باطنی حقیقت کی ظاہری تمثیل تھی۔ اس میں جس لباس کے اترنے کا ذکر کیا گیا ہے وہ درحقیقت اون اور سوت کا کوئی لباس نہیں تھا بلکہ وہ لباس تھا جو اللہ تعالیٰ اپنے تمام مومن بندوں کو پہناتا ہے اور جس کو شیطان اتار دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ آدم و حوا کا قصہ بیان کرنے کے بعد عام انسانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:۔

يَا بَنِيٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ	اے آدم کی اولاد ہم نے تمہارے لیے ایک لباس
لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَ	بنایا ہے جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپاتا ہے اور تمہارے
لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ	لیے زینت ہے اور تقویٰ کا لباس وہ زیادہ بہتر
اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○	ہے۔ یہ خدا کی نشانیاں ہیں تاکہ لوگ غور کریں۔
يَا بَنِيٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ	اے آدم کی اولاد، شیطان تم کو نہ بہکائے جس طرح
اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا	اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا
لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ	تھا۔ اس نے ان کے لباس اتروا دیے تاکہ ان کی
يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا	شرمگاہیں کھل جائیں۔ وہ اور اس کا گروہ تم کو ایسے
تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ	مقام سے دیکھتا ہے جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے
اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○	ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا ساتھی بنا دیا ہے جو
(اعراف ۲۶-۲۷)	ایمان نہیں لاتے۔

گویا جس طرح ظاہری جسم کو چھپانے اور سردی گرمی سے بچنے کے لیے ہم کو ایک لباس دیا گیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک اور لباس ہمارے لیے مہیا کر رکھا ہے۔ یہ خدا کی مدد کا لباس ہے جو تقویٰ کی صورت میں ہماری زندگیوں میں ظاہر ہوتا ہے اور شیطان کے مقابلے میں زرہ کا کام دیتا ہے۔ یہ بندے کی ایمانی پیش کش کے بعد خدا کی طرف سے اس کا جواب ہے۔ (—— وآتاهم تقواهم، محمد-۱۷) یہ تقوے کا لباس شیطان کو سخت ناپسند ہے اور وہ جس کے اوپر اسے دیکھتا ہے اس کو اتار دینے کے لیے اپنی ساری کوشش لگا دیتا ہے۔ جس شخص کو حقیقی معنوں میں ایمان کی دولت نصیب ہوئی ہے وہ بالکل محسوس طور پر پاتا ہے کہ اس کے اوپر خدا کا لباس اوڑھا یا گیا ہے۔ حتیٰ کہ زندگی کی پُرپیچ راہوں میں جب کبھی شیطان اس کو وسوسے میں مبتلا کر کے اس کا لباس اتروا دیتا ہے تو وہ یکایک محسوس کرتا ہے کہ وہ ننگا ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ ٹھیک اسی طرح خدا کی طرف دوڑتا ہے جس طرح آدم و حوا درخت کے

بتوں کی طرف بھاگ گئے تھے۔ مگر جو لوگ غافل ہیں انھیں نہ تو لباسِ تقویٰ کا کوئی علم ہوتا اور نہ یہ احساس ہوتا کہ کوئی لباس تھا جو ان کے اوپر سے اتار لیا گیا ہے۔ وہ بےحس جانوروں کی طرح ننگے پھرتے رہتے ہیں اور اسی حال میں مرجاتے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جو سورہ کے آخر میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ	جو اصحاب تقویٰ ہیں جب شیطان کا کوئی اثر
طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم	انہیں چھوتا ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں اس وقت وہ
مُّبْصِرُونَ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ	دیکھنے لگتے ہیں۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں وہ ان
فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ ○ (اعراف ۲۰۱-۲۰۲)	کو گمراہی میں برابر کھینچے چلے جاتے ہیں۔

۲۔ دولت ایمان حاصل ہونے کی دوسری پہچان یہ ہے کہ آپ کو "رزقِ رب" پہنچنے لگے۔ خدا کے حکم کی تعمیل میں آپ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے۔ چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ مگر اس عمل کے دوران میں جو مخصوص کیفیات آپ پر گزرتی ہیں وہ آپ کے اختیار میں نہیں ہیں۔ آپ خود سے انھیں پیدا نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کیفیات کہاں سے آتی ہیں۔ وہ در اصل خدا کی طرف سے ہیں۔ یہ مومن کا رزق ہے جس کے بغیر اس کی ایمانی شخصیت زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہی وہ "رزق" ہے جس کو حضرت مریم کے پاس دیکھ کر وقت کے نبی نے پوچھا تھا "یہ تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے"۔ انھوں نے جواب دیا۔ هو من عند الله (آل عمران) آپ کی کوششیں آپ کا عمل ہیں اور یہ کیفیات وہ بدلہ ہیں جو خدا کی طرف سے حسنِ عمل کے صلے میں دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بہترین انعام کو ادھار نہیں چھوڑا بلکہ اسے نقد رکھا ہے۔ بندۂ مومن اس انعام کو اسی لمحہ پا لیتا ہے جب وہ اس کے پانے کا استحقاق پیدا کرتا ہے۔ جب ہمارا آقا ہمارے کسی عمل کو قبول کرتا ہے اس وقت حیرت انگیز طور پر کچھ ملکوتی قسم کی واردات ہمارے اوپر گزرتی ہیں —— یہ اس جنت کا تعارف ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے مومنین صالحین سے وعدہ کیا ہے۔ یہ بلاغ بہشت کی خوشبو ہے جس کو اہل ایمان دنیا کے اندر پاتے ہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اہل ایمان کو جو جنت ملنے والی ہے وہ ان کے لیے ایک "رزق معلوم" (صافات۔ ۴۱) ہوگا۔ وہ ان کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں ہوگی بلکہ وہ ایک جانی پہچانی چیز ہوگی جس سے وہ دنیا کی زندگی میں آشنا ہو چکے تھے۔

وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا	اور اللہ انھیں جنت میں داخل کرے گا جس
لَهُمْ (محمد - ۶)	کی پہچان انھیں کرا دی ہے[1]۔

---

[1] حدیث میں ہے۔ لاحدکم بمنزلہ فی الجنۃ اعرف منہ بمنزلہ فی الدنیا۔ دنیا میں کوئی شخص جس طرح اپنے (باقی اگلے صفحہ پر)

جب آدمی کو ایسا صدقہ کرنے کی توفیق ہوتی ہے جس کے اندر الذین یؤتون ما آتوا وقلوبہم وجلۃ کی روح کام کر رہی ہو، جب اس کو ایک ایسی تلاوت نصیب ہوتی ہے جب وہ ترٰی اعینہم تفیض من الدمع کی تصویر بن گیا ہو، جب وہ ایک ایسی رات گزارتا ہے جس کو ہمارے رب نے تتجافیٰ جنوبہم عن المضاجع کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جب اس پر وہ لمحات گزرتے ہیں جس میں وہ الذین آمنوا اشد حبا للہ کی حقیقت کا ادراک کرتا ہے، جب اس کے اوپر ایمان کی لطیف ترین حیات وارد ہوتی ہیں، جب چھپی ہوئی حقیقتوں کا کوئی پردہ اس کے اوپر سے اٹھایا جاتا ہے، جب وہ بیقرار دل اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اپنے آقا کو ایسے الہامی الفاظ میں پکارتا ہے جن کو پہلے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا —— تو یہ دراصل ایک رزقِ رب ہوتا ہے جو اسے پہنچا ہے۔ وہ ان پھلوں میں سے ایک پھل کا مزہ چکھتا ہے جو اس کے رب نے اس کے لیے چھپا رکھے ہیں۔ دنیا میں ان پھلوں کا نام ایمانی کیفیات ہے اور آخرت میں وہ جنت کے انعامات کی صورت میں ملیں گے۔ اس وقت اہل ایمان محسوس کریں گے کہ یہ تمام وہی چیزیں ہیں جن کا مزہ دنیا کی زندگی میں انھیں چکھایا گیا تھا:

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ	جب انھیں جنت کا کوئی پھل ملے گا تو وہ کہیں
رِّزْقًا قَالُوا هَٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ	گے کہ یہ وہی ہے جو پہلے ہم کو دیا گیا تھا۔ اور ان کو
قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا (بقرہ ۲۵)	ملتے جلتے پھل دیے جائیں گے۔

یاد رکھیے آخرت میں جو کچھ اہل جنت کو ملنے والا ہے وہ عطائے متشابہ ہے، وہ مومن کی معلوم و معروف چیز ہے پھر کس قدر نادانی ہوگی اگر کوئی شخص سمجھے کہ وہ آخرت میں ان ذائقوں کو پا سکتا ہے جن سے وہ دنیا کی زندگی میں آشنا نہیں ہوا تھا۔ اگر دنیا میں آپ پر ایسے لمحات نہیں گزرے جبکہ آپ تمام چیزوں سے زیادہ اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرتے ہوں تو آخرت میں خدا کی قربت آپ کو کس طرح مل سکتی ہے۔ بے شک نماز اتنے بڑے اجر کی موجب ہے جس کو دیکھ کر آخرت میں نمازیوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ مگر یہ نعمت تو صرف اسی کا حصہ ہے جو دنیا میں ایسی نمازوں سے آشنا ہوا ہو جس کے متعلق رسول نے فرمایا ہے۔ جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ

۳۔ اس سلسلے کی تیسری پہچان یہ ہے کہ آپ کی زندگی کبھی جمود و تنزل کا شکار نہ ہو۔ جو شخص حقیقی معنوں

(پچھلے صفحہ کے حاشیہ کا بقیہ) اپنے گھر کو پہچانتا ہے، جنت میں جانے والے اس سے زیادہ اپنے مقام کو پہچان لیں گے۔ اسی طرح ایک اثر ہے: ان حسناتہ تکون دلیلاً لہ الی منزلہ فیہا۔ اہل جنت کے اعمال انھیں جنت میں اپنا مکان بتائیں گے۔ (روح المعانی)

میں ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے اس کو دنیا کی زندگی میں خدا کی طرف سے "حیاتِ طیبہ" کی توفیق عطا کی جاتی ہے (نحل — ۹۷) پھر کس قدر ناقابلِ قیاس ہو کہ جس کے لیے خود خدا کی طرف سے "حیاتِ طیبہ" کے انتظامات کیے گئے ہوں وہ بے حسی اور تنزل میں مبتلا ہو۔ ایسا ہونا اس بات کا ثبوت ہو کہ آدمی کا ایمان خدا کے یہاں قبول نہیں کیا گیا۔ بجلی کے لیمپ میں آپ کو اس کا تجربہ ہوا ہوگا کہ اس کا پلگ اگر ٹھیک سے لگا ہوا نہ ہو اور آپ بٹن دبائیں تو لیمپ یا تو کم روشنی دے گا یا جل کر بجھ جائے گا۔ یا صرف تار سرخ ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اگر پلگ ٹھیک سے بٹھا دیا جائے تو لیمپ پوری طرح روشن ہو جاتا ہے اور مسلسل روشنی دیتا رہتا ہے۔ ٹھیک یہی حال آپ کی ایمانی معرفت کا بھی ہے۔ اگر آپ کو ادھوری معرفت حاصل ہوئی ہو تو آپ کی زندگی میں ایمان کے کچھ شرارے ضرور نظر آئیں گے مگر وہ ناقص اور عارضی ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ کو مکمل معرفت حاصل ہو جائے تو آپ کی پوری زندگی جل اٹھے گی اور مرتے دم تک جلتی رہے گی۔ اس کے شعلے کبھی ماند نہ ہوں گے۔ حقیقی ایمانی معرفت نام ہے ایک ایسے پاور اسٹیشن سے اپنا تعلق جوڑنے کا جس کا انجن کبھی فیل نہیں ہوتا۔ پھر جس کو یہ تعلق نصیب ہوا ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ جل کر بجھ جائے، یا جلے بھی تو محض ٹمٹماتا رہے۔

یہی نہیں بلکہ ہدایت کی راہ پر آپ کو ہمیشہ آگے بڑھنا چاہیے۔ ایمان آدمی کو ایک ایسے خدا سے جوڑتا ہے جو کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْن کی خصوصیت رکھتا ہو۔ (الرحمٰن) پھر ایسے خدا کو جو شخص پالے وہ کسی ایک مقام پر ٹھہرا ہوا کس طرح رہ سکتا ہے۔ جب دینے والے کی طرف سے ہر آن بخشش کا سیلاب جاری ہے تو پانے والے کو بھی ہر آن اس میں سے اپنا حصہ پانا چاہیے۔ ایسا نہ ہونا دراصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی اس منبعِ فیض سے اپنا تعلق قائم نہ کر سکا۔ وہ ابھی کسی اور جگہ اٹکا ہوا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی (محمد — ۱۷)	اور جنھوں نے ہدایت کی راہ پکڑی اللہ ان کی ہدایت کو بڑھاتا ہے۔

آخر میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ کر دینا ضروری ہے۔

دین کی مختلف تعبیرات کی طرف جن وجوہ سے لوگ کھنچے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ اس کے ذریعے دین کو کچھ فائدے ہو رہے ہیں۔ انھوں نے سوچا کہ جس کوشش سے دین کو اتنے فائدے پہنچ رہے ہوں وہ یقیناً صحیح کوشش ہوگی

---

[۱] ضحاک نے حیاۃ طیبہ کی تفسیر ان لفظوں میں کی ہے۔ ھی العمل بالطاعۃ والانشراح بھا (ابن کثیر)

ہوگی۔ (موجودہ زمانے میں بیرونی ملکوں میں قادیانی تبلیغ کے متعلق بہت سے لوگوں کے تاثرات اس کی ایک مثال ہیں) مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی لازمی رشتہ نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی کوشش دین کے لیے کسی پہلو سے مفید ہو مگر جو لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں وہ خود صراط مستقیم پر نہ ہوں اور ان کی اپنی آخرت کے لیے یہ جد وجہد کچھ زیادہ مفید نہ ہو۔ کچھ سرمایہ دار مل کر ایک تجارتی دارالاشاعت قائم کریں اور قرآن کے نہایت صحیح نسخے چھاپ کر بہت بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں اس کو فروخت کریں تو اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس سے دین کو فائدہ پہنچے گا۔ مگر یہ یقینی نہیں ہے کہ خود کاروبار کرنے والوں کی آخرت کے لیے بھی یہ چیز ضرور مفید ہوگی۔

اصل یہ ہے کہ دین کے نام پر ہونے والی کوششوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک 'شہادتِ دین' اور دوسرے وہ جس کو ہم 'حفاظتِ دین' کہہ سکتے ہیں۔ شہادتِ دین کی تحریک وہ ہے جو خالص دین کی تبلیغ کے لیے اٹھے اور اس کی صحیح ترین شکل میں کام کرے۔ جس میں نظری اور عملی اعتبار سے کوئی خلا نہ ہو۔ یہی مطلوب ہے اور آخرت میں وہی لوگ دراصل خادمِ دین کی حیثیت سے اٹھائے جائیں گے جنھوں نے اس انداز سے کام کیا ہو۔ حفاظتِ دین کی تحریک وہ ہے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر دین کو تقویت پہنچے۔ مثلاً دشمن کے مقابلے میں مدافعت، اس کے کسی جز کو باقی رکھنے کی جد وجہد وغیرہ[1]۔ اس دوسرے کام کے لیے صحتِ فکر یا صحتِ عمل ضروری نہیں ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَيُؤَيِّدُ هٰذَا الدِّيْنَ بِرَجُلٍ فَاجِرٍ ۔	اللہ ایک فاجر آدمی سے بھی اس دین کی مدد کرے گا۔

دوسری بات یہ کہ تعبیری غلطیوں کے منطقی نتائج اس کے تمام پیرووں میں ظاہر ہونا ضروری نہیں ہیں۔ کسی تعبیر پر تنقید اس کی جن کمزوریوں کی طرف اشارہ کر رہی ہو اگر کوئی شخص اس سے متاثر ہونے کے باوجود اپنے اندر ان کمزوریوں کو نہ پاتا ہو تو یہ تنقید کے غلط ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔ تعبیر چونکہ تاریخ سے الگ نہیں ہوتی بلکہ وہ تاریخ ہی کو نئے انداز سے پیش کرتی ہے، اس لیے اس سے متاثر ہونے والے اکثر اوقات اس مخصوص تعبیر کے منطقی نتائج کے ساتھ ساتھ ان تاریخی اثرات کو بھی اپنے اندر لیے رہتے ہیں جو نسلی اور روایتی طور پر پہلے سے ان کے اندر جگہ بنائے ہوئے تھے۔ جرمن پادری ٹاٹ (TODT) کہ جس میں سوشلزم کا علم بردار تھا۔ (باقی صفحہ پر)

[1] اس تقسیم کا مطلب نہیں ہے کہ حفاظت اور شہادت دو بالکل الگ الگ کام ہیں [illegible] جس کی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ دراصل ایسی تقسیم کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی واقعہ کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا جائے جو زیادہ ابھرا ہوا ہو یا پورے مجموعے میں اصل حیثیت رکھتا ہے۔

رسول کی پہچان

(سید جلال الدین عمری)

خدا کا رسول رسالت کی حقیقت سے براہ راست واقف ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو اپنے رسول ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے وہ شعوری طور پر جانتا ہے کہ اس کو منصب رسالت حاصل ہوا اور خدا اس سے خطاب کر رہا ہے۔ رسالت اس کے لیے کوئی قیاسی اور استدلالی چیز نہیں ہوتی بلکہ ایک مشاہداتی حقیقت ہوتی ہے۔ جس طرح ہم اپنے کسی ذاتی تجربے اور مشاہدے کے بارے میں شک نہیں کرتے ٹھیک اسی طرح خدا کے رسول کو بھی رسالت کے بارے میں کوئی شک اور تردد نہیں ہوتا۔

رسالت کے بارے میں اس نوعیت کا یقین اس شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا جو خدا کا رسول نہیں ہے۔ رسالت کی کیفیت کا اس کو تجربہ یا مشاہدہ نہیں ہوتا اس لیے وہ اس کی حقیقت کو براہ راست جان نہیں سکتا۔ سوال یہ ہے کہ پھر رسالت پر اس کے یقین کا کیا ذریعہ ہے؟ وہ کس بنیاد پر خدا کے رسولوں پر ایمان لائے؟ وہ کیسے معلوم کرے کہ کون شخص خدا کا رسول ہے اور کون خدا کا رسول نہیں ہے؟ مذہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے اطمینان کے لیے خدا کا رسول اپنی رسالت کے ثبوت میں معجزات پیش کرتا ہے۔

معجزات

معجزہ ایک مذہبی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی واقعہ جس ترتیب کے ساتھ اس عالم میں ظاہر ہوتا ہے رسول کی صداقت کے ثبوت میں وہ ترتیب بدل جائے۔ فرض کیجیے رسول کے کہنے پر لکڑی سانپ اور اژدہے کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو یہ معجزہ ہوگا کیونکہ کسی جاندار کے وجود میں آنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ یا رسول کی دعا سے زلزلہ اور طوفان آجائے تو یہ معجزہ کہلائے گا کیونکہ زلزلہ اور طوفان کے اسباب معلوم ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ان اسباب میں انسان کی دعا شامل نہیں ہے۔

اس طرح کے واقعات دنیا کی تقریباً تمام قوموں اور جماعتوں میں مشہور رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے واقعات تاریخ کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اس لیے ان پر یقین نہیں کیا جا سکتا لیکن ساتھ ہی بعض واقعات اس تسلسل اور تواتر کے ساتھ ثابت ہیں کہ ان کا انکار کرنا دشوار ہے۔

بعض لوگ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس قسم کے واقعات رسول کے دعویٰ رسالت کا ثبوت ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کوئی واقعہ جن اسباب کے نتیجہ میں عام طور پر وجود میں آتا ہے، انسان ان ہی کو دیکھتا ہے اس لیے سمجھتا ہے کہ یہی اس واقعہ کے حقیقی اسباب ہیں کوئی دوسرا سبب اس واقعہ کو وجود میں نہیں لا سکتا۔ حالانکہ کبھی بعض واقعات کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے مخفی اور غیر عادی اسباب موجود ہوتے ہیں۔ ان مخفی اور غیر عادی اسباب کے نتیجے میں جو واقعات ظاہر ہوتے ہیں رسول ان کو معجزہ کا نام دیتا ہے اور ان کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ سادہ لوح انسان اس پر اس لیے یقین کر لیتے ہیں کہ وہ ان اسباب کو دیکھ نہیں پاتے یا وہ کسی واقعہ کو جس شکل میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں یہ صورت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دریا کا پانی کچھ دیر کے لیے دو حصوں میں بٹ جائے اور درمیان میں خشکی ظاہر ہو جائے تو رسول اس کو معجزہ سے تعبیر کرے گا۔ حالانکہ دریا میں مدوجزر ہمیشہ ہوتا ہی رہتا ہے لیکن عام طور پر اس میں شدت نہیں ہوتی۔ کبھی یہی مدوجزر زیادہ شدید ہو کر ایسی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے جس کو رسول معجزہ قرار دیتا ہے۔

معجزات کی تردید میں یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو رسالت کے انکار کے لیے کوئی بہانہ تلاش کر رہا ہو۔ ایک شخص آپ کے سامنے خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ آپ اس سے ثبوت مانگتے ہیں اور وہ پتھر سے اونٹ نکال کر آپ کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے اس کو دیکھ کر ہر شخص یہی کہے گا کہ رسول کے دعوے کے ثبوت میں یہ واقعہ ظاہر ہوا ہے اگر کوئی اس کی توجیہ یہ کرتا ہے کہ یہ واقعہ اس لیے وجود میں آیا کہ اس کو وجود میں لانے والے اسباب موجود تھے البتہ وہ اسباب پوشیدہ تھے جن کی طرف ہر شخص کی نظر نہیں جا سکتی تھی۔ جب کسی واقعہ کو وجود میں لانے والے اسباب جمع ہو گئے تو وہ لازماً وجود میں آئے گا خواہ رسول اس کو اپنے دعویٰ رسالت میں پیش کرے یا نہ کرے۔ تو وہ ایسی توجیہ کرتا ہے جسے کوئی معقول انسان صحیح نہیں مان سکتا۔ معجزہ اگر نا قابل قبول ہے تو یہ توجیہ اس سے زیادہ نا قابل قبول ہے۔ جس واقعہ کو وجود میں لانے والے اسباب پوشیدہ طور پر کام کر رہے تھے سوال یہ ہے کہ رسول کو ان کا پہلے سے علم کیسے ہو گیا؟ کیا یہ خود اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ کائنات کے بہت سے اسباب جو ہم سے پنہاں ہیں وہ رسول کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ آج تک کوئی شخص پوری کائنات کو نہ تو سمجھ سکا ہے اور نہ کسی نے اس کا دعویٰ کیا ہے۔ کائنات کو بہت کم ہم نے جانا ہے اس کا بڑا حصہ ہمارے لیے ایک سربستہ راز ہے۔ رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو کائنات کی بہت سی حقیقتوں کا علم ہے جن سے ہم ناواقف ہیں۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ کہتا ہے کہ

یہ مردہ جو تمہارے سامنے پڑا ہوا ہے خدائے تعالیٰ ابھی اس کو زندہ کرنے والا ہے اور اس کے کہنے کے مطابق مردہ میں جان آجاتی ہے کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ اپنے دعوی میں سچا ہے اور اس کو ایسی حقیقتوں کا علم ہے جو آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہیں؟

اب آپ اس پر غور کیجیے کہ رسالت کے دعوی کے ساتھ کسی واقعہ کا غیر عادی طور پر ظاہر ہونا دعوی کرنے والے کی صداقت کی دلیل کیسے بن جاتا ہے؟ اگر کسی کے حکم سے خشک زمین سے پانی کا چشمہ ابل پڑے تو اس سے یہ بات کیسے ثابت ہو گئی کہ اس کے پاس وحی آتی ہے اور وہ براہ راست خدا کے کلام کو سن رہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ معجزہ منطقی معنی میں رسالت کی دلیل نہیں ہے۔ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی قدرت کا ایک غیر معمولی مظاہرہ ہے۔ لیکن چونکہ یہ مظاہرہ رسول کے دعوی رسالت کے ساتھ ہوتا ہے، اس سے رسول یہ ثابت کرتا ہے کہ خدا سے اس کا ایک خاص نوعیت کا تعلق ہے جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہے اور اسی تعلق کو وہ وحی و رسالت کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ فرض کیجیے ایک شخص یہ کہتا ہے کہ وہ فلاں حکومت کا سفیر اور نمائندہ ہے اور اس کا ثبوت اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کو ایک سفارشی خط لکھتا ہے اور اس کی سفارش منظور ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ اس کے سفیر ہونے کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہوگا البتہ اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کا حکومت سے بہت ہی گہرا اور قریبی ربط و تعلق ہے اور یہ ربط و تعلق دعوی کرنے والے کے بقول سفارت کا ہے۔ اسی طرح معجزہ رسول کے دعوی رسالت کے ساتھ مل کر اس کی صداقت کی دلیل بن جاتا ہے۔

جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں ان کے لئے معجزہ کا ظہور بعید از امکان نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اس کائنات میں بڑے سے بڑا واقعہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر خدا ہے اور واقعات کی ترتیب اس کی قائم کردہ ہے تو وہ ان کو اپنی مرضی سے بدل بھی سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ بھی اس طرح کے امکان کو رد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس بات کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ واقعات جس ترتیب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں وہ ناقابل ترمیم ہے۔ اور اس کی جگہ کوئی نئی ترتیب قائم نہیں ہو سکتی۔ انسان جب تک ان تمام اسباب کا احاطہ نہیں کر لیتا جو کسی واقعہ کے وجود کا ذریعہ بنتے ہیں اس وقت تک وہ یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ کونسا واقعہ کب اور کس شکل میں ظاہر ہونے والا ہے۔ اس کائنات میں واقعات کی جو ترتیب قائم ہے اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ اس ترتیب میں تبدیلی کا اب تک مشاہدہ نہیں کیا گیا لیکن اس سے اس کا امکان ختم نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی واقعہ اس ترتیب کے خلاف ثابت ہو تو اس کا انکار ضد اور ہٹ دھرمی اور اپنے مشاہدہ پر اصرار کے ہم معنی ہوگا۔

معجزات رسالت کا جزو نہیں ہوتے بلکہ وہ رسالت کی حقیقت سے خارج کی چیز ہیں۔ رسول اس دعویٰ کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے کہ اس کو خدا کی ذات و صفات کا تفصیلی علم ہے۔ اگر رسول سے کسی معجزہ کا صدور ہوتا ہے تو یہ اس دعویٰ کی اصل حقیقت میں شامل نہ ہوگا بلکہ اس کی صداقت کا ایک خارجی ثبوت ہوگا۔ رسول کی صداقت کو براہ راست جانچنے اور اس کی اصلیت کو سمجھنے کے دو ذرائع ہیں۔ رسول کی تعلیمات اور رسول کی سیرت

رسول کی تعلیمات

خدا کے رسول کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسانوں کو خدا کا صحیح اور تفصیلی تعارف کراتا ہے۔ خدا کا اپنے بندوں سے کیا رشتہ ہے اور وہ ان سے کیا چاہتا ہے؟ اس کی رضا و غضب کے کیا اصول ہیں؟ موت و حیات کا سلسلہ کیوں قائم ہے؟ اس کی قدرت کے کیا معنی ہیں؟ کیا اس کی صفات انسانوں کی صفات سے مشابہ ہیں یا ان سے مختلف؟ اگر وہ اپنی صفات میں انسانوں سے مشابہ ہے تو انسانوں میں اور اس میں کیا فرق ہے؟ اگر وہ اپنی ذات و صفات میں انسانوں سے مختلف ہے تو اس کے علم و حکمت اور قدرت و اقتدار کے کیا معنی ہیں؟ خدا جس شخص کو اپنا رسول منتخب کرتا ہے اس پر یہ تمام حقیقتیں کھول دیتا ہے اور یہ حقیقتیں جس حد تک انسانی عقل کی گرفت میں آسکتی ہیں رسول ان کو پوری وضاحت اور تعین کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ جو شخص خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کرے اور اس کو خدا کے بارے میں تفصیلی علم نہ ہو تو ہم سمجھیں گے کہ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

رسول خدا کا جو تعارف کرا رہا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟ خدا کی ذات و صفات کی جو تفصیلات ہم رسول کی زبان سے سن رہے ہیں کیا حقیقت وہی ہے یا اس سے مختلف؟ اس کے فیصلہ کی پہلی بنیاد آپ کی عقل اور فطرت ہے جو آپ کو خدا کے مجمل یقین تک پہونچاتی ہے۔ انسان پہلے خدا کے وجود پر اطمینان حاصل کرتا ہے اس کے بعد رسول پر ایمان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو شخص خدا کو نہ مانتا ہو اس کے لیے خدا کے رسول کو ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ رسالت پر ایمان کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خدا کے وجود پر یقین ہو۔ یہ یقین مجمل ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے پہلو مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں۔ خدا کا رسول ان کو کھول کر بیان کرتا ہے۔ بہت سے تضاد اور تناقص ہوتے ہیں۔ خدا کا رسول ان کو رفع کرتا ہے لیکن خدا کا رسول خدا کا ایسا کوئی تصور نہیں دیتا

جس سے انسان کی فطرت نا آشنا ہو اور نہ وہ خدا کے یقین کی جو بنیاد انسان کے اندر پہلے سے موجود ہوتی ہے اس کو مسمار کرکے کوئی نئی بنیاد رکھتا ہے۔ انسان کے باطن میں خدا کے علم و یقین کی جو جھلک موجود ہے اس کو جھٹلانے والا کبھی خدا کا رسول نہیں ہو سکتا۔ انسان خدا کے رسول کو رسول اسی وقت مان سکتا ہے جبکہ خدا کے بارے میں اس کی تعلیمات ان تصورات سے ہم آہنگ ہوں جو اس کو اپنی فطرت سے ملے ہیں۔ اگر وہ خدا کا کوئی ایسا تصور پیش کرتا ہے جس سے اس کی فطرت مانوس نہیں ہے تو وہ اس کو رد کر دے گا۔

اس بات کو ذرا وضاحت سے سمجھنے کے لیے آپ اس طرح غور کیجیے۔ کیا آپ کو خدا پر یقین اس وجہ سے ہوتا ہے کہ رسول خدا کے وجود کا دعویٰ کرتا ہے یا اس وجہ سے کہ یہ کائنات اس کی محتاج ہے؟ دوسرے الفاظ میں خدا کا یقین خارج سے ٹھونسی جانیوالی کوئی چیز ہے یا وہ آپ کے اندر سے ابھرتا ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اس کائنات پر غور و فکر کے نتیجہ میں جب انسان پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ خدا کے بغیر نہ تو اس کا وجود میں آنا ممکن ہے اور نہ وہ ایک لمحہ کے لیے قائم رہ سکتی ہے تو وہ بے اختیار خدا کا اقرار کرنے لگتا ہے۔ یہ اقرار ایسی کسوٹی ہے جس پر انسان رسول کی صداقت کو پرکھتا ہے۔ رسول خدا کی ذات و صفات کی ہزار تفصیلات پیش کرے انسان اس روشنی میں سمجھ سکتا ہے کہ کیا یہ وہی خدا ہے جس کا وجود اس کائنات کے لیے ضروری ہے یا کوئی ایسا خدا ہے یہ کائنات جس کی محتاج نہیں ہے؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ سارے انسانوں کی ذہنی سطح ایک نہیں ہے ان کے انداز فکر جدا اور سوچنے کے ڈھنگ مختلف ہیں کسی کے ذہن میں خدا کا تصور منطقی ترتیب کے ساتھ موجود ہوگا۔ کوئی خدا کا سادہ تصور رکھتا ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ انسان اپنی کسی فکری خامی کی وجہ سے صحیح نہج پہ کائنات کا مطالعہ نہ کر سکے اور خدا کے بارے میں غلط تصور کا شکار ہو جائے۔ لیکن جب بھی اس کے سامنے خدا کی ذات و صفات کی تفصیلات آئیں گی ان پر غور و فکر کے لیے وہ اسی تصور خدا کو بنیاد بنائے گا جو پہلے سے اس کو حاصل ہے۔ اگر اس کے ذہن و فکر میں کوئی خامی ہے تو رسول کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے اس خامی کی اصلاح کرے تاکہ وہ خدا کے صحیح تصور تک پہونچ سکے۔

ہماری اس بحث سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان کے ذہن میں خدا کا جو اجمالی تصور ہوتا ہے رسول صرف اس کی تفصیل کرتا ہے۔ اس کے پاس فی نفسہ خدا کے وجود پر دلائل نہیں ہوتے یا وہ ان کو پیش نہیں کرتا خدا کے رسول کے پاس خدا کے وجود پر قوی ترین دلائل ہوتے ہیں۔ جو شخص خدا کا منکر ہے رسول ان دلائل کو اس

کے سامنے پیش بھی کرتا ہے۔ان دلائل سے جب کوئی شخص مطمئن ہو جاتا ہے اور خدا کو ایک حقیقت کے طور پر ماننے لگتا ہے تو وہ رسول کے دعویٰ رسالت پر غور کرتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ جن وجوہ و اسباب کی بنا پر وہ خدا کو مان رہا ہے۔رسول کی تعلیمات اس سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں؟ اگر رسول کی تعلیمات اس سے ٹکرا رہی ہوں تو کبھی وہ اس کو رسول تسلیم نہیں کر سکتا۔

جو شخص خدا پر یقین رکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات آپ سے آپ وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کا ایک پیدا کرنے والا ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔فرض کیجئے اگر رسالت کا دعویٰ کرنے والا خدا کی ذات کا اس طرح تعارف کراتا ہے کہ اس سے کائنات کے لیے خدا کا وجود ضروری نہ قرار پائے تو انسان اپنے اس یقین کی بنیاد پر مدعی رسالت کی تعلیم کو باطل اور خلاف واقعہ سمجھے گا۔اس کائنات میں اصول و ضابطہ کی فرمانروائی دیکھ کر انسان یہ تصور اخذ کرتا ہے کہ خدا اپنے تمام کاموں میں با اصول ہے بے ضابطگی اس کی شان کے خلاف ہے۔اگر کوئی شخص خدا کو بے اصول ثابت کر کے اس کے یقین کو رد کرنا چاہے تو وہ اس کو جھوٹا اور افترپرداز قرار دے گا۔اسی طرح انسان خدا کو ہر پہلو سے مستغنی اور اپنے ارادہ و عمل میں آزاد تصور کرنے پر مجبور ہے اس لیے وہ کبھی اس شخص کو خدا کا رسول نہیں مانے گا جو خدا کو محتاج اور اپنے فیصلوں میں کسی دوسرے کا پابند بتائے۔

رسول کی تعلیمات پر غور و فکر کی ایک اور بنیاد ہے جسے ہم رسولوں کی شہادت کہہ سکتے ہیں۔مذہب کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں آپ کو ملیں گی کہ خدا کے رسول نے کسی متعین شخص کا نام لیکر یا اس کی صفات، زمانہ اور مقام کی صراحت کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ خدا کا رسول ہے ظاہر ہے اس صورت میں اس شخص کے رسول ہونے میں ان لوگوں کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا جو گواہی دینے والے کو خدا کا رسول مانتے ہیں۔وہ جو بات بھی خدا کا نام لیکر پیش کرے گا اس کو وہ خدا ہی کی طرف سے سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔

شہادت کی ایک دوسری قسم بھی ہو سکتی ہے اور وہ ہے رسولوں کی تعلیمات کی شہادت۔جس فرد یا افراد کو ہم خدا کا رسول مانتے ہیں وہ اگر کسی شخص کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں تو اس گواہی کا تعلق خاص اسی شخص سے ہوگا جس کے بارے میں گواہی دی جا رہی ہے۔ہم اس کو پھیلا نہیں سکتے لیکن رسولوں کی تعلیمات کے ذریعہ ہم ہر مدعی رسالت کے رسول ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔جو شخص رسالت کا دعویٰ کر رہا ہے اگر اس کی تعلیمات دوسرے رسولوں کی تعلیمات سے مل جاتی ہیں تو یہ اس کے رسول کے رسول ہونے کا ایک قوی ترین ثبوت ہوگا رسالت کا دعویٰ کوئی بے بنیاد دعویٰ نہیں ہے۔انسانیت اس دعویٰ سے مانوس ہے۔یہ دعویٰ ماضی کے مختلف ادوار میں بلند ہوتا

رہا ہے۔ بلکہ مذہبی کتابوں کا تو بیان ہے کہ اس زمین پر پہلا شخص جو آیا وہ خدا کا رسول تھا خیال ہوتا ہے کہ اس سے وجود میں آنے والی نسل اس کو خدا کے رسول ہی کی حیثیت سے جانتی اور مانتی رہی ہوگی اس کو کبھی یہ شبہ نہیں ہوا ہوگا کہ وہ خدا کا رسول نہیں ہے۔ اس کے بعد جن لوگوں نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا انسان نے اس پہلے رسول کی تعلیمات کی روشنی میں ان کی صداقت کو جانچنا شروع کیا ہوگا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا رسولوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور انسان بہتر طریقہ پر سمجھنے لگا کہ خدا کے رسول کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں؟ اور وہ کیا پیغام دیتا ہے؟

یہ ایک فطری بات ہے کہ جس شخص کے حالات، نظریات اور مزاج سے آپ واقف ہوں اگر اس کے خلاف کوئی اطلاع آپ کو پہونچے تو آپ اس پر یقین نہیں کرتے بلکہ اطلاع دینے والے کی صداقت کے بارے میں شبہ کرتے ہیں۔ تاریخ کی ان ہی روایات کو مستند سمجھا جاتا ہے جو تواتر کے ساتھ منقول ہیں شاذ روایات کو جوان کے خلاف پڑتی ہیں رد کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح خدا کے رسولوں نے خدا کا ایک تصور پیش کیا ہے۔ گو اس تصور میں بہت سے اختلافات پیدا ہو چکے ہیں لیکن ان اختلاف کو ہٹانے کے بعد بعض باتوں پر سب لوگ متفق ہیں۔ دنیا اصولی طور پر جانتی ہے کہ اخلاق و سیرت اور تہذیب و تمدن کے بارے میں رسولوں کی کیا تعلیمات ہیں؟ ان کے نزدیک انسان خدا کی رحمت کا کب مستحق ہوتا ہے اور کب اس پر خدا کا غصہ نازل ہوتا ہے؟ کونسے اعمال خدا کے پسندیدہ ہیں اور کونسے ناپسندیدہ؟ اس کے ہاں عدل ہے یا وہ ظلم بھی کرتا ہے؟ جو شخص خدا کا رسول ہے وہ کبھی ان تعلیمات کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ دس آدمی جس حقیقت کا مشاہدہ کر چکے ہیں اگر گیارھویں آدمی نے بھی اس حقیقت کو دیکھا ہے تو اس کو اس حقیقت کے بیان میں ان دس آدمیوں سے اتفاق کرنا چاہیے۔ اگر وہ اپنے بیان میں ان سے اختلاف کرتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ حقیقت تک اس کی رسائی نہیں ہوتی ہے رسولوں کے کے ذریعہ جو تعلیمات ملی ہیں ان کی روشنی میں انسان خدائی تعلیمات اور غیر خدائی تعلیمات کے درمیان آسانی سے فرق کر سکتا ہے اور یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ رسالت کا دعویٰ کرنے والوں میں کون واقعتاً خدا کا رسول ہے اور کون خدا پر افترا پردازی کر رہا ہے؟

رسول کی سیرت

طبیعات کی دنیا میں جو دعویٰ کیا جائے، براہ راست تحقیق کے ذریعہ اس کی صداقت معلوم کی جا سکتی

ہے۔ لیکن جس دعویٰ کا تعلق طبیعات سے باہر کی دنیا سے ہو اس پر یقین کا حقیقی ذریعہ صرف ایک ہے وہ یہ کہ ہم دعویٰ کرنے والے کے بیانات پر اعتماد کریں۔ اس کو سچا اور راست باز مان لیں۔ رسول ہمارے سامنے جن حقیقتوں کا اظہار کرتا ہے، ہم براہ راست تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ اس کی تردید یا تصدیق کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ وہ ہمارے لیے خالص استدلالی حقیقتیں ہوتی ہیں ان کی تفصیلی کیفیت ہم صرف رسول کی زبان سے معلوم کرسکتے ہیں اور رسول کے رسول ہونے کا سب سے بڑا اور حقیقی ثبوت خود اس کی سیرت ہے۔ اس کی کتاب زندگی کو کھولیے اور دیکھ لیجیے کہ وہ رسول ہے یا نہیں؟ انسان کے عمل کا رشتہ اس کے ماضی سے بندھا ہوتا ہے۔ اس کی پچھلی زندگی اس کی موجودہ زندگی کی ترجمان ہوتی ہے۔ جس شخص کے ماضی کا آپ نے گہرا مطالعہ کیا ہے اس کے حال اور مستقبل کے بارے میں آپ صحیح رائے دے سکتے ہیں۔ انسان جس منزل کی طرف سو قدم بڑھ چکا ہو لازماً اس کا اگلا قدم اسی منزل کی طرف اٹھے گا۔ بعض اوقات انسانوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ اپنے ماضی سے لڑا دن ہے۔ حالانکہ ان تبدیلیوں کے اسباب ان کی پچھلی زندگی میں بہت دور تک پھیلے ہوتے ہیں۔

خدائے تعالیٰ جس شخص کو اپنے رسول کی حیثیت سے انسانوں کے درمیان کھڑا کرتا ہے وہ سیرت و کردار کی سب سے اونچی سطح پر ہوتا ہے۔ خدا کا رسول جن لوگوں سے خطاب کرتا ہے وہ اس کی سچائی، امانت، دیانت اور عہد کی پابندی کے پہلے سے معترف ہوتے ہیں۔ ان میں سے جس شخص کو جس پہلو سے اس کی زندگی کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے وہ اس کی سیرت کو بے داغ اور بے عیب دیکھتا ہے وہ اگر اس کے ساتھ کبھی تجارت کرتے ہیں تو اس کو امین اور دیانتدار پاتے ہیں۔ وہ اس کو معاملہ کا پکا، بات کا سچا اور عہد کا پابند نظر آتا ہے۔

خدا کے رسول منصب رسالت کے ملنے سے پہلے نیکی اور شرافت کے روشن چراغ ہوتے ہیں۔ بداخلاقی، بدعہدی، ظلم، جھوٹ اور مکر و فریب کی تاریکی میں دنیا ان سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ اخلاقی زوال اور پستی سے انسان، انسانیت ہی سے مایوس ہونے لگتا ہے تو ان کو دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھتی ہے۔ انسان جب کسی امین اور دیانت دار شخص کا تصور کرتا ہے تو اس کے ذہن کے سامنے ان ہی کی تصویر آتی ہے۔ اس کو کسی پابند عہد اور بات کے سچے انسان کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ بے اختیار ان کی طرف دوڑتا ہے وہ جب مخلص اور خیر خواہ انسان کا خیال کرتا ہے تو اس کو وہی افراد یاد آتے ہیں جو بعد میں خدا کا پیغام اس کو سنانے والے ہوتے ہیں۔

ایسے بلند سیرت افراد میں سے کوئی فرد اپنی قوم کے سامنے جب یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے تو

ان میں جو خود غرض اور ہٹ دھرم نہیں ہوتے وہ اس اعلان کی تردید کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتے جس شخص کی زبان جھوٹ سے کبھی آلودہ نہ ہوئی ہو، وہ جرأت نہیں کر سکتے کہ اس کو جھوٹا قرار دیں وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ جس شخص کو انھوں نے سالہا سال تک انسانوں کا خیر خواہ اور مخلص پایا ہو اس کو کیسے انسانیت کا دشمن کہا جائے؟ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جس سے کسی ایک فرد نے کبھی دھوکا نہ کھایا ہو وہ پوری قوم کو دھوکا دے سکتا ہے؟ ان کی عقل ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتی کہ جس شخص نے کبھی کسی انسان کو صدمہ نہ پہونچایا ہو اس سے پوری انسانیت کو نقصان پہونچنے والا ہے۔

رسول کے دعوی رسالت کا عموماً وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو حق کو کسی دوسرے کی زبان سے سننا نہیں چاہتے۔ جو آسانی سے اپنے باطن کے احساسات کو دبا تو سکتے ہیں لیکن کسی کی قیادت اور رہنمائی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ جنکو اپنے ضمیر کی آواز کو جھٹلانے اور خدا کی رحمتوں سے دور رہنے کا افسوس نہیں ہوتا البتہ اپنے مفادات یا اقتدار و حکومت کے چھوٹ جانے کا غم گھلاتا رہتا ہے۔

رسول کی سنجیدگی

انسان کی سیرت کے چند خاص پہلو ہیں جو اس کی بات میں وزن پیدا کرتے ہیں اور اس کو غور و فکر کے قابل بناتے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں حیثیت اس کی سنجیدگی کو حاصل ہے۔ انسان کی سنجیدگی بسا اوقات اس کی صداقت کی زبردست دلیل بن جاتی ہے اور سننے والا مزید کسی دلیل کا مطالبہ کیے بغیر اس پر یقین کرنے لگتا ہے۔ انسان اگر اپنی بات میں سنجیدہ نہیں ہے تو خواہ وہ علم و فضل کے کتنے ہی بلند مقام سے کیوں نہ بول رہا ہو کوئی شخص اس کو قابل التفات نہیں سمجھتا۔ بسا اوقات مخاطب بڑی سے بڑی حقیقت کو جھٹلا دیتا ہے اگر اس کو سنجیدگی کے ساتھ اس کے سامنے نہ لایا جائے اور کبھی کسی مہمل بات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جبکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ سنجیدگی کی حامل ہے۔ سنجیدہ دعوی آپ اپنی عظمت کا ثبوت ہے۔ انسان کی سنجیدگی اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ مذاق نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ ان کو ایک حقیقی واقعہ سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ دنیا اس کی باتوں کو ہنسی کھیل نہیں سمجھتی بلکہ اہمیت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

کوئی شخص اپنے دعوی میں سنجیدہ ہے یا نہیں؟ اس کو ناپنے کا کوئی متعین پیمانہ نہیں ہے سنجیدگی و عدم سنجیدگی کا فیصلہ دو اور دو چار کی طرح ریاضی کے کسی فارمولے کی بنیاد پر ہم نہیں کر سکتے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جسے دعوی کرنے والا اور جس کے سامنے دعوی کیا جا رہا ہے دونوں پوری طرح محسوس کرتے ہیں جب کوئی بات انتہائی شدت اور اہمیت کے ساتھ کسی کے دل میں اتر جاتی ہے تو اس کا پورا وجود اس میں ڈھل

ول کی پہچان
تا ہے اور جب وہ کسی کے سامنے اس کا اظہار کرتا ہے تو اس کے ایک ایک لفظ اور اس کی ایک ایک حرکت وادا سے
س بات کی اہمیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اگر کسی کے گھر آگ لگ جائے اور وہ لوگوں کو اس کی اطلاع دے تو اس کا پورا
وجود اس واقعہ کا ترجمان بن جائے گا اور ہر انسان اس سے دلیل کا مطالبہ کئے بغیر اسکی مدد کے لیے دوڑ پڑے گا
خدا اور آخرت کا یقین اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے جن لوگوں پر یہ حقیقت کھلتی ہے۔ ان کو دنیا کی
ہر چیز ہیچ نظر آنے لگتی ہے اور یہی ایک حقیقت ان پر چھا جاتی ہے۔ وہ اس کی عظمت وہیبت سے کانپتے ہوتے ہیں۔ وہ
اس حقیقت کا اظہار انسانوں کے سامنے اس طرح کرتے ہیں گویا غور وفکر کے قابل یہی ایک حقیقت ہے۔ وہ جب دیکھتے
ہیں کہ انسان چھوٹے چھوٹے واقعات کے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے اور اس کی نگاہ سے یہ عظیم حقیقت چھپی ہوتی ہے تو وہ
انتہائی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ اس کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ اس غم میں گھلتے رہتے ہیں کہ انسان
خدا سے غافل ہے۔ وہ اس کو ہر طرف سے پھیر کر خدا کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جن افراد تک پہونچ سکتے ہیں ان تک
پہونچتے ہیں اور ان کو ان کی عاقبت سے باخبر کرتے ہیں۔ وہ ہر کھلے مجمع میں جاتے ہیں اور ہر انفرادی صحبت سے فائدہ اٹھاتے
ہیں۔ وہ بے قرار ہوتے ہیں کہ خدا کا کوئی بندہ خدا کے عذاب کی زد میں نہ آجائے۔ ان کو سب سے بڑی فکر یہ ہوتی ہے
کہ ان کا پیغام لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔ ان کے کسی مخاطب کا سینہ ان کی دعوت سے خالی نہ رہے۔
خدا کے رسول اسی دردمندی اور اخلاص کے ساتھ ایک لمبی مدت تک اپنی دعوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس
راہ میں ہر طرح کے مصائب اور مشکلیں آتی ہیں لیکن ان کی پیشانی پر بل نہیں پڑتے۔ وہ دشواریوں سے گھبرا کر اپنی دعوت
سے باز نہیں آتے بلکہ اس کو اور شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ دعوت کا انکار ان کے نزدیک اس کی اہمیت کو بڑھا
دیتا ہے اور وہ اپنی قوت کا ایک ایک شمہ اس کی وضاحت میں لگا دیتے ہیں۔ ان کی یہ تڑپ اور بے چینی صاف بتاتی ہے
کہ وہ اپنی آنکھوں سے کوئی بہت بڑا خطرہ دیکھ رہے ہیں جس سے وہ ہر اس شخص کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں جس تک انکی
آواز پہونچے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی شخص اس خطرہ سے ناواقف نہ رہے۔
خدا کے رسول جن قوموں سے خطاب کرتے ہیں ان کے سنجیدہ اور باہوش افراد رسولوں کی اس روش کو دیکھکر
یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ان پر کسی عظیم ترین حقیقت کا انکشاف ہوا ہے۔ وہ کچھ ایسے واقعات کا مطالعہ کر رہے ہیں
جن تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس یقین کی وجہ سے ان کو اپنے موجودہ موقف پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی
ہے اور جب وہ اپنے موقف کے حق میں مضبوط دلائل نہیں پاتے تو آگے بڑھ کر رسول کی دعوت کو شرح صدر
سے قبول کر لیتے ہیں۔
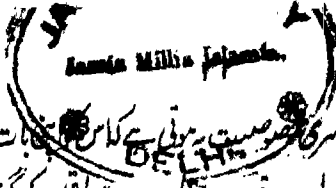
رسول کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کو اپنی بات پر بے پناہ یقین ہوتا ہے

پختہ یقین جو بھی شخص رسول سے قریب ہوتا ہے وہ اس یقین کی گرمی محسوس کرتا ہے۔ اس کا سینہ جس ایمانی کیفیت سے سرشار ہوتا ہے وہ بات بات میں جھلکتی رہتی ہے۔ زندگی کے کسی مرحلہ اور کسی حال میں اس یقین میں کمی نہیں آتی۔ دنیا کا کوئی واقعہ اور سانحہ رسول کے یقین کو متزلزل نہیں کرتا بلکہ اس میں اور شدت آجاتی ہے خوشی اور غم کے مواقع پر انسان کا باطن کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ آدمی کے حقیقی جذبات، بیوی بچوں میں اور بے تکلف صحبتوں میں چھپے نہیں رہ سکتے۔ جس شخص کو سانپ ڈس لے اس وقت اس کی زبان سے جو کلمات نکلیں گے وہ آپ کو بتائیں گے کہ زندگی اور موت کے بارے میں اس کا حقیقی نقطۂ نظر کیا ہے؟ رنج و راحت، خوف و اطمینان، مرض اور صحت ہر حال میں رسولوں سے خدا کی ذات پر جس مضبوط یقین کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ ان کی صداقت کا زبردست ثبوت ہے۔ انسان اپنے نازک ترین لمحات میں کسی مفروضہ اور خیالی تصور کا کبھی سہارا نہیں لے سکتا۔ وہ ایسی ہی چیز پر اعتماد کر سکتا ہے جو حقیقت بن کر اس کے رگ و ریشہ میں اتر چکی ہو۔

ایک شخص سو رہا ہے اس کا دشمن ہاتھ میں ننگی تلوار لیے اسے جگا کر سوال کرتا ہے! بتا اب تمہیں کون بچا سکتا ہے؟ اور وہ پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیتا ہے اللہ! اس ایک لفظ کے ذریعہ بولنے والا خدا پر اپنے اعتماد کا ایسا ثبوت پیش کر رہا ہے کہ آپ کسی دلیل سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیا آپ اس کے اس اعتماد کو غیر حقیقی کہہ سکتے ہیں؟ کیا آپ اس پر یہ الزام لگا سکتے ہیں کہ وہ موت و حیات کا مالک خدا کے سوا کسی اور کو سمجھتا ہے؟ اس ایک لفظ میں جو زور اور قوت ہے دشمن کی تلوار میں بھی وہ زور اور قوت نہیں۔ تلوار چوک سکتی ہے لیکن اس یقین کی کاٹ سے دشمن بچ نہیں سکتا۔ اس لفظ کے کان میں پڑتے ہی وہ بے اختیار پکار اٹھے گا کہ یہ شخص اپنی بات میں سچا ہے۔ اور میں لوہے کے ٹکڑے سے سچائی کا مقابلہ کر رہا ہوں۔

جو شخص اپنی پریشانی کے اوقات میں خدا کی طرف لپکے کون شبہ کر سکتا ہے کہ وہ خدا کو اپنی آخری پناہ نہیں سمجھتا ایک شخص جس کو اس کی بیوی شب میں بستر سے غائب پا کر تلاش کرتی ہے تو اس حال میں دیکھتی ہے کہ وہ خدا کے حضور سجدہ میں سر رکھے پڑا ہے اور درد بھرے انداز میں کہہ رہا ہے "خدایا تو میری مغفرت فرما۔ میں تیری حمد و ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا"۔ اسے ہم کس زبان سے خدا پر جھوٹ باندھنے والا کہیں۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو کسی کی صداقت کو جانچنے کا آخر کیا معیار قرار دیا جا سکتا ہے؟

جو انسان خدا کے رو برو اس حال میں کھڑا ہو کہ اس کے خوف سے کانپ رہا ہو۔ اس کے سینہ سے آہ و زاری اور

خوف وخشیت کی آواز اس طرح سنی جاتے جیسے چولہے پر ہانڈی جوش مار رہی ہو جس پر خدا کے نعمات کا احساس اس قدر غالب ہو کہ عبادت کرتے کرتے پیر ورم کر جائیں لیکن پھر بھی وہ یہ سمجھے کہ حق نعمت ادا نہ ہوا۔ خدا کے بارے میں اس کے احساسات کے صحیح ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

خدا کے رسول تنہائی میں مجلس میں، بات چیت میں، اٹھتے بیٹھتے میں، خوشی اور غم میں خدا کی ذات پر جس اعتماد کا اظہار کرتے ہیں اسے دیکھنے والی آنکھ کبھی اس شبہ میں نہیں پڑ سکتی کہ خدا سے ان کا بہت ہی گہرا رشتہ نہیں ہے۔ انسان دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ جو شخص اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کر چکا ہو خدا کے بارے میں اس کے احساسات جھوٹے نہیں ہو سکتے۔

قول وعمل میں مطابقت

انسان کو جو قوتیں اور صلاحیتیں ملی ہیں اور جو وسائل وذرائع اس کو میسر ہیں ان کی اس کے نزدیک بڑی قدر وقیمت ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ حاصل کر سکتا ہے اسی سرمایہ سے حاصل کر سکتا ہے۔ اس کو کھونے کے بعد وہ دنیا کی ہر چیز سے محروم ہے۔ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے بعد اس کا کسی مقصد کو حاصل کرنا اور کسی تمنا کو پورا کرنا ناممکن ہے۔

رسول انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو خدا کی راہ میں لگا دیں کیونکہ کل خدا کی رحمتیں اس شخص کے حصہ میں آنے والی ہیں جو اپنا سب کچھ خدا کے لیے لٹا دے اور جو ایسا نہ کر سکے اس کو خدا کے عذاب کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔ اس دعوت کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس اس کا اپنا کچھ نہیں رہا۔ اس کے سارے وسائل وذرائع جن سے وہ اس دنیا کی کامیابی ڈھونڈھ سکتا تھا خدا کے لیے وقف ہو گئے۔ اب وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی ہر خواہش خدا کے احکام کے تابع ہو گئی۔

انسان اتنا بڑا اقدام کرنے سے پہلے دیکھنا چاہے گا۔ کہ جس شخص پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے اس کا طرز زندگی کیا ہے؟ کیا وہ محض ایک قول ہے یا اس کے دل سے نکلی ہوئی آواز؟ وہ اگر خلوص کے ساتھ اس کو حق سمجھتا ہے تو اس کی پوری زندگی اس کی گواہی دے گی۔ اس پر عمل میں ہزار دشواریاں اور دقتیں ہوں لیکن اس کے قدم کبھی کسی دوسری راہ پر نہیں پڑ سکتے۔ ورنہ یہ اس کے قول کی آپ اپنی تردید ہوگی۔

انسان کی بات کی سب سے بڑی تائید خود اس کی زندگی سے ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات پر زمین وآسمان کی ہزار دلیلیں فراہم کرے لیکن اس کا عمل اس کی بات کے حق میں نہیں ہے تو وہ بے وزن ہو جائے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو لفظ نکالتا ہے اپنے ایک ایک عمل سے اس کے حق یا باطل ہونے کی شہادت فراہم کرتا ہے اور یہ شہادت اتنی واضح ہوتی ہے کہ

دسری کسی دلیل میں اتنی تاثیر اور قوت نہیں ہے جب انسان پر کوئی فکر اس طرح چھا جاتی ہے کہ نہ تو طمع اور لالچ اس
اس سے پھیر سکتے ہیں اور نہ وہ کسی مصیبت اور پریشانی سے گھبراتا ہے تو دنیا یہ ماننے پر مجبور ہوتی ہے کہ یہ ایسا فکر ہے
ہکے لئے قربانی دی جاتی ہے ۔

خدا کے رسولوں پر جس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے وہ اس کے بارے میں "اول المسلمین" ہونے کا اعلان
تے ہیں۔ وہ جس منزل کی طرف بلاتے ہیں اس کے وہ پہلے مسافر ہوتے ہیں۔ وہ جس راہ پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں
راہ کی گرد ان کے جسم پر موجود ہوتی ہے۔ وہ جب حق کی راہ میں مصیبتیں اور دشواریاں جھیلنے کی تلقین کرتے ہیں تو ان
پاؤں کے آبلے شہادت دیتے ہیں کہ کس طرح حق کے لئے تکلیفیں جھیلی جاتی ہیں۔ وہ حق سے کنارے رہ کر اس کے
آئل مناقب نہیں بیان کرتے بلکہ ان کی زبان اس وقت کھلتی ہے جبکہ ان کی پوری زندگی پر حق کی حکومت قائم ہو جاتی
.. ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات ایک ہی حقیقت کے ترجمان ہوتے ہیں ایک کو دیکھ کر دوسرے کو سمجھا جا سکتا ہے ان
یالات بتاتے ہیں کہ ان کی زندگی کیا ہے اور ان کی زندگی ظاہر کرتی ہے کہ وہ دوسروں سے کیا چاہتے ہیں۔ ان کی زبان
ان کے نظریات کی قولی تشریح ہوتی ہے اور ان کی زندگی اس کی عملی تعبیر پیش کرتی ہے ۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں حضرت عائشہؓ سے کسی نے سوال کیا تو انھوں نے جواب
کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ مطلب یہ کہ قرآن کو دیکھ کر تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ آپ کے اخلاق کیا ہیں۔ قرآن اور آپ
ندگی میں کوئی تضاد نہیں ہے جو چیز تمہیں قرآن میں ملے گی وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں جلوہ گر ہوگی۔

رسولوں کی تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ ان پر ان کے دشمنوں تک نے نفاق کا الزام نہیں لگایا انھوں نے کبھی یہ
کہا کہ خدا کے رسول جس بات کا دعویٰ کرتے ہیں عمل سے اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان کی تعلیمات جس طرف رہنمائی کرتی
ان کی سیرت اس کے خلاف لے جاتی ہے۔ قول و عمل کی یہ مطابقت اور ہم آہنگی آپ اور کہیں نہیں دیکھ سکتے ۔

رسولوں کی سیرت کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ اپنے ہر کام میں بے غرض اور مخلص ہوتے ہیں

بے غرض دعوت اس صفت کے ہونے میں خاص وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں کسی بات
اتی غرض شامل ہو جائے اس کی صداقت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اگر آپ انسانیت کے مفاد کی کوئی بات کہیں لیکن
کے پیچھے کوئی ذاتی غرض کام کر رہا ہو تو آپ کے حق میں مخاطب کی نفسیات بدل جائیں گی۔ وہ یقین نہیں کر سکتا کہ جو
[illegible] دوسروں کی فلاح کا داعی ہوگا
ہر شخص کے [illegible] اور وہ صحیح خادم بھی ہو سکتا ہے۔ وہ آدمیوں کی زبان سے [illegible]

بات چلتی ہے لیکن اغراض مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص قوم کی خدمت کا دعوی لے کر اٹھتا ہے اور اپنی دنیا بنانے اور اپنی خستہ حالت کو ٹھیک کرنے لگتا ہے دوسرا شخص یہی دعویٰ کرتا ہے اور اپنی آباد دنیا کو اجاڑ کر قوم کو فائدہ پہونچاتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی شخص کی پیشانی پہ پہلے سے لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ کون اپنے دعوی میں مخلص ہے اور کون اس کو اپنی دنیا کمانے کا ذریعہ بنانے والا ہے۔ اس کا علم آپ کو ان کی سیرت سے ہوگا۔ ان کی کل تک کی معروفیت اور جدوجہد کو دیکھ کر آپ فیصلہ کر سکیں گے کہ آئندہ ان کی زندگی کا رخ کیا ہوگا جو شخص اپنی پچھلی زندگی میں مفاد انسانیت کا دشمن رہا ہو اس کے کسی بھی دعوی کے بارے میں انسان کا پہلا تاثر یہی ہوگا کہ یہ دام مکر و تزویر ہے۔ اس شخص کا مخلص ہونا دلیل محتاج ہے جس کے خود غرض اور غیر مخلص ہونے کا ثبوت اس کے ماضی میں موجود ہے۔ جو ہاتھ کل تک تخریب میں معروف رہا ہو انسان کے لیے ناممکن ہے کہ بغیر کسی دلیل کے آج اس کو تعمیر کرنے والا سمجھ بیٹھے۔ لیکن جس شخص کے بارے میں آپ کا تجربہ اس کے برعکس ہو۔ جس کو آپ ایک بے غرض اور سچے انسان کی حیثیت سے جانتے ہوں۔ انسانوں کے ساتھ جس کی ہمدردی اور خیر خواہی ہر شبہ سے بالاتر ہو۔ کسی بھی معاملہ میں اس پر کوئی اخلاقی گرفت نہ کی جا سکی ہو، اس کو جھوٹا کہنا صداقت اور شرافت کی موت ہے، خواہ وہ کتنا ہی اونچا سے اونچا دعوی کیوں نہ کر رہا ہو، اس کی بات ہماری سمجھ میں آرہی ہو یا نہ آرہی ہو۔ اگر ایسے انسان بھی اخلاقی گراوٹ میں مبتلا ہو سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اخلاق کی بلندی، سیرت کی مضبوطی، کردار کی پختگی دنیا سے اٹھ گئی۔ اب کسی کو نہ تو یہ حق پہونچتا ہے کہ کسی معاملہ میں اپنی صداقت کا دعوی کرے اور نہ اس کو سچا ماننا کسی کے لئے جائز ہے۔ خدا کے رسول رسالت کا دعوی اتنے بلند مقام سے کرتے ہیں کہ دشمنوں تک کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی دنیا بنانے کے لیے اٹھے ہیں اور اپنے اس پیغام کے ذریعہ کوئی ذاتی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا ایسے شخص کو کیسے جاہ طلب اور عزت و شہرت کا خواہاں کہنے کی جرأت کرے گی جس کی بے نفسی کا یہ عالم ہو کہ لوگ اس کو سجدہ کرنے کی اجازت چاہیں تو وہ جواب دے نہیں! ہرگز نہیں! یہ انسانیت کی توہین ہے کہ انسان کا سر خدا کے سوا کسی اور کے آگے جھکے۔ جو اپنے ساتھیوں کو اس سے بھی منع کرے کہ وہ اس کی آمد پر کھڑے ہوں۔ جس کی نصیحت ہو کہ میری تعریف و توصیف میں اس طرح مبالغہ نہ کیا جائے جس طرح گمراہ قوموں نے مبالغہ کیا۔

جس شخص کے سامنے حکومت و ریاست، دولت و ثروت اور حسن و جمال اس شرط پر پیش کیا جائے کہ وہ خدا کا پیغام پہونچانے سے باز آجائے اور وہ اس پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے بے نیازانہ جواب دے یہی نہیں بلکہ تم آسمان سے چاند اور سورج اتار لاؤ اور میرے ہاتھ پر رکھ دو تب بھی میں اس پیغام سے باز نہیں آسکتا۔ ایسے شخص پر بہت بڑا بہتان لگاتا ہے جو اس کو دنیا کا بھوکا کہتا ہے اور اس کے دعوی رسالت کو دنیا کمانے کی تدبیر سمجھتا ہے۔

جس شخص کے پاس اقتدار ہو، حکومت ہو، مال و دولت کی فراوانی ہو لیکن اس کے آرام کے لیے کوئی نرم بستر تک نہ ہو اس کو بوریے پر لیٹا ہوا دیکھ کر اس کے ساتھی گدا تیار کرنے کی خواہش کریں تو جواب دے یہ دنیا آرام کی جگہ نہیں۔ اس دنیا میں میری حیثیت مسافر کی ہے جس طرح مسافر کسی درخت کے سایہ کے نیچے کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاتا ہے لیکن اس کو اپنی منزل نہیں سمجھتا اسی طرح دنیا میری منزل نہیں ہے۔ وہ جس کمبل پر آرام کرتا ہے اس کی بیوی اسے تہہ کر کے بچھا دے تو اس پر سونے کے بعد جس کا یہ تاثر ہو کہ یہ خدا سے غافل کرنے والی چیز ہے بڑی ناانصافی ہوگی اگر اس کے بارے میں کہا جائے کہ وہ دنیا کی خاطر نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ کیا کوئی دنیا کا چاہنے والا ایسا بھی گزرا ہے جو عیش کے سارے سامان کے باوجود فقر و فاقہ کی زندگی گزار دے اور جو دنیا سے اتنا فائدہ اٹھانا بھی پسند نہ کرے جتنا فائدہ ایک بے حیثیت آدمی اس دنیا سے اٹھا لے جاتا ہے۔

ایسا انسان جس کی موت اس حال میں آئے کہ اس کی زرہ رہن رکھ کر غلہ حاصل کیا گیا ہو، جو تنہائی میں دعا کرے کہ خدایا میری اولاد کو قوت لایموت دے جو اپنے ذاتی مال میں بھی اپنے گھر والوں کا حصہ نہ قرار دے دل کہتا ہے کہ وہ دنیا دار نہیں ہے۔ وہ خاندان اور قبیلہ کی خاطر خدا پر تہمت نہیں باندھ سکتا۔

یہ بے غرضی اور یہ اخلاص اور یہ بے مثال قربانیاں ہمارے سامنے سوال بن کر آتی ہیں۔ کہ ایک ایسا شخص جو اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مالک ہے جو اگر چاہے تو اپنی دنیا ہم سے بہتر طریقہ سے بنا سکتا ہے وہ کیوں عسرت و تنگی برداشت کر رہا ہے؟ عیش و عشرت اس کا استقبال کرتی ہے تو کیوں وہ اسے ٹھکراتا ہے؟ آخر وہ کتنا بلند مقصد ہے جس کے لیے یہ بہترین قوتیں اور صلاحیتیں صرف ہو رہی ہیں؟ اگر انسان تعصب کا مارا ہوا نہ ہو اور حق کے لیے اس کے دل کے دروازے کھلے ہوں تو وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ جو شخص واقعتاً خدا کے لیے نہ کھڑا ہو اس کے اندر یہ بے غرضی اور بے نفسی کبھی نہیں پیدا ہو سکتی جس وقت اس کے اندر یہ احساس ابھرے گا اس کو خدا کے رسول کا گرویدہ بنا دے گا۔[1]

---

[1] رسولوں کی سیرت کے اظہار کے لیے واقعات ہم نے سلسلہ رسالت کی آخری کڑی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے لیے ہیں۔ آپ کی سیرت پر تمام رسولوں کی سیرت کو قیاس کرنا چاہیے۔ کیوں کہ سیرت کی بلندی رسولوں کے درمیان قدر مشترک کے طور پر پائی گئی ہے۔

دو اہم قراردادیں

(سید احمد عروج قادری)

گزشتہ اشاعت میں انڈین مسلم کنونشن کے بارے میں مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کی قرارداد کا مختصر جائزہ لیا گیا تھا۔ آج اس مختصر مقالے میں اس کی دو اہم قراردادوں —— قومی یک جہتی اور سیکولرزم —— پر اظہار خیال مقصود ہے۔ مناسب ہوگا کہ پہلے قرارداد کا متن یہاں نقل کر دیا جائے۔ اس کے بعد اس کے تجزیے کی کوشش کی جائے۔ قومی یک جہتی پر جو قرارداد منظور کی گئی ہے وہ یہ ہے:

قومی یک جہتی

"ملک میں لسانی، جغرافیائی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر جو تعصبات ابھر رہے ہیں، مجلس شوریٰ ان کو تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس کی اصلاح و تدارک کی جو فکر حکومت اور مختلف جماعتوں کو لاحق ہو گئی ہے اس پر اظہار اطمینان کرتی ہے۔ اس طرح کے تعصبات کا ابھرنا ملک کی وحدت اور سلامتی کے لیے جو ہر خیرخواہ وطن کو عزیز ہونی چاہیے خطرناک ہونے کے علاوہ ان عالمگیر اصولوں کے بھی منافی ہے جن کے ہم اسلام کے داعی ہونے کی حیثیت سے علمبردار ہیں۔ اس لیے اس صورت حال کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے حکومت اور ان تمام جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے کے خواہش مند ہیں جو ان تعصبات کو مٹانا اور ملک میں یک جہتی اور اتحاد پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ —— البتہ مجلس شوریٰ یقین رکھتی ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جو مختلف قوموں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے کسی ایسی یک جہتی کے قائم کرنے کی کوشش کرنا جس سے ان کی جداگانہ حیثیت اور ان کی اپنی مخصوص تہذیب برقرار نہ رہ سکے نہ صرف یہ کہ دستور ہند کے خلاف ہوگا بلکہ اس سے اس مقصد کو بھی شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور جس میں بھی یک جہتی اور اتحاد مقصود ہے اس کو حکومت یا اکثریت کے دباؤ کے ذریعہ پیدا کرنا قطعاً غیر مناسب اور غیر مفید ہوگا۔ اس مقصد کے لیے بہتر اور موثر ذریعہ شعور و احساس کا بیدار کرنا اور ملک کی مختلف تہذیبی اقلیتوں کو اطمینان دلانا ہو کہ مذہب اور تہذیب کی بنیاد پر ان کے جداگانہ وجود اور

کے اپنے مذہب کو نہ صرف یہ کہ کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ ان کے بڑھنے اور پھیلنے کے کافی مواقع ہیں۔

اس قرارداد میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں کوئی جوہری اور بنیادی جزو ایسا نہیں ہے جو جماعت کے لٹریچر اور ذمہ داروں کے خطبات و مقالات میں پہلے سے موجود نہ ہو، اس قرارداد کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں جو باتیں کہی گئی ہیں انہیں ذیل کے نکات میں مختصر کیا جا سکتا ہے:

(۱) ملک میں مختلف النوع تعصبات کے ابھرنے پر اظہار تشویش (۲) اس طرح کے تعصبات ملک کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ (۳) ان کی خطرناکی صرف خیر خواہیِ وطن کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ یہ تعصبات ان عالمگیر اصولوں کے بھی منافی ہیں جن کی جماعت اسلامی داعی ہے۔ (۴) اس صورت حال کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا جماعت اپنا فرض سمجھتی ہے۔ (۵) وہ ان تعصبات کو مٹانے کی جد و جہد میں دوسروں کے ساتھ تعاون کرنے کی بھی خواہشمند ہے۔

ان اجزا میں سے کوئی جزو ایسا نہیں ہے جو جماعت اسلامی ہند کے لیے نیا ہو، فسادات کی روک تھام، ہندو مسلم کشمکش کا ازالہ اور مختلف فرقوں کا اتحاد ہمیشہ سے جماعت اسلامی کے پروگرام میں داخل رہے ہیں اور ان مقاصد کے حصول کے لیے قولاً و عملاً اپنی حد تک وہ جد و جہد بھی کرتی رہی ہے کیونکہ باشندگانِ ملک تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے بھی انتہائی ضروری ہے کہ یہاں امن و امان کی فضا اور اس دعوت کو سمجھنے کی خواہش موجود ہو ورنہ مار دھاڑ اور فسادات کے ماحول میں کسی کے لیے اس دعوت کی طرف دھیان دینا عملاً ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ اس قرارداد کو پڑھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے کوئی نئی چیز اختیار کی ہے یا کسی سے متاثر ہو کر اس نے یہ قرارداد منظور کی ہے وہ جماعت اسلامی کے مقصد اور پروگرام سے ناواقف ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں نسل، نسب، وطن، رنگ اور زبان کے تعصبات کی گنجائش نہیں ہے اور جب تک لوگ ان تعلیمات کو قبول نہ کریں گے یہ تعصبات ختم نہ ہوں گے۔ جماعت اسلامی اس حقیقت پر یقین رکھتی ہے اس لیے ملک میں ان تعصبات کے ابھرنے سے تشویش، ان کو مٹانے کی جد و جہد اور اس میں دوسروں کے ساتھ تعاون اس کے عقیدہ و یقین کا عین تقاضا ہے اس معاملے میں وہ دوسروں کو متاثر کرتی ہے، دوسروں سے اس کا متاثر ہونا بے معنی بات ہے۔

اس قرارداد کے دوسرے حصے میں جو اہمیت میں پہلے حصے سے کم نہیں ہے حسب ذیل نکات پیش کیے گئے ہیں:

(۱) ہندوستان مختلف قوموں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ (۲) اس طرح کے ملک میں کسی ایسی یک جہتی کی سعی جس سے ان مختلف قوموں کی جداگانہ حیثیت اور ان کی اپنی مخصوص تہذیب برقرار نہ رہے، صحیح نہیں ہے۔ (۳) ایسی کوشش سے یک جہتی کے مقصد کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور یہ دستورِ ہند کے بھی خلاف ہے۔ (۴) جن معنی میں بھی یک جہتی اور اتحاد مقصود ہوں ان کو حکومت اور اکثریت کے دباؤ کے ذریعہ پیدا کرنا قطعاً غیر مناسب اور غیر مفید ہوگا۔ (۵) آئی

مقصد کے لیے بہترا ور موثر ذریعہ شعور و احساس کا بیدار کرنا اور ملک کی مختلف تہذیبی اقلیتوں کو ان کے مذہب، تہذیب اور جداگانہ وجود کے بارے میں اطمینان دلانا ہے۔

ان نکات میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ بھی جماعت اسلامی کے لیے نئی نہیں ہیں بلکہ وہ ہمیشہ اس خیال کا اظہار کرتی آئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ملک کی اکثریت اس خیال میں متفق ہوتی تو آج اکثریت و اقلیت کے درمیان یہ شدید کش مکش موجود ہی نہ ہوتی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صرف جماعت اسلامی ہی کا تو خیال نہیں ہے بلکہ خود دستور ہند بھی تو یہی بات کہتا ہے وہ بھی تو ہندستان کے تمام باشندوں کو بلا لحاظ مذہب و ملت یکساں حقوق عطا کرتا ہے جس پارٹی نے یہ دستور بنایا اور نافذ کیا ہے وہ بھی تو یہی بات کہتی ہے لہذا اس خیال میں جماعت اسلامی کو کیا انفرادیت اور کیا خاص امتیاز حاصل ہے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ایک دوسرا سوال حل کر لیا جائے تو جواب سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ جب دستور ہند بھی سکولر ہے اور اس ملک کی حکمراں اور نمائندہ پارٹی کانگرس بھی وسیع النظر اور سکولر ہے تو پھر قومی اتحاد و یک جہتی کے لحاظ سے ہندستان کی چودہ سالہ تاریخ اتنی ناکام کیوں رہی ہے؟ اور چودہ سال کے بعد حکمراں پارٹی کو مستقل انٹگریشن کمیٹی قائم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا ہندوستان کی بدنام فرقہ پرست جماعتوں کے سر اس کا الزام دھر کر الگ ہو جانا اس سوال کا معقول اور تسلی بخش حل ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ دستور ہند میں جو کچھ تحریر ہے اور ملک کی نمائندہ اور حکمراں پارٹی جو کچھ کہتی ہے اس کا تعلق صرف زبان و قلم سے ہے دل و دماغ اور عقیدہ و خیال سے بالکل نہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ سیاست کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے "منافقت" کو آرٹ کی حیثیت دیدی ہے، جو شخص اس آرٹ کا سب سے بڑا ماہر ہو وہی سب سے بڑا لیڈر سمجھا جاتا ہے لیکن منافقت ایک ایسا کوڑھ ہے جو زیادہ دنوں تک جلد کے نیچے چھپا نہیں رہتا، بہت جلد باہر آجاتا ہے۔ ملک کی اکثریت فی الواقع جس قومی اتحاد و یک جہتی پر یقین رکھتی ہے اس میں مسلم اقلیت کی علیحدہ تہذیب اور جداگانہ مستقل قومی وجود کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسری پارٹیوں کو چھوڑیئے، خود کانگرس کے کرتا دھرتا لیڈروں کے بیانات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ان کے نزدیک قومی یک جہتی کا مطلب کیا ہے۔

اس سوال کو حل کر لینے کے بعد یہ بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ جماعت اسلامی کو جو انفرادیت اور خاص امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہے جو کچھ کہتی ہے وہی اس کا عقیدہ و خیال بھی ہوتا ہے اور جو اس کا عقیدہ و خیال ہوتا ہے اسی کے مطابق اپنی حد تک عمل بھی کرتی ہے وہ صرف اخلاقی بات

دل ہی سے نفرت نہیں کرتی جو حقیقی نفاق ہے بلکہ عقیدہ و عمل کی عدم مطابقت کو بھی سخت ناپسند کرتی ہے جو عملی نفاق ہے وہ چاہتی ہے کہ سیاست میں منافقت گوارا نہیں بلکہ لعنت سمجھا جائے اس لیے کہ جب تک یہ لعنت دور نہیں ہوتی دنیا پر امن و امان کی رحمت سایہ فگن نہیں ہو سکتی۔

قومی یکجہتی کے بارے میں جماعت اسلامی نے اپنے بنیادی تصور و خیال کو اس قرار داد میں اختصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے تاکہ اس کا نقطۂ نظر واضح ہو جائے اور اس پہلو سے کسی کو غلط فہمی باقی نہ رہے۔

سیکولرزم | مجلس شوریٰ نے ایک اہم قرار داد سیکولرزم کے بارے میں بھی منظور کی ہے اس کا متن یہ ہے

"سیکولرزم کی اصطلاح مختلف معنی میں استعمال ہو رہی ہے۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے دور میں سائنس اور مذہبی طبقہ کے اختلافات اور ان کے تصادم میں اس اصطلاح کا ایک تاریخی پس منظر ہے جس میں نہ صرف مذہب بلکہ خدا کی مخالفت اس کی اصل روح تھی، ہر چند کہ اس وقت کے پادری طبقہ کا رویہ جس کے رد عمل میں خلاف مذہب جذبات نے شدت اختیار کی ایک بالکل غلط اور مذہب کی روح کے خلاف رویہ تھا لیکن اس کے مقابلے میں لامذہبیت کا جو تخیل لایا گیا اس نے جو صدمہ اخلاقی اقدار اور انسانیت کے اعلیٰ جذبات کو پہنچایا وہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کو ہر دیکھنے والی آنکھ مغرب کے موجودہ مادہ پرستانہ زندگی اور اس کے مہلک نتائج میں دیکھ سکتی ہے، اسی معنی میں جماعت سیکولرزم کی مخالف رہی ہے اور رہے گی چونکہ اجتماعی معاملات سے خدا اور اس کی ہدایت کو بے دخل کر دینا اس کی اصل روح ہے اور یہی انسانی زندگی کی جملہ خرابیوں کی اصل جڑ ہے اور اسلام انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل نظام پیش کرتا ہے اور اس نظام کی افادیت، عمل کی کسوٹی پر حق ثابت ہو چکی ہے جس کا ریکارڈ تاریخ عالم میں موجود ہے ۔۔۔۔۔۔ لیکن اگر سیکولرزم کا یہ مطلب لیا جائے جیسا کہ بعض حلقوں کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حکومتی کاروبار میں کسی مذہبی فرقہ کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جائے۔ اور اس کے ساتھ بلا امتیاز مذہب و ملت یکساں برتاؤ ہو اور یکساں مواقع حاصل رہیں تو جماعت نے اس تخیل کی کبھی مخالفت نہیں کی۔

اس قرار داد میں بھی کوئی ایسی بات نہیں کی گئی ہے جو پہلے سے جماعت اسلامی کے لٹریچر میں موجود نہ ہو، اس میں سیکولرزم کے تاریخی پس منظر کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہوئے اس کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور اس سے اپنے اختلاف برملا اظہار کیا گیا ہے۔ سیکولرزم کی جو حقیقت اس قرار داد میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے :۔ "اجتماعی معاملات سے خدا اس کی ہدایت کو بے دخل کر دینا" یعنی سیاست اور انتظام مملکت سے مذہب کی بے دخلی و علیحدگی، یہ ہے سیکولرزم

کا وہ عقیدہ جسے قرارداد میں انسانی زندگی کی جملہ خرابیوں کی اصل جڑ کہا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد اسلام کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ عقیدہ سیکولرزم دین اسلام کے خلاف ہے اور جماعت اسلامی کی مخالفت کا سبب یہ ہے کہ وہ شعوری طور پر دین اسلام کی صحت وحقانیت پر یقین رکھتی ہے وہ اس سیاست کو لعنت سمجھتی ہے جس سے مذہب کو بالکل الگ کر دیا گیا ہو اور مذہب کو انسان کا محض انفرادی اور پرائیوٹ معاملہ قرار دیا گیا ہو ——— یہ بات بھی سبھی عقل مند آدمی جانتے ہیں کہ ہر عقیدے کے کچھ عملی تقاضے اور اس کے کچھ نتائج وثمرات ہوتے ہیں لیکن کسی نتیجہ یا کسی عملی تقاضے کو اس عقیدے کا ہم معنی یا مترادف قرار دینا صحیح نہیں ہے لیکن اس زمانے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو بہت سارے عقائد کے نتائج وثمرات اور عملی تقاضوں کے ساتھ یہی رویہ اختیار کرتے ہیں اور ان کی عقل مندی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مثال کے طور پر اسی لفظ سیکولرزم کو دیکھیے، یہ ایک عقیدہ ہے ایک نظریہ حیات ہے جو سیاست سے مذہب کو الگ کرتا ہے۔ جو اجتماعی معاملات اور اسٹیٹ کے نظم ونسق سے الٰہی قوانین اور مذہبی ہدایات کو صرف علیحدہ ہی نہیں رکھتا بلکہ ان کی ذرہ برابر دخل اندازی بھی اسے گوارا نہیں ہوتی اس عقیدے کے بہت سے عملی تقاضے اور نتائج وثمرات ہیں۔ مثال کے طور پر اس کا ایک عملی تقاضہ یہ ہے کہ اجتماعی معاملات اور اسٹیٹ کے نظم ونسق میں انسانوں کے درمیان مذہب کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس لحاظ سے ان کے درمیان فرق کرنا عقیدۂ سیکولرزم کے خلاف ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس عملی تقاضے ہی کو لفظ سیکولرزم کا اصل معنی ومطلب قرار دے تو کیا اس کی یہ بات صحیح ہوگی اور کیا اس کے دعوے سے سیکولرزم کا وسیع عقیدہ اسی عملی تقاضے میں محدود ہو کر رہ جائیگا؟ ہندوستان میں مسٹروں ہی کا نہیں، مولویوں کا بھی ایک طبقہ اس لفظ کے ساتھ یہی کھیل کھیل رہا ہے اور اسے اصرار ہے کہ اسی بازیگری کو اصل حقیقت سمجھا جائے لیکن جو لوگ خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان میں سے کتنے آدمی اس دھوکے سے فریب کھائیں گے؟

اس قرارداد کے آخر میں جو بات کہی گئی ہے وہ دوسروں کے دعوے کو بالفرض صحیح مان کر علیٰ سبیل التنزل کہی گئی ہے اور محض اس لیے کہی گئی ہے کہ سیکولرزم کے اس عملی تقاضے کی جماعت اسلامی مخالف نہیں ہے، اس کا ہرگز یہ مقصود نہیں ہے کہ وہ سیکولرزم کے دو متقابل مطلبوں کی قائل ہے اور اس عملی تقاضے کو وہ بھی بعض حلقوں کی طرح سیکولرزم کا ہم معنی یا مترادف قرار دیتی ہے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی۔

فرض کیجیے، کوئی شخص اسلام کی اس لیے مخالفت کرتا ہے کہ وہ اجتماعی اور حکومتی معاملات میں بھی خدا کے اتارے ہوئے قانون کی پیروی لازم قرار دیتا ہے لیکن کچھ لوگ اسلام کے بعض عملی تقاضوں کو بار بار اسلام قرار دیتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ اسلام کا مطلب وہی ہے۔ اب وہ شخص اپنی کسی تحریر میں اسلام کے نظریۂ اجتماعی کی تردید کرتا ہے اور اس سے اپنی مخالفت کا اظہار کرکے آخر میں لکھتا ہے :۔

"لیکن اگر اسلام کا مطلب یہ لیا جائے جیسا کہ بعض حلقوں کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حکومتی کاروبار میں نسل، رنگ، نسب اور زبان کی بنا پر کسی انسان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے اور اس لحاظ سے تمام انسانوں کو یکساں اور مساوی اور برابر سمجھا جائے تو میں نے اس تخیل کی کبھی مخالفت نہیں کی۔"

تو کیا اس تحریر کو پڑھ کر اس شخص کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کے نزدیک اسلام کے دو معنی ہیں ایک معنی وہ جس کی اس نے تردید کی اور ایک معنی یہ جس کی حمایت کر رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس شخص کی طرف ایسی بات کا انتساب صحیح نہیں ہوگا۔ اپنے مخالفین کے دعویٰ کو بالفرض تسلیم کر کے گفتگو کرنا دنیا کی ہر زبان میں رائج ہے اور کوئی بھی نہ اسے تضاد سمجھتا ہے نہ بالفرض مانی ہوئی بات کو متکلم کا مسلک قرار دیتا ہے، نہ اس بات کو زیر بحث لفظ کا متقابل معنی و مطلب باور کرتا ہے اور نہ اس شخص کے بارے میں یہ خیال کرتا ہے کہ وہ اس کا مومن بھی ہے اور منکر بھی، موافق بھی ہے اور مخالف بھی ——— لیکن ہمارے بعض کرم فرما معاصروں نے اپنے اخبار کے قارئین کو اس فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جماعت اسلامی سیکولرزم کے دو معنی تسلیم کرتی ہے۔ جن میں سے ایک غلط ہے اور ایک صحیح ہے جماعت اسلامی جب سیکولرزم کی حمایت کرنے والوں کی مخالفت کرنا چاہتی ہے تو اس کا غلط معنی لیتی ہے اور جب سیکولرزم سے کوئی کام نکالنا اور اس کی حمایت کرنا چاہتی ہے تو صحیح معنی لیتی ہے۔ معاصر یا تو اتنی موٹی بات سمجھتا نہیں یا اپنے قارئین کو جان بوجھ کر جماعت اسلامی سے بدظن کرنا چاہتا ہے معاصر نے اپنی بات ثابت کرنے کے لیے کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں کہ دیکھو، فلاں مقام پر چونکہ مخالفت کرنی تھی اس لیے سیکولرزم کا غلط معنی استعمال کیا گیا اور فلاں جگہ چونکہ حمایت کرنی تھی اس لیے اس کا صحیح معنی لیا گیا ——— مثلاً جماعت اسلامی کے لوگ نصاب کی کتابوں میں ہندو دھرم کی باتیں دیکھ کر کہتے ہیں کہ جب حکومت سکولر ہے تو اس کے مقرر کردہ نصاب میں کسی ایک مذہب کی باتیں داخل کرنا سیکولرزم کے خلاف ہے کیونکہ نظریہ سیکولرزم کے لحاظ سے کسی ایک مذہب کی پاسداری غلط ہے۔

یہ مثال پیش کر کے معاصر جھٹ یہ دور کی کوڑی لے آتا ہے کہ دیکھو یہاں جماعت اسلامی والوں نے سیکولرزم کا صحیح معنی استعمال کیا اور اس صحیح معنی کے لحاظ سے اس کی حمایت کی۔ حالانکہ معاصر ذرا غور کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ ایسے تمام مواقع پر سیکولرزم کا کوئی معنی یا اس کی حقیقت نہیں بیان کی جاتی بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں بات عقیدۂ سیکولرزم کے عملی تقاضے کے خلاف ہے جب حکومت دعویٰ کرتی ہے کہ اس کی بنیاد سیکولرزم کے عقیدے پر ہے تو اسے اس کے عملی تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ حکومت خود اپنے عقیدہ سیکولرزم کی وفادار نہیں ہے بلکہ اس کا قول

(بقیہ مطالعات)

کچھ ہے، اور فعل کچھ ہے۔ عقیدہ کچھ ہے اور عمل کچھ ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کوئی حکومت اگر اپنے اسلامی حکومت ہونے کا دعویٰ کرے اور پھر وہاں غیر مسلم شہریوں کے حقوق تلف کئے جا رہے ہوں ان کی قومی تہذیب کو مٹانے کی سعی ہو رہی ہو اور ان کے مذہب میں مداخلت کی جا رہی ہو، اس پر کوئی منکر اسلام کہے کہ جب حکومت اسلامی ہے تو اس کے حدود مملکت میں، غیر مسلم شہریوں کے ساتھ بدسلوکی، اسلام کے خلاف ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص، غیر مسلم شہریوں کے ساتھ حسن سلوک کو تمام اسلام یا اس کو اسلام کا ایک مطلب و معنی سمجھ کر اپنی بات کہہ رہا ہے یا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان مظالم کو اسلام کے عملی تقاضے کے خلاف سمجھ کر اپنی بات کہہ رہا ہے؟ کوئی معقول آدمی پہلی صورت کا قائل نہیں ہو سکتا بلکہ ہر آدمی یہی کہے گا کہ معترض حکومت کے سربراہوں کو عقیدہ و عمل کے تضاد پر متنبہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ہمارے معاصر نے بے جھجک یہ بات بہت پھیلا کر لکھی ہے کہ ایسے مواقع پر جماعت اسلامی سیکولرزم کا صحیح معنی بیان کر کے اسکی حمایت کرتی ہے۔

معاصر نے سیکولرزم پر اپنے اخبار کے دو اداریئے لکھے ہیں لیکن پوری داستان میں بس اسی قسم کی غیر سنجیدہ باتیں بھری ہوئی ہیں پھر لطف بالائے لطف یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے سیکولرزم کی جس اصل روح کا ذکر کر کے اس کی مخالفت کی ہے، معاصر اسے اس کا غلط معنی قرار دیتا ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ سیکولرزم اجتماعی معاملات میں مذہب اور خدا کی ہدایت کو بے دخل کرنا نہیں چاہتی بلکہ ایک ریاست، سیکولر ہوتے ہوئے بھی اپنے نظم و نسق میں ہدایت خداوندی کی پابند ہو سکتی ہے۔ سیکولرزم کے بارے میں یہ "خلائی اکتشاف" اس لائق ہے کہ روس اور امریکہ کی حکومتوں کو بھیج دیا جائے۔

جہاں تک بھارت کے دستور کا تعلق ہے اس نے تو اجتماعی معاملات میں مذہب کی دخل اندازی کا دروازہ اس طرح بند کیا ہے کہ الکشن تک میں کسی کو مذہب کے نام پر ووٹ مانگنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ کیا معاصر کے نزدیک یہ مخالفت عقیدہ سیکولرزم کے تحت نہیں بلکہ کسی "خلائی اصول" کے تحت ہے؟ جماعت اسلامی کی مخالفت میں شب دیجور کو چاندنی رات ثابت کرنے کی کوشش آخر کن لوگوں کو متاثر کر سکے گی؟

یہ بات ناقابل انکار دلائل سے ثابت ہے کہ سیکولرزم بقول مولانا عبد الماجد دریابادی اجتماعی و سیاسی ہو یا انفرادی و شخصی، خدا اور آخرت سے بے تعلقی کا خوشنما نام ہے ـــــ اس حقیقت کو جھٹلا کر باشندگان ملک کے درمیان بے امتیازی کو سیکولرزم کا صحیح معنی اور اس کی حقیقت قرار دینا معاصر کے نزدیک تہہ کی بات ہو تو ہو دوسروں کے نزدیک بالکل سطحی اور بے تہ بات ہے۔

باشندگان ملک کے درمیان مذہب کے اعتبار سے بے امتیازی سیکولرزم کا ایک عملی تقاضہ ہو سکتا ہے اس

کا معنی و مطلب، روح و حقیقت اور حدود تعریف بالکل نہیں ــــ اور یہ عملی تقاضہ جیسے مسلم اقلیت کے لیے نعمت عظمیٰ کہا جاتا ہے۔ چودہ سال سے ایک ایسا لفظ بنا ہوا ہے جو شرمندۂ معنی نہ ہو، یہاں تک کہ سیکولرزم پر عقیدہ رکھنے والے لوگ، ایک کنونشن کے ذریعہ اس عملی تقاضے کو پورا کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں تو بھارت کا دستور مرتب کرنے والے بھی ناخوش اور ناراض ہو جاتے ہیں۔ یہی ہے وہ سیکولرزم جس پر تمام مسلمانانِ ہند کو ایمان لانے کی مسلسل دعوت دی جا رہی ہے اور اس دعوت میں مشتری ہی نہیں بہت سے علمائے دین بھی شریک ہیں۔

چونکہ اس وقت ملک میں قومی یک جہتی اور سیکولرزم کا بڑا چرچا ہے اس لیے مجلس شوریٰ نے جماعت اسلامی ہند کا نقطۂ نظر واضح کر کے اچھی خدمت انجام دی ہے جو لوگ مختصر اور مرتب الفاظ میں جماعت کا نقطۂ نظر جاننا چاہیں گے وہ ان قراردادوں کو پڑھ کر اسے جان لیں گے اور اس بارے میں انھیں کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے گی۔

نظریۂ اوتار اور عقیدۂ رسالت

(۱۲)

(جناب ابو محمد امام الدین رام نگری صاحب)

ہندو مذہب میں رسالت کا نشان ستیارتھ پرکاش میں ویدوں کے ایسے منتر اور کلمات ملتے ہیں جن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں ہندوستان میں خدا کے رسول اور نبی مبعوث ہوتے تھے۔ مثال کے لیے کچھ منتروں کے ترجمے دیکھئے۔

"ہے سکھ کے داتا! پرکاش سوروپ! سب کو جاننے والے پرماتما! آپ ہم کو شریشٹھ مارگ سے سمپورن پرگیانوں کو پراپت کرائیے۔ اور جو ہم میں کٹیل پاپا چرن روپ مارگ ہے اس سے پرتھک کیجئے اس لیے ہم لوگ نمرتا پوروک آپ کی بہت ستوتی کرتے ہیں کہ آپ ہم کو پوتر کریں" (یجر وید ۴۰۔۱۶)

یعنی۔ اے راحت دہندہ، نور ذات، دانندۂ کل پرماتما! آپ ہم کو اقوم راہ کے ذریعہ کامل علم و معرفت عطا کیجیے، اور جو ہم میں معصیت کی ٹیڑھی راہ ہے اس سے دور رکھئے، اس لیے ہم لوگ آپ کی بکثرت عاجزانہ حمد و ستائش کرتے ہیں تاکہ آپ ہم کو پاک کر دیں۔ (ستیارتھ پرکاش، باب ۷، ص ۱۱۱)

یہ منتر اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین سے کس قدر مشابہ ہے۔

اسی مضمون سے ملتا جلتا یہ منتر ہے۔

"ہے پرم گرو پرماتما! آپ ہم کو اسّت مارگ سے پرتھک کر سنمارگ میں پراپت کیجیے، اور ودیا اندھکار کو چھڑا کے ودیا روپ سوریہ کو پراپت کیجیے۔ اور مرتیو روگ سے پرتھک کر کے موکچھ کے آنند روپ امرت کو پراپت کیجیے۔"

(شت پتھ براہمن۔ ۱۴۔۳۔۱۔۳۰)

یعنی اے سب سے بڑے معلم پرماتما! آپ ہم کو باطل راہ سے محفوظ رکھ کر راہِ حق پر چلائیے، اور جہل کی تاریکی

ہے سورج کے مثل علم کی روشنی عطا کیجئے، اور موت کی بیماری سے شفا دے کر نجات کا راحت بخش آب حیات عنایت فرمائیے"
ستیارتھ پرکاش، باب صفحہ ۱۱۶)

اس دعا کا مضمون اس آیت کے مضمون سے کتنا ملتا ہوا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (پ۳ آل عمران)

جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا رفیق (راہ) اللہ ہے، وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے اور جو کفر کی راہ پر پڑ چکے ہیں ان کے رفیق (راہ) طاغوت ہیں وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں لے جاتے ہیں،

ایک منتر یہ ہے۔

"میں پرم ایشور ربیہ وان، سوریہ کے سمان سب جگت کا پرکاشک ہوں۔ کبھی پراجیہ کو پراپت نہیں ہوتا، اور نہ ...مرتیو کو پراپت ہوتا ہوں، میں ہی جگت روپ دھن کا نرماتا ہوں، سب جگت کو اتپتی کرنے والا مجھ ہی کو جانو، ہے ...ور الپشو ریہ پراپتی کے یتن کرتے ہوئے تم لوگ وگیانادی دھن کو مجھ سے مانگو، اور تم لوگ میری متر تا سے الگ مت ...سے منشیو! میں ستیہ بھاشن روپ ستوتی کرنے والے منشیہ کو سناتن گیانادی دھن کو دیتا ہوں۔ میں برہم ودیا ...کا پرکاش کرنے ہارا اور مجھ کو وہ وید یتھاوت کہتا، اس سے سب کے گیان کو میں بڑھاتا، میں ست پرکاش کا پریک ...کرنے ہارے کو پھل پرداتا اور اس وشو میں جو کچھ ہے اس سب کاریہ کو بنانے اور دھارن کرنے والا ہوں، اس ...تم لوگ مجھ کو چھوڑ کسی دوسرے کو میرے استھان میں مت پوجو، مت مانو اور مت جانو" (رگ وید، منتر ۱، سوکت ۴۸)
ستیارتھ پرکاش باب۔ صفحہ ۱۱۳)

یعنی میں سب سے بڑا صاحب اقتدار و اختیار ہوں، (وللہ ملک السمٰوٰت والارض) سورج کی طرح سارے جہان کا روشن کرنے والا ہوں (اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کبھی شکست قبول نہیں کرتا (وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ) اور نہ کبھی مرتا ہوں (الحی القیوم) جہان کی صورت جاگیر میں ہی معار ہوں (وللہ میراث السمٰوٰت والارض) ...جہان کو پیدا کرنے والا مجھی کو جانو (اللہ خالق کل شیء) اے ذی روحو! (انسانو) ساز و سامان کے حصول ...سعی و کوشش کرتے ہوئے علم و حکمت وغیرہ کا سرمایہ مجھی سے طلب کرو، اور تم لوگ میری رفاقت سے جدا نہ ہوا ...انسانو! میں صحیح بیان کرنے والے انسان کو دائمی علم و معرفت کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہوں، برہم یعنی وید کا الہام کرنے والا ہوں، اور وہ وید بالکل صحیح صورت سے بیان کرتا ہے اس کے ذریعہ میں سب کے

علم و معرفت کو ترقی دیتا ہوں میں اہل حق کا محرک ہوں، یگ کرنے والے کو، جزہ دیتا ہوں، اور جو اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے اس سب کے کام کو انجام دینے والا اور برقرار رکھنے والا ہوں، اس لیے تم لوگ مجھ کو چھوڑ کر میری جگہ کسی دوسرے کی پوجا بندگی نہ کرو، نہ کسی دوسرے کو (خالق و مالک اور معبود) مانو جانو (اننی انا اللہ فاعبدنی)

یجر وید کے ایک منتر کا تشریحی ترجمہ یہ ہے۔ کائنات (کے کارخانے) کا چلانے والا معبود حقیقی وہی ہے۔ وہ لازوال اور روشن ہے، وہ صاحب قوۃ (قوی العزیز) ہے، بلاشبہ وہ مسرت ذات اور مسرت بخش ہے، تمام جہاں کا خالق ہے۔ سب سے بڑا (اعلیٰ و اکبر) ہے، وہ سب جگہ موجود اور سب کو گھیرے ہوئے ہے (وسع کرسیہ السموات والارض۔ وللہ غیب السموات والارض) وہ تمام کائنات کا سوامی (رب العالمین) ہے (ماہنامہ ویدوانٹری بنارس)

یہ اور اس طرح کے کتنے منتر ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی ہندوستان میں بھی کلام الٰہی کا نزول ہوا تھا۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ویدوں کے نزول یا الہام کی کیا صورت بیان کی جاتی ہے اور اس سے رسالت کا کہاں تک سراغ ملتا ہے؟

سوامی دیانند سوال و جواب کے پیرائے میں لکھتے ہیں۔

سوال۔ جب ایشور غیر مجسم ہے تو منہ سے بولے بغیر اس نے وید کے علم کا اُپدیش کیسے کیا ہوگا؟

جواب۔ چونکہ پرمیشور سروشکتیمان، اور سرو دیاپک (سب کچھ کرنے پر قادر اور سب جگہ موجود) ہے اس لیے اپنی سرودیاپتی سے اسے روحوں کو وید کے علم کا اُپدیش (تلقین) کرنے کے لیے منہ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں، منہ اور زبان سے الفاظ ادا کرنے کا کام دوسرے کو سمجھانے کے لیے لیا جاتا ہے نہ کہ اپنے لیے، منہ اور زبان سے کام لیے بغیر ہی دل میں مختلف قسم کے خیالات آتے رہتے ہیں اور آوازیں پیدا ہوتی رہتی ہیں کانوں کو انگلیوں سے بند کر کے سنو، منہ، زبان اور تالو سے کام لیے بغیر ہی کیسی کیسی آوازیں نکلتی رہتی ہیں، اسی طرح پرمیشور نے انتریامی (دلوں میں موجود ہونے) کی وجہ سے روحوں کو ویدوں کا اُپدیش کیا ہے، غرض دوسروں کو سمجھانے کے لیے الفاظ ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب پرمیشور نراکار اور سرودیاپک ہے تو اپنے ہمہ گیر علم کا روحوں میں موجود ہونے کی وجہ سے روحوں میں پرکاشت (الہام) کر دیتا ہے، پھر وہ انسان اپنے منہ سے بول کر دوسروں کو سناتا ہے اس لیے ایشور پر یہ الزام نہیں آسکتا"

سوال۔ کن کی روحوں میں کب ویدوں کا پرکاش کیا؟

جواب۔ پرتھم سرشٹی کی آدی (اولین خلقت کی ابتدا) میں پرماتما نے اگنی، وایو، آدتیہ ([illegible]) اور انگرا ([illegible]) رشیوں کی روحوں میں ایک ایک وید کا پرکاش کیا (ستیارتھ پرکاش ۱۱-۲-۳۰۲)

سوال - یو وے برہماہ سر ابوودھاتی پوروا یو وے ویداپنشم پرہنروتی تسمے (شویتا شوا ۱-۶- منتر ۱۸)
یہ اپنشد کا قول ہے، اس قول کے مطابق پرماتما نے برہما کے دل میں ویدوں کا اپدیش کیا ہے، پھر آپ نے اگنی وغیرہ رشیوں کی روحوں میں کیوں بتایا؟

جواب - برہما کی روح میں اگنی وغیرہ کے ذریعہ استھاپت (جاگزیں) کرایا، دیکھو منو نے کیا لکھا ہے۔

"جس پرماتما نے ابتدائے خلقت میں انسانوں کو پیدا کرکے اگنی وغیرہ چاروں مہرشیوں کے ذریعہ چاروں وید برہما کو حاصل کرائے اور اس برہما نے اگنی، وایو، آدتیہ اور انگرا سے رگ، یجر، سام اور اتھرو وید حاصل کیا" (منو ۱-۲۳)

سوال - ان چاروں ہی میں ویدوں کا پرکاش (الہام) کیا دوسروں میں نہیں ہوا اس سے ایشور کچھ پاتی (بے انصاف نابت) ہوتا ہے۔

جواب - وہی چار سب سے زیادہ پاک باطن تھے، دوسرے ان کے جیسے نہ تھے، اس لیے پاکیزہ علم کا پرکاش انھیں میں کیا۔ (ستیارتھ پرکاش باب ہفتم صفحہ ۱۲۹)

دیانند جی نے ویدوں کے پرکاش یا الہام کی جو صورت بیان کی ہے وہ واضح ثبوت ہے ہندو مذہب میں وحی و رسالت[1] کی موجودگی کا، وحی کی ایک صورت خدا کا انسان کے دل میں اپنی ہدایات کا ڈال دینا بھی ہے، دیانند جی نے جو صورت بیان کی ہے اسے ہم بے تامل القاء اور الہام کہہ سکتے ہیں اور یہ طریقہ بھی وحی و رسالت کے تحت داخل ہے، دیانند جی کا یہ کہنا کہ انسانوں میں ویدوں کے ملہم چاروں رشی سب سے زیادہ پاک باطن تھے یہ وہی بات ہے جو اسلام بتاتا ہے کہ خدا جن نفوس کو رسالت کے لیے منتخب کرتا تھا وہ اپنی قوم میں سب سے زیادہ پاک باطن، صاحب صلاحیت اور نیک کردار ہوا کرتے تھے۔

ہم نے اپنی تحقیق و جستجو کا جو نتیجہ پیش کیا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے سناتن دھرمی بھائیوں کے نزدیک اطمینان بخش نہ ہو پھر بھی ہم ان کے اہل فکر حضرات سے درخواست کریں گے کہ وہ ہمارے پیش کردہ نتیجے پر غور فرمائیں ہندو مذہب

---

[1] ویدوں کے الہام کے متعلق آریہ فرقہ کا عقیدہ تو یہی ہے کہ ان کے ملہم اگنی وغیرہ رشی ہیں، لیکن سناتن دھرم کے عقیدہ کے مطابق چاروں وید برہما کے چار منہوں سے نکلے، سناتن دھرم کے عقیدہ کے مطابق برہما انسان نہ تھے، دیوتا تھے وہ اپنی بیوی کا ایک علیحدہ اور دیانند جی اس بات کو مانتے نہیں پھر معلوم نہیں انھوں نے منو کا قول کیسے قبول کر لیا، اور منو کے نزدیک برہما کون تھے، اگر اگنی وغیرہ فلاں رشیوں سے [illegible]

اور اسلام دونوں میں ایک بالکل ملتی جلتی چیز پائی جاتی ہے، دیانند جی نے جن کتابوں کے حوالے دیئے ہیں ان کو سناتن دھرمی ہندو بھی مانتے ہیں، اور ان کتابوں میں ویدکے پرکاش کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ اسلام کے وحی والہام کے طریقے سے ملتی ہوئی ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آریہ سماجی ہوں یا سناتن دھرمی اسلام کے وحی والہام کے عقیدے کی صحت کو تسلیم نہ کریں، اب رہی ان کے اس عقیدے کی دشواری کہ ان کے عقیدے کی رو سے دوسری کوئی کتاب خدائی یعنی خدا کی طرف سے وحی کردہ ہو ہی نہیں سکتی اس لیے کسی کو خدا کا رسول بھی نہیں مانا جاسکتا تو میں اس کے متعلق بھی سناتن دھرمی اور آریہ حضرات سے غور و فکر کرنے کی درخواست کروں گا، ویدوں کے الہامی کتاب ہونے کے مقابلے میں توراۃ وانجیل اور قرآن کے خدائی کتاب ہونے کی شہادت کم نہیں ہے۔

ہندو مذہب کی رو سے دنیا کی عمر تقریباً دو ارب سال کی ہے ذرا سوچئے تو اس مدت کی طوالت کی کچھ انتہا ہے؟ اور اتنی ہی عمر ویدوں کی بتائی جاتی ہے، اگر دنیا کی عمر اس مدت کی چوتھائی مان لی جائے جب بھی بہت ہوتی ہے، اس مدت میں کتنی قومیں پیدا ہوئیں اور نیست و نابود ہوگئیں، ایک قوم کا ابتدائی وطن کہیں تھا اور وہ ترک وطن کر کے کہیں چلی گئی یا اس کا ایک حصہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دنیا کے کسی دوسرے خطے میں جا بسا اور اس کی اولاد رفتہ رفتہ اپنے آبائی وطن اور اپنی ابتدائی تاریخ تک بھول گئی، اور اس نے ایک جدید قوم کی صورت اختیار کر لی، اس کی تہذیب و معاشرت اور زبان بھی اس کے جدید وطن کے سانچے میں ڈھل گئی یہاں تک کہ ماحول اور اس کی آب و ہوا کے اثر سے اس کا رنگ روپ تک بدل گیا، اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک ہی آباء و اجداد سے تعلق رکھنے والے انسانوں میں رنگ روپ، قد و قامت، زبان و تہذیب کا اتنا اختلاف نہ پایا جاتا، ایک ہندوستان ہی کو دیکھئے، یہاں جتنی قومیں مٹ گئیں ان سے قطع نظر جو قومیں موجود ہیں ان کو دیکھئے، ان کی تاریخ اور ان کے قدیم وطن کے بارے میں کتنا اختلاف ہے، خود آریہ یعنی ہندو قوم کے آبائی وطن کے بارے میں باہم اتفاق نہیں ہے، سوامی دیانند جی نے ستیارتھ پرکاش میں تبت کو آریوں کا آبائی مسکن بتایا ہے، بعض علماء سندھ کو ہندو قوم کا آبائی وطن بتاتے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی رائیں ہیں ان حالات میں دنیا کے دوسرے خطوں کے باشندوں کو یہ عقیدہ کہاں تک مطمئن کرسکتا ہے کہ پرماتما نے اپنی تعلیم و ہدایت سے صرف آریہ قوم کو نوازا جس کے وطن کا تعین بھی متفق علیہ نہیں، اور دنیا کی ساری قوموں کو اس سے محروم رکھا، اگنی وغیرہ چار رشی ہی ایسے پاک باطن اور پاک طینت پیدا ہوئے جن کو پرماتما نے بذریعہ الہام اپنی تعلیم و ہدایت سے بہرہ ور کرنے کے لیے خاص کر لیا؟ ان کے سوا کہیں بھی ایسے پاک دل اور نیک کردار انسان پیدا ہی نہیں ہوئے جب کہ پرماتما ہی نے تمام قوموں کو پیدا کیا ہے سب اسی کی مخلوق اور اسی کے بندے ہیں، اس نے تمام قوموں کو خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں [illegible] رہنے کا

سامان دیا ہے، اس کے سورج اور چاند کی روشنی سب انسانوں کے لیے عام ہے، اس کی آب و ہوا سب انسانوں کے لیے عام ہے، اس کا پانی بھی سب کے لیے عام ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے ہر قوم کے زمانے اور حالات کے مطابق اسے زندگی گزارنے کی تعلیم و ہدایت الہام نہ کی ہو؟ یہ مسئلہ ہمارے ہندو بھائیوں کے لیے قابل غور ہے، قرآن مجید کی تعلیم اس بارے میں صاف اور عقل کے مطابق ہے، خدا کا علم کامل ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے، اس کے علم کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ وہ کسی حد کے ساتھ محدود ہے، اس کے لیے ماضی، حال، مستقبل، غائب اور حاضر سب کچھ یکساں ہے، مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کو الگ الگ علم و ہدایت اور احکام و قوانین دینے کے بارے میں سوال خدا کے علم کا نہیں انسانوں کی ضرورت اور صلاحیت و استعداد کا ہے، قرآن مجید کی تعلیم کی رو سے ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے میں خدا کے رسول اور نبی مبعوث ہوتے رہے اور ہر قوم کے زمانے اور احوال کے مطابق خدا کی طرف سے تعلیم و ہدایت اور احکام و قوانین کا نزول ہوا، اور جب دنیا ترقی کرتے کرتے اس مرحلے پر پہونچ گئی کہ تمام دنیا کے لیے خدا کا ایک دستور اور ایک قانون ہو تو خدا نے قرآن مجید نازل کیا، ہمیں دنیا کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے، ایک ہندو قوم کے علاوہ ساری دنیا کی قومیں اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہیں، اور ناقص صورت میں سہی توریت، زبور اور انجیل موجود ہیں جن کو دنیا کی دو بڑی مشہور یہودی اور عیسائی قومیں خدائی کتابیں مانتی ہیں، اور خود قرآن ان تینوں کو خدائی کتابیں قرار دیتا ہے اور حضرت موسیٰؑ حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو جن پر یہ کتابیں نازل ہوئیں خدا کا رسول مانتا ہے۔ ایسی حالت میں ہندو بھائیوں کا عقیدہ دنیا کے نزدیک کہاں تک قابل قبول ہو سکتا ہے؟ اس پر ہندو بھائیوں کو غور کرنا چاہیے۔ (باقی)
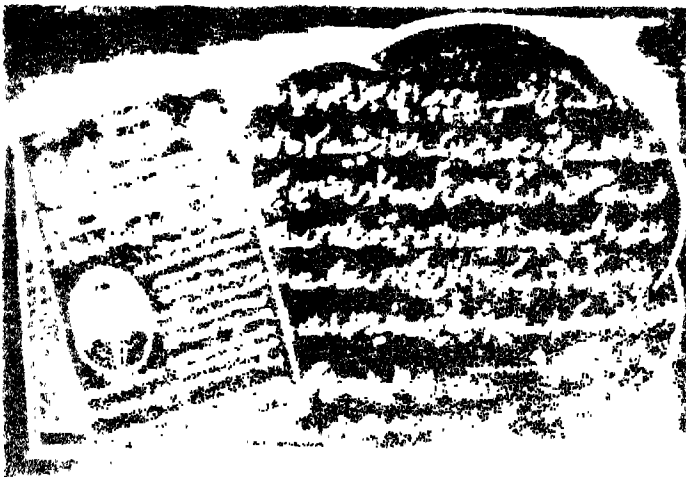
رسائل و مسائل

تقدیر کا مسئلہ

سوال ـــــ ۱۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ انسان کو عمل کی آزادی حاصل ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر سارے اختیارات صرف خدا کو حاصل ہیں اور اس کی اجازت کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا تو انسانی اختیار کے کیا معنی۔ اور اگر انسان کو اختیار حاصل ہے تو خدا کے مختار کل ہونے کی کیا توجیہ کی جائے گی۔

۲۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جہاں سارے اختیارات حاصل ہیں وہیں اس کو یہ اختیار بھی ہے کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی کو جزوی طور پر خود مختار بنا دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مخصوص مصالح کے تحت اپنی حکومت کے اندر انسان کو کچھ اختیارات دے دیے ہیں جس کا مقصد اس کا امتحان لینا ہے۔ مگر ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگلی پچھلی تمام باتیں معلوم ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ مستقبل کے متعلق خدا کے علم میں جو کچھ ہے اس کے خلاف یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اختیار پانے کے بعد بھی انسان مجبور ہے کہ وہ علم الٰہی کے مطابق کام کرے۔ اس سے ایسا کوئی عمل سرزد نہیں ہو سکتا جو پہلے سے خدا کو معلوم نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے علم کو دہراتا ہے۔ وہ وہی کرے گا جو اس کے متعلق پہلے سے اللہ نے جان لیا ہو کہ وہ فلاں فلاں کام کرنے والا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کے اوپر اس کے عمل کی ذمہ داری کس طرح آ سکتی ہے۔

جواب

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں یہ جو آیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے اذن کے تحت ہوتا ہے، اس کا مطلب انسان کی مجبوری کو بتانا نہیں ہے بلکہ دراصل اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ کائنات کے اندر حقیقی وجود اور ذاتی اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ کوئی بھی خود سے اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا نہ بذات خود کسی واقعہ کو ظہور میں لا سکتا۔ ہم کو یقیناً آزادی دی گئی ہے مگر یہ آزادی صرف ارادہ کی

آزادی ہے اس کے علاوہ ہم کو کوئی ذاتی اقتدار حاصل نہیں ہے کہ ہم جو چاہیں کر ڈالیں۔ ہم ارادہ تو ضرور کر سکتے ہیں مگر ہمارا ارادہ اسی وقت عمل بن سکتا ہے جب خدا کے مہیا کیے ہوئے ذرائع و وسائل ہمارے ساتھ موافقت کریں۔ خدا کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

اس کو ایک مثال کے ذریعہ بآسانی سمجھا جا سکتا ہے، زمین کیا ہے۔ یہ فضا میں اچھلتی ہوئی ایک گیند ہے جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں۔ زمین کے اوپر چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا سب کچھ ہماری اپنی مرضی سے ہوتا ہے۔ مگر یہ حیرت انگیز واقعہ کہ ایک فضائی کرہ کے چاروں طرف انسان اپنے وجود کو قائم رکھ سکے، کیا انسانی اختیار کی وجہ سے ہوتا ہے، کیا کسی بڑے سے بڑے شخص کو بھی ذاتی طور پر ایسا کوئی اختیار حاصل ہے کہ اس طرح کی ایک زمین کے اوپر اپنے وجود کو باقی رکھ سکے اور اپنے آپ کو لامتناہی خلا میں گرنے سے بچالے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ خدا کے اذن کے تحت ہوتا ہے جس کو سائنس کی زبان میں ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ نیچے سے زمین کی کشش اور اوپر سے ہوا کا دباؤ انسان کو زمین پر ٹھہرائے ہوئے ہے۔ اگر یہ غیر معمولی انتظامات نہ ہوں تو کوئی انسان انتہائی خواہش کے باوجود زمین پر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنی مرضی سے زمین پر چلتے پھرتے اور رہتے بستے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ زمین کے اوپر ہمارا وجود مکمل طور پر خدا کی مرضی کی وجہ سے ہے اسی طرح یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہم وہی کرتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں مگر ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس وقت تک ہم اسے نہیں کر سکتے جب تک خدا کی مدد ہمیں حاصل نہ ہو جائے۔ اسی کو قرآن میں اس طرح کہا گیا ہے کہ انسان وہی کرتا ہے جو خدا چاہتا ہے کیونکہ انسان جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کو اس وقت تک وہ عمل کی صورت نہیں دے سکتا جب تک خدا اپنے انتظامات کے ذریعہ اس کو ایسا کرنے کا موقع فراہم نہ کر دے۔

دوسرا سوال یقیناً ایک مشکل سوال ہے لیکن وہ نہایت آسانی سے حل ہو جاتا ہے اگر ہم کو مسئلہ کی نزاکت اور اپنی قوت فہم کی نارسائی کا صحیح احساس ہو جائے۔ کائنات کے اندر انسانی ارادے کا مسئلہ ایک نہایت پیچیدہ سوال ہے۔ اس کو ہم مجملاً تو سمجھ سکتے ہیں مگر اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس مسئلے کے متعلق ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ایک ایسی کائنات میں جہاں سارا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے، اس نے ارادہ کی حد تک کسی دوسری مخلوق کو بھی اختیار دے دیا ہے، اسی طرح وقت کے ایسے دائرے میں جہاں خدا کا علم اس کے دونوں سروں — ماضی اور مستقبل — تک چھایا ہوا ہے، اس نے انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا مستقبل بنا سکے۔ یہ دو متضاد تقاضے کس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ

ہو گئے ہیں اور ان کے الگ الگ حدود دکیا ہیں۔ ان کو لفظوں میں ٹھیک ٹھیک بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کو لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کرنا ایسی بحثوں کو چھیڑنا ہے جن کے متعلق ہم سرے سے کوئی علم ہی نہیں رکھتے ہم اپنی محدود عقل کے ذریعہ اس پیچیدگی کو نہیں سمجھ سکتے کہ خدا کی لامحدود قوتوں کے درمیان، جبکہ اس کا علم بھی لامحدود ہے، انسانی ارادہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔ اس انداز میں سوچنا مسئلے کو آخری حد تک سمجھنے کی کوشش کرنا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کسی مسئلے کو اس کی آخری حد تک سمجھنے کا سوال ہو تو عقل کو اپنی نارسائی تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ صرف یہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ کائنات کے کسی بھی مسئلے کو لے لیجیے۔ اگر آپ اس کی آخری حد تک جانا چاہتے ہیں تو آپ کبھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انسان کی قوتیں صرف ایک حد تک ہی کام دے سکتی ہیں۔ وہ کسی مسئلے کی آخری حد تک نہیں پہنچ سکتیں۔

میں ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت کروں گا۔ پانی کے اندر اگر آپ رنگ گھول دیں تو وہ دونوں مل کر بالکل ایک ہو جاتے ہیں انسانی آنکھ کے لیے وہ ایک ایسا مادہ ہے جو صرف ایک رنگ رکھتا ہے۔ وہ رنگ اور پانی کو الگ الگ نہیں دیکھ سکتی۔ کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ دیکھ سکے کہ اس کے اندر پانی کی سفیدی کہاں تک ہے اور رنگ کی رنگینی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ہماری آنکھ کے لیے بظاہر اس آمیزہ میں صرف رنگ ہی رنگ ہے۔ پانی کی سفیدی کا کہیں وجود نہیں لیکن اگر ہم کو ایسی آنکھ حاصل ہو جائے جس سے اشیاء کے سالمات (MOLECULES) کو الگ الگ دیکھا جا سکتا ہو اور پھر ہم اس آنکھ سے اس آمیزے پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے جیسا کہ معمولی آنکھ سے نظر آ رہی تھی۔ اب ہمارے سامنے رنگین شربت کے بجائے ایک ایسا مادہ ہوگا جس میں پانی اور رنگ کے نہایت چھوٹے چھوٹے ذرے اپنے علیحدہ رنگوں میں اس طرح نظر آئیں گے جیسے دو رنگی اینٹوں کا کوئی ڈھیر پڑا ہوا ہو۔ جو چیز معمولی نگاہ سے ایک نظر آ رہی تھی وہی زیادہ وسیع نگاہ سے دیکھنے میں دو بن جائے گی۔

اسی طرح خدا کی قدرت اور اس کے علم محیط کے درمیان انسانی ارادے کا وجود ہم اپنی موجودہ عقل سے نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں قیامت کے دن جب ذہن کی یہ محدودیت ختم ہو جائے گی تو ہم صاف دیکھیں گے کہ کس طرح ہم کو خدا کی دنیا میں سب کچھ کرنے کا اختیار حاصل تھا۔

تاہم یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے آج ہم بالکل واقف نہ ہو سکیں۔ یہ حقیقت جس کو ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ تجربے کے ذریعہ باسانی اسے معلوم کر سکتے ہیں۔ ہر شخص خواہ وہ جاہل ہو یا عالم یہ جانتا ہے کہ

اس کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ وہ ہر صبح و شام اس عقیدے کے مطابق عمل کرتا ہے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو اسلام کے معاملہ میں اس دلیل کو بڑے زور شور سے پیش کرتے ہیں وہ اپنے ذاتی معاملات میں اس پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ آخرت کے لیے عمل نہیں کرتے اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہی خدا کی مرضی ہے۔ اگر اس کی مرضی کچھ اور ہوتی تو ہم سے وہ دوسرے کام کراتا۔ مگر دنیا کے معاملات میں وہ اس فلسفہ پر بالکل یقین نہیں رکھتے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ دنیا میں انھیں صرف اتنا ہی مل سکتا ہے جس کی انھوں نے کوشش کی ہو۔ دنیا کے معاملے میں وہ ہر آن اپنی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں اور روزانہ سوچتے رہتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ دنیا میں ان کو وہی ملے گا جس کے لیے انھوں نے کوشش کی ہو۔ مگر آخرت کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ کوشش کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ آدمی کو وہی ملے گا جو اللہ نے اس کے لیے لکھ دیا ہے۔

وحیدالدین خاں

(صفحہ ۲۲ کا بقیہ) اس کا کہنا تھا کہ اگر تم سماجی مسائل کو سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے ایک طرف انجیل کھول کر رکھ لو اور دوسری طرف سوشلسٹ لٹریچر۔ بے شمار ایسے لوگ ہیں جو مارکسی افکار سے متاثر ہوئے اور اسی کے ساتھ وہ مذہبی رسوم بھی ادا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ سوشلزم کے نزدیک مذہب کی کوئی اہمیت ہے۔ اس کی اہمیت دراصل ان کے ذہنوں میں پہلے سے موجود تھی۔ شعوری طور پر بے شک وہ سوشلزم سے متاثر تھے مگر تاریخی روایات نے مذہب کو جس طرح ان کے ذہنوں میں راسخ کر دیا تھا اس سے وہ اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکے۔

یہ ایک ایسی تحریک کا معاملہ ہے جو مذہب سے بغاوت کی بنیاد پر اٹھی تھی۔ پھر دین کی تجدید کے نام سے جو کوششیں ہوں ان میں اس طرح کے دوطرفہ تاثرات کا امکان تو اور بھی زیادہ ہے۔ ہر وہ شخص جو کسی مسلم گھرانے میں پیدا ہوا ہے وہ پہلے سے کچھ افکار کو مانے ہوئے تھا، کچھ اعمال کو مذہبی اعمال کی حیثیت دے رہا تھا، رد و قبول کے ایک معیار کو ضروری تسلیم کرتا تھا۔ اب اگر دین کی ایک نئی تعبیر سے متاثر کرتی ہے تو اس کے بعد بننے والی زندگی کو مکمل طور پر صرف بعد کے تاثر کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ اس کی زندگی میں ان نسلی اور روایتی تاثرات کا بھی بہت کچھ دخل ہوگا جو ایک طویل اور پیچیدہ عمل کے نتیجے میں اس کی نفسیات کے اندر اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ وہ ان کا باغی ہو جائے جب بھی وہ اپنے اندر سے انھیں نکال نہیں سکتا۔ آپ کی زندگی آپ کے شعوری تصورات اور آپ کے سابقی رجحانات دونوں سے مل کر بنتی ہے اور اس کو صرف اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ ان دونوں کی روشنی میں اسے دیکھا جائے۔

باب التقریظ والانتقاد

اسلامی فقہ حصہ اوّل

(۲)

گزشتہ ماہ تنقید و تبصرہ کا جو حصہ شائع ہوا تھا اس میں کتاب کے صفحہ ۱۹ پر جو تنقید کی گئی تھی اس میں شامی کی پیش کردہ حدیث درج ہونے سے رہ گئی اس کے علاوہ صفحہ ۶۲ اور صفحہ ۶۷ کی تنقیدیں بھی کتابت سے رہ گئی تھیں، اس طرح کتاب کی تنقید کے صفحات میں تقدم و تاخر ہو گیا ہے۔ (ر۔ ق)

صفحہ ۶۲ مؤلف نے سجدے میں تیز جھپکی یا اونگھ کو اس صورت میں ناقض وضو قرار دیا ہے کہ کہنی ران سے مل گئی یا ران بالکل پیٹ سے مل گئی ہو مطلب یہ ہوا کہ اگر سجدہ مسنون ہیئت میں نہ ہوا اور اونگھ آ جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا، لیکن یہ بات متقدمین ائمۂ احناف کے مسلک کے خلاف ہے ان کے نزدیک مذکورہ بالا صورت میں بھی وضو نہیں ٹوٹتا۔ مؤلف نے جو قول لکھا ہے وہ متاخرین میں صاحب نور الایضاح وغیرہ کا قول ہے لیکن یہ قول عموم حدیث کے خلاف ہے اور اس قول کی کمزوری اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ عورتوں کے معاملے میں بے کار ہو جاتا ہے کیونکہ عورتوں کے لیے سجدے کی ہیئت وہی ہے جس کا ذکر مؤلف نے کیا ہے اور کوئی اس کا قائل نہیں ہے کہ اگر عورت کو سجدے میں اونگھ آ جائے تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ مؤلف نے جو قول لکھا ہے وہ کمزور ہے۔ آخر میں یہ اشارہ اور ضروری ہے کہ وضو ٹوٹنے کے لیے گہری نیند ضروری ہے ہلکی نیند یا اونگھ سے کسی حال میں وضو نہیں ٹوٹتا۔ ان مسائل پر بدائع الصنائع، بحر الرائق اور شامی میں مفصل و مدلل بحثیں ہیں طوالت کی وجہ سے درج نہیں کی گئیں۔

صفحہ ۶۷ مؤلف نے عالمگیری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر عورتوں کے بال کھلے ہوں تو غسل فرض میں ایک ایک بال کو بھگونا ضروری ہے اور ایک بال بھی خشک رہ گیا تو غسل نہ ہوگا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ عورتوں کے لیے یہ بات خاصی دشوار ہے اور فقہ حنفی میں ایک دوسرا قول بھی موجود ہے اگر مؤلف اس کا بھی ذکر کر دیتے تو بہتر تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عورتوں کے لیے صرف بالوں کی

ں تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔ بال گندھے ہوئے ہوں یا کھلے ہوئے ہوں۔ اس سلسلے میں جو احادیث آئی ہیں ان
جی یہی بات نکلتی ہے اور بقول صاحب الذخیرہ فقہ حنفی کا ظاہر مذہب بھی یہی ہے اس کے علاوہ فقہ حنفی کی معتبر
ں میں یہ مسئلہ موجود نہیں ہے کہ بال کھلے ہوئے ہوں تو ایک ایک بال کو بھگونا ضروری ہے۔ علامہ شامی نے صاحب
تار کے قول کو رد کرتے ہوئے اس پر بحث کی ہے اور ان کا رجحان بھی دوسرے ہی قول کی طرف ہے۔

صفحہ ۵۸ "اذان میں کون چیزیں مکروہ یا منع ہیں" اس عنوان کے تحت نمبر (۵) میں مؤلف لکھتے ہیں " جمعہ کی پہلی
ن کے بعد کوئی دنیاوی کام یا کاروبار کرنا حرام ہے "

پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ یہ مسئلہ اس عنوان کے تحت بیان کرنے کا نہ تھا۔ عنوان ہے کہ اذان میں کون چیزیں مکروہ
ہیں اور مسئلہ ہے کہ اذان جمعہ کے بعد کیا مکروہ و منع ہے۔ دونوں میں کیا ربط ہے؟ دوسری بات یہ کہ اگرچہ فقہ حنفی
ظاہر روایۃ یہی ہے کہ جمعہ کی اذان اول کے بعد بیع و شرا اور دوسرے دنیاوی کام نہیں کرنے چاہییں لیکن تمام
احناف نے اس ظاہر روایۃ کو قبول نہیں کیا ہے بلکہ متعدد جلیل القدر ائمہ نے بیع و شرا کی ممانعت کے لیے اس
ن کو معتبر مانا ہے جو خطیب کے سامنے خطبہ سے پہلے دی جاتی ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کے زمانے تک جمعہ میں صرف
ایک اذان دی جاتی تھی۔ میں یہاں صاحب بدائع الصنائع کی عبارت درج کرتا ہوں۔

وکذا یکرہ البیع والشراء یوم الجمعۃ	اسی طرح جمعہ کے دن بیچنا اور خریدنا مکروہ ہے جب
اذا صعد الامام المنبر واذن المؤذنون	امام منبر پر جائے اور مؤذن اس کے سامنے اذان پکاریں
بین یدیہ لقولہ تعالیٰ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا	اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے "اے مومنو! جب
اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا	جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی
اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ والامر	طرف لپکو اور بیع و فروخت ترک کر دو۔" ترک بیع کا حکم
بترک البیع یکون نہیا عن مباشرتہ	دراصل بیع و فروخت کرنے کی نہی ہے اور نہی کا سب
وادنیٰ درجات النہی الکراہۃ ولو	کم درجہ کراہت ہے اور اگر کوئی (اس نہی کے باوجود)
باع یجوز لان الامر بترک البیع	کوئی چیز بیع سے تو بیع جائز ہوگی اس لیے کہ ترک
لیس لعین البیع بل لترک استماع	بیع کا حکم کسی ایسی خرابی کی وجہ سے نہیں ہے جو بیع کے
الخطبۃ (بدائع جلد ۱ صفحہ ۲۷۰)	اندر ہو بلکہ استماع خطبہ کے ترک کی وجہ سے ہے۔

پہلی عبارت میں ... ایک تو یہ کہ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کاروبار ترک

کرنے کا حکم اس اذان کے بعد ہی جو خطبہ سے پہلے امام کے سامنے دی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے اس وقت یقینی طور پر صرف وہی اذان خطیب کے سامنے والی دی جاتی تھی اس لیے اس آیت کو اس زمانے کی اذان اول کے لیے مستدل بنانا کمزور بات ہے۔ اس مسئلے میں صاحب بدائع منفرد نہیں ہیں بلکہ امام طحاوی، شیخ الاسلام اور دوسرے ائمہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ تیسری وجہ مکتوبہ بالا عبارت کو نقل کرنے کی یہ ہے کہ اس میں بیع و شرار کے عدم جواز کی نوعیت بھی دلیل کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ قدوری اور دیگر متون معتبرہ میں بھی یہی ملتا ہے کہ اذان جمعہ کے بعد بیع و شرار مکروہ ہے۔ چونکہ مطلق مکروہ بول کر متقدمین مکروہ تحریمی مراد لیتے تھے اس لیے اسے مکروہ تحریمی لکھنا چاہیے۔

صفحہ ۹۰ شرائط صلوٰۃ کے بیان میں لکھتے ہیں: "اور اگر عورت کے ٹخنے کھل گئے تو نماز حرام ہوگی۔ پہلی بات تو یہ کہ یہاں پر لفظ حرام کا استعمال مناسب نہیں فاسد یا باطل کا لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ پھر یہ کہ معلوم نہیں مؤلف نے یہ قول کہاں سے نقل کیا ہے۔ فتح القدیر، بحر الرائق اور شامی میں اس مسئلے پر جو بحث کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ احناف کے نزدیک ٹخنے مستقل عضو نہیں ہیں بلکہ ساقین کے تابع ہیں۔ پنڈلی ٹخنے کے ساتھ مل کر ایک عضو بنتی ہے۔ اگر ٹخنے کے ساتھ یا ٹخنے کے بغیر پنڈلی کا چوتھائی حصہ کھل جائے اور ایک رکن کی ادائیگی تک کھلا رہے تو نماز فاسد ہوگی ورنہ نہیں۔ ٹخنوں کا حکم وہی ہے جو گھٹنوں کا ہے۔ گھٹنے بھی مستقل عضو نہیں ہیں، رانوں کے تابع ہیں، اگر مرد کے گھٹنے نماز میں کھل جائیں اور رانیں مستور رہیں تو نماز فاسد نہیں ہوگی، اس لیے کہ صرف گھٹنے پورے عضو کا ربع (چوتھائی) نہیں ہوتے۔ یہی مسئلہ عورتوں کے ٹخنوں کا بھی ہے اگر صرف ٹخنے کھل جائیں اور پنڈلیاں مستور رہیں تو نماز اس لیے فاسد نہیں ہوگی کہ صرف ٹخنے پورے عضو کی چوتھائی نہیں ہوتے۔ طوالت کے خوف سے عبارتیں نقل نہیں کی جا رہی ہیں۔

صفحہ ۹۱ "واجبات نماز" کے نمبر ۳ کی عبارت واضح نہیں ہے۔ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ مؤلف فرض نمازوں کی تیسری اور چوتھی رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت یا آیت ملانے کو سنت کہہ رہے ہیں۔ اگر بات یہی لکھی گئی ہے تو غلط ہے، فرض کی دو رکعتوں کے بعد صرف سورۂ فاتحہ پڑھنا مسنون ہے اس کے ساتھ کوئی سورہ یا آیت ملانا فقہ حنفی میں مکروہ تنزیہی ہے (شامی ج ۱ ص ۴۲۳) اور اگر مطلب یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کو فرض کی تیسری، چوتھی رکعتوں میں پڑھنا سنت ہے تو بات ٹھیک ہے لیکن عبارت سے بالکل ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ اس نمبر میں سورہ فاتحہ کے ساتھ سورہ یا آیت ضم کرنے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

صفحہ ۹۲ واجبات نماز کے نمبر ۱۴ میں ہے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہہ کر نماز ختم کرنا"۔ فقہ حنفی میں صرف "السلام" کا لفظ واجب ہے، علیکم کہنا بھی واجب نہیں، چہ جائیکہ ورحمۃ اللہ کہنا۔ اس پورے جملے کو واجبات صلوٰۃ میں

شمار کرنا غلط ہے۔

صفحہ ۵۹ مفسدات نماز کے تحت نمبر ۱ "قبلہ کی طرف سے قصداً دوسری طرف منہ پھیر لینا" یہ عبارت واضح نہیں ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ قبلے کی طرف سے گھوم کر منہ دوسری طرف کر لیا جائے تو بے شک نماز اس سے فاسد ہو جاتی ہے اور اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ داہنے یا بائیں طرف منہ پھیر لیا جائے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ فسادِ نماز کے لیے ضروری ہے کہ مصلی اپنا سینہ قبلے کی طرف سے پھیر لے۔ اسی عنوان کا نمبر ۱۸ " اتنی دیر ستر کا کھل جانا جتنی دیر میں ایک سجدہ یا رکوع کیا جاتا ہے"۔ یہ عبارت بھی واضح نہیں ہے۔ اعضاء ستر میں سے کسی عضوِ مستقل کا جب تک چوتھائی حصہ نہ کھلے، نماز فاسد نہیں ہوتی۔

اسی عنوان کا نمبر ۲۳ "عورت کا مرد سے مل کر کھڑا ہو جانا یہ کھڑا ہونا کم سے کم اتنی دیر ہو جتنی دیر میں ایک سجدہ کیا جاتا ہے"۔ ایک سطر میں جس مسئلے کا ذکر کیا گیا ہے وہ مسئلہ محاذاۃ ہے۔ اگر بالغ یا بلوغ سے قریب عورت، مرد کے پہلو میں یا اس سے آگے کھڑی ہو جائے تو نماز فاسد ہونے کے لیے فقہاء احناف کے نزدیک متعدد شرطیں ضروری ہیں۔ یہاں پورے مسئلے اور تمام شرطوں کی تفصیل موجب طوالت ہے۔ فساد نماز کی کم سے کم شرط یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی نماز پڑھ رہے ہوں۔ اس شرط سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ عورت کا یونہی کسی نماز کی نیت کے بغیر مرد کے پہلو میں کھڑا ہونا مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے دوسری یہ کہ اگر مرد کوئی اور نماز پڑھ رہا ہے اور عورت کوئی دوسری نماز پڑھ رہی ہو جب بھی نماز فاسد نہیں ہوگی، فرض کیجیے۔ مرد فرض پڑھ رہا ہے اور عورت کوئی سنت یا نفل پڑھ رہی ہے یا مرد ظہر کی نماز پڑھ رہا ہے اور عورت فجر کی قضا پڑھ رہی ہے تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ اس مسئلے میں فساد نماز کے لیے اور شرطیں بھی ہیں لیکن مؤلف نے بیک جنبش قلم مطلقاً نماز کو فاسد قرار دے دیا۔ مسئلہ محاذاۃ کو جو فقہ حنفی کا طویل اور پیچیدہ مسئلہ ہے اتنی بے پروائی اور بے احتیاطی سے لکھنا حیرت انگیز ہے۔

صفحہ ۷۹ مکروہات نماز کے تحت نمبر (۲) "اگر سجدہ کی جگہ کنکری ہو، اس کو ہٹانے کے لیے ایک بار ہاتھ چلا لیا منہ سے پھونک دیا تو کوئی حرج ہے"۔

یہ عبارت غلط چھپی ہے۔ شاید مؤلف کہنا چاہتے ہیں کہ حرج نہیں ہے "نہیں" کا لفظ چھپنے سے رہ گیا ہے۔ ایک بار زمین کو ہموار کر لینے یا کنکری کو ہٹا دینے کی اجازت تو ٹھیک ہے لیکن منہ سے پھونکنے کی اجازت خطرناک ہے۔ پھونکنے کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کلام ادا ہو جائے تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ معلوم نہیں پھونکنے کی اجازت مؤلف کہاں سے لی ہے۔ حدیث اور عامہ کتب فقہ میں ایک بار ہاتھ سے ہٹانے کی اجازت دی گئی ہے۔

اسی عنوان کے تحت نمبر ۵ "پہلی رکعت میں کچھ آیتیں ایک سورہ سے اور دوسری رکعت میں کچھ آیتیں دوسری سورہ
سے پڑھنا" معلوم نہیں اسے کس امام فقہ نے مکروہ کہا ہے؟ مؤلف نے نہ کوئی حوالہ دیا ہے اور نہ دلیل۔ فی الواقع ایسا کرنے
میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ اسی عنوان کا نمبر ۹ "سجدہ میں دونوں پیروں کا زمین سے اٹھنا بعض فقہاء کے
نزدیک یہ فعل مفسد نماز ہے" غرض یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سجدے میں دونوں پاؤں کی تمام انگلیاں زمین سے اٹھا لے
تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ یہ صرف بعض فقہاء کا مسلک نہیں ہے۔ امام قدوری کے نزدیک تو سجدے میں دونوں
قدموں کا زمین پر رکھنا فرض ہے۔ صاحب ہدایہ نے ان کے قول کو نقل کیا ہے اور کوئی تردید نہیں کی۔

صفحہ ۱۱ "فرض نماز کے بعد اکثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم آیۃ الکرسی اور ۳۳ بار سبحان اللہ اور ۳۳ بار الحمد للہ
اور ۳۳ بار اللہ اکبر بھی پڑھ کر اس دعا پر سو کی تعداد پوری فرما لیتے تھے۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک له
له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير۔ (مسلم، ابو داؤد)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کا انتساب غلط ہے، مسلم اور ابو داؤد کا حوالہ بھی غلط ہے۔ اس بے احتیاطی کو کیا کہئے۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۃ الکرسی اور ان تسبیحات کی تعلیم تو ضرور دی ہے لیکن خود آپ کا اس پر عمل ثابت نہیں ہے۔

صفحہ ۱۲ "لیکن گھر کی عورتیں مل کر نماز پڑھیں تو بہتر ہے" اس کا بیان آگے آئے گا" کے عنوان میں عورتوں کی جماعت کے
تحت مؤلف لکھتے ہیں: "عورتوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ گھر کے اندر تنہا نماز پڑھیں۔ لیکن اگر وہ گھر کے اندر جماعت کرنا چاہیں تو
کے لیے دو صورتیں ہیں" ان دونوں عبارتوں کی عدم مطابقت پر مؤلف کو غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ بات صحیح یہی ہے کہ اگر گھر میں
کئی عورتیں ہوں تب بھی ان کے لیے اپنی الگ جماعت قائم کر کے نماز پڑھنا بہتر نہیں ہے۔

صفحہ ۱۳ "ضروری ہدایات کے تحت مؤلف نے رکعت میں ملنے کا جو طریقہ بتایا ہے وہ ایسا ہے کہ شاید کسی کو امام کے
ساتھ مل سکے۔ یہ طریقہ ان کی اپنی ایجاد ہے۔ نئے ملنے کے لیے صرف اتنا ضروری ہے کہ وہ تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہے اور رکوع میں چلا
جائے۔ اس کے لیے نہ ہاتھ باندھنا ضروری ہے اور نہ [illegible] رکوع میں جانے کے لیے دوبارہ اللہ اکبر کہنا ضروری ہے۔ میں نے ایسے
لوگوں کو تو دیکھا ہے جو تکبیر تحریمہ کے بعد [illegible] ہاتھ باندھ کر [illegible] پڑھتے رہتے ہیں جب تک [illegible] امام ختم نہ
کر لے [illegible]۔ اس لیے [illegible] نماز کیسے پڑھیں کے تحت [illegible] کئی ابواب کے مسائل ایک جگہ
خلط ملط کر دیے [illegible] پڑھنے والے کو الجھن ہوتی ہے۔

صفحہ ۱۴ "مؤلف نے رد المحتار کے حوالے سے لکھا ہے کہ "پہلی جماعت کے مقابلے میں ثواب [illegible] دوسری جماعت
پڑھی گئی تو کوئی حرج نہیں ہے مگر اس کا ثواب جماعت کا نہیں ہوگا" کوئی پوچھے کہ جماعت کا ثواب نہیں ہوگا تو پھر دوسری جماعت
نماز پڑھنے کی اجازت کیوں دی جائے گی؟ رد المحتار [illegible] معلوم ہوا کہ [illegible] یہ شاید مؤلف کا اپنا [illegible]

تلاوت میں دو چار منٹ بھی صرف نہیں کرتے ایسا کرنا سخت گناہ ہے" مولف نے یہ بات بھی بلا دلیل کہی ہے۔

صفحہ ۹۸ "عید اضحیٰ کی نماز کے بعد بھی تکبیر تشریق کہنی واجب ہے (ردالمحتار)" پہلی بات یہ کہ ردالمحتار میں صراحۃً یہ کہیں نہیں ہے کہ عید اضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر تشریق واجب ہے۔ دوسری بات یہ کہ عید اضحیٰ کے بعد تکبیر تشریق کو واجب کہنا صحیح نہیں ہے۔ کتب ظاہر الروایۃ اور متون معتبرہ میں تصریح ہے کہ تکبیرات فرض نمازوں کے بعد واجب ہیں اور دوسرے درجے کی کتابوں میں اس کی بھی صراحت موجود ہے کہ نماز عید اضحیٰ کے بعد تکبیر تشریق نہیں ہے۔ صاحب بدائع نے دلائل کے ساتھ لکھا ہے کہ فرض نمازوں کے علاوہ اور کسی نماز کے بعد تکبیر نہیں کہی جائے گی اس مسئلے میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین متفق ہیں ان کے صریح الفاظ یہ ہیں

ولکن لا یکبر عقیب صلوٰۃ العید عندنا لما قلنا	اور اسی طرح نماز عید کے بعد ہمارے نزدیک تکبیر تشریق نہیں کہی جائے گی اس دلیل کی وجہ سے جسے ہم پیش کر چکے۔

(بدائع الصنائع جلد ۱ ص ۱۹۸)

عنایہ شرح ہدایہ میں دھو عقیب الصلوٰت المفروضات کی تشریح میں لکھا گیا ہے ففی قولہ المفروضات اشارۃ انہ لا یکبر بعد الوتر وصلوٰۃ العید والنافلۃ (المفروضات کے قول میں اشارہ ہے کہ تکبیر تشریق، وتر، نماز عید اور نفل کے بعد نہیں کہی جائے گی۔)

صفحہ ۴۴ "سونے کے وقت کی دعا کے تحت ص ۲۴۲ پر ہے: "آیۃ الکرسی پڑھنے کا بھی معمول تھا" نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سونے کے وقت دو ایک بار بھی آیۃ الکرسی پڑھنا ثابت نہیں ہے، معمول ہونا تو بڑی بات ہے۔

الفاظ اور آیات و احادیث کے بعض تراجم بھی نامناسب یا غلط ہو گئے ہیں ان کی طرف بھی مختصر اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

صفحہ ۲۰ آپ نے فرمایا کہ "کفر و دین کے درمیان نماز ہی حد فاصل ہے" یہ غالباً الفرق بین الکفر والایمان والی حدیث کا ترجمہ ہے۔ اس میں ایمان کا ترجمہ دین مناسب نہیں ہے۔ یوں بھی کفر کے مقابلے میں ایمان اور اسلام کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ دین کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا

صفحہ ۴۳ "زمین میرے لیے پاک کر دی گئی ہے" یہ جعلت لی الارض طھوراً کا ترجمہ ہے۔ طھور کا ترجمہ صرف "پاک" صحیح نہیں ہے۔ اس سے حدیث کا مفہوم بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ زمین تو ہمیشہ سے تمام امتوں کے لیے طاہر ہے امت محمدیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے زمین کو مطہر بھی بنا دیا اور اسی کے لیے خاص طور پر تیمم کا حکم نازل فرمایا۔

صفحہ ۵۲ "وضو کے لفظی معنی تو ہیں روشن چہرہ والا" پتہ نہیں یہ لفظی معنی کس لغت سے لکھے ہیں۔ وضو ایسا اسم مصدر ہے جس میں فاعل کا معنی نہیں پایا جاتا۔ عربی لغت میں وضو کے لفظی معنی "حسن و نظافت" کے آتے ہیں۔

صفحہ ۷۰ سورۂ نساء کی آیت میں اسمائے حسنیٰ عفواً و غفوراً کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ "انصاف کرنے والا اور رعایت کرنے والا" معلوم نہیں یہ غلط ترجمہ کس طرح درج ہو گیا ہے۔

صفحہ ۸۷ "اس لیے کہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو" یہ فان لم تکن تراہ کا غلط ترجمہ ہے۔

صفحہ ۱۷۸ فاذا عینا ہ تذرفان کا ترجمہ کیا گیا ہے آپ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ یہ لفظ تذرفان کا صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ آنکھوں کا ڈبڈبانا اور چیز ہے اور اس سے آنسوؤں کا بہنا اور چیز ہے۔

صفحہ ۱۸۱ "جو قرآن بھٹک بھٹک کر پڑھتا ہے" غالباً مؤلف نے "اٹک اٹک کر پڑھتا ہے" لکھا ہوگا ——— یہ کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

فقہی کتابیں خصوصیت کے ساتھ اس لیے اہمیت رکھتی ہیں کہ مسلمان روزانہ کی زندگی میں ان کے مسائل پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ان میں بے احتیاطیاں اور غلطیاں ہوں تو بہت سے لوگ ان میں مبتلا ہو جائیں گے۔ راقم الحروف نے اس کتاب پر تنقید و تبصرہ میں اتنی محنت انہیں غلطیوں اور بے احتیاطیوں کی نشان دہی کے لیے برداشت کی ہے۔ امید ہے کہ مؤلف اور ناشر دونوں ہی اس لمبی تنقید کو اسی جذبے پر محمول کریں گے۔ (ع ق)

شرائط ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی۔

۲۔ رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ غیر فروخت شدہ رسائل واپس نہیں لیے جائیں گے۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ ۵۰ یا زائد رسائل کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی دیا جائے گا۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمہ ہوگا اور رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا۔

۵۔ رقم پیشگی آنی چاہیے یا رسائل ذریعہ وی پی روانہ کرنے کی اجازت دی جائے۔

مینیجر ماہنامہ **زندگی** رامپور۔ یوپی۔

'ZINDGI' Monthly Rampur, Oct. 1961 Regd. No. A-688

● ایک نادر تحفہ ● ایک قابل قدر پیشکش

● تنہائی کا رفیق ● معلومات کا خزانہ

ہندی ماہنامہ "کانتی" رامپور کا

سالنامہ

اسلامی نظام حیات نمبر

★ اسلام مکمل نظام حیات ہے—

★ اس نے مذہب اور سیاست کو زندگی کے دو حصے نہیں بنائے ہیں

★ خدا پرستی پر قائم نظام خلافت ہی بہترین سیاسی نظام ہے—

★ اسلام کا معاشی نظام سرمایہ داری و کمیونزم کے مقابلہ میں کیوں بہتر ہے—

★ اسلام کا معاشرتی نظام پاکیزہ تہذیب و تمدن کو جنم دیتا ہے—

★ اسلام میں اخلاق و کردار کا اہم مقام ہے—

★ اسلام روح و مادہ کا بہترین امتزاج ہے—

یہ اور اسی قسم کے عنوانات کے تحت لکھے گئے مضامین، کہانیاں، کارٹونس، خاکے، سوال و جواب، خطوط و مسائل پر مشتمل یہ نمبر جلد ہی شائع ہو رہا ہے—

آپ اس کا مطالعہ ضرور فرمائیں اور

زیادہ سے زیادہ خریدار فراہم کرنے میں ہمارا تعاون کریں—

مستقل خریداروں کو ان کے سالانہ چندہ ہی میں یہ نمبر دیا جائے گا—

صفحات ۱۲۰ سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت صرف ایک روپیہ

سالانہ چندہ چار روپے

—منیجر

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

جلد ۲
شمارہ ۵

جمادی الاول ۸۱ھ
نومبر ۱۹۶۱ء

ماہنامہ

رام پور، یوپی

سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: ۵۰ نئے پیسے

(ماہنامہ زندگی)

- عرصہ ۱۳ سال سے تحریک اقامت دین کا نقیب ہے۔
- ایک مکمل ہمہ گیر نظام زندگی کے نظریہ کا علمبردار ہے۔
- اسلامی اخلاقی قدروں کا داعی ہے۔
- امن و سلامتی کا پیغامبر ہے۔
- مشرقی و مغربی علوم کا صحیح امتزاج پیش کرتا ہے۔
- دین اور اس کی حقیقتوں کا شارح ہے۔ اور زندگی کے تمام پیچیدہ اور اہم مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔
- تمام انسانوں کے سامنے ایک خدا پرستانہ نظریۂ زندگی اور اس کے مطابق ایک مکمل ڈھانچہ عمل رکھتا ہے۔
- الحاد اور خدا بیزاری کی خرابیاں اور اس کے ہلاکت آفریں نتائج سے خبردار کرتا ہے۔

اسلام!

اگر آپ سے بحیثیت ایک مسلم کے کچھ مطالبات رکھتا ہے تو

ماہنامہ زندگی کا مسلسل مطالعہ آپ کے لئے ناگزیر ہے۔

جلد ۲۷ — جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ
شمارہ ۵ — نومبر ۱۹۶۱ء

زندگی

مدیر: سید احمد عروج قادری

- خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی
- زرِ سالانہ: - ۵ر - ششماہی: - تین روپیہ - فی پرچہ: - پچاس نئے پیسے
  ممالکِ غیر سے: - دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

احمد حسین طابع و ناشر نے جماعت اسلامی ہند کی طرف سے ناظم پریس بازار نصر اللہ خاں میں چھپوا کر دفتر زندگی رامپور یوپی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قرآن کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے خود اپنے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا ہے جو اس کتاب کا قاری جاننا چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ کوئی قاری اگر جاننا چاہے کہ قرآن — قرآن والے کی نظر میں کیا ہے تو یہ کتاب خود اس سوال کا مکمل جواب بن کر سامنے آجائے گی۔

خدا سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ اُس کتاب کی نوعیت، حیثیت، امتیازات وخصوصیات اور قدر وقیمت کیا ہے جو بلا شرکت غیرے صرف اور صرف اسی کے چشمۂ علم وحکمت کا مظہر ہے۔ قاریِ قرآن جگہ جگہ قرآن نازل کرنے والے کی طرف سے اس کی تعریف پڑھتا اور اس کی صفات سے آشنا ہوتا ہے، پھر وہ انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے اس کا مقابلہ ومعازنہ کرتا ہے تو اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ یہ واقعی ایک بے نظیر کتاب ہے جو کسی انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ آیئے اس گلشنِ وحیِ الٰہی کی ان کیاریوں میں علمی سیر کریں جن میں قرآن کی تعریف وتوصیف کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔

کتاب ہدایت

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ	تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی
نُوْرٌ وَكِتٰبٌ مُبِيْنٌ يَهْدِيْ	آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعہ سے
بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ	اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں
وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ	سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان
بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ	کو اندھیرے سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے
(مائدہ ۲)	اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے

یہ قرآن کے مقصد نزول اور اس کی نوعیت کا بیان ہے۔ اس میں مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ کا ٹکڑا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کتاب سے استفادے کی شرط اس جملے سے واضح ہوتی ہے۔ ویسے تو یہ کتاب تمام دنیا

کے انسانوں کے لیے پیغام ہدایت ہے لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے بھی ہوں۔ جن لوگوں کے نزدیک خدا اور خوشنودیِ خدا کی کوئی اہمیت نہ ہو وہ اس کتاب سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ جن لوگوں کے نزدیک ذاتی اور قومی مفادات نے معبود کی حیثیت حاصل کر لی ہو وہ اس کتاب سے کیا نفع اٹھا سکتے ہیں جو صرف ایک خدا کی بندگی کی طرف دعوت دیتی ہے اور صرف اسی کی رضا کو انسانی فلاح کا واحد وسیلہ قرار دیتی ہے۔ یہ کتاب انسانوں کو اس صراطِ مستقیم پر لانا چاہتی ہے جس کے سوا کوئی دوسری راہ خوشنودیِ رب کی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے کہ انسان دوسری راہوں پر چل کر فانی دنیا کی عارضی کامیابیاں حاصل کرے اور اپنے آپ کو، اپنی قوم کو اور اپنے وطن کو مادی خوش حالی و فارغ البالی کی منزل تک پہنچا دے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ابدی زندگی کی دائمی کامیابی حاصل کر سکے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ابدی زندگی اور آخرت کی لازوال کامیابی کا قولاً یا عملاً انکار کر رہے ہوں وہ اس کتابِ ہدایت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر نور کا لفظ استعمال کیا ہے اس لیے کہ یہ کتاب بصیرت کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو بصارت کے لیے روشنی کی ہوتی ہے، اگر خارج میں آفتاب کی، چراغ کی، چاند کی یا برقی قمقمے کی روشنی موجود نہ ہو تو آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح اگر قرآن موجود نہ ہو تو کسی انسان کی بصیرت، ان حقائق کو نہیں دیکھ سکتی جن پر ہدایت و سعادت کا انحصار ہے، جہل و کفر کی تاریکیاں صرف اسی نورِ قرآن سے دور ہو سکتی ہیں۔

اس آیت میں نورِ قرآن کے تین فوائد کا ذکر کیا گیا ہے۔ (۱) جو لوگ اللہ کی مرضیات کی پیروی کرتے ہیں وہ انہیں قرآن کے ذریعہ سلامتی کے طریقے بتاتا ہے۔ (۲) شرک و بت پرستی اور خرافات و اوہام کی تاریکیوں سے نکال کر توحیدِ خالص کے نور تک پہنچاتا ہے۔ (۳) صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ سیدھا راستہ جو دین کے مقصد و غایت تک سب سے معقول اور فطری راستہ ہے۔ اس راستے کے علاوہ جتنے راستے ہیں وہ سب ٹیڑھے اور اپنے مسافروں کو ہلاکت کے گڈھے میں گراتے ہیں۔ سورۂ نساء میں فرمایا:۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ	لوگو! تمہارے رب کی طرف سے دلیلِ روشن
مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا	آگئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی
مُبِينًا ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَ	ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھلانے والی ہے،

اِعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِىْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ٥ (۲۴)

اب جو لوگ اللہ پر ایمان لے آئیں گے اور اس کو مضبوطی سے تھام لیں گے، ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لیگا اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کریگا

برہان، عربی زبان میں ایسی واضح اور روشن حقیقت کو کہتے ہیں جو کسی دعوے کے لیے قطعی اور ناقابل دلیل و حجت بن جاتی ہے اسی لیے مختصر لفظوں میں برہان، دلیل قطعی کو کہتے ہیں۔ یہاں برہان سے کیا مراد ہے مفسرین نے تین قول لکھے ہیں: معجزات، قرآن، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

بظاہر یہ تین الگ الگ قول معلوم ہوتے ہیں لیکن فی الواقع تینوں ایک ہی حقیقت پر گواہ ہیں۔ جہاں تک قرآن اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی دلیل ہیں قرآن اس بات پر برہان قاطع ہے کہ سیدنا محمد، اللہ کے رسول ہیں۔ آپ کی رسالت کے ثبوت میں اس سے بڑا کوئی معجزہ آپ کو نہیں دیا گیا اور سیدنا محمد کی ذات گرامی صفات اس دعوے پر حجت قطعی ہے کہ قرآن، اللہ کا کلام ہے۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کو مخاطب کر کے یوں کہنا کہ اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے قرآن محمد کی رسالت پر برہان قاطع بن کر آگیا ہے یا یوں کہنا کہ اے لوگو! تمہارے درمیان خود محمد کی ذات اس بات پر قطعی دلیل ہے کہ قرآن اللہ کا کلام اور اسی کی بھیجی ہوئی وحی ہے۔ دراصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں باقی رہا معجزات کا قول تو یہ پہلے معلوم ہو چکا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑا معجزہ یہ قرآن ہی دیا گیا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ مفسرین کے اقوال میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے — اس آیت میں قرآن کو نور مبین کہا گیا ہے۔ نور کا خاصہ یہ ہے کہ وہ خود واضح ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو واضح کرتا ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے، وہ سرے پا تک خود واضح ہے جس میں کوئی دھندلا پن نہیں اور دوسروں کے لیے چراغ راہ ہے جس کی روشنی میں وہ رضائے الٰہی کی منزل مقصود کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔ یہ چراغ، راہ راست کے ہر حصے پر اپنی روشنی بکھیرتا ہے اور راہرو کسی مقام پر بھی تاریکی سے دوچار نہیں ہوتا۔

مصدق و مہیمن وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا

اور ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لیکر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے پاس موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی

عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (مائدہ ۸)

اور اس کی محافظ و نگراں ہے لہذا تم ان کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور اس حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے ان کے خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

مصدق اور مہیمن کی صفات بھی قرآن کی نوعیت واضح کرتی ہیں۔ مصدق کے معنی ہیں تصدیق کرنے والا اور مہیمن کے کئی معنی آتے ہیں:۔

رقیب۔ امین۔ شہید۔ حاکم۔ قرآن کو ان تمام معانی کے لحاظ سے مہیمن کہا گیا ہے۔ مصدق ہونے کی صفت یہ واضح کرتی ہے کہ اس کتاب کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ گزشتہ آسمانی کتابوں کو جھٹلا کر یہ صرف اپنی صداقت کی مدعی ہو، اس کی نوعیت یہ بھی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے کوئی نیا دین پیش کر رہی ہو اور کچھ ایسے نئے کلیات و اصول سامنے لا رہی ہو جن سے لوگوں کے کان کبھی آشنا نہیں ہوئے اور اس کی نوعیت یہ بھی نہیں ہے کہ وہ انسانوں سے ایسے مطالبات کر رہی ہو جیسے کبھی نہیں کیے گئے بلکہ اس کے برعکس اس کتاب کی نوعیت یہ ہے کہ وہ گزشتہ تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق و تائید کرنے والی ہے، لوگوں کے سامنے وہی دین پیش کر رہی ہے جو اس سے پہلے تمام آسمانی کتابیں پیش کر چکی ہیں اور انسانوں سے وہی مطالبات کر رہی ہے جو پہلے بھی کیے جاتے رہے ہیں۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ تمام کتب سماوی کی تصدیق کرنے والی ہے بلکہ گزشتہ تمام کتابوں کی محافظ و نگراں بھی ہے۔ امین بھی ہے، گواہ اور حاکم بھی ہے۔ ان کتابوں کی تمام اصولی تعلیمات و ہدایات کو اس کتاب نے اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے اور اب قیامت تک ان کی اس طرح نگراں ہے کہ ان کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کہ اس نے ان ہدایات کو ایسی امانت و دیانت کے ساتھ اپنے اندر لیا ہے کہ ذرہ برابر بھی کسی طرح کی تحریف و تبدیلی یا خیانت نہیں ہونے پائی ہے اور اب یہی کتاب ان تعلیمات و ہدایات پر اس معنی میں گواہ اور حاکم ہے کہ جو کچھ اس میں ہے وہی صحیح ہے۔ گزشتہ آسمانی کتابوں کی صحت و سقم جانچنے کی اب یہی تنہا کسوٹی ہے۔ اسی کے ذریعہ جانچا جا سکتا ہے کہ ان کتابوں میں کتنا حصہ سونا ہے اور بعد کو لوگوں نے ان میں کتنا کھوٹ ملا دیا ہے ــــــــ مصدق کے ساتھ مہیمن کے اضافے نے سورۂ مائدہ کی اس آیت کو میرے نزدیک ختم نبوت کی بھی ایک دلیل بنا دیا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے۔ آئندہ ختم نبوت پر لکھنے کی نوبت آئی تو وہاں ان شاء اللہ تھوڑی تفصیل سے آیت کے اس پہلو پر گفتگو کی جائے گی۔

یہ بات کہ قرآن تمام کتب سماوی کا مصدق ہے بہت سی آیات میں کہی گئی ہے ان سب کا استقصاء غیر ضروری ہے۔ سورۂ یونس کی صرف ایک آیت اور نقل کی جاتی ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؀ (۳۷)

اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آچکا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ فرماں روائے کائنات کی طرف سے ہے۔

اس آیت میں قرآن سے متعلق کئی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں جن کی تفصیل ہم کر چکے ہیں، یہاں زیر بحث موضوع سے متعلق ایک بات اور معلوم ہوتی ہے کہ قرآن گزشتہ کتب سماوی کا صرف مؤید ہی نہیں ہے بلکہ ان میں بیان کی ہوئی ہدایات اور اصولی تعلیمات کا شارح بھی ہے۔ یعنی اس کتاب میں ان حقائق و عقائد کے لیے جنھیں ہمیشہ خدا کے پیغمبروں اور اس کی کتابوں نے بیان کیا ہے۔ نوع بہ نوع انداز و اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ دلوں میں اتر جانے والے دلائل و شواہد سامنے لائے گئے ہیں اور پھر ان سب کو حالات پر منطبق کر کے بھی دکھایا گیا ہے۔ اصولی تعلیمات میں دیگر کتب سماوی سے اس کتاب کا عدم اختلاف، بلکہ ان کی تصدیق و تائید اور تفصیل و تشریح خود اس بات کی ایک اہم دلیل ہے کہ یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں ہے بلکہ خدا کی اتاری ہوئی ہے —— جس طرح قرآن، سابق کتابوں کا مصدق ہے اسی طرح سابق کتابیں بھی قرآن کی مصدق ہیں اور ان کتابوں کو ماننے والے منصف علماء تسلیم کرتے ہیں کہ جس خدا نے توریت و انجیل نازل کی ہے اسی نے قرآن بھی نازل کیا ہے۔ یہ ساری کتابیں ایک ہی منبع علم سے نکلی ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ؀ (۱۰)

اب اگر تجھے اس ہدایت کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں، فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے تیرے رب کی طرف سے، لہٰذا تو شک کرنے والوں میں نہ ہو

اس آیت میں اگرچہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس سے مراد قرآن کے وہ مخاطبین ہیں

جو اس کے وحی الٰہی ہونے میں شک کر رہے تھے۔ اہل کتاب سے سوال کرنے کی ہدایت اس لیے کی گئی کہ ان کے منصف مزاج علماء اس بات کی تصدیق کر سکتے تھے کہ قرآن ٹھیک وہی دعوت دے رہا ہے جو اس سے پہلے خدا کی کتابیں اور اس کے رسول دیتے آئے ہیں اور یہ کتاب وہیں سے اتری ہے جہاں سے پہلی کتابیں اتری تھیں، چنانچہ تاریخ میں ان اہل کتاب کے نام محفوظ ہیں جنھوں نے سنتے ہی اس کا فیصلہ کیا تھا کہ یہ قرآن کسی انسان کی تصنیف نہیں بلکہ خدا کی کتاب ہے۔

تذکرہ و موعظہ

قرآن کریم کو متعدد مقامات پر ذکر، تذکرہ اور ذکریٰ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور کئی جگہ اسے موعظہ بھی کہا گیا ہے۔ یہ الفاظ بھی اس کتاب کی نوعیت کا ایک پہلو واضح کرتے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ اس کتاب کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ وہ انسانوں کے سامنے کچھ ایسے حقائق پیش کرتی ہے جن سے وہ اپنے وجود کے کسی دور میں آشنا نہ رہا ہو اور وہ اس کے لیے بالکل اجنبی اور نامانوس ہوں۔ یک بیک اور اچانک اس سے ایسی باتیں کہی جا رہی ہوں جنھیں نہ اس کی عقل تسلیم کرتی ہو اور نہ وہ اس کی فطرت سے ہم آہنگ ہوں بلکہ اس کتاب کی نوعیت "یاددہانی" کی ہے، جو حقیقتیں یہ کتاب پیش کر رہی ہے، جو ہدایتیں دے رہی ہے اور جو مطالبات کر رہی ہے ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انسان ناآشنائے محض ہو، بلکہ یہ سب کچھ اس کے اندرونی وجود میں موجود اور اس کی فطرت میں پوشیدہ ہے، بات صرف اتنی ہے کہ وہ دنیا کے ماحول میں پھنس کر انھیں بھول گیا ہے اسی طرح یہ سب کچھ اس کے دائرۂ عقل کے اندر اور اس کی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ قرآن کی آیات خارج سے انہیں چیزوں کو ابھارنے کا کام انجام دیتی ہیں جو پہلے سے اس کے اندر موجود ہیں اس لیے قرآن، یاددہانی اور یادداشت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

قرآن کے ذکر (یاددہانی) ہونے کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ جس آیت میں اللہ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اس میں اس کے لیے ذکر ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ○　　　بلاشبہ ہم نے یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے محافظ ہیں۔

یہ کتاب خود ہماری نگرانی میں ہے اور کسی طاقت کی مجال نہیں ہے کہ اس کو برباد کر سکے یا اس میں کسی طرح کی تحریف یا تبدیلی کر سکے۔ اس کتاب کے بارے میں ہماری مشیت یہ ہے کہ قیامت تک جوں کی توں اسی طرح دنیا میں موجود رہے جس طرح نازل کی گئی تھی ــــــ سورۂ تکویر میں فرمایا:-

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ — یہ تو بس تمام عالم کے لیے یاد دہانی ہے۔

سورۂ انبیاء میں ہے:-

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ○ — یہ بابرکت ذکر ہے جسے ہم نے نازل کیا، کیا تم اس کا انکار کرتے ہو

سورۂ یٰسٓ میں کہا:-

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ○ — یہ تو بس ذکر اور واضح کرنے والا قرآن ہے۔

سورۂ مزمّل و مدثر میں فرمایا گیا:-

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○ — بلاشبہ، یہ تو ایک یاد داشت ہے تو اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کرے۔

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ○ — ہرگز نہیں، یہ یقیناً ایک یاد دہانی ہے تو اب جس کا جی چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

سورۂ انعام و اعراف میں ہے:-

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ○ — یہ تمام عالم کے لیے یاد دہانی ہے۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ (اعراف ۱) — یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے پس اے محمد تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کے لیے یاد دہانی ہو۔

اس مضمون کی بہت سی آیات میں سے یہ چند آیتیں مثال کے طور پر یہاں نقل کی گئی ہیں۔ ان سب آیتوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ قرآن کسی انسان کے لیے بھی اجنبی کتاب نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کے مقتضیات کا مکمل جواب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس یاد دہانی سے فائدہ کون لوگ اٹھاتے ہیں اور کون اس سے محروم رہ جاتے ہیں ــــ متعدد آیتوں میں قرآن کو موعظۃ بھی کہا گیا ہے۔ موعظت کے لفظ سے اس کتاب کی نوعیت کا ایک دوسرا رخ روشن ہوتا ہے جو لفظ تذکرہ کا اہم پہلو ہے وہ یہ کہ قرآن کے مطالبات کی نوعیت

یہ نہیں ہے کہ ان سے مطالبہ کرنے والے کو کوئی نفع پہنچتا ہو یا ان مطالبات کے ذریعہ لوگوں کو اذیت پہنچانا یا ان پر خواہ مخواہ تکلیف دہ ذمہ داریوں کا بوجھ لادنا مقصود ہو بلکہ ان کی نوعیت یہ ہے کہ ان مطالبات کو پورا کرنے کا نفع صرف ان لوگوں کو پہنچتا ہے جو اسے پورا کرتے ہیں اور یہ کہ ان مطالبات کے پیچھے صرف ان کی خیر خواہی کا ارادہ کام کر رہا ہے ـــــ سورہ یونس میں ہے:۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۶۱)	اے لوگو تمہارا رب کی طرف سے ایک نصیحت آگئی ہے۔

سورۂ آل عمران میں ہے:۔

ھٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَھُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ ○ (۱۴)	یہ لوگوں کے لیے بیان ہے اور متقیوں کے لیے ہدایت اور ایک نصیحت ہے۔

وَعْظٌ ـ عِظَةٌ ـ مَوْعِظَةٌ ـ عربی میں خیر خواہی اور کسی شے کے انجام و مآل کی یاد دہانی کو کہتے ہیں یہ یاد دہانی ڈرا کر بھی ہوتی ہے اور خوش خبری سنا کر بھی ہوتی ہے ـ اسی لیے عام طور پر ثواب و عقاب کے ایسے ذکر کو جس سے انسان کے دل میں نرمی اور رقت پیدا ہوتی ہے وعظ کہا جاتا ہے ـ قرآن کریم ہی نہیں تمام آسمانی کتابیں اسی لیے اتاری گئی ہیں کہ وہ انسان کو طاعت و معصیت کے انجام و مآل سے باخبر کریں، اللہ تعالیٰ کی رضامندی و نارضامندی اور اس کے ثواب و عقاب کو اس طرح بیان کریں کہ انسانوں کے دل متاثر ہوں ـ اس پہلو سے تمام آسمانی کتابیں یکساں طور پر وعظ اور موعظۃ ہیں چنانچہ قرآن میں تورات و انجیل کو بھی موعظۃ کہا گیا ہے ـ اگر لوگوں کو قرآن کا موعظۂ حسنہ بھی متاثر نہیں کرتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اپنے دلوں کے دروازے خود بند کر لیے ہیں ـ

بصائر سورۂ اعراف میں کہا گیا ہے:۔

ھٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَھُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ (آیت ۲۰۳)	یہ بصیرتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اس پر ایمان لائیں ـ

بصائر، بصیرت کی جمع ہے ـ لفظ بصیرت متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے:۔ عقیدہ ـ یقین ـ عبرت ـ گواہ ـ حجت ـ قلب کی وہ قوت جس سے علمی حقائق کا ادراک کیا جاتا ہے ـ اس آخری معنی کے لحاظ سے بصیرت کا لفظ بصارت

کے مقابلے میں آتا ہے اور اسی معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

قرآن دلائل و براہین کا مجموعہ بھی ہے، نبوت محمدی کا گواہ بھی اور بصیرت افروز منارۂ نور بھی۔ اس کے دلائل و براہین، گواہیاں اور بصیرت افروز روشنیاں، تمام عالم کے لیے عام ہیں، جو چاہے ان سے فائدہ اٹھائے لیکن واقعہ کے لحاظ سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو اسے قبول بھی کریں، ظاہر ہے کہ جو لوگ اسے رد کردیں اور اپنے دلوں کو اندھا بنا لیں وہ اس روحانی اور معنوی سورج سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے جس طرح آنکھوں کے اندھے مادی سورج کی روشنی سے محروم رہتے ہیں، ہاں جو لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب سراپا ہدایت و رحمت بن جاتی ہے ان کی زندگیاں سنور جاتی ہیں اور قرآن کی رحمت ان سے چھلکی پڑتی ہے۔ یہی بات سورۂ جاثیہ میں بھی کہی گئی ہے:۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى	یہ عام لوگوں کے لیے بصیرتیں ہیں اور یقین
وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ	کرنے والوں کے لیے ہدایت و رحمت۔

بشیر و نذیر: سورۂ حٰم السجدہ میں ہے:۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا	یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں مفصل ہیں، عربی زبان میں واضح قرآن
لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا	ہے ان لوگوں کیلئے جو علم رکھتے ہیں، خوشخبری سنانیوالا اور ڈرانیوالا
فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ○	پس ان میں سے اکثر لوگ اعراض کرتے ہیں، وہ اسے (قبول کرنے کیلئے) نہیں سنتے

یہ قرآن کی حیثیت کا بیان ہے، اس کی حیثیت بشیر و نذیر کی ہے۔ یہ ایمان اور شکر گزاری کا رویہ اختیار کرنے والوں کو خدا کی خوشنودی اور جنت کی بشارت دیتا ہے اور کفر و ناشکری کا رویہ اختیار کرنے والے کو خدا کے غضب اور جہنم کا ڈراوا سناتا ہے ـــ خدا کے جتنے رسول آئے وہ بھی بشیر و نذیر تھے اور خدا کی طرف سے جتنی کتابیں آئیں وہ بھی بشیر و نذیر تھیں۔ رسولوں اور کتابوں کا کام تبشیر و تنذیر اور تذکیر ہے۔ ان کا کام یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ہدایت کا نور ڈال دیں اور انہیں سیدھی راہ چلنے پر مجبور کردیں بلکہ ان کا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دیں اور ان کے انجام سے انہیں آگاہ کردیں۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے، یہی اس مخلوق کا امتیاز ہے اور یہی جزا و سزا کی علت ہے۔ قرآن کا مبشر و منذر ہونا متعدد آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں کہا ہے:۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى	جو کچھ اس کے سامنے ہے اس کی تصدیق کرنے والا

وَبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۲) اور مومنوں کے لیے ہدایت و بشارت

سورۂ احقاف میں کہا :-

وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ○ (۲) اور یہ تصدیق کرنے والی کتاب ہو صاف عربی زبان میں تاکہ یہ ظالموں کو ڈرائے اور نیکی کرنے والوں کے لیے خوش خبری ہو۔

خدا کے رسول انسان کی سعادت و شقاوت کے سلسلے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ وہ یا تو کتاب الٰہی کی آیات تلاوت کرتے ہیں یا پھر وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے تحت ہوتا ہو۔ یہی وجہ ہو کہ خدا کے رسولوں اور اس کی کتابوں کی صفات میں عموماً اشتراک ہوتا ہو۔ قرآن میں بشیر و نذیر کی صفت انبیاء کے لیے بھی بیان ہوتی ہو اور آسمانی کتابوں کے لیے بھی، خصوصاً قرآن اور قرآن کے داعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا اشتراک اس کتاب کا ایک بصیرت افروز باب ہے

اس کتاب کی فصاحت و بلاغت اور اس کی بلند ترین ادبیت اس کے معجزہ ہونے کا صرف ایک پہلو ہو اس کے ساتھ جب اس کی نوعیت و حیثیت، امتیازات و خصوصیات اور قدر و قیمت کے پہلو جانے ہیں تو کسی کھلے دل کے انسان کو اس کے وحی الٰہی ہونے میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا۔ نوعیت و حیثیت کی بارے میں مختصراً چند باتیں اوپر عرض کی گئیں آئندہ انشاء اللہ اس کے امتیازات اور قدر و قیمت کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے گا۔

حقیقت کی دریافت میں انسان کی ناکامی

(جناب وحید الدین خاں صاحب)

فریڈرش انگلز نے جہاں ہیگل پر تنقید کی ہے، وہ لکھتا ہے :-

"اگرچہ ہیگل اپنے وقت کا ایک بہت بڑا انسائیکلو پیڈیائی ذہن رکھنے والا آدمی تھا۔ تاہم وہ ایک محدود انسان تھا۔ اس کی محدودیت کی پہلی وجہ اس کی اپنی معلومات کی کمی تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے زمانے کا علم اور اس وقت کے نظریات بھی محدود تھے، اس کے علاوہ ایک تیسرا سبب بھی تھا، وہ یہ کہ ہیگل ایک عینیت پسند (IDEALIST) شخص تھا۔ یعنی وہ مادے کے بجائے تصور کو اصل حقیقت سمجھتا تھا۔"

انگلز نے لکھا ہے کہ ان اسباب کی بنا پر ہیگل کی تفصیلات سب کی سب غلط ہو کر رہ گئیں[1] اور حقیقت کی دریافت میں وہ ناکام رہا۔

انگلس کی یہ بات جو اس نے ہیگل کے بارے میں لکھی ہے، یہی خود مارکس پر بھی پوری طرح چسپاں ہوتی ہے کیونکہ وہ زندگی کے قانون کو اگرچہ تاریخ کا فیصلہ قرار دیتا ہے مگر اس کے باوجود اس کا کہنا ہے کہ اس قانون کو معلوم کر کے اسے استعمال کرنا خود انسان کا اپنا کام ہے۔ اس لیے عملاً اس کے یہاں بھی قانون ساز خود انسان ہی بن جاتا ہے۔ مارکس جب کہتا ہے کہ زندگی کا قانون خود زندگی کے اندر موجود ہے اس کو خارج میں کہیں سے برآمد کرنے کی ضرورت نہیں تو در اصل وہ اپنے آپ کو ان فلسفیوں سے الگ کرنا چاہتا ہے جو انسان کو ایک خود فکر مخلوق مان کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان اپنا قانون ساز آپ ہے۔ اس کے برعکس مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ جس طرح لوہے اور پتھر کے لیے الگ سے کوئی قانون بنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اپنا قانون اپنے ساتھ رکھتے ہیں ٹھیک اسی طرح انسان بھی ایک قانون میں جکڑا ہوا ہے جس کو بنانا نہیں بلکہ دریافت کرنا ہے۔ مگر

---

[1] مارکس انگلس سلکٹڈ ورکس جلد دوم (ماسکو ۱۹۴۹) صفحہ ۱۲۲

اس چھپے ہوئے قانون کو دریافت کرنے کا کام جب وہ خود انسان کو دیتا ہے تو ظاہری اختلاف کے باوجود وہ اپنے آپ کو انھیں فلسفیوں کے گروہ میں شامل کر دیتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ انسان خود اپنے لیے قانون بنا سکتا ہے، اس لیے وہ تنقید جو قسم اول کے فلسفیوں پر چسپاں ہوتی ہے ٹھیک وہی تنقید خود مارکس پر بھی چسپاں ہو رہی ہے، اس اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

انگلز نے اپنے اس تجزیے میں ہیگل کی ناکامی کی وجہ یہ بتاتی ہے کہ اس کا علم محدود تھا کیونکہ ایک شخص خواہ کتنا ہی وسیع مطالعہ رکھتا ہو مگر بہرحال وہ محدود ہی رہے گا۔ دوسرے یہ کہ تحصیل علم کے لیے اس کو جو زمانہ ملا وہ بھی ایک ایسا زمانہ تھا جو اسے زیادہ معلومات نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود چونکہ ایک خاص طرز فکر رکھتا تھا اس لیے زیادہ وسیع ذہن کے ساتھ نتائج اخذ کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اگر انگلز کی اس تشریح کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے نہ صرف ہیگل بلکہ تمام فلسفیوں کے نظریات کی تردید ہو جاتی ہے۔

پہلی چیز انسان کا اپنا علم ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قانون دریافت کرنے کے لیے جس وسیع علم کی ضرورت ہے اس کے مقابلہ میں انسان کا علم ہمیشہ محدود رہے گا۔ زندگی کے قانون کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تمام انسانوں کے لیے ہے جو روئے زمین پر بستے ہیں۔ کیا کوئی انسان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے تمام انسانوں کے جذبات کو پڑھ لیا ہے اور ان کی ضروریات کو معلوم کر لیا ہے۔ آدمی بسا اوقات خود اپنے بارے میں کسی قطعی اور صحیح فیصلہ تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ پھر وہ ان کروڑوں انسانوں کے بارے میں کیا جان سکتا ہے جن کی اس نے شکل تک نہیں دیکھی، جن کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ زندگی کا مسئلہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جس طرح کسی مشین کا ایک پرزہ درست کرنے کے لیے اس کے تمام پرزوں سے واقفیت ضروری ہوتی ہے اسی طرح انسانی زندگی کے کسی ایک جزو کے لیے بھی وہی شخص قانون بنا سکتا ہے جو پوری زندگی کے مسائل پر عبور حاصل کر چکا ہو کیا انسان اپنی موجودہ عمر اور موجودہ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ ایک شخص جو بیک وقت دو خیالات پر غور نہیں کر سکتا اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کروڑوں انسانوں کے لیے قانون بنا سکتا ہے، ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے حق میں کوئی دلیل نہیں۔ ذہنی صلاحیتیں تو در کنار کیا چند سال کی یہ محدود عمر کسی کے لیے کافی ہو سکتی ہے کہ وہ زندگی کے مسائل کا جامعیت اور تفصیل کے ساتھ مطالعہ کر سکے۔

مارکس کی زندگی کے آخری ۳۵ سال اس طرح گزرے ہیں کہ لندن میں برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں صبح کو وہ سب سے پہلے داخل ہوتا تھا اور شام کو سب کے آخر میں نکلتا تھا۔ مگر اس غیر معمولی جانفشانی کے

باوجود اپنی عمر میں وہ اپنی کتاب "سرمایہ" کی صرف ایک جلد شائع کرسکا اور بقیہ جلدیں مکمل کرنے سے پہلے ایک روز اپنے مطالعہ کے کمرہ میں آرام کرسی پر بیٹھا بیٹھا انتقال کرگیا۔ اس کی یہ مشہور کتاب جو محنت کش طبقہ کی بائبل کہی جاتی ہے اس کی دوسری اور تیسری جلدیں جن کا مسودہ وہ ناتمام حالت میں چھوڑ گیا تھا اس کو انگلز اور کاٹسکی نے بعد کو مکمل کیا اور اس میں بہت دنوں تک کاٹ چھانٹ ہوتی رہی۔ پھر مارکس نے اپنی بہترین کوشش صرف کرنے کے بعد جو ناتمام حاصل مطالعہ چھوڑا ہے اس کا بھی یہ حال ہے کہ اس میں زیادہ تر صرف سرمایہ دارانہ اقتصادیات کی تشریح کی گئی ہے۔ مگر موجودہ نظام کو توڑ کر سوشلسٹ اقتصادیات کی تنظیم کس طرح ہوگی۔ اس پر توجہ دینے کا اسے بہت کم موقع ملا۔ مارکس کی تحریروں میں کہیں بھی اس نظام کی تفصیل نہیں ملتی جو سرمایہ دارانہ نظام کے بعد آئے گا۔ حقیقت یہ کہ انسان کو جو صلاحیتیں دی گئی ہیں اور اس کو دنیا میں کام کرنے کے لیے جتنا وقت ملتا ہے اس کے تحت کوئی بھی انسان خواہ وہ کتنا ہی قابل ہو یہ کام نہیں کرسکتا۔ انسان کے لیے قانون بنانا انسان کے بس سے باہر ہے۔

دوسرے پہلو سے دیکھیے۔ آج جو قانون بنتا ہے وہ کل نافذ ہوتا ہے۔ مگر انسان کو کل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ آدمی کی معلومات صرف ماضی یا درحال کے واقعات تک محدود ہیں جب کہ اسے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔ مثال کے طور پر مارکسزم کا سارا انحصار ماضی کے تجزیے پر ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتی ہے اور یہی دیکھ سکتی ہے کہ جو کچھ آج ہے وہ کیوں کر وجود میں آیا اور اس کی نشو ونما کس طرح ہوئی اور پھر اسی تجزیے کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کردیتی ہے۔ مارکس اور اس کے متبعین کو اس طریقے کے مکمل ہونے پر اس قدر اصرار ہے گویا انھوں نے "آخری سچائی" کو پالیا ہے۔ حالانکہ مارکس کا نظریہ ہے کہ جس طرح تمام موجودات عمل ارتقا کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں اسی طرح انسانی سماج میں بھی ایک ارتقائی عمل ہورہا ہے اور پھر ڈاروِن کے نظریہ کے برعکس اس کا یہ بھی خیال ہے کہ ارتقا کا یہ سفر لازمی طور پر تدریج اور تسلسل کے ساتھ نہیں ہورہا ہے بلکہ اس میں اچانک خلاف توقع تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے۔ یہ نظریہ خود اس بات کی تردید کررہا ہے کہ کوئی شخص مستقبل کے بارے میں جان سکتا ہے۔ جب انسانی سماج کسی لگے بندھے ارتقائی نظریے کے مطابق سفر نہیں کررہا ہے بلکہ بعض اوقات بالکل اچانک اس میں غیر متوقع تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں تو آئندہ کے بارے میں کوئی اصول کس طرح طے کیا جاسکتا ہے۔ پھر کس طرح یقین کیا جائے کہ ماضی کے بارے میں کسی شخص کا تجزیہ لازمی طور پر مستقبل کی بھی صحیح تشریح کرتا ہے۔ جو کچھ وجود میں آچکا ہے

ان کے بارے میں کوئی سر پھرا اب کچھ جاننے کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ مگر جو کچھ ابھی سرے سے وجود ہی میں نہیں آیا ان کو کون جان سکتا ہے جبکہ مارکسی فلسفہ کے مطابق ان کے لیے کوئی لگا بندھا اصول بھی نہیں ہے جیسا کہ اکثر اوقات اندازے کے خلاف بھی اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

اب تیسری حیثیت سے دیکھیے۔ انگلز کے خیال میں ہیگل اس لیے حقیقت تک نہ پہنچ سکا کہ وہ ذہنیت پسند تھا ٹھیک یہی بات خود مارکس کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ وہ اس لیے حقیقت تک نہیں پہنچ سکا کہ وہ مادیت پسند تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی انسان اس پر قادر نہیں ہو کہ وہ بالکل تجریدی انداز میں حقائق کا مطالعہ کرسکے، ہر شخص کے کچھ مخصوص رجحانات ہوتے ہیں اور آدمی مجبور ہو کہ وہ جب بھی مسائل حیات کا مطالعہ کرے تو ان رجحانات سے مغلوب ہو جائے۔ اس طرح ہر آدمی کا مطالعہ جانبدار مطالعہ بن جاتا ہے اور اس کے فیصلے زندگی کے بے شمار پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں، اس میں ایک فرد کے ذوق کی تسکین ہو سکتی ہے مگر مجموعی طور پر پورے معاشرے کے لیے وہ بالکل ناقابل قبول ہوتے ہیں۔

انسان کی ذاتی کیفیات کس طرح اس کے طرز فکر پر غالب ہو جاتی ہیں اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ مارکس کی کتاب "سرمایہ" کی پہلی جلد شائع ہو کر جب انگلز کے ہاتھ میں گئی تو اس نے اس کے پہلے دو ابواب پر جن میں جنس اور زر کا تجزیہ ہے اور جو تمام کتاب میں سب سے زیادہ صبر آزما اور دقیق سمجھے جاتے ہیں، تنقید کرتے ہوئے مارکس کو لکھا

> "کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ ابواب اتنے لمبے ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے کئی حصوں پر منقسم ہوتے۔ اور ان کو زیادہ عام فہم بنا دیا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ جس زمانہ میں یہ ابواب لکھے جا رہے تھے، تمہیں سرطان کے پھوڑوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ تمہارے پھوڑوں کا وہی عذاب ان ابواب میں مقید ہو گیا ہے اور درد ہی کرب دیوان میں بھی بس گئی ہے"

مارکس نے اس تنقید کی تصدیق کرتے ہوئے جواب دیا:۔

> "مجھے اس کا افسوس نہیں ہے بلکہ خوش ہوں کہ سرطان کے پھوڑوں کا عذاب ان میں محفوظ ہے کیونکہ میری یہ کتاب سرمایہ داروں کے طبقے میں جب جائے گی تو اس عذاب کا مزہ وہ بھی چکھ سکیں گے"

یہ صحیح ہے کہ ایک سرطان زدہ مصنف کی تحریر کو جو شخص پڑھے گا وہ اس کے اندر پھوڑوں کا تعفن اور ان کا کرب محسوس کرسکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ تحریر کی خوبی نہیں بلکہ اس کا نقص ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تحریر ایک مریض کی ذہنی حالت کی ترجمان ہے نہ کہ حقیقت کی ترجمان۔

نظریۂ اوتار اور عقیدۂ رسالت

(قسط ۱۳)

(جناب ابومحمد امام الدین صاحب رام نگری)

اوتار کے شواہد

اب ہم اوتار اور رسالت کے مسئلے پر اوتار کے شواہد کے نقطۂ نظر سے غور کریں گے، شری پرشوتم چترویدی شرما نے اوتاروں کی قسمیں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"کامل اوتار اسے کہتے ہیں جس کی طاقت کی پرماتما ہی کی طاقت کی طرح کوئی انتہا نہ ہو، ایسے اوتار کے سوانح میں وقت بوقت ناممکن اور عام انسانوں کے لیے غیر معمولی معلوم ہونے والے احوال و واقعات کا بھی نامحدود صورت میں ظہور ہوتا رہتا ہے، جیسے کرشن کی لیلاؤں میں، رام بھی کامل اوتار ہیں لیکن وہ آدرش (اسوہ) کے قیام کے لیے آتے ہیں انہیں انسانی زندگی کا آدرش قائم کرنا تھا اس لیے ان میں غیر معمولی اور ناممکن معلوم ہونے والے واقعات کم پائے جاتے ہیں، لیکن ہیں ضرور، مثلاً سمندر پر پل باندھنا اور بالی کو ہلاک کرنا وغیرہ"

(بھارتیہ درتو سو صفحہ ۴۴)

ہم اس مقالے کے آغاز میں اوتار سے متعلق چترویدی جی کی پوری عبارت نقل کر آئے ہیں اور بالمیکی کی رامائن سے بالی کی ہلاکت کی کتھا بھی لکھ چکے ہیں۔ یہاں تلسی داس سمندر پر پل باندھنے کی کتھا پیش کر رہے ہیں۔

"سیتا جی کو راون بھگا لے گیا تھا، رام جی نے بندروں[1] کی فوج سے لنکا پر حملہ کرنے کا پروگرام طے کیا،

---

[1] جن لوگوں کو تلسی داس جی نے بندر اور ریچھ کی فوج کہا ہے ان کو ہندو علماء کا ایک گروہ جنگلی انسان مانتا ہے، ایسے ہی لوگوں میں شری رادھا کرشنن جی ہیں جو اپنے مضمون "آدم جاتیاں" (ہندوستان کی قدیم اقوام) میں لکھتے ہیں۔ "رامائن میں آدم جاتیوں کا کثرت تذکرہ ملتا ہے شبری کے دستانے پر جاکر خود رام (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

لیکن سمندر بندروں کی فوج کو پار اترنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، جب اسی انکار کی حالت میں تین روز

(حاشیہ کا بقیہ) اور لچھمن نے درشن دیے تھے، یہاں تک کہا ہے کہ رام اور لچھمن دونوں بھائیوں نے شبری کے دیے ہوئے جوٹھے بیروں کو مزے لے کر کھایا تھا، اسی شبری کے نام پر منڈا، ہوا ور سنتھال قوموں کا نام شبر مشہور ہے۔ شری رام چندر نے جن بندروں سے دوستی کی تھی وہ بندر نہیں درحقیقت آدی واسی تھے، ان میں نل اور نیل ایسے انجنیر تھے جنھوں نے حوصلے کے ساتھ سمندر پر پل باندھا تھا، اسی وقت سے ہندوؤں کے یہاں گھر گھر مہابیر ہنومان کی پوجا ہورہی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ رامائن کے مصنف نے انھیں بندر کیوں لکھا۔

اس سوال کا جواب مضمون نگار نے یہ دیا ہے۔

"آدی واسی قومیں اپنے نام کے ساتھ اپنے قبیلے کے نام کو بہت اہمیت دیا کرتی ہیں (عرب اور افغان وغیرہ قومیں بھی اپنے قبیلوں کے ناموں کو بڑی اہمیت دیتی ہیں) اور ان کے قبیلوں کے نام زیادہ تر جانوروں اور پرندوں کے نام پر رکھے جاتے ہیں مثلاً آدم جاتیوں کا ایک قبیلہ "لکڑا" ہے اور لکڑا ایک جانور کا نام ہے۔ فرض کیجیے رام چندر اور کسی آدی واسی لکڑے سے دوستی ہوگئی، شاعر کو یہ واقعہ ملا، شاعر کو غلط فہمی ہوگئی، اور اس نے لکڑا کو (لکڑا جانور) ہی مان لیا، اور شاعر نے لکڑا کی جیسی صورت دیکھی تھی ویسی ہی بیان کردی، یہی وجہ ہے کہ سگریو مہابیر ہنومان، جامونت وغیرہ آدی واسیوں کو شاعر نے بندر، بھالو وغیرہ کی صورت میں پیش کر دیا، جو بھی ہو، بندر کی صورت میں پیش کیے جانے پر ہندوستان کی ہندو نسل آدمی اسی مہابیر ہنومان کو دیوتا مانتی ہے، ان کی پوجا کرتی ہے، اور ان کا نام لے کر بھوساگر پار کرنے (نجات پانے) کا عقیدہ رکھتی ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ آدی واسی قومیں زمانۂ قدیم کے انھیں سہ اسُر، "راکھشس" اور کول کی اولاد ہیں موجودہ زمانے میں انھیں کو اناریہ (غیر آرین) آدی نواسی (قدیم باشندے) وغیرہ کہا جاتا ہے، اور دیوتا کی اولاد کو جو ہندو کہے جاتے ہیں آریہ بتایا جاتا ہے۔" (آدی واسی نمبر ماہنامہ وشو وانی الہ آباد دسمبر ۱۹۵۱ء)

اوپر کے بیان میں یہ بات قابل غور ہے کہ جب مضمون نگار کے نزدیک تلسی داس جی کو اتنی سی بات کو سمجھنے میں غلط فہمی ہوگئی کہ رام کتھا میں جن لوگوں کو بندر، بھالو وغیرہ کہا گیا ہے وہ درحقیقت انسان تھے یا انھوں نے کتھا میں عجوبہ پن پیدا کرنے کے لیے ان کو دانستہ بندر بھالو وغیرہ لکھ دیا تو انھیں اور کن کن حقیقتوں کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہوگی یا انھوں نے دانستہ شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا ہوگا؟ اس صورت میں رام چندر جی کا اوتار ہونا بھی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ تلسی جی ایک بھگت آدمی تھے۔ خیال گزرتا ہے کہ انھوں نے جوشِ عقیدت میں رام جی کو اوتار لکھ دیا ہو۔ آخر رشی بالمیکی نے (باقی اگلے صفحہ پر)

گذر گئے تو رام جی نے برہم ہو کر کہا "لچھمن! بغیر خوف محبت نہیں ہوتی۔ تم میرا تیر کمان لاؤ، میں آتشیں تیر سے سمندر کو خشک کر دوں۔ گنوار سے عاجزی، نطفہ ری کمیں سے اچھی نیتی (روش) ممتا (حرص و ہوس) میں پھنسے ہوئے انسان سے حکیمانہ باتیں، حد سے گذرے ہوئے حریص سے ترک دنیا کی فضیلت، غصہ در سے صلح کی بات، اور کامی (نفس پرست) سے بھگوان کی کتھا، ان سب کا وہی نتیجہ ہوتا ہے جو بنجر زمین میں بیج بونے کا۔

یہ کہہ کر رام جی نے کمان چڑھائی اور اپنا آتشیں تیر سمندر میں مارا جس سے سمندر کے دل میں آگ بھڑک اٹھی اور سمندر کے مگر، سانپ اور مچھلیاں تمام جانور تڑپنے لگے۔ سمندر نے یہ حال دیکھا تو طلائی طشت میں جواہرات سجا کر اپنا کبر و غرور دور کر کے برہمن کی صورت میں رام جی کے پاس آیا اور ڈرا سہما رام جی کے پاؤں پکڑ کر بولا: "سوامی! میرا قصور معاف فرما دیجیے۔ آکاش (خلا) ہوا، آگ، پانی اور (عناصر خمسہ) سب اپنی فطرت ہی سے جامد ہیں۔ آپ کی پریرنا یعنی آپ کی تحریک سے مایا نے ان کو خلقت کی غرض سے پیدا کیا ہے، جس کے لیے مالک کا جیسا حکم ہو اس کو اسی حالت میں آرام ملتا ہے۔ پربھو نے اچھا ہی کیا جو مجھے تنبیہ کی، لیکن مریادا (فطرت) آپ ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ ڈھول، گنوار، شودر، حیوان، عورت، یہ سب تاڑنا (تنبیہ اور سختی) کے مستحق ہیں۔ میں آپ کے جلال سے جل جاؤں گا، اور فوج پار اتر جائے گی، لیکن اس میں میری کوئی بڑائی نہیں ہے۔ آپ کا حکم ناقابل انکار ہے۔ آپ کی جو مرضی ہو میں بے تامل اس کی تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔"

(حاشیہ ۵ کا بقیہ) بھی تو رام کتھا لکھی ہے۔ وہ تلسی داس سے بہر طور افضل تھے۔ تلسی داس کلجگ کے انسان تھے جو بدترین زمانہ مانا جاتا ہے اور بالمیکی اس زمانے میں تھے جسے بہترین زمانہ قرار دیا جاتا ہے، وہ اس مرتبہ کے انسان تھے کہ خود بالمیکی کی رامائن ہی کے مطابق ان کے پاس برہما نارد منی اور برہما جی آئے تھے اور انھیں کے بیان کے مطابق انھوں نے رامائن لکھی جس میں رام جی کو ایک بلند مرتبہ انسان لکھا گیا۔ مضمون نگار نے بھی لکھا ہے اور واقعہ بھی ہے کہ ہنومان انسان رہے ہوں یا دراصل جانور، دیوتا بہرحال نہ تھے، لیکن جب انھیں بھی دیوتا مان کر ان کی ہندوؤں کے یہاں پوجا ہو رہی ہے تو پھر کیا عجب ہے جو رام جی کو انسان سے بڑھا کر وشنو کا اوتار مان لیا گیا ہو؟ یہاں ایک بار پھر اس بات کی طرف خیال جاتا ہے کہ رام چندر جی کے زمانے کو دس لاکھ برس قبل بتایا جاتا ہے پھر کیا یہ آدم جاتیاں دس لاکھ برس سے برابر چلی آ رہی ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ بس مان لینے کے سوا واقعات و شواہد رام جی کے اوتار ہونے کے خلاف ہی ملتے ہیں۔

سمندر کی عاجزانہ باتیں سنکر کرپالو رام جی مسکرا پڑے۔ بولے۔ "بھائی! بندروں کی فوج جس طرح پار اتر جائے وہ تدبیر بتاؤ۔

سمندر نے عرض کی۔ "پربھو! نیل اور نل بندر دونوں بھائی ہیں۔ انھوں نے بچپن میں رشی سے آشیرواد پایا ہے کہ ان کے چھو دینے ہی سے بڑے بڑے پہاڑ بھی آپ کے اقبال سے سمندر پر تیرنے لگیں گے اور میں بھی پربھو کی پربھوتا کو دل میں جگہ دے کر تا امکان مدد دوں گا لہذا آپ سمندر کو اس طرح پار کیجیے کہ تینوں لوکوں (آسمان، زمین اور زیر زمین) میں آپ کی مدح و ستائش کی جائے۔ آپ اس تیر سے میرے شمالی ساحل پر رہنے والے گناہ کے مخزن انسانوں کو ہلاک کیجیے۔

مہربان اور جنگ آزمودہ رام جی نے سمندر کے دل کا درد سنکر اسی وقت تیر سے ان آدمیوں کو ہلاک کر دیا رام جی کی یہ بہادری اور مردمی دیکھ کر سمندر بہت خوش ہوا اور اس نے ان شریر انسانوں کا سارا حال رام جی کو سنایا اور آپ کے قدموں کی بندنا (مدح و ستائش) کر کے چلا گیا۔ سمندر کے جانے کے بعد رام جی نے مشیروں کو بلا کر کہا۔

"اب کیوں دیر ہو رہی ہے؟ پل تیار کرو کہ فوج اترے؟" جامبوان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مہاراج! سب سے بڑا پل تو آپ کا نام ہی ہے جس پر سوار ہوکر انسان اس سنسار سے پار اتر جاتا ہے۔ پھر اس معمولی سے سمندر سے پار اترنے میں کتنی دیر لگے گی۔"

یہ سن کر ہنومان نے کہا۔ "پربھو کا جلال ہی بڑا بڑوائل (سمندر کی آگ) کے مثل ہے۔ اس نے پہلے ہی سمندر کے پانی کو سوکھ لیا تھا لیکن دشمنوں کے آنسوؤں کی دھارا سے یہ پھر بھر گیا آنسوؤں ہی کے اثر سے تو یہ کھاری ہو گیا ہے۔

جامبوان نے نیل اور نل دونوں بھائیوں کو بلا کر تمام باتیں سنائیں اور کہا۔ "دل میں شری رام کے اقبال کو یاد کر کے پل بناؤ۔ اس طرح اس کام میں تمہیں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔

پھر بندروں کے گروہ کو طلب کر کے کہا۔ "آپ میری درخواست کو توجہ سے سنیے۔ شری رام چندر کے چرن کمل (قدموں) کو اپنے دل میں رکھو لیجیے اور سب بھالو بندر مل کر ایک کھیل کھیلئے۔ اے وِکٹ بندروں کے غول! آپ دوڑ جائیے اور درختوں کے جنگل اور پہاڑوں کو اکھاڑ لائیے۔

یہ سنکر بندر اور بھالو ہنکار کر کے شری رام چندر کی جے پکارتے ہوئے چل پڑے اور بڑے بڑے پہاڑوں اور درختوں کو کھیل ہی کھیل میں اکھاڑ اکھاڑ کر لانے اور نیل نل کو دینے لگے اور یہ دونوں بھائی ان کو اچھی طرح گڑھ گڑھ کر پل

تیار کرنے لگے، بندر بڑے بڑے پہاڑ اکھاڑ لاتے اور نیل۔ نل ان کو گیند کی طرح روک لیے۔

شری رام چندر جی نے پل کی بہترین ساخت دیکھ کر کہا: "یہ سرزمین بڑی پرفضا اور اعلیٰ درجے کی ہے۔ میں نے طے کیا ہے کہ یہاں شیوجی کو نصب کروں گا، میں نے اس کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔"

یہ سنکر بندروں کے راجا سگریو نے بہت سے فرستادوں کو بھیجا جو تمام ممتاز منیوں کو بلا لائے انھوں نے شیولنگ نصب کرکے دستور کے مطابق اس کی پوجا کی۔

رام جی نے کہا: "مجھے شیوجی کی طرح دوسرا کوئی پیارا نہیں، جو بھی شیوجی سے عداوت رکھتا ہے اور میرا بھکت کہلاتا ہے وہ مجھے خواب میں بھی نہیں پاسکتا، جو بھی شیوجی سے منحرف ہوکر میری بھکتی کرنا چاہتا ہے وہ نرک میں جانے والا بے وقوف اور کم عقل ہے۔ جن لوگوں کو شنکر جی پیارے ہیں اور مجھ سے دشمنی رکھتے ہیں یا شیوجی کے دشمن ہیں اور میرے پیارے بننا چاہتے ہیں وہ کلپ (دنیا کی عمر کا ایک نہایت طویل حصہ) بھر جہنم کے نچلے طبقے میں پڑے رہتے ہیں، جو لوگ میرے نصب کیے ہوئے ان رامیشور کا درشن کریں گے وہ مرنے پر میرے کور میں جائیں گے، اور جو گنگا جل لاکر ان پر چڑھائیں گے وہ سجیہ مکتی پائیں گے یعنی مجھ میں مل جائیں گے۔ جو شخص نفاق سے پاک ہوکر بلا غرض رامیشور جی کی خدمت کرے گا اسے شنکر جی میری بھکتی دیں گے، اور جو شخص میرے بنائے ہوئے پل کا درشن کریگا وہ بے ریاضت ہی سنسار ساگر کے پار اتر جائے گا۔" (نجات پا جائے گا۔)

یہ سن تمام ممتاز منی اپنے اپنے آشرم (سکونت گاہ) کو واپس چلے گئے۔

فن کار نیل اور نل نے پل تیار کر دیا، اور شری رام چندر کی عنایت سے ان کی نیک نامی چاروں طرف پھیل گئی جو پتھر خود بھی پانی میں ڈوب جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی ڈبو دیتے ہیں وہ جہاز کی طرح خود بھی تیرتے رہے اور دوسروں کو بھی پار اتارنے والے بن گئے۔[1]

---

[1] اس بیان کا خلاصہ بھی دیا جاسکتا تھا لیکن پورا بیان اس لیے دے دیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کتاب کس رنگ میں لکھی گئی ہے اور اس میں کس قسم کا مواد ہے۔ پل سازی کے بیان میں شیولنگ کے نصب کا واقعہ، اس کے درشن کے فضائل، شری رام اور شیو کا باہمی تعلق، ان سب کے مطالعہ سے دو چیزیں سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ بنارس میں مشہور شیو مندر ہے اور تلسی داس کا بنارس سے خاص تعلق ہے اس لیے یہاں شیولنگ کی کتھا لگا دی گئی ہے۔ دوسری خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تلسی داس کے زمانے تک رام جی کے عقیدتمندوں اور شیوجی کے ماننے والوں کی باہمی تفریق کے اثرات (باقی اگلے صفحہ پر)

شری پرشوتم چترویدی نے رام جی کے اوتار ہونے کے دلائل کی ایک مثال کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی نوعیت دیکھ لی گئی اور ایسے واقعات کیا ہیں؟ چترویدی جی نے ان کی کوئی نشان دہی نہیں کی۔ بالی کے قتل کا واقعہ کو بھی پیش نظر رکھیے۔ رہ گیا راون کا قتل اور لنکا کی فتح، تو اسے بھی رام جی کے اوتار کی دلیل مان لیجیے۔

چترویدی جی نے کرشن جی کے اوتار کی دلیل کے طور پر کسی واقعہ کی طرف اشارہ نہیں کیا، میرے ایک ہندو دوست نے جو اپنے مذہب کے بڑے عالم ہیں اس موقع پر مجھ سے کرشن جی کا ایک واقعہ بیان کیا تھا جسے ہم شروع مقالہ میں ذکر آئے ہیں۔ بندرابن کے لوگ سالانہ اندر کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ایک سال انھوں نے اندر کی پوجا کی تیاری کی تو کرشن جی نے ان سے پوچھا۔ یہ کس بات کی تیاری ہو رہی ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ اندر کی پوجا کی۔ کرشن جی نے کہا۔ اندر سے زیادہ تو تمہاری پوجا کا مستحق گوبردھن پہاڑ ہے جو تم کو طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے، کرشن جی کے اس طرح سمجھانے پر اس سال اندر کی پوجا نہیں ہوئی، معمول کے مطابق پوجا نہ ملنے پر اندر نے اپنے مقربین سے اس کی وجہ دریافت کی، انھوں نے وجہ بتائی، اس پر خفا ہو کر اندر نے پانی برسانا شروع کیا اور اتنی بارش کی کہ بندرابن کے باشندے گھبرا اٹھے، اور کرشن جی کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کی کہ اندر خفا ہو گئے ہیں، وہ ہم کو تباہ کر دیں گے، کرشن جی نے کہا۔ تم گھبراؤ نہیں، اندر تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ چنانچہ انھوں نے گوبردھن پہاڑ کو اپنی چھوٹی انگلی پر اٹھا لیا اور لوگوں سے کہا۔ اپنا تمام سامان لے کر پہاڑ کے سایے میں آ جاؤ۔ سب نے یہی کیا، اب کسی کو کوئی پریشانی نہ تھی۔ اندر کا خیال تھا کہ لوگ بارش سے بے پناہ ہو کر ان کی طرف رجوع کریں گے، لیکن جب ایسا نہ ہوا تو پھر انھوں نے اپنے مقربین سے وجہ دریافت کی انھوں نے بتایا کہ جس شخص نے لوگوں کو پوجا سے منع کیا تھا وہ جانے کس کمال کا انسان ہے کہ اس نے گوبردھن پہاڑ کو اپنی چھوٹی انگلی پر اٹھا لیا ہے۔ اب بندرابن کے باشندے اسی کے سایے میں محفوظ ہیں۔ ان پر بارش کا کوئی اثر نہیں۔ یہ سنکر اندر چونکے کہ یہ تو کوئی خاص شخصیت ہے۔ چنانچہ وہ بندرابن آئے تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ کرشن جی وشنو کا اوتار ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) موجود تھے، اور ایک دیوتا کے ماننے والے دوسرے کے دیوتا کو نہیں مانتے تھے۔ اس کتھا کے ذریعہ اس تفریق کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو رام جی کی زبان سے یہ کیوں کہلوایا جاتا کہ "جن لوگوں کو شنکر جی پیارے ہیں اور وہ مجھ سے عداوت رکھتے ہیں یا شیو جی سے دشمنی رکھتے ہیں اور میرے پیارے بننا چاہتے ہیں وہ کلپ بھر نرک کی تہ میں پڑے رہیں گے" وغیرہ

اس واقعہ کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ مہابھارت کی جنگ کے سلسلے کے کچھ واقعات ہوں جن کو کرشن جی کے اوتار ہونے کا ثبوت مانا جاتا ہو۔

اب اس کے آگے ہم دکھائیں گے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور خود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات موجود ہیں، خدا کے رسولوں سے متعلق ایسے واقعات کو اسلامی اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔ اگر ہمارے ہندو بھائی انبیاء کرام کے معجزات پر غور کریں گے تو ان کو اس نتیجے پر پہنچنے میں چنداں دشواری نہ ہوگی کہ جیسے واقعات کو وہ اوتار کے دلائل و شواہد قرار دیتے ہیں ایسے واقعات بلکہ ان سے بھی عجیب تر خدا کے رسولوں سے متعلق گذر چکے ہیں۔ درآں حالیکہ وہ خدا کے اوتار تو تھے ہی نہیں، اس صنف سے بھی نہ تھے جن کو ہمارے ہندو بھائی دیوتا مانتے ہیں اور جن کا مقام سورگ یعنی عالم بالا میں ہے، بلکہ خدا کے رسول اسی زمین پر رہنے والے انسان تھے، پس اگر شری رام چندر اور شری کرشن جی سے متعلق جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ صحیح ہوں اور یہ دونوں حضرات اگر اپنے اپنے زمانے کے ایشور کے سندیش واہک (پیغمبر) رہے ہوں تو ہو سکتے ہیں مگر وہ ایشور کا اوتار نہ تھے۔ ان حضرات کے زمانے کے بعد یا تو ان کے متعلق اصطلاحات و تمثیلات کے سمجھنے میں غلط فہمی واقع ہو گئی یا ان کے معتقدین نے رفتہ رفتہ ازراہِ عقیدت ان کو اوتار کا درجہ دے دیا، مذہبی تاریخ میں ایسی مثالیں نایاب نہیں ہیں اور ہم اوپر ایسی مثالیں پیش کر آئے ہیں۔

انبیائے کرام کے معجزات

شری رام چندر اور شری کرشن جی کو اوتار ثابت کرنے کے لیے دو ممتاز ہندو عالموں نے جو واقعاتی دلائل بیان کیے ہیں، نیز جن کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے ان کو ہم نے اوپر نقل کر دیا ہے۔ ہمیں ایسے اگر مزید دلائل ملتے تو ہم ان کو بھی نقل کر دیتے تاکہ بحث میں کوئی تشنگی باقی نہ رہ جائے۔ اس کے باوجود ہم مانے لیتے ہیں کہ ان دونوں بزرگوں کے متعلق ایسے اور واقعات بھی ہوں گے، مگر ان سب کا حاصل یہی نکلے گا کہ ان سے متعلق ایسے عجیب و غریب اور مافوق الانسانی واقعات ظہور میں آئے جو ان کے سوا دوسرے انسانوں کے ذریعہ وقوع پذیر نہیں ہو سکتے تھے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کیا جن ہستیوں سے عجیب و غریب اور خلافِ عادت واقعات کا ظہور ہو وہ لازماً خدا کے اوتار ہی ہوں؟ بالفاظِ واضح کیا وہ خدا ہوں؟ کیا خدا کے خاص بندوں کے ذریعہ خلافِ عادت واقعات کا ظہور نہیں ہو سکتا؟ انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ انسانوں کے ذریعہ خدا کے خاص بندوں سے ایسے واقعات ظہور میں آئے اور وہ

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، خدا کے یہ بندے کسی ایک ہی قوم، کسی ایک ملک اور کسی ایک ہی زمانے میں نہیں ہوئے مختلف قوموں، ملکوں اور زمانوں میں ہوئے، ان کو ماننے والے بھی کسی ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم و مذہب کے لوگ نہیں ہیں، مختلف ملکوں، قوموں اور مذہبوں کے لوگ ہیں اور سب مانتے ہیں کہ ان سے عجیب غریب مافوق الفطرت واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ اسلامی زبان میں ایسے واقعات کو معجزہ کہتے ہیں اور معجزات کو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت کا خدائی ثبوت اور نشان مانا گیا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ہندو علماء عجیب و غریب واقعات کو اوتار کا ثبوت بتلاتے ہیں ان انبیاء کرام اور ان کے معجزات کی تاریخ اتنی مسلسل عام اور عالمگیر ہے کہ اصولی حیثیت سے ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان معجزات کی موجودگی میں جو خدا کے بندوں سے صادر ہوئے ہندو علماء غور فرمائیں کہ جن واقعات کو وہ اوتار کا ثبوت قرار دیتے ہیں ان کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے جب ویسے ہی واقعات خدا کے رسولوں اور نبیوں کے ذریعہ وقوع میں آئے؟ پھر تو دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ایسے واقعات کی بنا پر خدا کے رسولوں کو بھی اوتار مانا جائے اور یہ صورت کسی طرح درست قرار نہیں دی جاسکتی، اور دوسری صورت یہ کہ جن کو اوتار کہا جاتا ہے ان کو بھی خدا کا بندہ اور قرینہ کی حد تک خدا کا رسول قرار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ عقل سلیم کا فیصلہ اسی دوسری صورت کے حق میں ہوگا۔ جیسے واقعات خدا کے رسولوں سے ظاہر ہوئے ایسے ہی واقعات کی بنا پر یہ ماننا مقتضائے عقل کیسے ہوسکتا ہے کہ خود خدا ہی انسانی صورت میں اتر آیا تھا؟ یہ بات تو خدا کی شان کے بھی منافی ہے۔ یہ عالم خدا کی صورت کے ظہور کا نہیں ہے، یہ عالم ہے خدا کی قدرت کے ظہور کا اور اس کے تمام مظاہر و مشاہد سے خدا کی قدرت کا ظہور ہو رہا ہے، اور یہی مظاہر و مشاہد ہم میں یہ ادراک و شعور پیدا کرتے ہیں کہ خدا کا وجود برحق ہے۔ اور ان تمام صفات حسنہ سے متصف ہے جس کا ثبوت کائنات کے مشاہد و مظاہر سے مل رہا ہے۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کی تفصیل تو اسی صورت میں ضروری ہوگی جب ہندی میں اس مقالہ کی اشاعت ہو، یہاں اپنے موضوع کی تکمیل کے لیے ہم ان معجزات کی طرف بالاختصار اشارہ کریں گے۔

(۱) جن انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر دوسری خدائی کتابوں کے علاوہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے ان میں حضرت نوح علیہ السلام بھی ہیں، ان کے زمانے میں شرک و بت پرستی کا بڑا زور تھا۔ آپ کے زمانے میں جن بتوں کی پرستش ہو رہی تھی ان کے نام ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد سے برابر اپنی قوم کو خدا کی توحید، خدا پرستی اور نیک عملی کی دعوت دیتے

رہے، مگر ان کی قوم راہِ راست پر آنے کے بجائے ضلالت اور بدعملی ہی میں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی جب دعوت و تبلیغ اور وعظ و پند کی انتہا ہو گئی اور حضرت نوح علیہ السلام نے دیکھ لیا کہ یہ قوم سیدھی راہ پر آنے کی نہیں، یہ باقی رہی تو خدا کی زمین فتنہ و فساد ہی سے بھرتی چلی جائے گی اور اس سے جو نسل پیدا ہوگی وہ بھی اسی کے نقش قدم پر چلے گی تو آپ نے خدا سے فریاد کی :-

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ (سورۂ نوح)

اے میرے رب! زمین پر ان منکروں کا ایک گھر بھی آباد نہ چھوڑیو، اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ ہی کریں گے، اور یہ جو اولاد پیدا کریں گے وہ بھی سرکش اور کفر پسند ہی اولاد ہوگی

حضرت نوح علیہ السلام کی فریاد سن لی گئی، ان کو کشتی بنانے کا حکم دیا گیا، مگر وہاں نہ کوئی دریا تھا اور نہ سمندر، مذاق اڑانے والے حضرت نوحؑ کا مذاق اڑانے لگے، آخر خدائی فیصلے کے ظہور کا وقت آ گیا، حضرت نوح علیہ السلام اپنے پیروؤں اور سامان زندگی کے ساتھ کشتی پر سوار ہو گئے، آبادی کا ایک تنور پانی کا چشمہ بن گیا اس سے پانی ابلنے لگا، اوپر سے بارش شروع ہو گئی، پورا علاقہ ہولناک سمندر بن گیا جس کی موجیں پہاڑوں کی چوٹیاں ناپنے لگیں، پوری سرکش اور بددین قوم اس آبی طوفان میں نیست و نابود ہو گئی صرف حضرت نوحؑ اور ان کی کشتی کے سوار بچے۔

فَأَنجَيْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ۝ ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبَاقِينَ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝ — ہم نے نوح کو اور ان کو جو اس بھری کشتی میں تھے بچا لیا پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا بلا شبہ اس واقعہ میں (منکرین حق کے لیے) نشانی ہے، حالانکہ ان میں اکثر ایمان لانیوالے نہ تھے۔

غور کیجیے۔ اگر رامائن کی کتھا کے مطابق ایک جگہ سمندر پر پل بن جاتا ہے تو دوسری جگہ خشکی سمندر بن جاتی ہے، وہاں شری رام چندر جی کی ذات واسطہ ہے اور یہاں حضرت نوحؑ کی ذات، وہاں بھی ادھرمی اور ظالم قوم ہے۔ یہاں بھی بددین اور سرکش قوم ہے۔ اگر رام چندر کو اوتار مانا جائے تو حضرت نوحؑ کو کیا قرار دیا جائے۔ یہ بھی واضح رہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کو کتھا کہانی کہہ کر جھٹلایا نہیں جا سکتا آپ کی کشتی کا نشان موجودہ زمانے میں بھی مل چکا ہے۔ سمندر کے پل کے واقعہ کے مقابلے میں طوفانِ نوحؑ کا واقعہ زیادہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ سمندر کے واقعہ کو ماننے والی ایک قوم ہے تو طوفانِ نوحؑ کو ماننے والی دنیا کی متعدد قومیں ہیں جو دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ (باقی)

"اِنِ الحُکمُ اِلَّا لِلّٰہ" کا مفہوم

سوال

ادارہ اہل سنت و جماعت، حیدرآباد دکن کے ترجمان ماہنامہ "الحق" جلد ۱۵ شمارہ ۵، ۳ ۷ ۱ تا ۶، ۷ ۱ میں عنوان ربانی ہدایت کے تحت ان الحکم الا للہ کے فقرۂ قرآنی کی تشریح کی گئی ہے۔ تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ اس مضمون میں لکھا گیا ہے :۔

"لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ عصر حاضر کے مفکرین اسلام حق تعالیٰ کے اس ارشاد اِنِ الحُکمُ اِلَّا لِلّٰہ کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ قانون سازی کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے اور یہ کہ اقتدار اعلیٰ اللہ ہی کے لیے ہے۔ بالخصوص جب یہ بات ان حضرات کی طرف سے پیش کی جاتی ہے جو اپنی دینی بصیرت کے لحاظ سے عوام و خواص کے نزدیک ایک مقام رکھتے ہیں اور ایک حد تک دینی بصیرت کے حامل ہیں تو اور بھی دکھ ہوتا ہے۔"

اس عبارت میں اگرچہ یہ تصریح نہیں کی گئی ہے کہ عہد حاضر کے وہ مفکرین اسلام کون ہیں جو یہ مفہوم بیان کرتے ہیں مگر ہر شخص کا ذہن جس نے جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھا ہے اس عبارت کو پڑھتے ہی جماعت اسلامی کی طرف جاتا ہے۔ مولانا صفوۃ الرحمٰن صابر مدیر الحق کی تشریح پڑھ کر یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ آخر کون سی بات صحیح ہے۔ ان الحکم الا للہ کے علاوہ ان کے مضمون میں کئی باتیں اور ہیں جو جماعت اسلامی کے لٹریچر اور اس کے مسلک کے خلاف ہیں اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر رسالہ "زندگی" میں اس کا مدلل اور تشفی بخش جواب دیں تاکہ الجھن دور ہو۔

جواب

ماہنامہ "الحق" یہاں ماہنامہ "زندگی" کے تبادلے میں آتا تھا لیکن ادھر بہت دنوں سے وہ ہمارے پاس تبادلے میں نہیں آرہا ہے۔ آپ کے توجہ دلانے پر راقم الحروف نے وہ شمارہ منگا کر اس مضمون کو پڑھا۔ —— اس مضمون میں ایک جگہ یہ عبارت نظر آئی :۔

"غور فرمائیے اور ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے کہ ہمارے ان مفکرین کی مرعوب ذہنیت کہاں کہاں اور کیسے کیا گل کھلا رہی ہے۔ دراصل ان حضرات نے دیکھا کہ مغرب میں ہر انقلاب سیاسی ہو کہ تمدنی ہو کہ معاشرتی حکومت واقتدار کے بل بوتے پر ہوا ہے لہذا انھوں نے اسلامی انقلاب کے لیے حکومت و اقتدار کے حصول کو ضروری فرض کر لیا اور اس مفروضہ کو مدلل کرنے کے لیے ان حضرات کو اسی طرح کی بے محل تاویلات کا سہارا لینا پڑا۔ اقتدار اعلیٰ اللہ ہی کے لیے ہو یا یہ کہ قانون سازی کا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے۔ یہ اپنی جگہ الگ بحث ہے۔ آیت زیر تشریح نہ اس کا محل ہے اور نہ اس مفہوم کی متحمل — صفحہ ۹

اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ جن مفکرین کی طرف مضمون نگار اشارہ فرما رہے ہیں ان کے پاس اس عقیدے کے لیے کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ ہی کے لیے اور انسانی زندگی کے لیے قانون سازی کا مستحق صرف وہی ہے۔ کوئی دلیل اس فقرے کے سوا موجود نہیں ہے اور انہیں اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے اس فقرے کی بے محل تاویلات کا سہارا لینا پڑا ہے تو میں سب سے پہلے یہاں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جماعت اسلامی میں ایسے مفکرین کا وجود نہیں ہے۔ اس جماعت کے مفکرین کے پاس عقیدۂ بالا کے لیے کتاب وسنت کے بیسیوں دلائل موجود ہیں بلکہ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے۔ سورۂ یوسف کی متعلقہ آیتوں کا ترجمہ وتفسیر کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے کسی ذمہ دار شخص نے یہ ترجمہ نہیں کیا ہے کہ" اقتدار اعلیٰ اللہ ہی کے لیے ہے" قانون سازی کا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے" اس لیے آپ کو مطمئن رہنا چاہیے کہ فاضل مضمون نگار کی اس عبارت کی مصداق جماعت اسلامی نہیں ہے۔"

مدیر الحق کے مضمون میں اصل چیز وہ تشریح ہی ہے جو انھوں نے اِن الحکم الا للہ کے فقرے کی کی ہے اور باقیں یا تو اسی تشریح کا نتیجہ ہیں یا محض ضمنی ہیں اس لیے اس تشریح پر ہی اصلاً تھوڑی تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں — محترم مدیر الحق نے قرآن کے زیر بحث فقرے کی جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ اس فقرے کے ترجمے ہی میں درج کر دیا ہے ان کی عبارت یہ ہے :-

"ان الحکم الا للہ فرماں روائی صرف اللہ ہی کے لیے ہے (یعنی اللہ کی کارسازی وکار فرمائی میں کوئی فرد خلق شریک و دخیل نہیں ہے۔"

قوسین میں جو عبارت انھوں نے اضافہ کی ہے اسی کو آگے تشریح کے عنوان سے کئی صفحے میں پھیلا کر لکھا ہے۔ اس لمبی تشریح کا حاصل یہ ہے کہ ان الحکم الا للہ میں حکم سے مراد اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکومت ہے اس لیے اس فقرے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کائنات کے انتظام وانصرام اور اس کی کارسازی وکارفرمائی میں کوئی

مخلوق شریک و دخیل نہیں ہے بلکہ خدا ہی اپنی کائنات کا تنہا کارساز و کارفرما ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اقتدارِ اعلیٰ اللہ ہی کے لیے ہے اور قانون سازی کا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے تو آیت زیرِ تشریح نہ اس کا محل ہے اور نہ اس مفہوم کی متحمل۔

اس تشریح کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "فرماں روائی" اور "اقتدار" میں لفظی فرق کے سوا معنوی فرق کیا ہے؟ یعنی "فرماں روائی صرف اللہ کے لیے ہے" اور "اقتدارِ اعلیٰ اللہ ہی کے لیے ہے" ان دونوں جملوں میں لفظوں کے سوا معنی و مفہوم کا کیا فرق ہے؟

ظاہر ہے کہ اس کائنات میں جب فرماں روائی صرف اللہ کے لیے ہے تو اقتدارِ اعلیٰ بھی یقیناً صرف اسی کے لیے ہوگا۔ جو اس کائنات کا تنہا فرماں روا ہے یقیناً وہی تنہا مقتدرِ اعلیٰ بھی ہوگا۔ جملے دو ہیں لیکن حقیقت ایک ہے۔ دونوں کے درمیان کوئی معنوی فرق نہیں ہے۔ معلوم نہیں مضمون نگار نے دونوں میں کیا فرق سمجھا ہے جس کی بنا پر وہ زیرِ بحث فقرے کا ترجمہ "فرماں روائی صرف اللہ کے لیے ہے" کرتے ہیں اور پھر اس فقرے میں اقتدارِ اعلیٰ کے مفہوم کی اس شدت سے نفی کر رہے ہیں کہ وہ اس مفہوم کا متحمل ہی نہیں ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ جو اس کائنات کا تنہا فرماں روا ہوگا اسی کو انسانی زندگی کے لیے قانون سازی کا بھی حق ہوگا۔ قانون سازی، فرماں روائی کا لازمی اقتضا ہے، فرماں روائی ملزوم ہے اور قانون سازی اس کا لازم غیر منفک۔ جب دونوں لازم و ملزوم ہیں تو پھر آخر کس قاعدے سے مفہوم لازم کی اس شدت سے نفی درست ہوگی کہ آیت اس مفہوم کی متحمل ہی نہ رہے۔ یہ جو کچھ لکھا گیا اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عقلِ عام اور فہمِ عام سے اونچی ہو۔ ایک دیہاتی بھی یہ جانتا ہے کہ ملک کا جو بادشاہ ہوگا وہاں قانون بھی اسی کا چلنا چاہیے۔

اس لحاظ سے کہنا چاہیے کہ فاضل مضمون نگار نے کئی صفحے میں جو تشریح لکھی ہے وہ خود ان کے اپنے ترجمہ کے خلاف ہے اور دونوں میں توافق کی نہیں تضاد کی نسبت ہے۔ عقل و درایت کے لحاظ سے اتنا ہی جواب کافی ہو سکتا ہے لیکن آئیے اب اس پہلو پر ذرا تفصیل سے گفتگو کر لیں کہ یہاں قانون سازی کے مفہوم کی نفی کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟

اگر فقرۂ زیرِ بحث میں اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکومت کے ساتھ ساتھ اس کی تشریعی حکومت بھی مراد لی جائے اور اس سے کو "کارسازی" کے ساتھ "قانون سازی" کے مفہوم کا بھی متحمل مانا جائے تو یہ بات غلط کیوں ہوگی؟ غلط ہونے کی کیا وجہیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) عربی لغت اور استعمالاتِ قرآن کے لحاظ سے لفظ حکم کو امر و نہی یا قانون کے معنی میں لینا غلط ہو۔
(۲) صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تشریعی حکومت یعنی تنزیل شریعت اور قانون سازی کی تخصیص صحیح نہ ہو یا اس مفہوم کو ماننے میں کوئی عقلی یا شرعی قباحت لازم آتی ہو۔ (۳) سیاق و سباق میں اس مفہوم کی کوئی گنجائش نہ ہو۔
(۴) آخر درجے میں یہ کہ آج تک کسی مستند مفسرِ قرآن نے اس فقرے میں امر و نہی یا قانون کا مفہوم بیان نہ کیا ہو۔
یہ چار وجوہ ہیں جن کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان الحکم الا للہ کا فقرہ قانون سازی کے مفہوم کا متحمل نہیں ہے۔ آگے ہم ان چاروں وجوہ کا جائزہ لیں گے۔

لفظ حکم کی لغوی حقیقت

عربی لغات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ "حکم" کا لفظ اصلاً دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی شے کا فیصلہ کرنا۔ کسی کو اصلاح کے لیے کسی چیز سے روکنا۔ لسان العرب میں ہے:-

الحکم: القضاء وجمعہ احکام قال الازھری: روینا عن ابراھیم النخعی انہ قال: حکم الیتیم کما تحکم ولدک ای امنعہ من الفساد واصلحہ کما تصلح ولدک وکما تمنعہ من الفساد

حکم کے معنی ہیں فیصلہ اور اس کی جمع احکام ہے۔ ازہری نے کہا: ہم نے ابراہیم نخعی سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: یتیم بچے کو روکو جس طرح تم اپنے بچے کو روکتے ہو یعنی اسے شر و فساد سے منع کرو اور اس کی اصلاح کرو جس طرح تم اپنی اولاد کی اصلاح کرتے ہو اور اسے فساد سے روکتے ہو

امام راغب نے "حکم" کا اصل معنی منع ہی کو قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں: حکم اصلہ منع منعا لاصلاح ومنہ سمیت اللجام حکمۃ الدابۃ (حکم کی اصل اصلاح کے لیے روکنا ہے اسی سے لگام کو جانور کا حکمہ کہتے ہیں) حاکم کو حاکم بھی انہیں دونوں معنوں کے لحاظ سے کہتے ہیں۔ لسان میں ہے:- الحاکم: منفذ الحکم والجمع حکام وھو الحکم (حاکم اس کو کہتے ہیں جو فیصلے کو نافذ کرے اس کی جمع حکام ہے اور "حکم" بھی حاکم کے معنی میں آتا ہے) دوسرے معنی کے لحاظ سے کہا ہے۔ ومن ھذا قیل للحاکم بین الناس حاکم لانہ یمنع الظالم عن الظلم (اسی لیے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے والے کو حاکم کہتے ہیں کیونکہ وہ ظالم کو ظلم سے روکتا ہے) انہیں دو معنوں کے لحاظ سے یہ لفظ فرماں روائی، اقتدار، علم و فقہ، امر و نہی اور قانون کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔
اس مختصر لغوی تشریح سے یہ بات معلوم ہوئی کہ لفظ حکم کا ترجمہ فرماں روائی بھی اس کا اصلی اور حقیقی معنی نہیں

بلکہ مجازی اور حقیقت لغوی کا لازمی معنی ہے۔ اس لفظ کے حقیقی معنی کے لحاظ سے ان الحکم الا للہ کا ترجمہ یہ ہوگا "فیصلے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے" یا فیصلہ کن طاقت صرف اللہ کی ہے" اللہ تعالیٰ کے لیے احکم الحاکمین کی صفت بھی اسی معنی کے لحاظ سے لائی گئی ہے اور شرعی و قانونی احکام کو بھی احکام اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ مختلف معاملات میں دراصل شارع کے فیصلے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جس طرح "فرماں روائی و کارسازی صرف اللہ کے لیے ہے" ان الحکم الا للہ کا لغوی اعتبار سے صحیح ترجمہ ہے اسی طرح اگر کوئی شخص یہ ترجمہ کرے کہ "فرماں روائی اور قانون سازی اللہ ہی کے لیے ہے" تو لغت کے اعتبار سے یہ ترجمہ بھی غلط نہ ہوگا اس لیے کہ خدائے احکم الحاکمین تکوینی و تشریعی ہر دو لحاظ سے حاکم حقیقی ہے اور فیصلہ کن طاقت صرف اسی کے پاس ہے۔ وہی اپنی کائنات کا جائز بادشاہ بھی ہے اور وہی اپنی کائنات کا جائز شارع بھی ہے۔

لفظ حکم قرآن میں

قرآن حکیم میں یہ لفظ زیادہ تر قضا یعنی فیصلہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کی نسبت سے استعمال ہوا ہے ہر جگہ بلا استثنا قضاءِ تکوینی کے ساتھ وہاں قضا تشریعی بھی مراد ہے لیکن میں چند ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جہاں بلا اشتباہ وہ صرف قضا شرعی یعنی شرعی قانون کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۱) وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ	اور کیسے وہ تمہیں اپنا حکم بناتے ہیں حالانکہ
التَّوْرٰاةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ	ان کے پاس توریت ہے جس میں اللہ کا حکم موجود
مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ط وَمَآ اُولٰٓئِكَ	ہے پھر وہ اس سے منہ موڑتے ہیں اور یہ لوگ مومن
بِالْمُؤْمِنِيْنَ ○ (مائدہ ر۷)	نہیں ہیں

اس آیت میں حکم اللہ کا لفظ اس قانونِ قتل یا قانونِ رجم کے لیے استعمال ہوا ہے جو توریت میں موجود تھا۔ یہاں حکم اللہ سے اللہ کا حکم تکوینی مراد نہیں ہے۔

(۲) ولا تمسکوا بعصم الکوافر	اور کافر عورتوں کی ناموس پر قبضہ نہ رکھو اور تم نے جو کچھ
وسئلوا ما انفقتم ولیسئلوا ما انفقوا	خرچ کیا ہو وہ تم مانگ لو اور انھوں نے جو کچھ خرچ کیا ہو وہ مانگ
ذلک حکم اللہ ط یحکم بینکم ط	لیں، یہ اللہ کا حکم ہے۔ وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (الممتحنہ ر۲)	اللہ علیم و حکیم ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں ذالک حکم اللہ کا اشارہ اس قانون ہی کی طرف ہے جو اوپر سے بیان ہوتا چلا آرہا

ہے۔ یہاں بھی حکم اللہ سے اس کی تکوینی فرماں روائی مراد نہیں ہو سکتی۔

(۳) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (مائدہ ۷)

کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں اللہ سے بہتر حکم کس کا ہے؟

اس آیت میں دونوں جگہ حکم کا لفظ انسانی زندگی کے احکام و قوانین ہی کے معنی میں آیا ہے۔ یہاں بھی تکوینی حکومت مراد نہیں ہے۔

چنگیز خاں کا مجموعۂ احکام

یہاں ضمنی طور پر افحکم الجاھلیۃ یبغون کی آیت کے تحت مفسر ابن کثیر کی چونکا دینے والی عبارت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ینکر تعالیٰ علی من خرج عن حکم اللہ المحکم المشتمل علی کل خیر الناھی عن کل شر وعدل الی ما سواہ من الآراء والاھواء والاصطلاحات التی وضعھا الرجال بلا مستند من شریعۃ اللہ کما کان اھل الجاھلیۃ یحکمون بہ من الضلالات والجہالات مما یضعونھا بآرائھم واھوائھم وکما یحکم بہ التتار من السیاسات الملکیۃ الماخوذۃ عن ملکھم جنکز خان الذی وضع لھم الیاسق وھو عبارۃ عن کتاب مجموع من احکام قد اقتبسھا عن شرائع شتی من الیہودیۃ والنصرانیۃ والملۃ الاسلامیۃ وغیرھا وفیھا کثیر من الاحکام اخذھا من مجرد

اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان لوگوں پر انکار کر رہا ہے جو اللہ کے اس محکم فیصلہ و قانون سے الگ ہو جائیں جو ہر خیر پر مشتمل اور ہر شر سے روکنے والا ہے اور اس کے بدلے میں لوگوں کی ایسی خواہشات آراء اور اصطلاحات اختیار کر لیں جن کی اللہ کی شریعت میں کوئی سند اور دلیل موجود نہ ہو جس طرح اہل جاہلیت اپنی خواہشات اور آراء سے گھڑی ہوئی گمراہیوں اور جہالتوں کے مطابق زندگی کے معاملات کے فیصلے کیا کرتے تھے یا جس طرح تاتاری ان ملکی سیاستوں کے مطابق فیصلے کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے بادشاہ چنگیز خاں سے اخذ کیے ہیں چنگیز خاں کی سیاساتِ ملکی عبارت ہے اس مجموعۂ احکام سے جو یاسق نے اس کے لیے مرتب کیا تھا اس میں یہودی، نصرانی، اسلامی اور دوسری شریعتوں سے احکام لیے گئے ہیں اور بہت سے

نظرہ وھواہ فصارت فی بنیہ شرعا متبعا یقدمونہا علی الحکم بکتاب اللہ وسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمن فعل ذلک فھو کافر یجب قتالہ حتی یرجع الی حکم اللہ ورسولہ فلا یحکم سواہ فی قلیل ولا کثیر

احکام ایسے ہیں جو محض مرتب مجموعہ کے غور و فکر اور اس کی خواہشات کا نتیجہ ہیں۔ یہ مجموعۂ احکام اب اس کے خاندان کے مسلمان سلاطین و حکام کے نزدیک وہ اصل شریعت ہے جس کا وہ اتباع کرتے ہیں۔ اس مجموعے کے احکام کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے احکام پر مقدم رکھتے ہیں اور جو ایسا کرے وہ کافر ہے اس سے اس وقت تک قتال واجب ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف پلٹ نہ آئے اور چھوٹے بڑے معاملات میں انہیں کے مطابق فیصلے نہ کرنے لگے۔

مفسر ابن کثیر کی یہ قیمتی عبارت اس لائق ہے کہ مسلمان حکام اور علماء امت اس پر بار بار غور کریں۔ اصل موضوع بحث کے سلسلے میں لفظ حکم کی پابندی کے ساتھ چند مثالیں پیش کی گئی ہیں ورنہ اس مصدر کے صیغوں کی مثالیں اتنی ہیں کہ اس مختصر جواب میں ان کا سمانا بھی مشکل ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن میں حکم کا لفظ امر و نہی، شریعت اور قانون کے لیے بھی بکثرت استعمال ہوا ہے اس لیے اگر فقرۂ زیر بحث میں قانون سازی کے مفہوم کو داخل مانا جائے تو اس پہلو سے کوئی مانع موجود نہیں ہے ـــــ مدیر الحق نے اپنے دعوے کی تائید میں سورۂ کہف کے ایک ٹکڑے ولا یشرک فی حکمہ احدا کا حوالہ دیا ہے۔ حیرت ہے کہ ان کو صرف یہ آیت نظر آئی اور ہماری پیش کردہ آیتیں ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئیں۔ اس کے علاوہ سورۂ کہف کے اس ٹکڑے میں کیا حکم کا لفظ صرف حکومت تکوینی کے لیے استعمال ہوا ہے؟ راقم الحروف کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں بھی تکوینی کے ساتھ حکم تشریعی موجود ہے اس سے خارج نہیں ہے۔ اس ٹکڑے کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ـــ ای انہ تعالیٰ ھو الذی لہ الخلق والامر الذی لا معقب لحکمہ ولیس لہ

یعنی اللہ تعالیٰ ہی وہ ہے کہ اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے جس کے فیصلے کا کوئی پیچھا کرنے والا نہیں، جس کا نہ کوئی وزیر ہے، نہ مددگار،

وزیر ولا نصیر ولا شریک ولا مشیر — نہ شریک ہے اور نہ مشیر وہ بلند و بالا اور پاک

تعالیٰ و تقدس — منزہ ہے ۔

معلوم ہوا کہ یہاں بھی ابن کثیر نے حکم کو تکوینی امور کے ساتھ خاص نہیں کیا ہے بلکہ اس میں اللہ کے امر کو بھی داخل مانا ہے ۔

اس پوری بحث سے معلوم ہوا کہ عربی لغت اور قرآن کے استعمالات کی رو سے انِ الحکمُ الاّ للہ میں قانون سازی کے مفہوم کو داخل ماننا بالکل صحیح ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی تشریعی حاکمیت

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تشریعی حکومت یعنی اعطائے شریعت اور قانون سازی کی تخصیص صحیح ہے یا نہیں ؟

تمام امت مسلمہ کا اس عقیدے پر اجماع ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ تکوینی طور پر تنہا اس کائنات کا فرماں روا ہے کوئی مخلوق اس میں دخیل و شریک نہیں اسی طرح وہ تشریعی طور پر بھی تنہا اس کائنات کا شارع ہے ، امر و نہی ، تحلیل و تحریم اور انسانی زندگی کے لیے قانون دینا صرف اسی کا حق ہے ، کوئی مخلوق اس میں دخیل و شریک نہیں ہر وہ شریعت اور ہر وہ قانون باطل ہے جو شریعت الٰہی اور قانون الٰہی کے علی الرغم بنایا گیا ہو جس طرح یہ عقیدہ شرک ہو کہ دنیا کے انتظام و انصرام اور تکوینی امور میں کسی مخلوق کو دخیل سمجھا جائے اسی طرح یہ عقیدہ بھی شرک ہی ہے کہ امر و نہی ، تحلیل و تحریم اور انسانی زندگی کے لیے قانون سازی میں کسی مخلوق کو دخیل سمجھا جائے اور یہ دوسرا شرک پہلے شرک سے قباحت و شناعت میں ذرہ برابر کم نہیں ہے ۔ انبیاء کرام اللہ کا دین اور اس کی شریعت لے کر اس لیے آتے رہے کہ ان دونوں شرکوں کا استیصال کرکے اللہ کے دین اور اس کی شریعت کو ہر باطل دین و شریعت پر غالب کریں یہ وہ عقیدہ ہے جس پر دو چار دلیلیں نہیں بلکہ پورا قرآن اس کی دلیل ہے ۔ سورۂ مائدہ میں ان لوگوں کو جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں ، کافر ، ظالم اور فاسق کہا گیا ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ صرف اللہ کے لیے تشریعی حکومت کی تخصیص نہ صرف یہ کہ صحیح ہے بلکہ مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہو لہٰذا اس پہلو سے بھی ان الحکم الا للہ میں قانون سازی کے مفہوم کو داخل ماننا بالکل درست ہے اور کوئی مانع موجود نہیں ہے ۔ اسی سے یہ بھی واضح ہوا کہ اس سے کوئی عقلی اور شرعی قباحت لازم نہیں آتی بلکہ اگر اس مفہوم کو کارسازی کے مفہوم سے خارج تسلیم کیا جائے تو سخت قسم کی عقلی و شرعی قباحت لازم آئے گی ۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیتوں میں اپنی الوہیت و ربوبیت اور تکوینی طور پر کائنات کی بلا شرکت غیرے مالکیت و حاکمیت کو اپنی تشریعی حاکمیت اور اپنے صاحب امر و نہی ہونے کی دلیل بنایا ہے کیونکہ تشریعی حاکمیت

دراصل تکوینی حاکمیت کا لازمی اقتضاء ہے اس لیے جہاں کہیں بھی قرآن میں اللہ کی تکوینی حاکمیت کا ذکر ہے وہاں اس کی تشریعی حاکمیت آپ سے آپ موجود ہے جس طرح لازم ملزوم کے ساتھ آپ سے آپ موجود ہوتا ہے۔ اب اگر اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اور وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا جیسی آیتوں سے کوئی شخص تشریع اور قانون سازی کے مفہوم کی نفی کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لازم کو ملزوم سے الگ کر رہا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور اس کے انتظام و انصرام پر بلا شرکت غیرے خدا کے حاکم و متصرف ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہی صاحب امر و نہی، شارع اور انسانی زندگی کے لیے قانون ساز بھی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس بات کا کوئی صاحب علم مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

سیاق و سباق کی دلیل کیا ان الحکم الا للہ کے سیاق و سباق میں قانون سازی کے مفہوم کی گنجائش نہیں ہے؟

اگر کسی شخص نے اوپر کی تفصیلات کو غور سے پڑھا ہے تو اس کے لیے اس سوال کا جواب معلوم کرنا مشکل نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سیاق و سباق میں اس مفہوم کی پوری گنجائش موجود ہے کیونکہ اس فقرے سے آگے اور پیچھے کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو اس مفہوم کی نفی کرتی ہو بلکہ پورے قرآن میں کہیں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو اس مفہوم کے خلاف ہو۔ قاعدے کے لحاظ سے قرآن کے سیاق و سباق کو کسی مفہوم کے خلاف دلیل بنانے کی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہاں اس مفہوم کو ماننے سے کوئی معنوی خرابی لازم آتی ہو دوسری یہ کہ وہ مفہوم پورے قرآن کے مضامین و حقائق سے ہم آہنگ نہ ہو۔

جب فقرۂ زیر بحث میں امر و نہی یا قانون سازی کا مفہوم ماننے سے نہ کوئی معنوی خرابی لازم آتی ہے اور نہ وہ پورے قرآن کے مضامین سے بے میل ہے تو پھر آخر سیاق و سباق کو کس طرح اس کے خلاف دلیل بنایا جا سکتا ہے فاضل مدیر الحق نے اپنے دعوے پر سیاق و سباق کی دلیل کو اپنے جانتے بڑے زور کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے نہ سیاق و سباق پر اچھی طرح غور کیا ہے اور نہ اس قاعدے کی پروا کی ہے۔

یہ تو اس لحاظ سے گفتگو تھی کہ سیاق و سباق اس مفہوم کے خلاف نہیں ہے اب میں اس پہلو پر گفتگو کروں گا کہ یہاں سیاق و سباق اس مفہوم کا متقاضی بھی ہے۔ یہ فقرہ جس آیت کا ایک ٹکڑا ہے اس سے پہلے کی آیت یہ ہے:۔

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ۝ — کیا متفرق و متعدد رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔

عام طور سے مفسرین ارباب کی تفسیر اصنام سے کرتے ہیں لیکن یہاں ارباب کے لفظ کو بتوں کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس میں وقت کے وہ سلاطین و امرار اور وہ رہبر و رہنما داخل ہیں جن کے گھڑے ہوئے قوانین کے شکنجے میں اس وقت کی مخلوق کسی ہوئی تھی اور جن کی حیثیت رب حقیقی کے مقابلے میں ارباب باطل کی تھی۔ جیل کے جن دو ساتھیوں کے سامنے حضرت یوسف تقریر کر رہے تھے وہ بھی اسی قسم کی خود ساختہ ربوبیت کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔ آگے کی آیتوں میں اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ کا ٹکڑا اس پر دلیل ہے کہ ارباب متفرقون میں حضرت یوسف نے وقت کے بادشاہ کو داخل مانا تھا۔ ان الحکم الا للہ کے بعد کے ٹکڑے یہ ہیں :-

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ط	اس نے حکم دیا ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ	کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے مگر اکثر
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥	لوگ نادان ہیں۔

ان ٹکڑوں نے تو یہ بات بالکل صاف کر دی کہ اِنِ الحکم الا للہ میں اللہ کا حکم تشریعی بھی مراد ہے۔ ان میں تین لفظ آئے ہیں۔ امر، عبادت، الدین القیم۔ اَمَرَ کا صیغہ بتا رہا ہے کہ اللہ صرف مدبر کائنات ہی نہیں ہے بلکہ تمہارے لیے آمر (حکم دینے والا) بھی ہے۔ عبادت اور الدین القیم کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اسی نے تمہاری زندگی کے لیے "الدین" بنایا ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ اسی الدین پر اپنی زندگی بسر کرو۔ یہاں عبادت ہی کو الدین القیم کہا گیا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اس سے مراد صرف پرستش نہیں ہے بلکہ پوری زندگی میں خدا کی اطاعت مراد ہے اور غور سے دیکھیے تو پرستش بھی اس کی اطاعت ہی کا ایک مظہر ہے کیونکہ ہم اس کی ہدایات کے خلاف اس کی پرستش بھی نہیں کر سکتے اور اگر کریں تو وہ باطل ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اطاعت عبادت کا ایک ایسا لازمی جزو ہے جو کبھی اس سے علیحدہ نہیں ہوتا۔۔۔۔ اب آپ خود غور کیجیے کہ فقرۂ زیر بحث کا سیاق و سباق حکم تشریعی کے مفہوم کا متقاضی ہے یا اس کے خلاف ہے۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بڑی گہری بینی بصیرت کے مدعی حضرات کس ذہن سے قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں

چند قدیم مفسرین کی تشریح

اوپر جو دلائل گزر چکے ان کے بعد ضرورت نہ تھی کہ کسی جدید و قدیم مفسر کی تفسیر کا حوالہ دیا جائے۔ لیکن مستند مفسرین کے اقوال بہر حال اپنا ایک وزن رکھتے ہیں اور ان کی تائید سے مزید تشفی حاصل ہوتی ہے اس لیے یہاں فقرۂ زیر بحث میں چند قدیم مفسرین کے اقوال بھی نقل کیے جا رہے ہیں۔ امام رازی نے آیات زیر بحث کی تفسیر میں سوال و جواب

کے انداز میں جوبات لکھی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے :۔

جان لو کہ بتوں کو پوجنے والی ایک جماعت نے کہا کہ ہم لوگ ان اصنام کو عالم کا الٰہ اس معنی میں نہیں کہتے کہ انھوں نے دنیا کو پیدا کیا ہے بلکہ انہیں الٰہ کے اسم سے موسوم کرنے، ان کی پوجا کرنے اور ان کی تعظیم کرنے کی وجہ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے اس جماعت کو جواب دیتے ہوئے اللہ فرماتا ہے کہ ان اصنام کو الٰہ کے اسم سے موسوم کرنے کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے اور ان اسمار کے لیے اس نے نہ کوئی حجت نازل کی ہے نہ برہان، نہ کوئی دلیل نازل کی ہے نہ سند۔ غیراللہ کا نہ کوئی فیصلہ ایسا ہے جسے قبول کرنا واجب ہو اور نہ کوئی امر ایسا ہو جس کا التزام ضروری ہو بلکہ فیصلہ کرنا، حکم دینا اور مکلف کرنا صرف اللہ کا حق ہے ۔

اس عبارت میں خط کشیدہ جملے اِنِ الحُکمُ اِلّا لِلّٰہ کی تفسیر ہیں ۔ مفسر بغوی اِنِ الحُکمُ اِلّا للہ کے تحت لکھتے ہیں

ما القضاء والامر والنھی الا للہ ——— فیصلہ اور امر و نہی صرف اللہ کے لیے ہے ۔

خازن لکھتے ہیں :۔

ان الحکم الا للہ ۔ یعنی ان الحکم والقضاء والامر والنھی للہ تعالیٰ لا شریک لہ فی ذلک ——— یعنی حکم و فیصلہ اور امر و نہی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ۔

ان قدیم مفسرین کی تفسیروں سے معلوم ہوا کہ وہ اِنِ الحکم الا للہ میں خدا کے حکم تشریعی اور امر و نہی کو داخل مانتے تھے اس لیے یہ عہد حاضر کے مفکرین کی اپج نہیں ہے بلکہ عہد قدیم کے مفکرین بھی ایسا کر چکے ہیں ۔ ان تمام تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اِنِ الحکم الا للہ کو اللہ کی تکوینی حکومت کے ساتھ خاص کرنا نہ عقلاً صحیح ہے اور نہ شرعاً درست بلکہ اس فقرے میں اللہ تعالیٰ کی تشریعی حاکمیت کا ثبوت بھی موجود ہے اور کسی مخلوق کے لیے جائز نہیں کہ قوانین خداوندی کے خلاف قوانین بنائے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا عمل

کریم بن کریم بن کریم بن کریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کے بارے میں مدیر الحق نے وہی بات لکھی ہے جو کچھ عرصہ پہلے کسی خان بہادر صاحب نے لکھی تھی اس کا مفصل جواب جماعت اسلامی کے لٹریچر میں موجود ہے اس لیے میں یہاں تفصیلی بحث نہیں کروں گا اس کے لیے تفہیمات حصہ دوم کے متعلقہ مضامین پڑھنے چاہییں یہاں اتنا اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مدیر الحق نے شرک اور انبیائے کرام کی بعثت پر جو کچھ لکھا ہے وہ خود ان کی

نظر ثانی کا محتاج ہے وہ عہد حاضر کے مفکرین کی مخالفت میں اہل سنت و جماعت کے مسلمہ عقاید پر بھی ضرب لگا رہے ہیں اور شاید محسوس بھی نہیں کر رہے کہ حقیقت شرک کی تحدید اور انبیاء کے مقصد بعثت کی تحدید سے دین اسلام کو کیا نقصان پہنچے گا۔

لا اکراہ فی الدین کا مفہوم مضمون کو ختم کرتے ہوئے فاضل مدیر الحق نے جس سلسلۂ کلام میں لا اکراہ فی الدین کے منشا کا حوالہ دیا ہے وہ بہت مبہم ہے اسی طرح حکومت و اقتدار کے زور سے حق کی اشاعت کا انھوں نے کیا مطلب سمجھا ہے۔ یہ بھی واضح نہیں ہے اس لیے اس پر تفصیلی گفتگو غیر ضروری ہے۔ اگر مطلب یہ ہے کہ حکومت واقتدار کے زور سے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا لا اکراہ فی الدین کے منشا کے خلاف ہے تو ان کی یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ عہد حاضر کے وہ کون "مصلحین و مفکرین اسلام" ہیں جو اس کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں اور زور و زبردستی سے کلمہ پڑھوانے کو صحیح سمجھتے ہیں ـــــ اور اگر ان کا مطلب یہ ہو کہ خلافۃ علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کے لیے حصول اقتدار کی جدوجہد اور حصول اقتدار کے بعد قوانین شرعی کی بزور تنفیذ لا اکراہ فی الدین کے منشا کے منافی ہے تو ان کی یہ بات بالکل غلط ہے۔ یہ بات کسی خان بہادرانہ ذہن کی تراوش تو ہو سکتی ہے لیکن اسے مدیر الحق جیسے بزرگ کی طرف نسبت دینا بھی ایک تکلیف دہ امر ہے۔

(سید احمد عروج قادری)

سات اسباب

جو

"ایک سائنس داں کو خدا کے وجود پر ایمان لانے کے لیے مجبور کرتے ہیں"

مصنفہ - اے کریزی مارین - صدر نیویارک اکاڈمی آف سائنسز

ترجمہ جناب ریاض الدین احمد - پرنسپل مجیدیہ اسلامیہ کالج - الہ آباد -

ہم لوگ آج ایک ایسے سائنسی دور سے گذر رہے ہیں جس کی صبح ہنوز ختم نہیں ہوئی ہے۔ مگر جوں جوں روشنی کی شعاعیں تیز ہوتی جاتی ہیں یہ حقیقت واضح تر ہوتی جا رہی ہے کہ دنیا کی تخلیق میں کسی ذہن خالق کا ہاتھ ہے اگرچہ ڈارون کے بعد نوے برس میں نئی معلومات کا کثیر ذخیرہ ہمارے قبضے میں آچکا ہے مگر آج بھی سائنس کی لاچاری ہمیں خدا شناسی سے قریب تر کر رہی ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے سات ایسے اسباب ہیں جن کے پیش نظر میں اللہ کے وجود پر ایمان لانے کے لیے مجبور ہوں

پہلا سبب فرض کرو ہم دس سکے نمبر لگا کر بالترتیب اپنی جیب میں رکھیں۔ پھر ان سب کو خوب ہلا دیں اس کے بعد ان کو اس ترتیب سے نکالنے کی کوشش کریں کہ پہلے نمبر ۱ اور آخر نمبر ۱۰ والا سکہ برآمد ہو اور اس عمل کو مسلسل جاری رکھیں تو علم الحساب کی رو سے ہم جان سکتے ہیں کہ دس بار کے بعد ایک مرتبہ امید کی جا سکتی ہے کہ پہلے نمبر والا سکہ برآمد ہو لیکن اگر ہم چاہیں کہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ یکے بعد دیگرے نکل آئیں تو اس عمل کا سو مرتبہ اعادہ کرنا پڑے گا۔ اسی طرح نمبر ۱ نمبر ۲ نمبر ۳ کو بالترتیب نکالنے کے لیے ایک ہزار بار اور دسوں کو بالترتیب نکالنے کے لیے دس ارب بار اسی عمل کی ضرورت ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا ایک حقیر ترین حادثہ بھی اتفاق پر مبنی نہیں ہے بلکہ کسی مکمل نظم یا اعلیٰ اصول کے تابع ہے۔

اسی استدلال کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ نظام حیات ایسے محکم قوانین سے جکڑا ہوا ہے کہ جن کو صحیح توازن کے ساتھ قائم رکھنا کسی اتفاق یا حادثے کا فعل نہیں ہو سکتا۔ دنیا اپنے محور پر ایک ہزار میل

ل گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے اگر اس کے بجائے یہ . . . میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومنے لگے تو اس نظام زندگی کا درہم برہم ہو جانا یقینی ہے کیونکہ ایسی صورت میں ہمارے دن اور رات دس دس گنا بڑھ جائیں گے۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ طویل دنوں میں سورج کی شعاعیں ہماری کھیتوں کو جھلس ڈالیں گی اور طویل راتوں میں زمین سے اگنے والی ہر نبی ٹھٹھر کر رہ جائیگی۔

ہمارا سورج جس کا سطحی درجۂ حرارت ۱۲ ہزار ڈگری فارن ہائٹ ہے زمین سے ٹھیک اس قدر فاصلے پر رکھا گیا ہے کہ اس کی لازوال شعاعیں ہمیں اتنی ہی روشنی پہنچا سکیں جو ہمارے لیے ازبس ضروری ہیں نہ کم نہ زیادہ۔ اگر سورج اپنی اس گرمی کو جو اس وقت ہمیں عطا کر رہا ہے پچاس فی صدی گھٹا دے تو ہم منجمد ہو کر رہ جائیں گے۔ اور اگر پچاس فی صدی بڑھا دے تو جل کر بھسم ہو جائیں گے۔

زمین کے گولے کا ۲۳ ڈگری جھکاؤ موسموں کی رنگا رنگی کا ذمہ دار ہے۔ اگر اس جھکاؤ کا وجود نہ ہوتا تو سمندر کے پانی کا جھاگ شمال اور جنوب کی طرف اٹھتا اور برف کا لامتناہی سلسلہ ہمارے اوپر مسلط ہو جاتا۔ اگر ہمارا چاند اپنے موجودہ فاصلے کے مقابلے میں زمین سے صرف پچاس ہزار میل دور ہوتا تو جوار بھاٹا کی شدت دن میں دو مرتبہ زمین کو پانی سے غرقاب کر دیتی اور اس کے تھپیڑے ایسے زبردست ہوتے کہ ہمارے دیو پیکر پہاڑ ریزے ریزے بن کر اڑ جاتے۔

اگر سمندر کی سطح اپنی موجودہ گہرائی کے مقابلے میں چند فٹ اور زیادہ ہوتی تو کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن محلول ہو جاتے۔ اس طرح پودوں میں نمو کی طاقت یکسر ختم ہو جاتی۔ اگر زمین کی پپڑی جتنی موٹی اس وقت ہے اس سے دس فٹ زیادہ موٹی ہو جائے تو دنیا سے آکسیجن کا خاتمہ ہو جانا ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ بغیر آکسیجن کے زندگی کا وجود ہی ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر فضا (atmosphere) کی سطح اپنی موجودہ حالت کے مقابلے میں کچھ اور پتلی ہو جائے تو شہاب ثاقب (Meteors) جو لاکھوں کی تعداد میں ہر وقت خلاء کے اندر جلتے رہتے ہیں زمین کے ہر ہر حصے میں گر کر آگ کے شعلے بلند کر دیں گے۔ اور اس قسم کے کتنے ہی حقائق جو آج ہمارے علم میں آ چکے ہیں شاہد ہیں کہ دس لاکھ میں ایک حصہ بھی اس شبہہ کو تقویت نہیں پہنچتی کہ زمین اور اس میں زندگی کی تخلیق کسی اتفاق یا حادثے پر مبنی ہے۔

دوسرا سبب ہر جاندار اپنے احتیاج کے تکملے کے لیے ذرائع تلاش کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس قدرت کا وجود اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ زندگی کے پیچھے کوئی زبردست طاقت اور اعلیٰ دماغ کارفرما ہے مگر زندگی کیا ہے ابھی تک کوئی انسان اس کی گہرائیوں کی تہ کو نہیں پا سکا ہے۔ یہ ایک عجیب چیز ہے

جس میں نہ وزن ہے نہ حدود ذائقہ۔ پھر بھی اس میں نمو کی حیرت انگیز طاقت موجود ہے۔ کیا عجیب بات نہیں کہ ایک نشو و نما پانے والی جز میں اتنی زبردست طاقت موجود ہے کہ وہ چٹان کی سطح میں شگاف پیدا کر سکتی ہے۔ یہ زندگی ہی ہے جس نے پانی، زمین اور ہوا پر اپنا تسلط جما لیا ہے۔ اس کی مثال ایک سنگ تراش کی ہے جو ہر ذی روح میں صورت تراشی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ایک صناع کی ہے جو درخت کی ایک ایک پتی کا ڈیزائن اعلیٰ کاریگری کے معیار پر مرتب کرتا ہے۔ ایک رنگ ساز کی ہے جو کمال ندرت کے ساتھ ایک ایک پھول میں رنگ بھرتا ہے۔ ایک ماہر مغنیات کی ہے جو چڑیوں کو چہچہانا اور کیڑوں کو گنگنانا سکھلاتا ہے۔ ایک ماہر کیمیا کی ہے جو پھلوں کی لذت اور مصالحوں میں چاشنی کا پتہ چلاتا ہے۔ اسی نے پھولوں کو خوشبو اور شکر کو مٹھاس عطا کی ہے۔ اسی کی بدولت آکسیجن ہر ذی روح کے لیے سانس کا ذریعہ بن سکا ہے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ مادہ حیات یعنی پروٹوپلازم (Protoplasm) کا ایک باریک ترین قطرہ جسے بغیر آلات کے دیکھا جانا بھی ناممکن ہے حرکت پر قادر ہے اور سورج سے روشنی اخذ کرتا ہے۔ اسی اکیلے خلیے (Single cell) والا جواب آسا قطرے کے اندر زندگی کا جرثومہ موجود ہے۔ اور اس میں زندگی کو ہر ذی روح میں تقسیم کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت بھی پائی جاتی ہے۔ اس چھوٹے قطرے کی طاقتیں درختوں جانوروں اور انسانوں کی طاقتوں سے عظیم تر ہیں کیونکہ ان سب کا وجود اسی سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ زندگی کا یہ کرشمہ کس کی تخلیق ہے؟

تیسرا سبب جانوروں میں عقل حیوانی (Instinct) کا وجود ایک لاجواب خالق کا خود بخود اعلان کر رہا ہے۔ کیونکہ اگر ان میں یہ طبعی تحریک عطا نہ کی گئی ہوتی تو ان کی بے چارگی اور بے بسی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔ سالمن (Salmon) مچھلی عین نو عمری میں ترک وطن کرتی ہے۔ مگر برس ہا برس سمندر میں زندگی گزارنے کے بعد بلا کسی ظاہری راہ نمائی کے اس کا پھر مادر وطن کی طرف رجوع کرنا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کس عزم کے ساتھ یہ بہاؤ پر تیرتی ہوئی سمندر کی ٹھیک اسی شاخ کے ساتھ مڑ جاتی ہے

لہ (Protoplasm) پروٹوپلازم ایک مادہ ہے جس پر نباتات اور حیوانات کی جسمانی زندگی کا انحصار۔ یہ مادہ کاربن، ہائڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، سلفر، فاسفورس اور دوسرے اجزا سے مل کر بنا ہے۔ مگر کسی کو یہ نہیں معلوم کہ اس مادہ زندگی کیونکر پیدا ہو جاتی ہے اور کس طرح زندگی اس سے نکل جاتی ہے۔

سات اسباب

پر اس کی جائے پیدائش کی طرف رہنمائی کرنے والی ہے۔ اگر آپ اس کو پکڑ کر کسی غلط شاخ میں ڈال دیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ واپسی کی زبردست جنگ میں مبتلا ہے۔ اور اس وقت تک مبتلا رہے گی جب تک کہ منزل مقصود حاصل نہ کر لے۔ اس سے بھی زیادہ محیر العقول عیل مچھلی کے حالات ہیں جو سن بلوغ پر پہنچنے کے بعد فوراً تالابوں اور دریاؤں سے نکل کر ہزاروں میل سمندری سطح پار کر کے برموڈا کے قریب گہری اور تاریک آبی سطح پر قیام کرتی ہے وہیں انڈے دے کر بچے نکالتی ہے اور وہیں جاں بحق تسلیم ہو جاتی ہے مگر اس کے بچے جن کے پاس ظاہرا کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے وہ اپنے والدین کے متروکہ وطن کا پتہ چلا سکیں وسیع سمندروں سے گزر کر ٹھیک انہی دریاؤں جھیلوں اور تالابوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے ان کے والدین نے ہجرت کی تھی اور یہ سفر اس صحت کے ساتھ عمل میں آتا ہے کہ آج تک کسی نے امریکہ کی عیل کو یورپ میں اور یورپ کی عیل کو امریکہ میں نہیں دیکھا۔ اس معاملہ میں قدرت نے یہاں تک احتیاط سے کام لیا ہے کہ یورپ کی عیل میں بلوغ ایک سال بعد نمایاں ہوتا ہے تاکہ امریکہ کے مقابلے میں یورپ کے سفر کی لمبائی کا تدارک ہو سکے اور امریکا اور یورپ دونوں مقاموں کی عیل مچھلیاں ٹھیک بلوغ کے وقت اپنے اپنے وطن میں داخل ہو سکیں۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اس حیرت انگیز رہبری اور رہنمائی کا سامان کس نے فراہم کیا ہے؟

واسپ (Wasp) جو ایک ڈنک مارنے والا کیڑا ہے ٹڈی کو پکڑ کر کمال مہارت جراحی کے ساتھ اس میں اپنے ڈنک سے صرف اسی قدر زہر پیوست کرتا ہے کہ ٹڈی بے ہوش ہو جائے مگر مرنے نہ پائے۔ پھر زمین کھود کر اسے اس طرح محفوظ کر دیتا ہے کہ اس کا زندہ گوشت عرصہ دراز تک استعمال کر سکے۔ اسی کے قریب وہ انڈے دے کر بچے پیدا کرتا ہے تاکہ ان کو زندہ گوشت کی غذا میسر ہو سکے کیونکہ مردہ گوشت ان کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ بچوں کے جنم لینے سے قبل ماں اڑ جاتی ہے اور اس کو یہ موقع نصیب نہیں ہوتا کہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تربیت کر سکے۔ مگر یہ بچے جملہ وظائف زندگی بلا کسی تربیت کے خود ہی انجام دینے لگتے ہیں۔ ہم پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کون سا تکنیکی ماحول ہے جس نے یہ علم ان کو عطا کیا اور ان کو تربیت دی۔ جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ یہ عادات حاصل کردہ نہیں بلکہ ذات باری کا عطیہ ہیں۔

انسان کے اندر عقل کا مادہ ہے جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں پایا جاتا۔ تاریخ شاہد ہے

کہ کسی دوسری مخلوق میں کبھی یہ صلاحیت نہیں رہی ہے کہ وہ ایک سے دس تک گنتی بھی گن سکے۔ یا دس کے معنی ہی سمجھ سکے۔ بقیہ مخلوق صرف فطری رجحانات (Instincts) سے مزین کی گئی ہیں ان کی مثال ایک ایسے ساز کی ہے جس سے ایک ہی آواز نکل سکتی ہے۔ برخلاف اس کے انسانی دماغ اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ اس میں ساز کے سبھی پردے موجود ہیں اور ہر ہر پردہ اپنی آواز کو کمال ہنرمندی کے ساتھ نکالنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ آج ہم جو کچھ ہیں وہ صرف اس وجہ سے ہیں کہ ایک ابدی اور لازوال خزینہ نور سے ہم کو شعاعیں نصیب ہو گئی ہیں۔

پانچواں سبب زندگی کے تمام آثار ان ظواہرات (Phenomenon) میں موجود ہیں جن سے آج ہم پوری طرح واقف ہیں۔ اگرچہ ڈارون ان سے ناواقف تھا۔ مثلاً وراثتی خصائل کے حامل ذرات (Genes) کے عجائبات' یہ ذرات اس قدر ناگفتنی حد تک باریک ہوتے ہیں کہ اگر ان کے صرف اسی حصہ کو جمع کیا جائے جن پر دنیا کی تمام آبادی کا انحصار ہے تو وہ سب کے سب ایک انگشتانے سے کم جگہ میں اکٹھا کیے جا سکتے ہیں۔ پھر بھی یہ باریک ذرات جن کو بغیر طاقتور خوردبین کے دیکھا بھی نہیں جا سکتا اور ان کے ساتھی کروموزومس (Chromosomes) ہر جاندار خلیے (Cell) میں بسے ہوتے ہیں اور انسان و حیوانات کے عادات و خصائل پر کماحقہ روشنی ڈالتے ہیں۔ انگشتانے کے برابر جگہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ دو ارب انسانوں کے عادات و خصائل کو اکٹھا کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ ذرات لاکھوں آباؤ اجداد کے توارثی تاثرات اور ایک ایک کی نفسیات کو حد درجہ چھوٹی جگہ میں کس طرح محفوظ کر لیتے ہیں اتنی عجیب حقیقت ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ارتقاء درحقیقت یہیں سے شروع ہوتا ہے اور یہی خلیہ ارتقاء کی پہلی منزل ہے۔ اسی کے اندر وہ (Genes) پنہاں ہیں جن سے انسان کا وجود ہے۔ کیا محض چند لاکھ ذرات کا باریک ترین جراثیم کی شکل میں ایک چھوٹے سے مقام کے اندر بند ہو کر روئے زمین کے ہر ہر گوشہ ہائے زندگی پر حکمرانی کرنا ایسی تخلیقی ذہانت کی کارفرمائی کا ثبوت نہیں ہے جس کے اکمل ہونے سے انکار نہ کیا جا سکے۔

انسان بہت سے خلیوں (Cell) سے مل کر بنتا ہے۔ ہر خلیے میں بہت سے کروموزومس ہوتے ہیں اور کروموزم میں لاکھوں کی تعداد میں (Genes) نظر آتے ہیں۔ انسان کے آباء و اجداد کی ہر خصلت کا ایک (Gene) اس میں موجود ہے۔ ان میں سے جو (Gene) زیادہ طاقتور ہوتا ہے وہ غالب

جاتا ہے اور اسی کے مطابق انسان کے عادات و اطوار شکل و رنگ وغیرہ مرتب ہوتے ہیں۔

خلیہ (Cell) ایک مجتمع مادہ ہے جو پودوں، جانوروں اور دیگر موجودات میں پایا جاتا ہے اور دوسرے مجتمع مادوں سے مل کر ایک اعلیٰ مخلوق وجود میں لاتا ہے۔

چھٹا سبب فطرت کا محتاط تصرف ہمیں یہ یقین کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ ضرور کسی ایسی عقل کاملہ کا وجود ہے جو اپنی دور اندیشی اور ذکاوت کو محیر العقول طریقے پر استعمال کرتی ہے۔

کچھ مدت ہوئی کہ ناگ پھنی کا استعمال آسٹریلیا میں جھاڑی کے طور پر شروع ہوا۔ اس وقت آسٹریلیا میں ناگ پھنی کے دشمن کیڑے موجود نہ تھے۔ اس لیے یہ پودے بے تحاشا بڑھنے اور پھیلنے لگے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اتنی لمبی چوڑی زمین پر قبضہ جما لیا جس پر کہ اس وقت پورا انگلستان بسا ہوا ہے اور کھیتیوں کو تباہ کر کے انسانوں کو دیہاتوں اور قصبوں سے باہر نکال دیا۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے کیڑوں کے ماہرین نے بالآخر ایک ایسا کیڑا تلاش کر لیا جس کی غذا ناگ پھنی ہے اور وہ سوائے ناگ پھنی کی دوسری کوئی چیز کھاتا ہی نہیں۔ ساتھ ہی اس میں یہ صفت بھی موجود ہے کہ افزائش نسل میں بے حد غیر محتاط ہے۔ آسٹریلیا میں یہ کیڑے موجود نہ تھے اس لیے انھیں باہر سے لانا پڑا۔ ان کیڑوں نے آ کر جلد ہی فتح حاصل کر لی اور ناگ پھنی کی لائی ہوئی مصیبت کا ازالہ ہو گیا۔ اور اب صرف احتیاطی تدابیر کی مدد سے ناگ پھنی کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے جس کے لیے تھوڑے ہی کیڑوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ زندگی میں توازن کو قائم رکھنے والے ایسے ہزارہا اسباب دنیا کے گوشے گوشے میں فراہم کیے گئے ہیں۔ بہت کیڑے ایسے ہیں جن میں حد درجہ سرعت کے ساتھ بڑھنے کی طاقت پائی جاتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ روئے زمین پر چھا نہیں جاتے۔ قدرت نے توازن کو قائم رکھنے کا یہ انتظام کیا ہے کہ ان کے جسم کے اندر اس طرح کے پھیپھڑے موجود نہیں ہیں جیسے کہ انسانوں میں پائے جاتے ہیں اور وہ نلکیوں کے ذریعہ سانس لیتے ہیں۔ یہ کیڑے جب بڑھنے لگتے ہیں تو نلکیاں اسی نسبت سے نہیں بڑھتیں۔ اس لیے کیڑے بہت بڑی جسامت کے کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ فطری کمزوری ان کو ہمیشہ قابو میں رکھتی ہے اور ان کی لامحدود افزائش پر بھی پابندی عائد کرتی ہے۔ اگر یہ رکاوٹ فطرت کی طرف سے مہیا نہ کی گئی ہوتی تو انسان کا دنیا میں وجود نا ممکن ہو جاتا کیونکہ ایسی صورت میں ایک حقیر ترین بھڑ (Hornet) جسامت کے لحاظ سے شیر کے برابر ہوتا اور افزائش نسل میں تیز رفتاری کی وجہ سے تمام روئے زمین پر چھا جاتا۔

ساتواں سبب یہ حقیقت کہ انسان خدا کے تصور کا حامل ہے خود ہی خدا کے وجود کی زبردست دلیل ہے،

سان میں خدا کا تصور ایک ایسی خدا داد صلاحیت کا نتیجہ ہے جسے دنیا میں سوائے انسان کے کوئی دوسرا
یں حاصل کر سکا ہے۔ اس صلاحیت کو "متخیلہ" کے نام سے آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی نادیدہ چیزوں
ثبوت فراہم کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے انسان پر صدہا شاہراہوں کا ظہور ہوتا ہے اور اسے صاف صاف
لوم ہونے لگتا ہے کہ آسمان کے نیچے جہاں جہاں جو کچھ بھی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ہر ہر جگہ اور ہر ہر چیز کے
ر خدا موجود ہے اور وہ خود ہمارے دلوں سے اتنا قریب ہے کہ اس سے قریب تر کوئی چیز نہیں۔

غرض کہ سائنس اور متخیلہ دونوں ہی کا فتویٰ ہے کہ ہمارا یہ کارخانہ حیات خدا ہی کی وجہ سے ہے اور
اسی کی مرضی کے مطابق چل رہا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ زمین کا گوشہ گوشہ اس کی ربوبیت کا اعلان کر رہا ہے
یہ آسمان اور اس پر چمکنے والے ستارے بھی اس کی جلالت و عظمت اور اس کی عدیم المثال کاریگری کا ڈنکا بجا رہے ہیں۔

اسلام کی قلب ماہیت

(ماہنامہ "وائس آف اسلام لاہور" (انگریزی) کے اداریہ بابت جولائی ۶۶ء کا اردو ترجمہ)

آج اسلام جن بنیادی مسائل سے دوچار ہے وہ اس "ملاقات" کے نتیجہ میں پیدا ہوئے جو اسلام اور مغرب کی مادی طور پر ترقی یافتہ اور توانا قسم کی تہذیب کے درمیان ہوئی۔ بڑی احتیاط و اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغرب نے اسلام پر جو اثرات ڈالے انھوں نے اپنے آپ کو دو صورتوں میں پیش کیا۔ ایک طرف اس تہذیبی اثر نے عالم اسلام کی صدہا سالہ غنودگی اور جمود کو پاش پاش کیا اور حیات نو کی سنسنی پیدا کر دی ہے۔ اس نے جامد قدامت زدگی اور اندھا دھند روایت پرستی پر کاری وار کیا جس نے مسلمانوں کو طرز زندگی کے فرسودہ و پامال طور طریقوں میں جکڑ رکھا تھا۔ اس تہذیب نے مسلمانوں کو اس احساس ضرورت کے لیے بیدار کیا کہ وہ اپنے مسائل کے تازہ حل تلاش کریں اور نئی نئی راہوں پر قدم اٹھائیں۔ ان سب باتوں کے نتیجہ میں ان تجربات اور کارہائے نمایاں سے عملی استفادہ شروع ہوا جو دوسری قومیں خصوصاً وہ قومیں سرانجام دے رہی تھیں جو سائنس اور ٹکنالوجی کے دائرے میں کام کر رہی ہیں اس صورت حال کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ گزشتہ سالوں کی چند دہائیوں میں مسلم دنیا اس قابل ہوگئی کہ اپنی پس ماندگی کے معتد بہ حصہ پر قابو پا سکے اور اب وہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک قطعی فیصلہ کن انداز سے اس راہ پر چل کر زندگی کا آغاز کر رہی ہے۔

عالم اسلام میں نئے حالات کا یہ سلسلہ جس کی ابتدا کا سراغ براہ راست مغرب کے ساتھ اس کے رابطے میں ڈھونڈا جا سکتا ہے صرف یہی نہیں کہ مفید اور قابل تعریف ہے بلکہ وہ ناگزیر بھی ہے ـــ بشرطیکہ مسلمان آسمان کے نیچے کوئی باعزت مقام دوبارہ حاصل کرنا چاہیں اور نوع انسان کے مستقبل کی تعمیر میں کوئی قابل قدر حصہ لینا پسند کریں اس بات کو کم کر کے دکھانا عصبیت ہی نہیں خودکشی بھی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس لحاظ سے مسلمانوں کو کہیں زیادہ مغربیت اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر مسلمانوں پر کوئی الزام آتا ہے تو یہی کہ وہ سائنس اور صنعت کاری کی راہ پر سست گامی دکھا رہے ہیں ـــ بہت تیز گامی نہیں۔

البتہ اسلام پر مغربی اثرات کی ایک شکل اور بھی ہے۔ کیونکہ مغرب نے عالم اسلام کو صرف تہذیبی طور پر ہی نہیں بلکہ کلچرل انداز میں بھی متاثر کیا ہے یعنی مغرب کے ساتھ ارتباط نے صرف یہی نہیں کیا کہ مسلمانوں میں زندگی کے مادی رخ سے وابستہ چیزوں سائنس اور ٹکنالوجی سے استفادہ کا جذبہ پیدا ہو گیا' بلکہ اسی مغرب نے یہ بھی کیا کہ ان کے زاویہ نگاہ اور ذہنی افتاد پر بھی اثرات ڈالے۔

اس باب میں مغربی اثر خالص نعمت ہی ثابت نہیں ہوا۔ یہ تو ضرور ہوا کہ مغرب کے وسیع تر معلومات نے ان سرکش برائیوں کے خلاف مسلمانوں کے اندر نفرت کو بھڑکایا جو مسلم دنیا میں رائج تھیں ـــ مثلاً مطلق العنان شاہیت ـــ کافی انفرادی آزادی کا فقدان ـــ سماجی اور معاشی ناانصافی ـــ صنف نازک کا گرتے گرتے کسی نہ کسی حد تک مرد کی خادمہ کے درجہ کو پہنچ جانا ـــ علیٰ ہذا القیاس بات یہ نہ تھی کہ مسلم زندگی کے ان گوشوں کو اسلام کی منظوری حاصل تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ اسلام خود ان چیزوں کا پرزور مخالف تھا۔ مغرب کے تعلق نے صرف یہ کیا کہ مسلم دماغ کو ایک زوال رسیدہ عہد کے رسم و رواج اور نظریات کی حلقہ بگوشی سے آزاد کر دیا اور اس انقلاب نے اسلام کی صالح اور جاودانی اقدار کی بازیافت کے لیے راہ ہموار کر دی سچ یہ ہے کہ یہ سارے تغیرات بڑے حوصلہ افزا ہیں جن کے لیے عالم اسلام مغرب کا رہین کرم ہے۔ شاید یہی وہ احساس تھا جس نے اقبال سے یہ کہلایا کہ :۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے ــــ تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

لیکن اس عہد کے اسلام پر مغربی اثرات کی بات صرف اسی جگہ ختم نہیں ہوتی۔ یہ کچھ اور آگے ـــ کچھ اوپر ہری جاتی ہے۔ مفید ہونے کے ساتھ اس کی نوعیت بے پناہ ضرررساں اور تخریب کار بھی ہے۔ اس نے مذہب اور ے اصولوں پر بے شمار مسلمانوں کے ایمان کو متزلزل کر دیا جن پر ان کے معاشرے کی عمارت کھڑی تھی۔ کم سے کم یہ زل نظری حیثیت سے ضرور واقع ہوا۔ اس سمت میں مغرب کا ثقافتی اثر انحاد انگیز قسم کا رہا ہے۔ بہت کچھ اس نے ڈھا دیا ـــ بہت کم تعمیر کر سکا۔

اس للکار کا جواب دینے کے لیے تعقل پسندی کے دائرے میں مسلمانوں کا جو رد عمل ہوا وہ' یہ تھا کہ اسلام کا ح کیا جائے اور اس کی زندہ حقانیت کو ثابت کیا جائے تاکہ مسلم سماج کے متزلزل عناصر میں یہ ایمان تازہ ہو جائے ان کا دین ہر طرح معقول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم مفکرین نے گزشتہ ایک سو برس کے دوران میں ایک وافر لٹریچر یدا کیا جس کا مرکزی نقطہ یہی مسئلہ تھا۔ سر سید احمد خاں اور مفتی محمد عبدہ اور امیر علی سے لے کر جمہور علماء کے

ں اہلِ قلم تک سب نے اسی اہم جدوجہد میں حصہ لیا ہے۔ کیونکہ اگر اسلام پر ایمان ہی متزلزل ہو گیا تو سمجھیے مسلم کلچر کا
ما قیمتی اثاثہ ضائع ہوا اور مسلم معاشرہ ایک ایسے سفینہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا جس میں پتوار نہیں۔

لیکن مسلم اہلِ فکر و نظر حضرات کی ایک بڑی تعداد اسلام کا دفاع کرتے ہوئے اور اس کو ایک شاندار اسلوب میں
پیش کرتے وقت خود کو اس خطرے سے نہ بچا سکی کہ کہیں وہ غالب اقدار کی شکار نہ ہو جائے! اس کا مطلب یہ نہیں کہ
اجنبی اور غیر اسلامی معاشروں سے تعلق رکھنے والے نظریات و اقدار کو قبول کر لینا ہمیشہ کوئی غیر صحت مندانہ کام ہوا
کرتا ہے۔ نہ اسلام بیگانوں اور غیروں کی چیزوں کو اپنے اندر ملانے کے خلاف ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ چیزیں اسلامی
تعلیمات سے ٹکرائیں نہیں۔ لیکن ہمارے معاملہ میں یہ ہوا کہ ماسوا ان لوگوں کے جو اسلام ہی کی حقانیت کے بارے میں
مشکوک ہو کر اعتراضات وارد کرنے لگے ہوں۔ ہم میں سے اکثر و بیشتر حضرات نے غیر شعوری طور پر مغربی نظریات و اقدار
کو اپنے اندر سمو لیا اور اس کے باوجود اسلام سے وابستہ رہے۔ سر دست ہم اس بحث کو صرف اس حد تک محدود
رکھیں گے کہ ایسے اشخاص کے رجحانات فکر اور طرزِ روش کا محاکمہ کریں اور اس کو ثابت کریں کہ ہمارے نزدیک
وہ اپنے معاملے میں نظرِ ثانی کے محتاج کیوں ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ لوگ خلوص کے ساتھ اس بات کے متمنی ہیں کہ وہ اسلام کے وفادار ہیں۔ وہ صرف یہ
چاہتے ہیں کہ اسلام کی نئی ترتیب و تدوین کریں۔ لیکن عموماً حد سے تجاوز کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے
پاس اسلام کے جامع علم کی کمی ہوتی ہے یا پھر آج کے ترقی پذیر توانا تر غیر اسلامی معاشروں سے وہ مرعوب ہوتے
ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اسلام کی ترتیب نو کے لیے وہ جب کوشش کرتے ہیں تو ہماری رائے میں کبھی کبھی یہ کوشش
سنگین طور پر اسلام کی شکل ہی مسخ کر دیتی ہے۔

اسلام کے متعلق عصرِ حاضر کے ایک کثیر لٹریچر کا غائر مطالعہ اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیتا ہے۔ مثال کے
طور پر یہ مطالعہ اس بات کا انکشاف کرتا ہے کہ زیادہ زور اس پہلو پر دیا جا رہا ہے کہ اسلام ایک طریقِ زندگی ہے۔
ایک سماجی نظامِ فکر ہے، اور یہ بات قدرے دب جاتی ہے کہ وہ ایک مذہب ہے۔ زیادہ زور و شور سے یہ بات
کہی جاتی ہے کہ اسلام صرف بندہ اور خدا کے تعلق سے ہی متعلق نہیں ہے بلکہ وہ اس بات سے بھی تعلق رکھتا ہے کہ
انسان اور انسان کے درمیان کیا ربطِ باہم ہے۔ لیکن یہ معصوم نعرے ہمیشہ اتنے معصوم نہیں ہوتے جتنے معصوم
وہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے مترشح ہوتا ہے کہ اسلام کا روحانی پہلو دب گیا ہے اور اس کے مقابلے میں اسلام
کے سماجی رنگ کچھ زیادہ ابھر گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی نظامِ فکر کی حیثیت سے اسلام کے فوائد رہ رہ کر روشنی میں

لائے جاتے ہیں۔ اسلام کا وہ وعدہ جو وہ اس دنیا کے لیے انسان سے کرتا ہے، اسلام کی یہ تاکید کہ وہ اپنے جسم کے حقوق کو پامال نہ ہونے دے ـــــ افلاس و جہالت سے اسلام کا تنفر، اسلام کا یہ خداپرستانہ جذبہ کہ جس کو اگر وفاکیشی اور اخلاص کے ساتھ حیات انسانی پر اثرانداز ہونے دیا جائے تو ایک ہم آہنگ اور منضبط سماجی نظم قائم کر سکتا ہے ـــــ سماجی اور معاشی عدل کو اسلام کا تقدیسی رنگ دینا ـــ اسلام کی آفاقیت جو نسل و رنگ کے امتیازات کی جڑوں پر وار کرتی ہے ـــ وغیرہ، یہ سب پہلو ہی آن تھک انداز میں لائے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ آج کا فیشن یہ ہے کہ اسلام کے سماجی اور سیاسی گوشوں پر اس طرح زور دیا جائے کہ اس کے خالص روحانی گوشے نظرانداز ہو کر رہ جائیں۔

ذہن کی اس افتاد کی تہ میں جو عوامل کارفرما ہیں ایک انسان ان کا سراغ لگا سکتا اور ان تک نفوذ کر سکتا ہے۔ غالباً یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اس کا راز اسی بدلے ہوئے زاویہ نظر میں پوشیدہ ہے کہ وہ سماجی مفاد (زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ خوشی) کو عظیم ترین فائدہ تصور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہی ہر دوسری کسی شے کی قدر و قیمت جاننے کی کسوٹی ہے ـــ جہاں تک روحانی حقائق کا تعلق ہے (خواہ ہم کھل کر یہ بات نہ کہیں لیکن اس کے اندر یہ مفروضہ روپوش ہوتا ہے کہ کم سے کم) وہ بنیادی طور پر کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

مسلمانوں نے اپنے دور کے غیر اسلامی معاشروں سے ربط و ضبط کے نتیجے میں جن مادی اور سماجی قدروں کو اپنے اندر جذب کر لیا اکثر و بیشتر صورتوں میں یہ ان اقدار کے اندر خاموش یقین کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اسلام کے عباداتی طریقوں تک کا ذکر بھی ان کی اصل لا ینفک اور روحانی تزکیہ اور اخلاقی بلندی پیدا کرنے والے اثرات کے واسطے اس شد و مد سے نہیں کیا جاتا جتنا ان کی سماجی منفعت کے طور پر کیا جاتا ہے۔ مثلاً نماز اچھی چیز ہے مگر اس لیے نہیں کہ وہ خدا کی یاد تازہ کرتی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ ہمیں پابندیٔ وقت، نظم و ضبط اور ایک سربراہ کی اطاعت کے لیے سدھاتی ہے ـــ اس لیے کہ وہ ہمیں سماجی شیرازہ بندی کی منزل تک پہنچاتی ہے ـــ اس لیے کہ وہ مسلمانوں کو (وضو کے ذریعہ ـــ جو نماز کے لیے ناگزیر ہے ـــ) حفظان صحت کے اصول پر زندگی گذارنے میں امداد دیتی ہے۔ روزہ کی قدر و قیمت کا راز دراصل اپنے اوپر وہ اخلاقی قابو پانے میں مضمر ہیں جو اس کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے ـــ اور نہ اس میں کہ وہ خوفِ خدا اور اس کی محبت میں گہرائیاں پیدا کرنے کا ذریعہ ہے ـــ اور حج کا اس بات میں بھی نہیں کہ وہ خداپرستی، خوبی و خیر اور تقویٰ کی زندگی کی تربیت دینے کے لیے ہمارے

اسلام کی قلب ماہیت

لیے ایک لائحہ عمل ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسلام کے یہ جدید طرز ترجمان کہہ رہے ہوں کہ اس روزہ کی اصل قیمت مسلمانوں کی جسمانی صحت کے لیے اس کی افادیت میں ہے — ہمارے نظام ہاضمہ کو قوی بنانے والی اس کی قوت تاثیر میں پوشیدہ ہے — یا زیادہ سے زیادہ اس کی قدر و قیمت یہ ہے کہ یہ سماجی حسیات کو ذکی بناتا ہے اور امیر کو غریب کا دکھ درد محسوس کرنا سکھاتا اور اس کے لیے اول الذکر کو بھوک کی ٹیس کا تجربہ بھی کراتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں یہ زور دینے کے بجائے کہ وہ آدمی کی گاڑھی کمائی کو فی سبیل اللہ خرچ کرا کر تزکیۂ روح کا سامان کرتی ہے۔ اس کی ضرورت پر اس لیے زور دیا جاتا ہے کہ وہ معاشی نابرابری کو ہموار کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہے۔ ہمارے اس بدلے ہوئے احساس اقدار کا نتیجہ ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگوں نے عیدالاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کی قربانی کے متعلق (جو گزشتہ چودہ سو سال کے مسلسل عرصہ میں اسلام کی واضح ہدایات اور غیر منقطع تسلسل کی تطہیر سامانی کی بنیاد پر قائم رہی ہے) یہ سوچنا شروع کر دیا ہے کہ وہ ایک ضیاع محض ہے دولت کا — اور ایک عظیم سالانہ معاشی نقصان کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم پھر اصرار کریں گے کہ یہ سب کچھ اس حقیقت کی پیداوار ہے کہ مغرب کے ساتھ ہمارے رابطے نے ہماری اقدار کے ورثہ کو تہ و بالا کر ڈالا ہے جس کے شاخسانے میں روحانی چیزیں اہم تر محسوس ہونا بند ہو گئی ہیں۔ ان کو باقی رہنے کی اجازت تو دی جا سکتی ہے ان کے حق و استحقاق کے مطابق نہیں بلکہ سماج کی مادی ضروریات کے محض متعلقات کی حیثیت سے — بطور خود ان کی طلب نہیں کی جا سکتی۔ اپنی ذات سے قیمتی ہونے کے لحاظ سے ان پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہے وہ منقلب زاویۂ نگاہ جو ہمیں ایسے روحانی اوصاف سے متمتع ہونے سے بیزار و بددل کر رہا ہے جیسے خدا سے محبت کرنا، اس کی رضا کے حصول کے لیے آرزو کرنا — اور انسان کے ساتھ خدا کی قربت سے کیف اندوز ہونا ("میں انسان سے اس کی رگ جاں سے زیادہ قریب تر ہوں") — اور خدا کی رحمت و شفقت اور گرمی محبت کا تجربہ حاصل کرنا۔ بجائے اس کے "حسین" کو "مفید" کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ یہ ذوق کا وہ بگاڑ ہے جو انسان کو اس حد تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ "گلاب کے پھولوں پر گوبھی کے پھولوں کو فوقیت دینے لگتا ہے" — !

یہی وہ خرابیٔ ذوق ہے جس کا اظہار حج کے بارے میں ہمارے زمانہ کی ایک سابق مسلم سیاسی شخصیت کی طرف سے ہوا ہے جن کی خدمات کو مسلمانوں کی سیاسی تحریک کے ذیل میں ہر طرف سراہا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بہتر ہوگا ہم خود ان کے الفاظ کو نقل کر دیں۔

"میں خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا تھا اور اپنی چشم تصور سے دنیا کے ان خطوں کو دیکھ رہا تھا جہاں جہاں اسلام

اسلام پہنچا۔ پھر میں نے اپنے دل سے کہا کہ حج کے متعلق ہمارا نظریہ ضرور بدلنا چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ایک عمر گزارنے کے بعد یہ جنت میں داخلے کے لیے ایک ٹکٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ کیف و سرور کا ایک زمانہ بسر کرنے کے بعد یہ مغفرت کا سودا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیا کے صحافیوں کو حج کا مشاہدہ کرنے کے لیے دوڑ کر آنا چاہیے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک روایاتی عبادت کی رسم ہے جو پڑھے لکھے عوام کے لیے دلچسپ اطلاعات فراہم کرتی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ایک وقت موعود پر منعقد ہونے والی سیاسی کانفرنس کی تقریب ہے جہاں مختلف ممالک کے سفیر، ان کے فکری سربراہ، ہر شعبۂ علم میں مہارت رکھنے والے ان کے اشخاص، ان کے اہل قلم ان کی صنعتوں کے ناخدا، ان کے تاجر اور نوجوان ملاقات کر سکتے ہیں تا کہ اسلام کی اس عالمی پارلیمنٹ میں اپنی قومی پالیسیوں کے مفصل خطوط اور ایک سال سے دوسرے سال تک کے لیے اشتراکِ عمل کے باہمی عہد و پیماں کو طے کر سکیں مجھے یاد ہے کہ میں نے ان میں سے کچھ خیالات کا تذکرہ ہز میجسٹی شاہ سعود سے کیا تھا اور انھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ

"درحقیقت حج کا یہی مقصودِ اصلی (RAISION D'ETRE) ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ خود میں کسی اور "مقصودِ اصلی" کا تصور کرنے سے قاصر ہوں"۔

اقتباسات اس حقیقت پر بہت تیز روشنی ڈالتے ہیں کہ جس کی طرف ہم توجہ مبذول کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کی اس کمزوری پر روشنی ڈالتے ہیں کہ وہ لوگ روحانیات کی ذاتی قدر و قیمت محسوس کرنے کی صلاحیت سے ہی ہیں۔ اوپر کی سطور میں جس عظیم مدبر کا حوالہ دیا گیا ہے وہ حج کی اہمیت کو اس لیے محسوس نہیں کر رہا کہ اس کے ساتھ راہِ خدا میں قربانی پیش کرنے کا لازمہ آتا ہو اور اس لیے امکان ہے کہ خدا کے ساتھ انسانی محبت کے تعلق میں گہرائی کر سکے اور اس کی رضا کے حصول کے لیے اس کے عزم سپردگی کو مستحکم کر سکے —— موصوف کے نزدیک اس کی اعلیٰ قدر و قیمت اس میں پنہاں ہے کہ وہ ایک وقت خاص پر منعقد ہونے والی کانفرنس ہے اور اس لیے مسلمانوں کے لیے ایک موثر سیاسی قوت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ لاریب کہ حج یہ سب کچھ ہے —— لیکن وہ اس سب کچھ سے کہیں زیادہ اور بھی ہے۔ عظیم مسلم مدبر موصوف اس حقیقت کو بھی محسوس نہ کر سکے کہ اگر حج کا "مقصودِ اصلی" یہ ہے کہ وہ اسلام کی ایک بین الاقوامی پارلیمنٹ اور ان حضرات کی سالانہ کانفرنس ہو جو عالم اسلام میں کوئی مقام رکھتے ہیں تو پھر عامۃ الناس اور صوفی والے ایک عام راہ گیر کے لیے اس کی کیا اہمیت ہو؟ —— اس کے علاوہ اگر حج کا "مقصودِ اصلی" یہی ہے تو پھر کانفرنسوں کا انعقاد تو حج کے علاوہ دوسرے ذرائع سے کہیں بہتر نظم و نسق کے ساتھ کیا جا سکتا ہے —— حیف! یہ

اسلام کے جدت پسند ارباب فکر و نظر دماغ تو رکھتے ہیں مگر سوچتے نہیں! اجنبی اقدار کے آگے غیر شعوری (اور غیر محتاط) طور پر سر تسلیم خم کر دینے کے نتیجے میں یہ ہماری "اقدار کی اقدار" کے ورثہ کا درہم برہم ہو جانا خالص اسلام کے لیے ایک نازک خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔ مغربی اثرات کی خطا تاکی یہ نہیں کہ اس نے ہمیں اپنی مادی قسمت کو سنوارنے اور سماجی حالات کو سدھارنے کا سلیقہ عطا کیا ہے۔ اس کے برعکس یہ سب کچھ تو بڑی قابل تعریف بات ہے۔ وہ اصل روگ جو اس مغربی اثر نے پیدا کیا ہے یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ سماجی احول کی اصلاح کو عظیم ترین مفاد کی حیثیت دینے لگے ہیں۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو ہمارے درمیان لوگوں کا ایک معتد بہ طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے زاویۂ نگاہ کی کجی، ذوق کا بگاڑ اور روح کا ضعف و انحطاط اسے اس بات سے روک رہا ہے کہ روحانی اقدار کو طور خود بیش قیمت مان سکے۔ اگر اس مسخ شدہ زاویۂ نگاہ کی اصلاح نہ کی گئی تو یہ اسلام کی قلب ماہیت کا باپلٹ اور سستے نعروں کے طور پر اس کو انتہائی عامیانہ بگاڑ تک پہنچا دے گا

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ بے شک و شبہہ اس بات کا خواہاں ہے کہ اس دنیا اور اس کے بعد کی دنیا کے فلاح و بہبود کو ہم آمیز کر دے ــــــ یہ بھی بجا کہ اسلام روح کے مطالبات کے ساتھ گوشت پوست کے مطالبات کی صداقت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن یہ بات کبھی بھی فراموش نہ ہونی چاہیے کہ اسلام میں روحانیات اپنے ذاتی حق کے طور پر موجود ہیں، ضروریات جسم کے متعلقات کے طور پر نہیں۔ علاوہ ازیں ـــ اگرچہ اسلام جسمانی وغیرہ کے برحق ہونے کو مانتا ہے لیکن وہ روحانی آدرشوں کو تقدم و فوقیت دیتا ہے۔ کیونکہ آدمی کی آخری فلاح اس جہان کی منفعت نہیں بلکہ آنے والی دنیا میں اس کی نجات و رستگاری ہے۔

مندرجہ ذیل آیات میں جو ہمیشہ غائر مطالعہ اور فکر و تدبر کی مستحق ہیں۔ قرآن پاک نے مادیات پر روحانیات کی فوقیت کی بڑے حسین و جمیل انداز میں تصویر کشی کی ہے۔

"اے ایمان والو! ـــ جب نماز جمعہ کی پکار سنائی دے تو یاد خدا کی طرف لپک کر آؤ ـــ اور اپنے کاروبار سے دست کش ہو جاؤ ـــ یہ بہتر ہے، اے کاش اگر تم جانتے! ـــ

اور جب نماز ختم ہو جائے تو زمین پر بکھر جاؤ اور خدا کی داد و دہش کو تلاش کرو۔ اور یاد کرو اللہ کو خوب ہی ـــ تاکہ تم کامراں ہو سکو ـــ لیکن جب وہ کوئی سامان تجارت یا لہو و لعب دیکھ پاتے ہیں تو سب کچھ چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور تجھ کو چھوڑ جاتے ہیں کھڑا ہوا ـــ کہہ دے کہ جو اللہ کے پاس ہے وہ ساز و سامان تجارت خوب تر ہے اور اللہ بہترین سامان فراہم کرنے والا ہے۔"

بابُ التقریظ والانتقاد

اسلامی فقہ، دوسرا حصّہ

(جدید اڈیشن)

اس کتاب کے مؤلف مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی نے حصّۂ اوّل میں اپنی اس پوری تالیف کی دو خصوصیت بیان کی ہے۔ ایک تو یہ کہ حنفی مسلک کے ساتھ دوسرے متداول فقہی مسلک مثلاً مالکی، شافعی اور حنبلی وغیرہ کا ذکر بھی متن یا حاشیے میں کر دیا گیا ہے اور دوسری یہ کہ مؤلف نے بعض مسائل میں کسی دوسرے فقہی مسلک یا حنفی فقہ کے مشہور اماموں میں سے کسی ایک کی رائے کو اگر ترجیح دی ہے تو وہ کسی ضرورت کی بنا پر دی ہے یا کتاب و سنت کے واضح دلائل سے مجبور ہو کر ـــــ ان دونوں خصوصیتوں کے لحاظ سے دوسرا حصّہ پہلے حصے سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ کتاب کا یہ حصہ روزہ، زکوٰۃ اور حج پر مشتمل ہے۔ روزے کے بیان میں دوسرے مسالکِ فقہ کا کوئی ایک مسئلہ بھی مؤلف کو ایسا نظر نہیں آیا جس کا ذکر وہ اپنی کتاب میں کرتے۔ اسی طرح حج کے بیان میں بھی انہیں اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، صرف زکوٰۃ کے بیان میں ایک جگہ ص۶۹ صاحبین کے مسلک کے ضمن میں صرف اتنا ارشاد ہوا ہے: "دوسرے ائمہ کی بھی یہی رائے ہے" ص۷۰ میں صاحبین ہی کے طفیل میں امام شافعی اور امام احمد کا مسلک بھی بیان کیا گیا ہے اور صفحہ ۸۸ میں درج ہے، "لیکن دوسرے ائمہ اس مد میں اب بھی خرچ کرنے کو کہتے ہیں" بس دوسرے مسالکِ فقہ کا بیان ختم ہوا۔ باقی رہا ترجیح کا مسئلہ تو اس سلسلے میں مؤلف نے عام طور پر یہ شاندار رویہ اختیار کیا ہے کہ قاری کو اس کا پتہ بھی نہ چلے کہ مؤلف نے یہ اپنا ترجیحی مسلک لکھا ہے یا یہی مسلک حنفی ہے۔ ترجیحی قول پر دلائل کیا ہیں؟ آئندہ مسائل کی تنقید میں اس پر اشارے آ رہے ہیں۔

ص۱۲ مؤلف نے حاشیے میں علامہ شامی کی نشر العرف سے کچھ باتیں لکھی ہیں۔ نشر العرف مرکز کے کتب خانے نہیں ہے اس لیے اس حوالے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن مطلع صاف ہونے کی صورت میں ایک یا دو

آدمیوں کی شہادت قبول کرنے کی روایت کے بارے میں یہ لکھنا کہ "امام صاحب کی اس رائے کو کسی نے قبول نہیں کیا ہے" غلط ہے بہت سے ائمۂ احناف جن میں امام سرخسی اور امام طحاوی جیسے اساطین علم شامل ہیں امام صاحب کی اس روایت کو قبول کیا ہے بلکہ مبسوط کی عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کا یہ قول بھی ظاہر الروایۃ ہے۔ مولف نے وینبغی العمل علیہا الخ کی جو عبارت لکھی ہے وہ اس طرح لکھی ہے جیسے یہ عبارت علامہ شامی کی ہو حالانکہ یہ ان کی نہیں ہے بلکہ صاحب بحر الرائق کی ہے اور شامی سے تین سو سال پہلے علامہ ابن نجیم لوگوں کے کاسل کی وجہ سے امام صاحب کی اس روایت کو ترجیح دے چکے ہیں۔

ص ۱۳ مولف نے حاشیے میں لکھا ہے، "لیکن اس بات کی تصریح نہیں ملی کہ اگر مطلع میں اختلاف ہو تب بھی اس حکم پر عمل کیا جائے گا یا نہیں" مؤلف کو فقہ کی عام کتابوں میں چونکہ اس کی تصریح نہیں ملی اس لیے انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی سے دریافت کیا اور شاید ان کو بھی حنفیہ کی کتابوں میں اس کی تصریح نہیں ملی اس لیے انھوں نے جامعۂ ازہر کے شیخ علامہ عبدالرحمٰن تاج کی رائے لکھ بھیجی۔ راقم الحروف کو یہ طول عمل ایک تماشہ نظر آیا کیونکہ فقہ کی کتابوں میں بھی اور شروح حدیث میں بھی اختلاف مطلع کے اعتبار و عدم اعتبار دونوں کی صراحت ملتی ہے۔ عرصہ ہوا راقم الحروف نے اختلاف مطالع پر ایک تحریر لکھی تھی اس کا ابتدائی حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

"اختلاف مطالع ایسے امور میں ہے جو مشاہدے سے ثابت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے احکام دینیہ میں علمائے اسلام بالاتفاق اختلاف مطالع کا اعتبار کرتے ہیں۔ مثلاً اوقات صلوٰۃ میں اس کا اعتبار بلا اختلاف ثابت ہے اسی طرح وقت حج کی تعیین میں بالاتفاق مکہ معظمہ کا مطلع معتبر ہے۔ بہت سے احکام دینیہ میں اتفاق کے بعد رویت ہلال کی وجہ سے وجوب صوم وفطر وغیرہ میں اختلاف مطالع کے اعتبار و عدم اعتبار میں علماء اختلاف کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ اس کا اعتبار نہیں کرتے۔ امام مالک کے متعلق ابن رشد جو خود مالکی ہیں بدایۃ المجتہد میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام مالک سے اہل مصر ہی کا عدم اعتبار روایت کرتے ہیں اور اہل مدینہ منورہ راوی ہیں کہ وہ اعتبار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ امام دار الہجرت سے متعلق اہل مدینہ کی روایت زیادہ قابل اعتماد ہوگی۔ ابن رشد نے یہ بھی لکھا ہے کہ تمام علمائے امت کا اس پر اجماع ہے کہ بہت زیادہ بعید البلاد شہروں (جیسے اندلس و حجاز) کے درمیان اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جائے گا، امام نووی جو خود شافعی ہیں شرح مسلم میں تحریر فرماتے ہیں کہ مذہب شافعی کا صحیح قول یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار ہوگا۔ فقہ حنفی میں ظاہر الروایۃ یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہ ہوگا لیکن امام زیلعی شارح کنز نے اپنی رائے یہ لکھی ہے کہ اس کا اعتبار کرنا صحت سے زیادہ

قریب ہے۔ حضرت الشیخ المحدث السید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ عرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ زیلعی کے قول کو تسلیم کرنا ضروری ہے ورنہ لازم آئے گا کہ عید کی نماز ۲۷ یا ۲۸ دنوں یا کبھی ۳۱ اور ۳۲ دنوں کے بعد پڑھی جائے کیونکہ بلاد قسطنطنیہ میں بسا اوقات ہندوستان سے دو دن پہلے رویت ہلال ہو جاتی ہے۔ صاحب بدائع الصنائع نے لکھا ہے کہ دو ایسے شہر جن کی مسافت قریب ہے اور ان کے مطالع میں اختلاف نہیں ہے وہاں اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا لیکن دو ایسے شہر جن کی مسافت بعید ہے اور ان کے مطالع میں اختلاف ہے وہاں اس کا اعتبار کیا جائے گا اور ایک شہر کی رویت دوسرے شہر والوں کے لیے موجب صوم و فطر نہ ہوگی۔

(احسن المقال فی رویۃ الہلال)

اس عبارت میں حوالوں کے ساتھ اختلاف مطالع کے اعتبار و عدم اعتبار دونوں کی صراحت موجود ہے۔ اب میں اس کتاب کی عبارت کا ترجمہ پیش کرتا ہوں جس کا حوالہ اسلامی فقہ کے مؤلف بکثرت پیش کرتے ہیں۔ متن تنویر الابصار اور اس کی شرح درمختار میں ہے:۔

"اختلاف مطالع کا ظاہر مذہب میں اعتبار نہیں ہے اور یہی اکثر مشائخ کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے جیسا کہ منح نے خلاصہ سے نقل کیا ہے لہٰذا اہل مشرق پر اہل مغرب کی رویت سے (صوم و فطر) لازم ہو جائے گا شرط یہ ہے کہ شرعی طریقے پر اس کا ثبوت مہیا ہو جائے اور زیلعی نے کہا ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جائے لیکن کمال نے کہا ہے کہ ظاہر الروایۃ کو اخذ کرنا احتیاط سے زیادہ قریب ہے" ان تفصیلات کی موجودگی میں مؤلف اسلامی فقہ کی عبارت اور ان کے طرز عمل کی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔

صلا "لیکن زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے لیے دل میں ارادہ کر لینا کافی ہے" چند سطروں کے نیت کی بحث اس عبارت پر ختم کی گئی ہے:۔

"نیت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ عربی میں کریں بلکہ وہ جس زبان کو جانتا ہو اس میں نیت کرلے" یہ بتایا گیا ہے کہ زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں ہے چند سطروں کے بعد بتایا گیا ہے کہ عربی میں نیت ضروری نہیں ہے یعنی نیت زبان سے تو ضروری ہے لیکن عربی زبان میں ضروری نہیں ہے گویا زبان سے نیت کرنا ضروری ہے بھی اور نہیں بھی۔ بات یہ ہے کہ غالباً مؤلف نے لفظ ضروری کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ یہ لفظ اپنے استعمال پر پناہ مانگتا ہوگا۔ بہرحال مؤلف کی پہلی بات یعنی زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ زبان سے نیت کہنے کا کوئی شرعی ثبوت موجود نہیں ہے۔

صلا جن صورتوں میں کفارہ واجب ہوتا ہے ان میں کی پہلی صورت مؤلف نے یہ لکھی ہے:۔

"بغیر کسی عذر کے روزہ نہ رکھنا"

یہاں مولف نے کہیں کوئی اشارہ تک نہیں کیا ہے کہ وہ یہ قول کہاں سے لے رہے ہیں اور انھوں نے کس امام کے قول کو اختیار کیا ہے۔ چونکہ مؤلف لکھ چکے ہیں کہ وہ یہ کتاب اصلاً فقہ حنفی کے مطابق لکھ رہے ہیں اس لیے پڑھنے والا یہ سمجھے گا کہ یہ فقہ حنفی ہی کا مسئلہ ہے چنانچہ خود راقم الحروف سے بعض دوستوں نے استفہام کے انداز میں یہ مسئلہ سنایا کہ "فقہ حنفی میں بغیر کسی عذر کے روزہ نہ رکھنے سے بھی کفارہ لازم آتا ہے" اور ثبوت میں انھوں نے اسلامی فقہ کی مذکورہ بالا عبارت دکھائی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ فقہ حنفی کا یہ مسئلہ نہیں ہے تو اس کتاب سے ان کا اعتماد اٹھ گیا۔ اس موقع پر مؤلف کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ وضاحت سے یہ بتاتے کہ انھوں نے کس امام کا قول اختیار کیا ہے اور کیوں اختیار کیا ہے۔ اس کے لیے کون سی دلیل شرعی ان کے پاس ہے۔ اس ابہام سے انھوں نے اپنے بارے میں کوئی اچھا تاثر پیدا نہیں کیا۔ خود اپنے آپ کو بھی نقصان پہنچایا اور اس کتاب کو بھی۔ راقم اس مسئلہ کے ماخذ و ماعلیہ سے واقف ہے لیکن اسے یہاں چھیڑنا غیر ضروری ہے۔

۲ اکل و شرب سے وجوب کفارہ کے سلسلے میں اسلامی فقہ کے مؤلف رقم طراز ہیں :-

"کھانے میں یہ بھی شامل ہے کہ منہ کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے قصداً معدہ یا دماغ میں کوئی غذا یا دوا پہنچا دی جائے تو کفارہ واجب ہوگا۔"

پتہ نہیں یہ مسئلہ ایجاد بندہ ہے یا کہیں سے اخذ کیا گیا ہے۔ فقہائے احناف تصریح کرتے ہیں کہ کفارہ صرف اس صورت میں واجب ہوگا کہ کوئی غذا یا دوا منہ سے فرو حلق کی جائے اگر کسی دوسرے راستے سے پیٹ میں پہنچائی جائے تو اس سے کفارہ واجب نہیں ہوگا۔ اس مسئلے کے لیے بحر الرائق اور شامی دیکھنی چاہیے۔ شامی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے :-

فقہا نے ذکر کیا ہے کہ کفارہ صرف اس صورت میں واجب ہوگا جب صورۃً اور معنیً ہر دو طرح روزہ توڑا گیا ہو کچھ کھا کر روزہ توڑنے میں صورۃً روزہ توڑنا یہ ہے کہ اس چیز کو نگل لیا جائے اور معنیً یہ ہے کہ وہ چیز یا تو غذا میں استعمال کی جاتی ہو یا دوا میں اسی بنا پر اگر کوئی شخص کنکری نگل جائے تو کفارہ واجب نہیں ہوگا اس لیے کہ یہاں صرف صورۃً روزہ توڑنا صادق ہے معنیً روزہ توڑنا صادق نہیں آرہا ہے اور اگر کوئی شخص حقنہ کے ذریعہ غذا پیٹ میں داخل کرے جب بھی کفارہ واجب نہیں ہوگا اس لیے کہ یہاں صورۃً روزہ توڑنا صادق نہیں ہے صرف معنیً صادق آرہا ہے۔ (شامی صفحہ ۱۶۶ ج ۲)

مؤلف نے مسلک حنفی کے موافق مسائل کے درمیان جس طرح دوسرے مسالک فقہ کے مسائل داخل کر دیے

ہیں اسے کوئی شخص معقول مبنی بر انصاف نہیں کہہ سکتا۔

ص۲۲ کفارہ صوم میں غلام آزاد کرنے کا ذکر مؤلف نے نہیں کیا ہے حالانکہ حدیث میں سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا گیا ہے، مؤلف نے شاید سوچا ہوگا کہ اس زمانے میں غلام ہیں کہاں کہ ان کا ذکر کیا جائے لیکن اس عذر کی وجہ سے اس کا ذکر نہ کرنا بالکل غلط ہے۔ اس کے علاوہ ص۲ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ص۱ کا ضمیمہ ہے کفارے کی کوئی الگ صورت نہیں ہے حالانکہ مؤلف کفارہ ادا کرنے کی صورتیں شمار کرا رہے ہیں۔

ص۲۵ ہدایت میں مؤلف نے لکھا ہے کہ "اگر کوئی شخص مال دار ہو اور وہ اپنے بچہ کو کسی دوسری عورت سے معاوضہ دے کر دودھ پلوانے کا انتظام کر سکتا ہو تو اس بچے کی ماں پر روزہ رکھنا فرض ہے"، اس مسئلے پر حاشیے میں انھوں نے رد المحتار کا حوالہ دیا ہے، فقہی مسائل کے سلسلے میں جب کسی کتاب کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اس سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اس کتاب کا مؤلف اس مسئلے سے متفق ہے، یہ بات کسی طرح صحیح نہیں کہ مصنف نے کسی قول کو رد کر دیا ہو اور کوئی شخص اس کی کتاب کا مطلق حوالہ دیدے ما اسلامی فقہ کے مؤلف نے یہاں یہی کیا ہے۔ شامی نے اس قول کو جس کا ذکر مؤلف نے "ہدایت" میں کیا ہے یہ لکھ کر رد کر دیا ہے کہ یہ قول ظاہر الروایۃ کے خلاف ہے۔ فقہ حنفی کا مستند اور مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ ماں پر دیانۃً ہر حال میں بچہ کو دودھ پلانا واجب ہے عام از یں کہ بچے کا باپ مال دار ہو یا مفلس اور عام از یں کہ بچہ کسی اور عورت کا دودھ لیتا ہو یا نہ لیتا ہو اس لیے باپ کے مال دار ہونے اور دوسری عورت کا انتظام کر سکنے کی صورت میں ماں سے رخصت افطار چھین کر اس پر روزے کو فرض قرار دینا غلط ہے۔

ص۲۹ مؤلف نے ایام تشریق ۱۱ ذی الحجہ تک لکھا ہے شاید اس جگہ ۱۲ کا عدد چھوٹ گیا ہے کیونکہ ایام تشریق میں ۱۲ ذی الحجہ بھی داخل ہے۔

ص۳۲ مؤلف لکھتے ہیں۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تراویح آٹھ رکعت بھی پڑھی ہے اور اس سے زیادہ سولہ اور بیس بھی اس لیے جتنی رکعت بھی پڑھی جائے گی وہ سب سنت کے موافق ہوگی"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سولہ اور بیس رکعتوں کے لیے اگر قاری وہاں کسی حوالے کی تلاش کرے تو اسے مایوسی ہوگی کیونکہ کسی صحیح حدیث کے بغیر سولہ اور بیس رکعتوں کا انتساب صحیح نہیں ہے۔ بیس رکعت کی عمل صحابہ سے دلیل دے کر مولف آخر میں لکھتے ہیں: "لیکن اگر کوئی شخص آٹھ یا سولہ یا بیس یا اس سے زیادہ پڑھے تو اس کو سنت کے خلاف نہ سمجھنا چاہیے اور نہ اس پر جھگڑنا چاہیے"، جھگڑنے کی ممانعت تو صحیح ہے لیکن خلاف سنت نہ سمجھنے کی نصیحت عجیب ہے۔ گویا نماز تراویح وہ مخصوص نماز ہے جس میں رکعتوں کی تعداد پڑھنے والے کی مرضی پر ہے وہ جتنی پڑھے سب سنت ہوگی، حالانکہ ایسا سمجھنا خلاف واقعہ ہے، تراویح میں بھی سنت کی تعریف بدلی نہیں ہے۔

ص۲۴ مولف لکھتے ہیں "جو لوگ جماعت سے تراویح پڑھیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ رمضان میں وتر بھی جماعت سے پڑھیں، جماعت سے تراویح پڑھ کر وتر تنہا پڑھنا یا تہجد کے وقت پڑھنا صحیح نہیں ہے" ——— اس تاکیدی مسئلے کا بھی نہ کوئی حوالہ ہے اور نہ اس کی کوئی دلیل، اس کتاب میں بہت سے مسائل، اس انداز میں بیان ہوئے ہیں کہ جیسے مؤلف کا فرمانا ہی ان مسائل کی معقول دلیل بھی ہے اور منقول دلیل بھی۔ اس مسئلے میں فقہائے احناف نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے :-

ثم بعد عدم کراهة الجماعة فی الوتر فی رمضان اختلفوا فی الافضل فی فتاوی قاضی خان الصحیح ان الجماعة افضل لانه لما جازت الجماعة کان افضل وفی النهایة بعد حکایة هذا قال واختار علماؤنا ان یوتر فی منزله لا بجماعة لان الصحابة لم یجتمعوا علی الوتر بجماعة فی رمضان کما اجتمعوا علی التراویح (فتح القدیر ۱۵)

رمضان میں، جماعت کے ساتھ وتر کی عدم کراہت کے بعد فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ افضل کیا ہے؟ فتاوی قاضی خان میں ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ جماعت سے ادا کرنا افضل ہے کیونکہ جب وتر جماعت سے جائز ہوئی تو جماعت افضل ہوگی اور نہایہ میں اس قول کو بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ ہمارے علماء نے یہ پسند کیا ہے کہ وتر گھر جا کر تنہا پڑھے جماعت سے نہ پڑھے اس لیے کہ صحابہ رمضان میں وتر کی جماعت پر اس طرح مجتمع نہیں ہوئے جس طرح وہ تراویح پر مجتمع ہوتے۔

ٹھیک یہی بات عنایہ، شرح ہدایہ میں بھی ہے، معلوم ہوا ہے کہ رمضان میں وتر کو جماعت سے ادا کرنے کی افضلیت پر بھی تمام فقہائے احناف متفق نہیں ہیں باقی رہی وہ بات جو اسلامی فقہ کے مؤلف نے لکھی ہے تو اس کا اسلامی فقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ بات، مسائل شرع میں مولف کی جرأت بے جا کا ثبوت ضرور ہے۔

ص۴۵ ارشاد فرماتے ہیں :- "اعتکاف کے معنی ٹھہرنے اور الگ ہونے کے ہیں، شریعت میں رمضان کے آخری دس دنوں میں دنیاوی کاروبار اور بیوی بچوں سے الگ ہو کر اور کٹ کر مسجد میں ٹھہرنے کو اعتکاف کہتے ہیں"

مؤلف نے لغوی معنی میں بھی اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے، لغت میں اعتکاف کے معنی الگ ہونے کے نہیں آتے ہیں۔ اور شرعی تعریف تو ایسی کی ہے کہ رمضان کے آخری دس دنوں کے علاوہ سال کے تین سو پچاس دنوں سے اعتکاف کا قصہ ہی ختم کر دیا ہے۔ شاید مولف، رمضان کے مسنون اعتکاف کی تعریف کرنا چاہتے تھے لیکن اتفاق سے وہ مطلق اعتکاف کی تعریف بن گئی کیونکہ آگے "ہدایت" میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ رمضان کے دنوں کے علاوہ بھی اعتکاف کرنے کی اجازت ہے

ص۴۶ "ہدایت" "رمضان کے دنوں کے علاوہ بھی اعتکاف کرنے کی اجازت ہے اس اعتکاف میں روزہ رکھنا بھی ضروری نہیں ہے"

اس کتاب میں اعتکاف کا بیان بھی ناقص ہوا ہے مسئلے کی پوری وضاحت نہیں ہوتی، اصل میں فقہائے احناف کے نزدیک اعتکاف کی تین قسمیں ہیں واجب، مسنون اور نفل۔ ہر قسم سے متعلق احکام ہیں۔ . . . جزوی اختلافات میں تبصرے میں سب کی تفصیل نہیں کی جا سکتی اتنا اشارہ ضروری ہے کہ اعتکاف واجب میں حنفیہ کے نزدیک روزہ شرط ہے روزے کے بغیر واجب اعتکاف ادا نہیں ہوتا۔ البتہ نفل اعتکاف میں ایک روایت کے مطابق روزہ رکھنا ضروری نہیں ہے۔

ص۳۹ مولف رقم طراز ہیں: "اعتکاف میں بالکل چپ چاپ بیٹھے رہنا مکروہ تحریمی ہے" ۔۔۔۔۔ محض اتنی عبارت سے مسئلہ واضح نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص اعتکاف میں بالکل خاموش رہنے کو عبادت سمجھے اور عبادت سمجھ کر کسی سے باتیں نہ کرے تو بے شک یہ مکروہ تحریمی ہے چاہے وہ تلاوت کرتا رہے، نفل پڑھتا رہے یا کسی دینی تحریر کے لکھنے میں مشغول رہے اس لیے کہ شریعت اسلامیہ میں چپ کا روزہ اور چپکا اعتکاف ممنوع ہے۔ لیکن اگر وہ خاموش رہنے کو عبادت نہ سمجھتا ہو اور یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہے تو کوئی کراہت نہیں ہے۔ تلاوت قرآن، نفل نماز اور دینی تحریر کو ممنوع خاموشی سے کوئی تعلق نہیں ہے ممنوع خاموشی یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان سے باتیں نہ کرنے کی نذر مانے یا اسے قربت الٰہی کا ذریعہ سمجھے۔

یکرہ الصمت اذا اعتقد انہ قربۃ	خاموش رہنا مکروہ ہے جب وہ اعتقاد کرے کہ خاموشی
اما اذا لم یعتقد لاکن اللہ فلا یکرہ	قربت ہے لیکن اگر وہ ایسا اعتقاد نہ کرے تو مکروہ نہیں ہے۔

(جزیری)

ص۴۲ لکھتے ہیں: "ظاہر ہے کہ جب سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا افسوسناک واقعہ آپ کی وفات کے بعد ہوا تو آپؐ اس کی اہمیت کیسے بیان کر سکتے تھے۔"

یہ عبارت بھی مولف کے قلم سے شاید بے سوچے سمجھے نکل گئی ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسین کے واقعۂ شہادت کی اہمیت بیان کی تھی یا نہیں لیکن یہ لکھنا کہ آپ کیسے بیان کر سکتے تھے عجیب بات ہے، مولف جانتے ہیں کہ آنحضورؐ نے قیامت تک کے اہم واقعات کی خبر دی تھی، اور آپ وحی کے ذریعہ اپنی وفات کے بہت عرصہ بعد کے کسی واقعہ کی اہمیت بیان کر سکتے تھے۔

ص۴۳ ایام بیض کے روزوں کے بارے میں یہ لکھنا کہ "آپؐ بہت کم ان تاریخوں میں روزہ چھوڑتے تھے" ایک روایت میں ضرور موجود ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے میں تین دن تاریخوں کی پابندی کے بغیر روزے رکھتے تھے کیونکہ زیادہ صحیح روایتوں میں مطلق تین دنوں کے روزوں کا ذکر آیا ہے اور مسلم شریف کی ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصریح ہے کہ آپ ہر مہینے کے تین روزے میں ایام یا تاریخوں کی پابندی نہیں کرتے تھے۔

ص۴۵ لکھتے ہیں: "البتہ اگر اس مکان کے کرایہ ہی پر اس کا گزر اوقات ہو تو پھر صدقۂ فطر واجب نہیں ہے"

معلوم نہیں مولف نے یہ فتوی کہاں سے نقل کیا ہے۔ کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے ایسے شخص پر صدقہ فطر واجب ہے۔ اور یہاں یہ بات جان لینا بھی مناسب ہے کہ آئمہ ثلاثہ مالک۔ شافعی۔ احمد بن حنبل کے نزدیک صدقہ فطر واجب ہونے کے لیے صاحب نصاب ہونا بھی ضروری نہیں ہے بلکہ عید کے دن جس کے پاس اس دن کی ضرورت سے زیادہ غلہ یا کوئی طعام موجود ہو اس پران کے نزدیک صدقہ فطر واجب ہے۔

ص۱۴۲ مولف نے "ضرورت سے زیادہ ہونے کا مطلب" کا عنوان قائم کرکے ایک مفصل فتوی تحریر فرمایا ہے، اور آخر میں حوالہ کے طور پر مولف نے حاشیے میں یہ عبارت لکھی ہے:-

"صاحب درمختار کے اس جملہ وفارغ عن حاجتہ الاصلیۃ کی تشریح میں علامہ شامی نے ردالمحتار میں جو تفصیل کی ہے یہ بیان اسی سے ماخوذ ہے"

یہ کوئی مبہم عبارت نہیں ہے۔ اس کو پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ اس جملے کی تشریح و تفصیل خود علامہ شامی نے کی ہے اور وہ اس سے متفق ہیں لیکن جب قاری در مختار اور ردالمحتار کھول کر پڑھے گا تو اسے سخت حیرت ہوگی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وفارغ عن حاجتہ الاصلیۃ، صاحب درمختار کا جملہ نہیں ہے بلکہ متن تنویر الابصار کا جملہ ہے، صاحب درمختار نے اسکی دلیل میں یہ بات کہی ہے کہ نصاب کو حاجت اصلیہ سے اس لیے فارغ ہونا چاہیے کہ جو مال حاجت اصلیہ میں مشغول ہو وہ گویا موجود ہی نہیں بلکہ معدوم ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مال مشغول بالحاجتہ الاصلیۃ کی تعریف و تفسیر کیا ہوگی، اس کی تفسیر میں انھوں نے ابن ملک کا ایک قول مجمل طور پر درج کیا ہے۔ چونکہ صاحب درمختار نے ابن ملک کی پوری عبارت درج نہیں کی تھی صرف اشارہ کردیا تھا اس لیے علامہ شامی نے ابن ملک کی پوری عبارت نقل کردی ہے۔ وہ تفسیر و تشریح ابن ملک کی ہے جس میں اپنی طرف سے کچھ اندازہ مثالیں اضافہ کرکے اسلامی فقہ کے مولف نے پورا فتوی مرتب کیا ہے اور لکھتے یہ ہیں کہ "علامہ شامی نے جو تفصیل کی ہے، یہ بیان اسی سے ماخوذ ہے"، مولف کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ شامی جو تفصیل دے رہے ہیں یہ خود ان کی ہے یا وہ محض ناقل ہیں اور لطف یہ ہے کہ ابن ملک کی عبارت نقل کردینے پر انھوں نے اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تفسیر پر پوری بحث بھی کی ہے اور آخر بحث تک پہنچ کر جو باتیں انھوں نے لکھی ہیں ان سے صاف طور پر ان کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ابن ملک کی تفسیر سے اتفاق نہیں ہے اسی طرح صاحب درمختار نے ابن ملک کی تفسیر کی طرف اجمالاً اشارہ تو کیا ہے لیکن ان کی تفسیر قبول نہیں کی ہے اور جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے کسی صاحب علم و تقوی مفتی نے بھی ابن ملک کی تفسیر کو قبول کرکے اس پر فتوی نہیں دیا ہے اس لیے کہ اگر ابن ملک کی تفسیر کو قبول کرلیا جائے تو لاکھوں صاحب نصاب افراد سے حولان حول کے بعد بھی وجوب زکوۃ ساقط ہوجائے گا، یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ ائمہ اربعہ یا آئمہ دین میں سے کسی نے بھی نقدین یعنی سونا چاندی کی زکوۃ میں سال

گزرنے کے بعد مستقبل کے اخراجات وضروریات کا اعتبار نہیں کیا ہے بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ تو قرض اور دین کو بھی سقوط زکوٰۃ کا سبب نہیں مانتے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کے پاس ایک ہزار روپے ہیں اور حولان حول ہو چکا ہے تو ان کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی چاہے وہ ایک ہزار روپے کا مقروض ہی کیوں نہ ہو۔ زکوٰۃ، جو نماز کے بعد، دین اسلام کا اہم ترین رکن ہے، کس میں جرأت ہے کہ محض ایک فقیہ کی تشریح کے سہارے جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے ہزاروں صاحب نصاب افراد سے زکوٰۃ ساقط کر دے لیکن یہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ جماعت نے اس اہم مسئلے میں بھی بے پروائی کا ثبوت دیا کتنے لوگوں نے اس کتاب کو پڑھ کر زکوٰۃ واجب ہونے کے باوجود اسے مستقبل کے اخراجات وضروریات کی بنا پر ادا نہیں کیا ہوگا اگر ناشر کتاب میرا مشورہ قبول کریں تو میں کہوں گا کہ جہاں جہاں یہ کتاب گئی ہو ہر جگہ وہ یہ اطلاع بھیج دیں کہ اس کتاب میں یہ مسئلہ بالکل غلط درج ہو گیا ہے، کوئی شخص اس پر عمل نہ کرے۔

ص۶۶ لکھتے ہیں: اگرچہ ضرورت سے زیادہ سامان جمع کرنا بجائے خود برا اور گناہ ہے "کسی چیز کو بلا دلیل گناہ قرار دینے کا مزاج یہاں بھی کام کر رہا ہے

ص۶۷ اگر کوئی شخص کھیتی باڑی کر سکتا یا کرا سکتا تھا لیکن اس نے اپنی زمین کو پرتی رکھا تو اس کو بھی اندازے سے عشر دینا پڑے گا یعنی اس زمین میں جتنا غلہ عموماً پیدا ہوتا ہے اس کا عشر یا نصف عشر ادا کرنا ہوگا۔

مولف کے اس فتوے کا ماخذ کیا ہے معلوم نہیں، بدائع الصنائع اور در مختار و رد المحتار میں تو یہ ہے کہ ایسی صورت میں عشر واجب نہیں ہوگا۔ در مختار میں ہے:۔

تمکن ولم یزرع وجب الخراج دون العشر

قدرت کے باوجود اگر کسی نے کھیتی نہیں کی تو خراج واجب ہوگا عشر واجب نہیں ہوگا۔

بلکہ ایسی صورت میں بھی ہر قسم کا خراج واجب نہیں ہوگا بلکہ صرف خراج موظف کی ادائیگی واجب ہوگی۔

ص۶۸ "۲۵ سے ۳۵ تک ——— اونٹ کا ایک سال کا بچہ" یہاں اس کی صراحت ضروری تھی کہ اونٹوں کی زکوٰۃ میں مادہ یا اس کی قیمت وصول کی جائے گی، نر نہیں لیا جائے گا۔

ص۷۱ "گھوڑے، گدھے اور خچر کی زکوٰۃ" اس عنوان کے تحت مولف نے جو چند سطریں لکھی ہیں وہ مبہم اور گنجلک ہیں، انہوں نے مسائل کو خلط ملط کر دیا ہے اور بعض باتیں غلط لکھی ہیں۔ مولف لکھتے ہیں: "اگر تجارت کے لیے ہوں تو ان کی قیمت کا اندازہ کر کے ڈھائی فیصد دینا چاہیے یا پھر فی راس ایک دینار سالانہ دینا ہوگا" ——— اس عبارت میں دوسرا جزء غلط ہے مال تجارت کی صورت میں فی راس ایک دینار سالانہ کا کوئی امام قائل نہیں ہے ہدایہ میں لکھتے ہیں: "ان جانوروں کا سائمہ ہونا

معلوم نہیں مولف نے یہ فتویٰ کہاں سے نقل کیا ہے۔ کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے ایسے شخص پر صدقہ فطر واجب ہے۔ اور یہاں یہ بات جان لینا بھی مناسب ہے کہ آئمہ ثلاثہ مالک۔ شافعی۔ احمد بن حنبل کے نزدیک صدقہ فطر واجب ہونے کے لیے صاحب نصاب ہونا بھی ضروری نہیں ہے بلکہ عید کے دن جس کے پاس اس دن کی ضرورت سے زیادہ غلہ یا کوئی طعام موجود ہو اس پر ان کے نزدیک صدقہ فطر واجب ہے۔

ص۲ مولف نے "ضرورت سے زیادہ ہونے کا مطلب" کا عنوان قائم کر کے ایک مفصل فتویٰ تحریر فرمایا ہے، اور آخر میں حوالہ کے طور پر مولف نے حاشیے میں یہ عبارت لکھی ہے:۔

"صاحب درمختار کے اس جملہ وفارغ عن حاجتہ الاصلیۃ کی تشریح میں علامہ شامی نے ردالمحتار میں جو تفصیل کی ہے یہ بیان اسی سے ماخوذ ہے"

یہ کوئی مبہم عبارت نہیں ہے۔ اس کو پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ اس جملے کی تشریح و تفصیل خود علامہ شامی نے کی ہے اور وہ اس سے متفق ہیں لیکن جب قاری درمختار اور ردالمحتار کھول کر پڑھے گا تو اسے سخت حیرت ہوگی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وفارغ عن حاجتہ الاصلیۃ، صاحب درمختار کا جملہ نہیں ہے بلکہ متن تنویر الابصار کا جملہ ہے، صاحب درمختار نے اسکی دلیل میں یہ بات کہی ہے کہ نصاب کو حاجت اصلیہ سے اس لیے فارغ ہونا چاہیئے کہ جو مال حاجت اصلیہ میں مشغول ہو وہ گویا موجود ہی نہیں بلکہ معدوم ہے اب سوال یہ پیدا ہوا کہ مال مشغول بالحاجۃ الاصلیۃ کی تعریف و تفسیر کیا ہوگی، اس کی تفسیر میں انھوں نے ابن ملک کا ایک قول مجمل طور پر درج کیا ہے۔ چونکہ صاحب درمختار نے ابن ملک کی پوری عبارت درج نہیں کی تھی صرف اشارہ کر دیا تھا اس لیے علامہ شامی نے ابن ملک کی پوری عبارت نقل کر دی ہے۔ وہ تفسیر و تشریح ابن ملک کی ہے جس میں اپنی طرف سے کچھ اور مثالیں اضافہ کر کے اسلامی فقہ کے مولف نے پورا فتویٰ مرتب کیا ہے اور لکھتے یہ ہیں کہ "علامہ شامی نے جو تفصیل کی ہے، یہ بیان اسی سے ماخوذ ہے" مولف کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ شامی جو تفصیل دے رہے ہیں یہ خود ان کی ہے یا وہ محض ناقل ہیں اور لطف یہ ہے کہ ابن ملک کی عبارت نقل کر دینے پر انھوں نے اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تفسیر پر پوری بحث بھی کی ہے اور آخر بحث تک پہنچ کر جو باتیں انھوں نے لکھی ہیں ان سے صاف طور پر ان کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ابن ملک کی تفسیر سے اتفاق نہیں ہے اسی طرح صاحب درمختار نے ابن ملک کی تفسیر کی طرف اجمالا اشارہ تو کیا ہے لیکن ان کی تفسیر قبول نہیں کی ہے اور جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے کسی صاحب علم و تقویٰ مفتی نے بھی ابن ملک کی تفسیر کو قبول کر کے اس پر فتویٰ نہیں دیا ہے اس لیے کہ اگر ابن ملک کی تفسیر کو قبول کر لیا جائے تو لاکھوں صاحب نصاب افراد سے حولان حول کے بعد بھی وجوب زکوٰۃ ساقط ہو جائے گا، یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ آئمہ اربعہ یا آئمہ دین میں سے کسی نے بھی نقدین یعنی سونا چاندی کی زکوٰۃ میں سال

گزرنے کے بعد مستقبل کے اخراجات وضروریات کا اعتبار نہیں کیا ہے بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ تو قرض اور دین کو بھی سقوط زکوٰۃ کا سبب نہیں مانتے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کے پاس ایک ہزار روپے ہیں اور حولان حول ہو چکا ہے تو ان کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی چاہے وہ ایک ہزار روپے کا مقروض ہی کیوں نہ ہو۔ زکوٰۃ، جو نماز کے بعد، دین اسلام کا اہم ترین رکن ہے، کس میں جرأت ہے کہ محض ایک فقیہ کی تشریح کے سہارے جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے ہزاروں صاحب نصاب افراد سے زکوٰۃ ساقط کردے لیکن یہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ مؤلف نے اس اہم مسئلے میں بھی بے پروائی کا ثبوت دیا کتنے لوگوں نے اس کتاب کو پڑھ کر زکوٰۃ واجب ہونے کے باوجود اسے مستقبل کے اخراجات وضروریات کی بنا پر ادا نہیں کیا ہوگا اگر ناشر کتاب میرا مشورہ قبول کریں تو میں کہوں گا کہ جہاں جہاں یہ کتاب گئی ہو ہر جگہ وہ یہ اطلاع بھیج دیں کہ اس کتاب میں یہ مسئلہ بالکل غلط درج ہو گیا ہے، کوئی شخص اس پر عمل نہ کرے۔

ص۲۶ لکھتے ہیں: اگرچہ ضرورت سے زیادہ سامان جمع کرنا بجائے خود برا اور گناہ ہے "کسی چیز کو بلا دلیل گناہ قرار دینے [illegible] مزاج یہاں بھی کام کر رہا ہے

ص۹۶ اگر کوئی شخص کھیتی باڑی کر سکتا یا کرا سکتا تھا لیکن اس نے اپنی زمین کو پرتی رکھا تو اس کو بھی اندازے سے عشر [illegible] پڑے گا یعنی اس زمین میں جتنا غلہ عموماً پیدا ہوتا ہے اس کا عشر یا نصف عشر ادا کرنا ہوگا۔

مؤلف کے اس فتوے کا ماخذ کیا ہے معلوم نہیں، بدائع الصنائع اور در مختار و رد المحتار میں تو یہ ہے کہ ایسی صورت [میں] عشر واجب نہیں ہوگا۔ در مختار میں ہے:۔

تمکن ولم یزرع وجب الخراج دون العشر	قدرت کے باوجود اگر کسی نے کھیتی نہیں کی تو خراج واجب ہوگا عشر واجب نہیں ہوگا۔

[خرا]ج میں بھی ہر قسم کا خراج واجب نہیں ہوگا بلکہ صرف خراج موظف کی ادائیگی واجب ہوگی۔

ص۱۰۴ "۲۵ سے ۳۵ تک ـــــ اونٹ کا ایک سال کا بچہ" یہاں اس کی صراحت ضروری تھی کہ اونٹوں کی زکوٰۃ میں [صرف] مادہ یا اس کی قیمت وصول کی جائے گی، نر نہیں لیا جائے گا۔

ص۱۰۹ "گھوڑے، گدھے اور خچر کی زکوٰۃ" اس عنوان کے تحت مؤلف نے جو چند سطریں لکھی ہیں وہ مبہم اور گنجلک ہیں، [انہوں] نے مسائل کو خلط ملط کر دیا ہے اور بعض باتیں غلط لکھی ہیں۔ مؤلف لکھتے ہیں: "اگر تجارت کے لیے ہوں تو ان کی قیمت [لگا] کر ڈھائی فیصد دینا چاہیے یا پھر فی راس ایک دینار سالانہ دینا ہوگا" ـــــ اس عبارت میں دوسرا جزء غلط ہے مال تجارت [کی] صورت میں فی راس ایک دینار سالانہ کا کوئی امام قائل نہیں ہے (۲) میں لکھتے ہیں: "ان جانوروں کا سائمہ ہونا

ہونا ضروری نہیں ہے" یہ عبارت یہاں بالکل بے معنی ہے۔

اصل میں مولف نے گدھوں اور خچروں کے ساتھ گھوڑوں کو جوڑ کر سب کچھ بے جوڑ کر دیا ہے۔ گدھوں اور خچروں کے بارے میں تمام آئمہ اس پر متفق ہیں کہ ان میں زکوٰۃ صرف تجارت کی صورت میں واجب ہوتی ہے باقی رہے گھوڑے تو ان کی زکوٰۃ و عدم زکوٰۃ میں ...... ائمہ کے درمیان اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دیگر ائمہ کا مسلک گھوڑوں کے بارے میں بھی یہی ہے کہ اگر وہ مال تجارت کے طور پر ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر نر اور مادہ دونوں قسمیں ہوں اور سائمہ ہوں تو گھوڑوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بقر و غنم اور گھوڑوں کی ادائیگی زکوٰۃ میں فرق یہ ہے کہ ارباب خیل کو اختیار ہے کہ ہر راس کی طرف سے ایک دینار سالانہ ادا کرے یا قیمت لگوا کر ڈھائی فیصد) دے اور گھوڑے اگر مال تجارت کے طور پر ہوں تو ان کی زکوٰۃ کا وہی مسئلہ ہے جو تمام اموال تجارت کا ہے یعنی صرف یہ کہ ان کی قیمت لگوا کر ڈھائی فیصد) ادا کیا جائے۔ مولف نے سائمہ ہونے کی شکل میں فی راس ایک دینار سالانہ کے مسئلے کو مال تجارت ہونے کی صورت میں بھی جاری کر دیا ہے جو غلط ہے اور کوئی اس کا قائل نہیں ہے۔ دوسری جدت انھوں نے یہ فرمائی ہے کہ گھوڑوں کے ساتھ اس مسئلے میں گدھوں اور خچروں کو بھی جوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ کسی صورت میں بھی ان کے متعلق فی راس ایک دینار سالانہ کا سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے

ص۹۰ لکھتے ہیں: "ورنہ پورا مال یا مال حرام ہوگا" پھر خود ہی آگے چل کر لکھتے ہیں: "زکوٰۃ کا روپیہ یا عشر کا غلہ فوری خرچ کرنا ضروری نہیں ہے" پہلے یہ لکھا کہ زکوٰۃ و عشر کی ادائیگی واجب ہوتے ہی مستحقین تک پہنچا دینا فرض ہے اگر کوئی ایسا نہ کرے تو پورا مال حرام ہوگا اور اب کہہ رہے ہیں کہ فوراً بھیجنا ضروری نہیں ہے صرف علٰحدہ کر کے رکھ دینا ضروری ہے اور وہ چاہے تو سال بھر میں تھوڑا تھوڑا کر کے غریبوں کو دے سکتا ہے، ان دونوں باتوں کے تضاد کو مولف نے محسوس نہیں کیا۔ بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی فوراً واجب ہے یا اس میں تاخیر کی جا سکتی ہے، یہ مسئلہ فقہائے احناف کے درمیان مختلف فیہ ہے راجح قول یہی ہے کہ فوراً ادا کرنا ضروری ہے اور اگر وہ بلا عذر تاخیر کرے تو گنہگار ہوگا لیکن اس مال کے حرام ہو جانے کے لیے کوئی شرعی نص نہیں ملتی۔

ص۹۷ لکھتے ہیں: "قرآن ان کو یاد دلاتا ہے کہ "اگر تم بھی کبھی غربت و افلاس کا شکار ہو جاؤ یا کوئی ناگہانی حادثہ پیش آ جائے اور خالی ہاتھ ہو جاؤ اور تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے بھوک سے تڑپنے لگیں تو تمہارا کیا حال ہوگا" قرآن کا حوالہ دے کر کوٹ سے اس عبارت کو گھیرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن کی آیت یا آیتوں کا ترجمہ ہے لیکن معلوم نہیں قرآن میں اس ترجمے کی کوئی آیت یا آیات کہاں ہیں۔

ص۱۴۲ لکھتے ہیں: "لغت میں کسی باعظمت مقام کی زیارت کا ارادہ کرنے کو حج کہتے ہیں"۔ مولف نے اس لغوی معنی میں مقام کی قید اپنی طرف سے لگائی ہے ورنہ لغت میں حج مطلق قصد و ارادہ کو کہتے ہیں چاہے کسی مقام کا ہو یا کسی شخص کا چنانچہ لسان العرب میں حججت فلانا اور حج بنو فلان فلانا کے جملے ملتے ہیں، بعض اہل لغت نے اس کے معنی القصد الی معظم کئے ہیں اور عام طور سے فقہا نے اسی کو اختیار کیا ہے لیکن مقام کی قید کسی نے نہیں لگائی ہے۔ مولف آگے حج کے شرعی معنی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:- "اور اسلامی شریعت میں حج کے زمانے میں زندگی میں ایک بار خانۂ کعبہ کی زیارت کرنے اور میدان عرفات میں پہنچنے کو حج کہتے ہیں"۔ اس تعریف میں بھی "زندگی میں ایک بار" کا اضافہ فقہ کی عبارت نہ سمجھنے کی وجہ سے ہو گیا ہے، حاشیے میں مولف نے درمختار کے حوالے سے جو عربی عبارت لکھی ہے اس میں فرض مرّۃً کو انھوں نے تعریف میں شامل کر لیا ہے حالانکہ تعریف بفعل مخصوص تک ختم ہو گئی ہے اور آگے کا مستقل جملہ حج کے حکم کو بیان کرنے کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ مولف اگر اس بات پر دھیان دیتے کہ ان کی تعریف سے تو نفلی حج کا قصہ ہی ختم ہو رہا ہے تو فرض مرۃ کے جملے کو سمجھنے میں غلطی نہ ہوتی لیکن مشکل یہ ہے کہ مولف کو اتنی فرصت کہاں تھی؟

ص۱۴۲ "تہلیل: کلمہ طیبہ یعنی لا الٰہ محمد رسول اللہ پڑھنے کو تہلیل کہتے ہیں اس کا ورد بھی اکثر موقعوں پر ضروری ہے" کاش مولف حج کے کسی ایک موقع کو بھی مثالاً لکھ دیتے جہاں کلمۂ طیبہ کا ورد ضروری ہے۔ ضروری کا لفظ مولف کے نزدیک شاید لغت اضداد میں داخل ہے جسے وہ ضروری اور غیر ضروری دونوں مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ تہلیل مندوب و مسنون ہے ضروری نہیں دوسری بات یہ کہ جن مواقع پر تہلیل کا ذکر آتا ہے اس سے مراد کلمۂ طیبہ نہیں ہے اس لیے ان مواقع پر کلمۂ طیبہ کا ورد مسنون کا درجہ بھی نہیں رکھتا۔

ص۱۴۴ کا نمبر (۱۲) شوط کی تعریف ناقص ہے۔ جس طرح صفا و مروہ کے درمیان ایک چکر لگانے کو شوط کہتے ہیں اسی طرح طواف میں حجر اسود سے حجر اسود تک کے ایک چکر کو بھی شوط کہتے ہیں۔

ص۱۴۵ "بعض صورتوں میں بال منڈانے کے بجائے چھوٹا کرا لیا جاتا ہے اس کو تقصیر کہتے ہیں"۔ اس عبارت میں "بعض صورتوں" کا ٹکڑا بے معنی ہے۔ عبارت یوں ہونی چاہیے:- حج یا عمرے میں بال چھوٹا کرانے کو تقصیر کہتے ہیں۔

ص۱۴۶ "رکن یمانی۔ ایک پتھر جو خانہ کعبہ کے ایک گوشے میں کھڑا ہوا ہے"۔ یہ کس قدر افسوس ناک ناواقفیت ہے کہ رکن یمانی الگ سے کوئی پتھر نہیں ہے۔ بلکہ رکن یمانی عمارت کعبہ کے ایک متعین گوشے کو کہتے ہیں۔ کوئی شخص اگر حجر اسود کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو تو اس کے بائیں ہاتھ پر کعبے کا جو گوشہ ہوگا اسی کو رکن یمانی کہتے ہیں۔ کعبہ کے چار رکن ہیں اور یہ ارکان الگ سے کھڑے ہوئے پتھر نہیں ہیں بلکہ خود عمارت کعبہ کے چار گوشے ہیں، جن میں ایک رکن تو حجر اسود کا ہے

دوسرا رکن یمانی ہے تیسرا رکن عراقی ہے اور چوتھا رکن شامی ہے۔ عمارت کعبہ کے چار گوشوں کے یہ چار نام ہیں۔

صدا "صفا و مروہ ــ دو مقام ہیں جس کے درمیان دوڑا جاتا ہے یعنی سعی کی جاتی ہے۔ پہلے یہ دونوں پہاڑیاں تھیں جو زمین میں چھپ گئیں"۔

یہ دوسری افسوس ناک ناواقفیت ہے۔ مکہ کے مشہور و معروف، صفا اور مروہ پہاڑ آج بھی موجود ہیں، زمین میں چھپ نہیں گئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان دونوں کے درمیان کی زمین اونچی ہوگئی ہے اور ان پر چڑھنے کے لیے جو سیڑھیاں بنائی گئی تھیں وہ کئی ایک زمین میں دفن ہوگئی ہیں اور اب بیت اللہ کے استقبال کے لیے زیادہ سیڑھیاں چڑھنی نہیں پڑتیں بلکہ پہلی یا دوسری سیڑھی پر کعبہ نظر آنے لگتا ہے۔

صدا "عرفات ــ ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے گرد ایک بہت بڑا میدان ہے اس کو وادی عرفات یا میدان عرفات کہا جاتا ہے"۔ یہ تیسرا نادر انکشاف ہے۔ اب تک تو یہ معلوم ہے کہ عرفات ایک میدان کا نام ہے جو حجاج کا موقف ہے اور اس میں جو پہاڑ ہے اس کا نام جبل رحمت ہے۔ معلوم نہیں یہ کس نے لکھا ہے کہ عرفات ایک پہاڑ کا نام ہے۔

ص۱۲۳ "طواف زیارت یا طواف افاضہ۔ یہ طواف فرض اور رکن حج ہے اگر یہ چھوٹ جائے تو حج فاسد ہو جائیگا اور اس کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ اس کو دوسرے سال حج کرنا ضروری ہوگا"۔

اس مختصر عبارت میں دو بڑی غلطیاں ہیں ایک یہ کہ اس طواف کے ترک سے حج فاسد نہیں ہوتا جیسا کہ مولف نے لکھا ہے بلکہ ناقص رہتا ہے دوسرے یہ کہ آئندہ اسے حج کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ صرف طواف کرنا کافی ہوگا۔ اس طواف کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک یہ کر نہ لیا جائے، بیوی سے مقاربت جائز نہیں ہوتی حرمت مقاربت کے معاملے میں اس کا احرام باقی رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ طواف ترک کر دے تو دوسرے سال کسی حج کے مہینے میں آکر صرف طواف زیارت کرنا ہوگا اس کے بعد اس کے لیے بیوی سے مقاربت جائز ہو جائے گی۔ اور اس کا حج مکمل ہو جائے گا۔

اسی صفحے میں عنوان "طواف زیارت کا وقت" کے تحت مولف نے لکھا ہے: "اگر بارہویں کو بھی ادا نہ کرے گا تو حج فاسد ہو جائیگا"
مولف نے اصل عنوان کے تحت یہ بات غلط لکھی ہے لیکن آگے ایک ضمنی بحث میں ص۱۳۱ "وقوف عرفات" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:۔

"مثلاً طواف زیارت دس، گیارہ، بارہ، تین تاریخوں میں کر سکتا ہے، اگر تین دنوں میں بھی نہ کیا تو بعد میں کرے اور اس تاخیر کے جرم میں ایک قربانی کر دے"۔

یہاں مولف نے مسئلہ صحیح لکھا ہے لیکن یہاں یہ بتانا چاہیے تھا کہ یہ تاخیر کب تک قابل تلافی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ محرم کا چاند نکلنے سے پہلے تک طواف زیارت کیا جا سکتا ہے ورنہ پھر دوسرے سال کا انتظار کرنا پڑے گا۔

ص۱۳۰ لکھتے ہیں: "بعض ائمہ کے یہاں اسی وجہ سے یہ فرض ہے" صفا و مروہ کے درمیان سعی بعض ائمہ کے یہاں نہیں بلکہ اکثر ائمہ کے یہاں فرض ہے بلکہ ارکان حج میں داخل ہے۔ ائمہ اربعہ میں صرف امام ابوحنیفہ اس کو واجب کہتے ہیں۔ اس لیے مولف کی یہ عبارت بالکل برعکس ہے۔

ص۱۴۲ لکھتے ہیں: "مدینہ منورہ کا قدیم نام یثرب ہے جس کے معنی خون بہانے کے ہیں" قاموس اور لسان العرب میں، ث۔ ر۔ ب۔ کے مادے میں خون بہانے کا معنی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ صاحب لسان نے ابن الاثیر کے حوالے سے لکھا ہے: "چونکہ اس نام میں تثریب یعنی ملامت اور عار دلانے کا معنی پایا جاتا تھا اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ناپسند فرمایا اور اس نام کو بدل دیا"۔۔۔ پتہ نہیں مولف نے اپنے سامنے کونسا لغت رکھا ہے کہ ان کے بتائے ہوئے اکثر لغوی معنی، ناقص یا زائد یا غلط ہیں۔

ادیب علیگڑھ کا نصاب نمبر

مدیر ابن فرید ایم اے (علیگ) صفحات ۲۶۴ قیمت تین روپے
ملنے کا پتہ منیجر ماہنامہ ادیب، جامعہ اردو۔ علی گڑھ۔ یو پی

گزشتہ سال ادیب نے ضخیم شبلی نمبر شائع کیا تھا اور اسی سال اس نے ضخیم نصاب نمبر شائع کیا ہے۔ فہرست مضامین کی پیشانی پر مدیر نے ذیل کی عبارت لکھی ہے:

"نصاب نمبر کو اس توقع کیساتھ نذر کر رہے ہیں کہ اس میں امتحانات جامعہ اردو کی سراغ رسانی کی گئی ہے۔ اگر آپ اس پر یقین کرتے ہیں تو یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ ہمارا مقصد آپ کی تیاری کو اطمینان بخش بنانا ہے"

جس مقصد کا اظہار کیا گیا ہے، یہ نمبر اس میں کامیاب ہے۔ رجسٹرار جامعہ اردو محترم سید ظہیر الدین علوی نے "امتحان کے پرچے کیونکر حل کریں؟" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ طلبہ کیلئے بہت مفید ہے۔ ان کی ہدایت نمبر ۶ پر تمام طلبہ نے اگر عمل کیا تو یہ بات انکے لیے چاہے کتنی ہی مفید ہو لیکن ممتحن کے قہقہوں یا کم سے کم مسکراہٹوں پر اوس پڑ جائیگی۔ بشال کے طور پر طالب العلم جب معراج کے معنی "ایک قسم کی گھاس ہے جو عرب میں پیدا ہوتی ہے" لکھتا ہے تو ممتحن بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ اس طرح بہت سے جوابات ممتحن کے لیے کشت زعفران بن جاتے ہیں۔ پھر بھی کسی طالب العلم کو اپنی بے وقوفی اور کم علمی کا اظہار کر کے ممتحن کو ہنسنے پر مجبور نہ کرنا چاہیے۔ بحیثیت مجموعی یہ نمبر طلبہ جامعہ اردو کے لیے ایک قیمتی دستاویز ہے (ع ۔ ق)

(بقیہ ص ۲) وہ لوگ جو اسلام میں نئی زندگی کی روح پھونکنا چاہتے ہیں انکو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ اسلام کے پاس خود اپنا ایک نظام افکار ہے ۔۔۔ اور یہ کہ اگر یہ نظام درہم برہم ہو جاتا ہے تو لازماً ذہن کی اس ساخت کا نقشہ بگاڑ دیگا جس کی تعمیر اسلام کو مطلوب ہے۔ اور جو اسلامی نظام حیات میں مرکزی اہمیت کی چیز ہے۔ اسی بنا پر اسلام کے لیے محض جوش و خروش کافی نہیں۔ اس جوش و خروش کے ساتھ ساتھ اسلام پر فخر و ناز کا ایک عمیق احساس اور اس کے نظام فکر کے مزاج و منہاج کا قوی شعور بھی ہر کارکن میں پیدا ہونا چاہیے۔

ماہنامہ "کانتی" رامپور

نے

[illegible] سال کے آغاز میں اشاعت خاص

توحید نمبر

پیش کیا

جس میں توحید و شرک سے متعلق مباحث مختلف انداز میں شائع کئے گئے

— کانتی کا یہ پہلا خاص نمبر ہے —

دفتر "کانتی" رامپور سے اب بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

$\frac{20\times30}{16}$ سائز کے ۱۵۰ صفحات پر مشتمل۔

یہ "توحید نمبر" صرف ایک روپیہ ہے

مستقل زر سالانہ چار روپیہ — عام شمارہ ۳۷ نئے پیسے

Nov. 1967 Regd. No. A-683

⊖ ایک اور نظم ⊖ ایک قابل قدر پیشکش

⊖ تنہائی کا رفیق ⊖ معلومات کا خزانہ

ہندی ماہنامہ "کانتی" رامپور کا

سالنامہ

اسلامی نظام حیات نمبر

★ اسلام مکمل نظام حیات ہے—

★ اس نے مذہب اور سیاست کو زندگی کے دو حصے نہیں بتائے ہیں

★ خدا پرستی پر قائم نظام خلافت ہی بہترین سیاسی نظام ہے—

★ اسلام کا معاشی نظام سرمایہ داری و کمیونزم کے مقابلہ میں کہیں بہتر ہے—

★ اسلام کا معاشرتی نظام پاکیزہ تہذیب و تمدن کو جنم دیتا ہے—

★ اسلام میں اخلاق و کردار کا اہم مقام ہے—

★ اسلام روح و مادہ کا بہترین امتزاج ہے—

یہ اور اسی قسم کے عنوانات کے تحت لکھے گئے مضامین- کہانیاں - تاثرات- خاکے- سوال و جواب- خطوط و مسائل پر مشتمل

یہ نمبر شائع ہو گیا

آپ اس کا مطالعہ ضرور فرمائیں اور

زیادہ سے زیادہ خریدار فراہم کرنے میں ہمارا تعاون کریں

مستقل خریداروں کو ان کے سالانہ چندہ ہی میں یہ نمبر دیا جائے گا

صفحات ۱۲۰ سائز $\frac{۳۰ \times ۲۰}{۸}$ قیمت صرف ایک روپیہ

سالانہ چندہ [illegible]

Printed at Shanker Press, Rampur

پانچ روپے

فی پرچہ ۵۰ پیسے

—(ماہنامہ زندگی)—

- عرصہ ۱۳ سال سے تحریک اقامت دین کا نقیب ہے۔
- ایک مکمل ہمہ گیر نظام زندگی کے نظریہ کا علمبردار ہے۔
- اسلامی اخلاقی قدروں کا داعی ہے۔
- امن و سلامتی کا پیغامبر ہے۔
- مشرقی و مغربی علوم کا صحیح امتزاج پیش کرتا ہے۔
- دین اور اس کی حقیقتوں کا شارح ہے۔ اور زندگی کے تمام پیچیدہ اور مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔
- تمام انسانوں کے سامنے ایک خدا پرستانہ نظریۂ زندگی اور اس کے مطابق ایک مکمل لائحۂ عمل رکھتا ہے۔
- الحاد اور خدا بیزاری کی خرابیاں اور اس کے ہلاکت آفریں نتائج سے خبردار کرتا ہے۔

—— اسلام!

اگر آپ بحیثیت ایک مسلم کے کچھ مطالبات رکھتا ہو تو

ماہنامہ زندگی کا مسلسل مطالعہ آپ کے لئے ناگزیر ہے۔

جلد ۲۷
شمارہ ۶

زندگی رامپور

جمادی الاخری ۱۳۸۱ھ
دسمبر ۱۹۶۱ء

مدیر:- سید احمد عروج قادری

• خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رام پور - یوپی

• زر سالانہ :- صہ ر ششماہی :- تین روپیہ - فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے
ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

طابع و ناشر نے جماعت اسلامی ہند کی طرف سے ناظم پریس بازار نصر اللہ خاں میں چھپوا کر دفتر رسالہ زندگی رامپور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد عروج قادری)

ادھر مسلسل کئی مہینوں سے قومی اتحاد اور جذباتی یک جہتی و ہم آہنگی کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی تدابیر پر غور کرنے کے لیے متعدد اونچے درجے کی کانفرنسیں اور جلسے منعقد ہو چکے ہیں، جن میں بہت سی تجاویز پاس کی گئی ہیں۔ حکومت کی اس جدوجہد اور تگ و دو کے اسباب پر گفتگو بے کار ہے لیکن اپنے مطالعۂ حالات کی بنیاد پر اتنا اشارہ ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے نزدیک اس تگ و دو کا سبب جبل پور میں مسلمانوں پر منظم اور بہیمانہ حملہ نہیں ہے۔ وہاں مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی وہ نہ توڑی جاتی جب بھی یہ سب کچھ ہوتا جو آج ہو رہا ہے، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کو مسلمانوں کے حال زار پر ترس آگیا ہے اور وہ ان پر منظم حملوں کی روک تھام اور ان کے استحفاظ کے لیے متحرک ہوئی ہے ان کی خوش فہمی کو وزراء اعلیٰ کی کانفرنس اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی بلائی ہوئی قومی اتحاد کانفرنس کی تقریروں تجویزوں اور متعدد مواقع پر حکومت کے ذمہ داروں کے بیانوں نے ختم کر دیا ہے۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے مقصود محض اظہارِ واقعہ ہے۔ اس میں حکومت سے شکایت کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو مسلمانوں کے مصائب کا سبب دوسروں میں ڈھونڈتے ہیں بلکہ ان لوگوں میں ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خود ہی اپنی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ یہ خود ہماری شامتِ اعمال ہے جو ہمیں رسوا کر رہی ہے۔

ہم ان سطور میں قومی اتحاد اور جذباتی ہم آہنگی کے مسئلہ پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہتے ہیں کہ بھارت کے مسلمانوں سے بالعموم اور تحریکِ اقامتِ دین کے داعیوں سے بالخصوص اس کا کیا تعلق ہے ــــ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے لازمی ہے کہ پہلے قومی اتحاد اور جذباتی یک جہتی کی جدوجہد کا مطلب

متعین کرلیا جائے کیونکہ ہندوستان کی اقلیتیں اور خصوصیت کے ساتھ مسلم اقلیت سب سے پہلے اس کی مخاطب ہے۔ آئیے اس کا جائزہ لیں کہ بھارت کی اکثریت کے نزدیک قومی اتحاد اور جذباتی یک جہتی کا مطلب کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتی ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا مطلب کیا ہے اور ہم کیا چاہتے ہیں یہ بات تنہا مسبح از بحث ہے کیونکہ قومی اتحاد کا، ملکی وفاداری کا، جذباتی یکجہتی کا، مقصدی ہم آہنگی کا مطالبہ وہ ہم سے کر رہے ہیں اور یہ اصطلاح بھی انہیں کی طرف سے استعمال ہو رہی ہے، ان کا اطمینان اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس ملک میں ان کے مطلب و مقصد کے مطابق ان چیزوں کا وجود ہو نہ کہ ہمارے مطلب و مقصد کے مطابق۔ تقسیم ہند سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی مسلمانوں کے بہت سے رہنمایان کرام کی ذہنی حالت یہ رہی ہے کہ وہ دوسروں کی وضع کردہ اصطلاحات کا کوئی مطلب بطور خود سمجھ لیتے ہیں اور پھر ان اصطلاحات کی حمایت اسی خود فہمیدہ مطلب کے مطابق شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آگے بڑھ کر وہ اصطلاح ان کے کندھوں پر پیر تسمہ پا بنکر بیٹھ جاتی ہے اور دوسرا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ ایک عجیب ذہنی گومگو کے حال میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اس کی زبوں حالی و تباہی کا پارہ اوپر ہی چڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں ماضی کی داستان دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ حال اور مستقبل کے لیے اس رویے کو بدلنا ضروری ہے۔ عقلی طور پر بھی یہی بات صحیح ہے کہ کسی اصطلاح کا وہی معنی صحیح ہوگا جو واضع اصطلاح نے متعین کیا ہے۔ قومی اتحاد اور جذباتی یک جہتی کے معاملے میں ہمیں ماضی کی غلطی دہرانی نہ چاہیے اور اس کا وہی معنی و مطلب اپنے سامنے رکھنا چاہیے جو مطالبہ کرنے والوں کے بیانات و پیامات اور ان کی حرکت و عمل سے واضح ہوتا ہے۔

بھارت میں اکثریت کی بہت سی سیاسی و مذہبی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ ان تمام جماعتوں کے ذمہ داروں کی تقریروں، تحریروں، تجویزوں اور تدبیروں کے مطالعے کے بعد مسلمانوں کے تعلق سے قومی اتحاد اور جذباتی یک جہتی کے مطالبے کا جو قدر مشترک سامنے آتا ہے اسے دو لفظوں میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ قومی انفرادیت کا خاتمہ ــــ بھارت ماتا کی معبودیت۔

قومی انفرادیت کے خاتمے کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ کم از کم سیاسی، تمدنی اور تہذیبی معاملات میں مسلمان جو کچھ سوچیں، جو کچھ چاہیں اور جو کچھ کریں ان میں ایک علیحدہ قوم ہونے کا احساس بالکل نہ پایا جائے بلکہ ان تمام معاملات میں وہ اپنے آپ کو ہندو قوم میں ضم کر دیں، اور بھارت ماتا کی معبودیت کا مختصر مطلب یہ ہے کہ ان کی تمام

تمناؤں، آرزوؤں، خواہشات اور جذبات کا محور و مرکز، مادرِ وطن کو ہونا چاہیے اسی کی بڑائی اور کبریائی کے لیے انہیں جینا چاہیے اور مرنا چاہیے —— یہ ہے وہ چیز جو اکثریت کی تمام جماعتیں قدرِ مشترک کے طور پر ہم مسلمانوں سے حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ حصولِ مقصد کے طریق کار، مزید مطالبات اور محرکات میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک اس قدرِ مشترک کا تعلق ہے۔ ہندو مہاسبھا، جن سنگھ اور کانگرس سب متفق ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزید مطالبات اور محرکات وطریق کار کے اختلاف پر بھی مختصر اشارے کیے جائیں۔ ہندو مہاسبھا، جن سنگھ اور کانگرس کا وہ گروپ جسکی رہنمائی شری سمپورنا نند اور شری کا ٹجو کرتے ہیں مسلمانوں سے مزید یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ پورے عالمِ اسلام ہی سے نہیں، مکہ اور مدینہ سے بھی اپنے تعلقات منقطع کرلیں۔ یہاں تک کہ تاریخی شخصیتوں اور ان کے احترام کا دائرہ بھی صرف بھارت میں محدود کرلیں۔ ان لوگوں کو "میرے مولیٰ بلالو مدینہ مجھے" کا اظہار محبت بھی گوارا نہیں اور ان کے تاریک دلوں کے گوشوں میں شاید یہ بھی چھپا ہوا ہو کہ مسلمان کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز بھی نہ پڑھیں۔ اس مزید مطالبہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس گروپ کے نزدیک محدود قسم کی مذہبی آزادی بھی مسلمانوں کے حصہ میں نہ آنی چاہیے اور انہیں مکمل طور پر ہندو قوم میں ضم کرلینا چاہیے۔ ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ کے مقررین نے تو برملا اس کا اظہار بھی کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں لیکن شری سمپورنانند اور شری کاٹجو ذرا شرماتے اور اشارے کنایے میں باتیں کرتے ہیں۔

اس خواہش اور مطالبے کا محرک انتقام کا اندھا جوش ہے۔ انتقام، عہدِ گزشتہ کی حکومت و فرماں روائی کا بھی اور عہدِ موجودہ کے حصولِ پاکستان کا بھی۔ ان لوگوں کو اس بات کا بھی غصہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندستان پر حکومت کیوں کی اور اس آگ میں بھی جل رہے ہیں کہ انھوں نے کشمکش کرکے پاکستان کیوں حاصل کیا۔ یہ چاہتے تھے کہ ڈھاکہ، لاہور، کراچی اور پشاور پر بھی انہیں کا پرچم اقتدار لہرائے لیکن غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان اس راہ میں حائل ہوگئے اور ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی، اس کا غصہ وہ ان مسلمانوں پر نکال رہے ہیں جو ہندستان میں ان کے زیرِ اقتدار زندگی گزار رہے ہیں اور حد یہ ہے کہ ان کے اس غصے کی زد سے مسلمانوں کی وہ جماعت اور وہ ادارے بھی محفوظ نہیں ہیں جو آخر دم تک نظریہ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد یہ لوگ کسی مسلمان کو بھی چاہے وہ تحریکِ آزادی کا جانباز سپاہی کیوں نہ ہو، مساوی درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں یہاں جو کچھ لکھ رہا ہوں اس کے لیے حوالے دینا چاہوں تو یہ اشارات، ایک کتاب

بن جائیں، لیکن یہاں ایک تازہ حوالہ دیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ علی گڈھ وغیرہ کے ایک حالیہ فساد کے بعد شری آچاریہ کرپلانی نے اخبارات کو ایک بیان دیا ہے، اس میں انھوں نے بڑی ہمدردی کے ساتھ مسلمان لیڈروں کو جو مشورہ دیا ہے وہ یہ ہے :-

> یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان لیڈر خواہ وہ کانگرس کے اندر ہوں یا باہر، اگر وہ اپنے فرقے اور ملک کی بھلائی چاہتے ہیں تو اپنے ہم مذہبوں کو قابو میں رکھیں، انھیں محسوس کرنا چاہیے کہ فساد میں تعداد ہی کام آتی ہے اس لیے انھیں اپنے ہم مذہبوں سے کہنا چاہیے کہ اکثریتی فرقے کے لوگوں سے تعلقات میں وہ محتاط رہیں۔ ایسا کرنے میں ممکن ہے انہیں بعض اوقات اپنی خودداری جیب میں رکھنا پڑے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اقلیتی فرقے کے لیے جو سمجھتا ہو کہ ہندستان پر کبھی اس کا تسلط تھا اپنی خودداری کو دبائے رکھنا ذرا مشکل ہے لیکن انہیں محسوس کرنا چاہیے کہ ہندستان کے بدلے ہوئے حالات میں اگر انہیں اپنے سے زیادہ تعداد والے ہم وطنوں کے ساتھ امن کی زندگی بسر کرنا ہے تو یہ ضروری ہے۔
>
> (قومی آواز ۱۴؍اکتوبر ۱۹۶۱ء)

اس پوری عبارت میں اقتدار کا غرور اور اکثریت کا گھمنڈ چھپائے نہیں چھپتا۔ یہ الفاظ کسی مہاسبھائی اور جن سنگھی کے نہیں ہیں اس شخص کے ہیں جو کبھی کانگرس کا صدر رہ چکا ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کی حیثیت کو اتنے واضح الفاظ میں اب تک شاید کسی کانگرسی یا سابق کانگرسی نے ظاہر نہیں کیا تھا ــــ یہ ہے دستور میں اقلیتوں کو دی ہوئی مساویانہ حیثیت کی اصل حقیقت ــ جب آچاریہ کرپلانی کے خیالات یہ ہیں اور ان کا مشورہ یہ ہے تو اسی پر قیاس کر لیجیے جن سنگھیوں کے خیالات اور ان کے مطالبے کو۔

اوپر سے اصل بحث یہ آرہی ہے کہ جن سنگھ اور اس جیسی دوسری جماعتیں مسلمانوں سے جو مزید مطالبات کر رہی ہیں اس کا محرک جوشِ انتقام ہے اور جب محرک جوشِ انتقام ہو تو ظاہر ہے کہ طریق کار بھی منتقمانہ ہی ہوگا۔ چنانچہ ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ نے قتل و غارت اور مسلمانوں کی معاشی تباہی کو حصولِ مقصد کا ذریعہ بنایا ہے۔ چودہ سال سے یہ لوگ اس طریق کار پر عمل پیرا ہیں، ان کی ٹیکنک یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس قدر خوف زدہ، مرعوب اور تنگ کیا جائے کہ یہ گھٹنے ٹیک دیں اور ان کے مطالبات تسلیم کرلیں۔ انتقام کے جوش میں یہ جماعتیں اس پہلو پر بھی دھیان دینے کے لیے آمادہ نہیں ہیں کہ ہنگامہ و فساد اور بدامنی سے ملک کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور بہت ساری قوت، مادی اور اس کے اثرات ابعد پر صرف ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں پر جن سنگھ کے منظم حملوں کا محرک محض سیاسی

ہے یعنی وہ کانگرس کو بدنام کرکے الکشن میں اس کو شکست دینا چاہتی اور خود برسرِ اقتدار آنا چاہتی ہے۔ کسی حد

۸

تک یہ بات بھی صحیح ہے لیکن یہ اصل محرک نہیں، میرے نزدیک اس کا اصل محرک جوشِ انتقام ہی ہے۔

کانگرس کا وہ گروپ جو مسلمانوں سے مزید مطالبات نہیں کرتا اس کا طریقِ کار پہلے گروپ سے مختلف ہے

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرِ مشترک میں اتفاق کے باوجود اس کا محرک مختلف ہے۔ یہ گروپ جس کے سب سے بڑے

نمائندے پنڈت جواہر لال نہرو ہیں جوشِ انتقام میں اندھا نہیں ہے بلکہ اس کا محرک، قوم پرستی اور وطن پرستی ہے۔ یہ

گروپ سمجھتا ہے کہ جب تک بھارت میں یورپ و امریکہ کی طرح قوم پرستی اور وطن پرستی کے نظریات بار آور نہ ہوں

گے اور ملک کے تمام باشندے قوم و وطن کے محور و مرکز پر جمع نہ ہوں گے، بھارت مادی لحاظ سے وہ ترقی نہیں

کرسکتا جو مثال کے طور پر برطانیہ یا امریکہ نے کی ہے نیز یہ کہ اس کے بغیر وہ عالمی سیاست پر پوری قوت کے ساتھ

اثر انداز بھی نہیں ہوسکتا اس لیے وہ مسلمانوں کو قوم پرستی اور وطن پرستی کے محور پر جمع کرنے کے لیے قتل و غارت

اور معاشی ناکہ بندی کو پسند نہیں کرتا اور نہ ان کے محدود قسم کے مذہبی معاملات مثلاً نماز روزہ میں مداخلت کرنا

چاہتا ہے بلکہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ تعلیم و ترغیب اور دوسرے "پرامن" ذرائع سے مسلمانوں کے

ذہن کو بدل دینا چاہتا ہے اور ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے کہ کم از کم ان کی آئندہ نسلیں جذبات و

خیالات کے لحاظ سے اکثریت کی ہم آہنگ ہوں کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ مار دھاڑ سے مسلمانوں کو مرعوب تو

کیا جاسکتا ہے لیکن ان سے برضا و رغبت، وطن کی معبودیت منوائی نہیں جاسکتی۔

یہاں پہنچکر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندستان کی حکومت تو کانگرس کے ہاتھ میں ہے، پھر ہندو مہا سبھا اور

جن سنگھ اس طریقِ کار پر کس طرح عمل پیرا ہیں اور چودہ سال سے وہ کس قوت پر مسلمانوں کو ستا رہی ہیں۔ اس سوال

کا مفصل جواب تو کانگرس کی عبرتناک تاریخ دے سکتی ہے۔ مختصراً اس سوال کو حل کرنے کے لیے کئی چیزیں

سامنے رکھنی چاہئیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ خود کانگرس میں ایک بہت ہی مضبوط گروپ ان لوگوں کا موجود رہا ہے اور ہے، جن

کی ذہنیت مسلمانوں کے بارے میں وہی ہے جو ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ کی ہے اور بہت بڑی حد تک بھارت

کی داخلی سیاست اور انتظام اسی گروپ کے ہاتھ میں رہا ہے۔ بیرونی جماعتوں اور کانگرس کے اس اندرونی

گروپ نے مل کر ایک طرف ہندو عوام کو مسلمانوں سے بدظن کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے اور دوسری طرف بھارت

کے ایڈمنسٹریشن کو اسی زہریلی ذہنیت کے افسروں اور ماتحتوں سے بھر دیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ کانگرس کا جو گروپ مہاسبھائی ذہنیت نہیں رکھتا وہ بھی مسلمانوں کے معاملے میں کوئی مضبوط عملی قدم نہیں اٹھاتا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ بھی قدرِ مشترک میں مہاسبھائی گروپ سے متفق ہے۔ دوسری یہ کہ اگر وہ مضبوط قدم اٹھائے تو اپنی قوم میں نامقبول ہو جائے اور اس طرح خود اس کا اپنا اقتدار خطرے میں پڑ جائے اس لیے وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے بلکہ مسلمانوں پر منظم حملوں کے لیے خود مسلمانوں کو قصوروار ثابت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ ایسا نہ کرے تو اس کی اپنی قوم ناخوش ہو جائیگی، اس کی تازہ مثال یوپی کے وزیر داخلہ شری چرن سنگھ کی پریس کانفرنس ہے۔ انہوں نے فسادات کے مستقل علاج پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا :۔

> لکھنؤ ۱۰ اکتوبر شری چرن سنگھ نے کہا کہ فرقہ وارانہ فسادات، صرف ایک علامت ہیں، ان پر پولس کی سخت کارروائیوں سے قابو پایا جا سکتا ہے لیکن اس طرح جو امن قائم ہوگا وہ دو مسلح گروہوں کی صلح جیسا ہوگا۔ مستقل علاج کی "تلاش" کے لیے ہمیں اصل مرض کی تشخیص کرنی ہوگی۔ میری رائے میں مرض کی جڑ یہ ہے کہ دونوں بڑے فرقے اپنے کو الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ کر سوچتے ہیں اور ان کے درمیان سماجی دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں۔ یہ صورت حال دو خاص اسباب سے پیدا ہوئی ہے ان میں سے ایک ہندوؤں میں ذات پات کا طریقہ ہے اور دوسرا مسلمانوں میں الگ تھلگ رہنے کا جذبہ جو انہیں قومی زندگی کے خاص دھاروں سے بے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ مسلمانوں میں الگ تھلگ رہنے کے رویہ کو ان آدھے درجن سے زیادہ جماعتوں کی وجہ سے تقویت حاصل ہوئی جو سماجی مذہبی یا تمدنی میدانوں میں کام کرتی ہیں۔ یہ جماعتیں ہندوستانی قوم کی وسیع تر وحدت کے ساتھ مسلمانوں کی مطابقت میں رکاوٹ ڈالتی ہیں (قومی آواز ١٢ اکتوبر ١٩٦١ء)

چودھری چرن سنگھ کا یہ واضح اظہارِ خیال ایک طرف یہ ثابت کرتا ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کی انفرادیت کا تعلق ہے اس کو کانگرس کا غیر جن سنگھی گروپ بھی بھارت کی قومی زندگی کے لیے اصل مرض سمجھتا ہے اور اس لیے وہ مسلمانوں کی ہر ایسی جماعت کو ملک کے لیے مضر جانتا ہے جو مسلمانوں میں سماجی، تہذیبی اور تمدنی انفرادیت کا احساس بیدار کرتی ہے یا اسے زندہ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب جمعیۃ العلماء کو بھی یہ لوگ گوارا نہیں کرتے جو سیاسی زندگی میں ہمیشہ کانگرس کا ساتھ دیتی رہی اور آج بھی دے رہی ہے کیونکہ بہرحال وہ مسلمانوں میں تہذیبی اور تعلیمی انفرادیت

کا احساس تازہ رکھنے کی مجرم ضرور ہے۔ دوسری بات جو اس بیان سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر جو منظم حملے کیے جارہے ہیں اس میں قصور خود ان کا اپنا ہے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ یہ حملے نہ ہوں تو انہیں قومی زندگی کے خاص دھاروں میں غوطے لگا کر پوتر ہونا چاہیے اور "ہندستانی قوم کی وسیع تر وحدت" میں اپنے آپ کو ضم کر دینا چاہیے —— یہ ہے وہ قدر مشترک جس پر اکثریت کی تمام جماعتیں متفق و متحد ہیں۔

یہ بات بھی اپنے ذہن میں تازہ کر لینی چاہیے کہ مہاسبھائی اور غیر مہاسبھائی یہ دونوں ذہنیتیں اور یہ دونوں طریق کار نئے نہیں ہیں بلکہ تقسیم ہند سے بہت پہلے سے برسر کار ہیں۔ ہندستان کا ہر منصف مزاج مورخ اس بات کو تسلیم کرے گا کہ اس ملک کو تقسیم کرنے میں مہاسبھائی ذہنیت اور طریقۂ کار کو اول درجے کی اہمیت حاصل ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اسی ذہنیت کے ردعمل نے مسلم لیگ کی سیاست کو فروغ دیا تھا اور ہندو قوم پرستی کے مقابلے میں مسلم قوم پرستی نے پر پرزے نکالے تھے۔ آخر کار انگریزوں کی تیسری طاقت نے اپنے مصالح کے پیش نظر ملک کو تقسیم کیا، خود درمیان سے ہٹ گئے اور اب بھارت اور پاکستان دو حریفوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہیں۔ اگر کانگرس کے دوسرے گروپ کی ذہنیت اور اس کا طریقہ کار اس ملک میں فروغ پا گیا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ ملک تقسیم نہ ہوتا بلکہ مسلمانوں کی اکثریت ابھی انڈین نیشنلزم پر مطمئن ہو چکی ہوتی۔ ماضی کی طویل داستان کی طرف یہ بالکل مختصر اشارہ محض اس لیے ہے کہ ان دونوں ذہنیتوں کی تاریخ اور خود ان کی باہمی کش مکش سامنے آ جائے۔

اوپر کی سطروں میں صورتِ حال کا بہت ہی مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ اختصار کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے مطالبہ کرنے میں اکثریت کی جماعتوں کا جو قدر مشترک یہاں پیش کیا گیا ہے وہ اب اتنا واضح ہو چکا ہے کہ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا مسلمان اس سے ناواقف ہو۔ اب اس سوال پر غور کرنے کا وقت آ گیا ہے کہ قومی اتحاد اور جذباتی یکجہتی کی جدوجہد یا اکثریت کے مذکورہ مطالبے کے سلسلے میں مسلمانوں کو بالعموم اور تحریک اقامت دین کے داعیوں کو بالخصوص کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ بھارت کی ملت اسلامیہ کو بحیثیت مجموعی کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے تو تنہا کوئی شخص یا کوئی جماعت اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ سب کی طرف سے اس کا کوئی متفقہ حل پیش کر سکے یا جواب دے سکے۔ اس کے لیے تنہائی ضروری ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی تمام جماعتیں اور وہ سربرآوردہ افراد، جن پر

مسلمان ہونے کی حیثیت سے مسلم عوام اعتماد کرتے ہیں، سر جوڑ کر بیٹھیں اور کوئی متفقہ جواب تیار کریں۔ بہت عرصے سے کسی ایسے اجتماع کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے اور روز بروز یہ ضرورت بڑھتی ہی جاتی ہے لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں کے وہ سربراہ بھی جو ہندستان میں مسلمانوں کو، مسلمان ہونے کی حیثیت سے زندہ اور باعزت دیکھنا چاہتے ہیں، اب تک کوئی ایسا اجتماع منعقد نہ کرسکے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ صرف بھارت کے دستور کی دہائی دے کر اس مطالبے سے چشم پوشی کرنا اور مسلمانوں کو اسلامی نقطہ نظر سے کوئی واضح ہدایت نہ دینا اب کسی حال میں تقاضائے مصلحت نہیں معلوم ہوتا۔ مسلمان اگر کسی ایک جواب پر متفق نہ ہوئے تو اس ملک میں ملتِ اسلامیہ کو اتنا شدید نقصان پہنچے گا جس کی تلافی آسان نہ ہوگی۔

جو لوگ ہندستان میں تحریک اقامتِ دین کی تاریخ سے واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس تحریک کے داعیوں اور رفادموں پر اکثریت کی سیاسی و مذہبی جماعتوں کا یہ مطالبہ آج سے ۲۰، ۲۵ سال پہلے ہی واضح ہوچکا تھا، ان کے لیے قومی اتحاد اور جذباتی یک جہتی کی اصطلاح نئی نہیں ہے یہ وہی "متحدہ قومیت" کی پرانی شراب ہے جو نئے جام میں پیش کی جارہی ہے۔ ان کے نزدیک اکثریت کا یہ مطالبہ بھی تعجب انگیز نہیں ہے اس لیے کہ کانگریس نے قوم پرستی، وطن پرستی اور مغربی جمہوریت کے جن نظریات کو اختیار کیا ہے، یہ مطالبہ ان کی عین فطرت میں داخل ہے۔

ہم نے ان نظریات کو صرف ہندستان ہی کے لیے نہیں، پوری دنیا کے لیے پہلے بھی مضر سمجھا تھا اور آج بھی مضر سمجھتے ہیں ان کے بجائے ہم چند متبادل نظریات پیش کرتے ہیں اور انھیں کو بھارت سمیت تمام دنیا کے لیے مفید جانتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں ان نظریات پر تنقید اور ان کے نقصانات بھی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور متبادل نظریات کی افادیت بھی تفصیل سے پیش کی گئی ہے اس لیے ان مختصر اشارات میں ان پر گفتگو غیر ضروری ہے۔ یہاں تحریک اسلامی کے داعیوں اور رفادموں سے یہ کہنا ہے کہ اکثریت کی سیاسی و مذہبی جماعتوں کی موجودہ جد و جہد اور سرگرمی، تقاضا کرتی ہے کہ ہم بھی لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے میں سرگرم ہوجائیں، کیونکہ اس ملک میں جب تک دعوتِ اسلامی مقبول اور بارآور نہیں ہوتی نہ ہمارے مصائب کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور نہ یہ ملک صحیح معنی میں ترقی کرسکتا ہے۔ ہمیں اپنے قول و عمل سے اکثریت کے مطالبے کا جو جواب دینا چاہیے وہ یہ ہے:۔

اگر حقیقت واقعہ یہ ہوتی کہ اس دنیا کے بعد کوئی دوسری دنیا آنے والی نہیں اور یہی دنیا جس

میں ہم سانس لے رہے ہیں سب کچھ ہے تو قومی انفرادیت کے ختم کرنے اور وطن کو معبود بنانے کا مطالبہ ماننا
مان لینے میں چنداں مضائقہ نہ تھا۔ بھارت کے تمام افراد' ایک ہی قوم' ہندو قوم کے افراد ہوتے۔ بھارت
کی پوجا کرتے' اسی کے گن گاتے۔ اسی کی ترقی کو اپنی زندگی کا محور و مرکز بناتے' اور امریکہ و روس کی طرح
بھارت کو بھی دنیا کی ایک عظیم فتنہ انگیز طاقت بنا کر کھڑا کر دیتے لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے جس پر بے شمار خارجی
دلائل کے علاوہ خود انسان کی فطرت بھی گواہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق' مالک' معبود اور حاکم ہے جس نے
اپنی عظیم سلطنت کے ایک مختصر سے ٹکڑے۔ زمین۔ پر انسان کو اس کا امتحان لینے کے لیے بھیجا ہے اور موجودہ
زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے جس میں وہ ہماری دنیوی زندگی کا حساب لے گا۔ خالق کا
فرمان ہے کہ میں ہی اس کائنات کا معبود برحق ہوں اور تمام دوسرے معبود باطل ہیں۔ میں ہی اس کا جائز
حاکم ہوں اور میری مرضی کے خلاف تمام دوسرے حکام باغی ہیں۔ میں ہی اس کا حقیقی رب ہوں اور دوسرے تمام مدعیان
ربوبیت میرے سرکش غلام ہیں' میری غیرت' اپنی الوہیت' ربوبیت' صفات اور حقوق میں ذرہ برابر شرک گوارا
نہیں کرتی' یہ وہ جرم ہے جس کو میں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ جو شخص بھی شرک لیکر آئے گا اس کے لیے میرے پاس
جہنم کے سوا کچھ نہیں۔ جو لوگ شرک سے بیزار اور میرے وفادار ہیں میں نے انہیں "مسلم" کے لقب سے نوازا ہے
وہ جب توحید کی عظیم نعمت اپنے سینوں میں چھپائے میرے پاس پہنچیں گے تو میں انہیں اپنے دامن رحمت میں جگہ
دوں گا اور سدا بہار جنتیں ان کا مسکن ہوں گی۔ اس زندگی کے بعد جو زندگی آئے گی وہ ابدی اور غیر فانی ہوگی
فرماں بردار و وفادار کی جزا بھی ابدی ہوگی اور باغی و غدار کی سزا بھی ابدی ہوگی۔

اس فرمان واجب الاذعان کی سچائی پر پوری کائنات گواہ ہے' ہم بھی پورے شعور کے ساتھ سلطان کائنات
کے اس فرمان پر ایمان لے آئے ہیں ہم نے اسے اپنا خالق' مالک' معبود اور حاکم مان لیا ہے۔ ہم نے اپنی زندگیاں
اس کے حوالے کر دی ہیں۔ ہمارے مراسم عبودیت صرف اسی کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔ ہمارا مرنا اور جینا اسی
کے لیے ہے اور ہم نے اپنے لیے "مسلم" کا جاں نواز لقب قبول کر لیا ہے۔

یہ ہے وہ حقیقی سبب جس کی بنا پر ہم اپنی اسلامی انفرادیت ختم کر سکتے ہیں اور نہ وطن کی معبودیت پر ایمان
لا سکتے ہیں' وطن سے ہمیں بھی محبت ہے' اس کے خیر خواہ ہم بھی ہیں لیکن اسے معبود نہیں مان سکتے' اور بات صرف اتنی
ہی نہیں ہے کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے بلکہ غیر مسلم بھائیوں کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی صرف معبود برحق ہی کو معبود
مانیں' اس کے فرمان پر ایمان لے آئیں اور آخرت کے اس عذاب سے اپنے آپ کو بچا لیں جو ابدی ہے اور لا نہائی

دردناک ہے۔ قیامت و آخرت اور اس کا عذاب و ثواب کوئی مفروضہ نہیں ہے بلکہ نگاہوں سے چھپی ہوئی ایک زندہ حقیقت ہے۔ عقل کی بینائی اسے اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے آنکھوں کی بینائی چمکتے ہوئے سورج کو دیکھتی ہے۔

ایک دوسری وجہ بھی ہے جو ہمیں اکثریت کا مطالبہ ماننے سے روکتی ہے اور وہ ہے ہماری وسعت نظر اور وسعت خیال۔ ہم زندگی کے مسائل کو جغرافیائی وطن کے محدود دائرے میں نہیں سوچتے۔ پوری دنیا پر پھیلا کر سوچتے ہیں۔ ہم انسانیت کو جغرافیائی خانوں میں تقسیم کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ ہم تو اس نظام حیات کو ماننے والے ہیں جو یکساں طور پر دنیا کی تمام قوموں کے لیے باعث رحمت ہو جو تمام عالم میں یکساں طور پر امن و سلام کی ضمانت ہو۔ یہ نعمت عام نہ قوم پرستی کے نظریے سے حاصل ہو سکتی ہے، نہ وطن پرستی کے نظریے سے۔ تمام دنیا کے لیے باعث رحمت ہونا تو بڑی بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نیشنلزم کا نظریہ کسی ایک ملک میں بھی ایسی فضا پیدا نہیں کرتا جو تمام باشندوں کے لیے یکساں باعث رحمت ہو۔ یہ بات صرف اس طریق زندگی اور اس دین سے حاصل ہو سکتی ہے جسے دنیا کے خالق و مالک نے انسانوں کے لیے بھیجا ہو۔ اسی طریق زندگی اور اسی دین کا نام اسلام ہے۔ معلوم ہوا کہ دنیوی مسائل کے نقطۂ نظر سے بھی اسلام کو ترک کرنا کسی صاحب عقل کا کام نہیں ہو سکتا

ہم اکثریت سے کہتے ہیں کہ اسلام پر غور کرو اور اگر ماننا نہیں چاہتے تو نہ مانو لیکن ہم سے ترک اسلام کا نامعقول مطالبہ چھوڑ دو۔ ہم توحید کے بدلے میں شرک، ایمان کے بدلے میں کفر، خدا کے شکر کے بدلے میں اس کی ناشکری اور روشنی کے بدلے میں تاریکی قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوں گے۔ باقی رہی حیات و موت کی بات تو ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس کا وقت بھی مقرر ہے، مقام بھی اور ذریعہ بھی۔ یہ تم سوچ لو کہ ظلم کی ٹہنی کب تک ہری رہے گی۔

نظریۂ اُوتار اُور عقیدۂ رسالت

(آخری قسط)

(جناب ابومحمد امام الدین، رام نگری)

۲۔ دھرم کی جیسی کس مپرسی اور زبوں حالی کے زمانے میں اوتاروں کا ظاہر ہونا بتایا گیا ہے ایسے ہی زمانوں میں برابر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ظہور ہوتا رہا حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جب پھر دین مظلوم ہو گیا اور بد دینی عام ہو گئی تو حضرت ہود علیہ السلام کا ظہور ہوا اور اگر ہم رسالت کو اوتار کے مفہوم میں لیں تو کہیں گے اوتار ہوا۔ حضرت ہود کی قوم عاد اپنے وقت کی بڑی طاقتور اور صاحبِ حکومت قوم تھی، جب اس قوم کی بد دینی اور سرکشی انتہا کو پہنچ گئی تو پھر اس پر بھی تباہی آئی۔ قرآن مجید کے ایک مقام میں اس کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا	ہم نے ان پر ایک سخت منحوس دن میں
فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ تَنزِعُ النَّاسَ	ایک تند ہوا چلائی، وہ ان کو اس طرح اکھاڑ
كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ ۝	پھینکتی تھی گویا وہ اکھڑی پڑی کھجوروں کے تنے
(سورۂ قمر)	ہیں۔

دیکھیے، حضرت ہود علیہ السلام خدا کا اوتار نہیں خدا کے رسول ہیں وہ دھرم کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں جس ظالم اور بد دین قوم سے ان کا معاملہ ہے اسے تباہ و برباد کرنے کے لیے نہ انسانی فوج و سپاہ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ مافوق الفطرت بندروں اور ریچھوں کی۔ ایک آندھی اٹھتی ہے اور پوری سرکش قوم کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔ خدا کی قدرت کا بڑا ظہور ہم کہاں دیکھتے ہیں؟ یہاں یا وہاں؟

(۳) حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ سے دین کی جو تجدید ہوئی تھی امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس کا اثر مٹ جاتا ہے۔ آں جنابؑ کی تعلیم و ہدایت سے جو دین دار اور خدا پرست جماعت پیدا ہوئی تھی

اس کی نسل پھر شرکت و بت پرستی اور بد دینی و بدعملی میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کی تعلیم و ہدایت اور تجدید دین کے لیے حضرت صالح علیہ السلام اٹھائے جاتے ہیں سرکش اور بد دین قوم ثمود ان کی بات نہیں مانتی اس کی گمراہی اور سرکشی بڑھتی ہی جاتی ہے کہتی ہے' ہم تمہاری بات کیوں مانیں؟ تم اپنے کو خدا کا رسول کہتے ہو' مگر ہم تو تم میں کوئی خاص بات نہیں دیکھتے' تم بھی تو ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہو' ہم تمہارے کہنے سے اپنے ان معبودوں کو کیسے چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آ رہے ہیں۔ تم ہمیں بار بار خدا کے عذاب سے ڈراتے رہتے ہو۔ اگر تم خدا کے سچے رسول ہو تو خدا کا وہ عذاب لا کیوں نہیں دکھاتے۔

جب اس قوم کی سرکشی اس حد کو پہنچ گئی تو اس کی تباہی کے لیے ایک اونٹنی کا ظہور ہوا حضرت صالح علیہ السلام نے لوگوں کو اس کے متعلق متنبہ کر دیا کہ

یقوم ھذہ ناقۃ اللہ	لوگو! یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لیے ایک
لکم ایۃ فذروھا تاکل	نشانی ہے' اس لیے اسے (آزاد) چھوڑ دو کہ یہ
فی ارض اللہ ولا تمسوھا	خدا کی زمین میں (آزادانہ) کھائے اور (خبردار)
بسوء فیاخذکم عذاب	تم برے ارادے سے اس کو چھونا بھی مت ورنہ تم
قریب	کو بہت جلد (خدا کا) عذاب اپنی گرفت میں
(سورہ ہود)	لے لیگا

لوگوں کی اپنی مملکت تھی' حکومت تھی' اقتدار و اختیار تھا' وہ اس کے نشے میں سرشار تھے' انھوں نے ایک روز اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو خبر کر دی کہ تم تین روز اور دنیا سے مزے اڑا لو' اس کے بعد تمہاری ہلاکت و بربادی یقینی ہے' اس کے بعد وہی ہوا جس کی حضرت صالح نے خبر دی تھی' خدا نے حضرت صالح اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا۔

واخذ الذین ظلموا	اور ظالموں کو ایک ہولناک چنگھاڑ نے آ پکڑا
الصیحۃ فاصبحوا فی دیارھم	نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل اوندھے
جثمین کان لم یغنوا	پڑے رہ گئے (اور اس طرح مٹ گئے) گویا وہ اس
فیھا۔	خطۂ زمین میں کبھی آباد ہی نہ تھے۔

دیکھیے مقصد ایک ہی ہے ظلم اور بددینی کا خاتمہ اور خدا پرستوں کی مدد لیکن ایک جگہ بھگوان شیر کی صورت میں اوتار لیتے ہیں اور دوسری جگہ بددینوں اور ظالموں کی ہلاکت و تباہی کے لیے خدا ایک اونٹنی ظاہر کر دیتا ہے اور اسی کو ان کی ہلاکت و تباہی کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ غور کیجیے قرین عقل اور ایشور کی عظمت و جلال کے شایان شان کون سا عقیدہ اور نظریہ ہے؟ شیر کو اونٹنی کی طرح ایشور کی قدرت کا ظہور ماننا یا خود ایشور کا ظہور طرح طرح کی تاویلوں کے ذریعہ بات کی چول بٹھانے کی بات نہیں۔ سیدھی عقل سے سیدھا فیصلہ طلب کیجیے۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کے ایک عظیم الشان رسول تھے۔ نمرود آپ ہی کی قوم میں گذرا ہے۔ پوری قوم بت پرست تھی خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاندان بت تراش اور بت پرست تھا، نمرود خود خدا بنا بیٹھا تھا اور لوگوں سے اپنی پرستش کراتا تھا آپ کو حیرت ہوگی کہ جب وہ خود بتوں کا پرستار تھا تو اس کی قوم اسے خدا کیونکر مانتی تھی؟ لیکن آپ کی حیرت کے باوجود شرک کی دنیا میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ شری رام چندر جی کو بھی دوسروں کی پوجا اپاسنا کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ فلسفہ میں بڑا زور ہے، وہ ناقابل فہم بات کو بھی درست ثابت کر دکھاتا ہے۔

بہرحال ایسا ہوتا رہا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ایسی گمراہ قوم میں خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو توحید کا داعی اور علمبردار بنا کر مبعوث فرمایا۔ آپ نے توحید اور خدا پرستی کی دعوت و تبلیغ اور بت پرستی پر تنقید شروع کی لیکن جب علمی اور عقلی بات لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی تو آپ نے ہاتھ سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ لوگ سالانہ قومی جشن منانے کے لیے شہر کے باہر نکل گئے تھے۔ شہر خالی پڑا ہوا تھا۔ آپ پھاوڑا لے کر شہر کے بڑے بت خانے میں داخل ہوگئے۔ چھوٹے چھوٹے بتوں کو توڑ کر پھاوڑا بڑے بت کے شانے پر لٹکا دیا۔ لوگ جشن منا کر واپس آئے اور بتوں کی یہ حالت دیکھی تو ان کے ساتھ اس طرح کی حرکت کرنے والے کی تلاش ہوئی۔ کچھ لوگوں نے کہا ابراہیم بت پرستی کی مذمت کرتے ہیں اس لیے یہ کام انھیں کا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ وہ جائے واقعہ پر لائے گئے اور آپ سے پوچھا جانے لگا۔ اب بات کے سمجھانے کا موقع آگیا تھا جس کے لیے آپ نے اتنا بڑا خطرہ سر لیا تھا۔ آپ نے فرمایا اگر بول سکے تو اس بڑے بت سے پوچھو کہ یہ کس کا کام ہے؟ لوگوں نے کہا۔ تم کیسی بات کر رہے ہو؟ جانتے ہو کہ بت بولا نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا:۔

اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	پھر کیا تم خدا کو چھوڑ کر ایسوں کو پوجتے ہو جو نہ
مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْئًا وَّلَا یَضُرُّكُمْ	تمہیں کچھ نفع پہنچا سکیں اور نہ نقصان؟ افسوس ہے

أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (انبیاء)

تف ہے تم پر اور خدا کو چھوڑ کر جن کو تم پوجتے ہو ان پر کیا تم ذرا بھی عقل سے کام نہیں لیتے۔

کتنی سیدھی اور عام فہم بات تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو سمجھائی تھی لیکن اس صاف سیدھی بات کو ماننے کے بجائے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک آتش کدہ تیار کرکے ان کو اسی میں جھونک دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کے سچے رسول تھے انھیں اس عظیم الشان کام کو انجام دینا تھا جس کے لیے خدا نے ان کو مبعوث فرمایا تھا۔ خدا کی مشیت و قدرت ان کی پشت پر تھی، خدا نے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ان کے لیے ٹھنڈک پیدا کردی۔ قرآن میں آیا ہے۔

قلنا یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراھیم (انبیاء)

ہم نے کہا اے آگ! ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی بن جا

آگ کی فطرت جلانا ہے، یہ خدائی قانون ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں کی مذہبی کتھائیں خلاف فطرت باتوں سے بھری ہوئی ہیں اس لیے وہ تو اس واقعہ پر کلام نہیں کرسکتے۔ مگر موجودہ زمانے کے عقل پرست خلاف فطرت باتوں پر بڑی جرح و قدح کرتے ہیں، ان کی بڑی عقل میں یہ موٹی سی بات نہیں سماتی کہ جس نے آگ کی فطرت میں جلن رکھ دی ہے اگر وہی کسی موقع پر اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانا چاہے تو آگ کی فطرت کو بدل دینے کی قدرت کیوں نہیں رکھتا؟ حالانکہ یہی عقلاء سائنس کے ذریعہ ایسی حالت پیدا کردینے پر قادر ہوچکے ہیں کہ مئی جون میں ٹھنڈا کردیتے ہیں اور دسمبر جنوری میں گرم اور لطف یہ کہ ٹھنڈک اور گرمی دونوں حسب خواہ معتدل ہوتی ہے لیکن یہاں جو کچھ ہوتا ہے مادی ذرائع سے ہوتا ہے، وہاں جو کچھ ہوا غیر مادی ذریعہ یعنی قدرت سے ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے واقعات و احوال کو جو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ وقوع و ظہور میں آئے معجزہ کہا جاتا ہے، جو لوگ معجزات کے وقوع میں کلام کرتے ہیں وہ دراصل خدا کے وجود اور اس کی قدرت میں کلام کرتے ہیں اور نام خود ان کی عقل کے خلاف ہے وہ خدا کی قدرت کو نہیں مانتے مگر مادہ کی قدرت اور کرشمہ سازی پر ایمان رکھتے ہیں، یہ کتنی بڑی جہالت اور نادانشی ہے۔

(۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی خدا کے ایک جلیل القدر رسول تھے، توریت انھیں پر نازل ہوئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل اپنی شامت اعمال سے مصری سلطنت کی محکومیت و غلامیت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ مصر کا بادشاہ فرعون بنی اسرائیل پر بے پناہ مظالم ڈھا رہا تھا۔

شری کرشن جی کے ماموں راجہ کنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑا ظالم تھا۔ نجومیوں نے بتایا تھا کہ اس کے بھانجے کے ذریعہ اس کی ہلاکت و تباہی عمل میں آئے گی اس لیے اس نے کرشن جی کی والدہ اور ان کے والد کو قید کر دیا تھا تاکہ بچہ پیدا ہو تو اسے ہلاک کر دیا جائے، اسی طرح فرعون کے نجومیوں نے اسے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جس کے ذریعہ اس کی اور اس کی سلطنت کی تباہی عمل میں آئے گی اس لیے فرعون نے یہ فرمان صادر کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل کے یہاں جو لڑکیاں پیدا ہوں ان کو چھوڑ دیا جائے اور جو بیٹے پیدا ہوں ان کو قتل کر دیا جائے۔ اس شاہی فرمان پر بڑی سختی سے عمل ہو رہا تھا۔ بنی اسرائیل کے اسی دورِ مظلومیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حاملہ ہوئیں، ان کو بڑا غم تھا کہ بیٹا پیدا ہوا تو مار ڈالا جائے گا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو خدا نے ان کی ماں کو حکم دیا کہ وہ بچے کو دودھ پلائیں اور اگر ان کو بچے کے لیے خوف محسوس ہو تو اسے ایک صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں ڈال دیں اور بچے کے ضائع جانے کا غم نہ کریں ان کا بچہ انھیں بخیر و عافیت واپس مل جائے گا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے یہی کیا، صندوق دریا میں بہتا ہوا شاہی محل کے سامنے پہنچا تو فرعون کی بیوی نے اسے دیکھ لیا اور خادموں کو حکم دیا کہ صندوق کو نکال لائیں، صندوق لایا گیا اور کھولا گیا تو اس میں سے ایک بچہ نکلا فرعون کی بیوی کو اس پر ایسا پیار آیا کہ اس نے بچے کو پرورش کرنا طے کر لیا، لیکن دودھ پلانے کے لیے دائیاں بلائی گئیں بچے نے کسی دائی کے دودھ کو منہ ہی نہ لگایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے صندوق کو دریا میں ڈالتے ہوئے اپنی بیٹی کو مقرر کر دیا تھا کہ وہ دریا کے کنارے کنارے صندوق کے ساتھ جائیں اور دیکھیں کہ بچے کے ساتھ خدا کیا معاملہ کرتا ہے، چنانچہ وہ بھی شاہی محل میں پہنچ گئی تھیں، انھوں نے دیکھا کہ بچہ کسی دائی کا دودھ نہیں پکڑتا تو انھوں نے ملکہ سے کہا کہ حکم ہو تو میں ایک دائی لے آؤں وہ اپنے کام کی بڑی ماہر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بچے کو دودھ پلانے میں کامیاب ہو جائے۔ ملکہ نے دائی کو لانے کا حکم دیا۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں شاہی محل میں پہنچ گئیں اور بچہ ان کو واپس مل گیا۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام شاہی محل میں پرورش پاکر جوان ہو گئے۔

ایک دفعہ آپ سناٹے کے وقت شہر میں نکلے، دیکھا شاہی قوم کا ایک آدمی بنی اسرائیل کی قوم کے ایک آدمی کو مار رہا ہے۔ مار کھانے والے نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے پکارا۔ آپ نے مارنے والے کو ایک گھونسہ مارا۔ اگرچہ آپ کا ارادہ مار ڈالنے کا نہ تھا، لیکن اس گھونسے سے اس کا کام تمام ہو گیا۔ حضرت موسیٰ شاہی محل میں واپس چلے گئے۔ شاہی قوم کے آدمی کا اس طرح مارا جانا ایک نیا واقعہ تھا، اس لیے شہر میں سنسنی پھیل گئی، لیکن مارنے والے کا پتہ نہ چل سکا۔ دوسرے روز پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں نکلے تو دیکھا اسی اسرائیلی کو پھر شاہی قوم

ایک آدمی مار رہا ہے اس نے فریاد کی حضرت موسیٰ غصے میں بھرے ہوئے لپکے۔ اسرائیلی کو اندیشہ ہوا کہ آپ اسی کو مارنا چاہتے
ہیں اس لیے وہ چلایا کہ کیا جس طرح تم نے کل ایک شخص کو مار ڈالا تھا آج مجھ کو مار ڈالنا چاہتے ہو؟ اس طرح معلوم ہوگیا
کہ کل شاہی قوم کا آدمی کس کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ یہ بات شاہی دربار میں پہنچ گئی اور پتہ چل گیا کہ یہ نوجوان اسرائیلی
قوم سے متعلق ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم جاری ہوگیا۔ دربار میں حضرت موسیٰ کے خیر خواہ بھی
تھے انھوں نے آپ کو شاہی فرمان کی خبر کردی آپ نے اسی وقت مصر سے مدین کی طرف کوچ کردیا۔ وہاں خدا کے ایک
پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام تھے ان کے پاس پہنچ گئے، انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے یہاں رکھ لیا
اور اس شرط پر ان سے اپنی ایک بیٹی کی شادی کردی کہ وہ دس برس تک ان کے یہاں رہ کر ان کی خدمت کریں گے چنانچہ
یہ مدت پوری ہوگئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ کے ساتھ شام روانہ ہوئے جو ان کے اجداد کا وطن تھا، بیوی
حاملہ تھیں، رات کے وقت کوہ طور کے پاس سے گذر ہوا، پہاڑ پر آگ نظر آئی، سردی کا زمانہ تھا اور ان کی اہلیہ کو آگ
کی ضرورت تھی، راستے کا بھی پتہ نہ چلتا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیوی کو راستے میں بٹھا دیا اور آپ پہاڑ پر آگ
لینے اور راستہ دریافت کرنے گئے وہ آگ نہ تھی، خدا کی قدرت کا ظہور تھا، وہیں خدا ان سے ہم کلام ہوا اور ان
کو پیغمبری عطا فرمائی، ان کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی، خدا نے ان کو حکم دیا کہ لاٹھی کو زمین پر ڈال دو۔ آپ نے اسے
زمین پر ڈال دیا، وہ سانپ بنکر دوڑنے لگی حضرت موسیٰ ڈرنے لگے، حکم ہوا کہ ڈرو مت، اسے پکڑ لو، حضرت موسیٰ نے اسے
پکڑا تو ان کے ہاتھ میں آتے ہی وہ پھر لاٹھی بن گئی، پھر خدا کا حکم ہوا کہ تم اپنا دایاں ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو اور اسے
بغل سے ملا کر باہر نکالو حضرت موسیٰ نے تعمیل حکم کی، ہاتھ گریبان سے نکالا تو وہ نہایت روشن اور چمکدار تھا۔ ارشاد ہوا
کہ یہ دونوں تمہاری رسالت کی نشانیاں یعنی تمہارے معجزات ہیں۔ اب تم فرعون کے پاس جاؤ، اسے دین حق کی دعوت
دو اور اس سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک سوتیلے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام
تھے، انھوں نے خدا سے درخواست کی کہ جو کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے اس میں ہارون کو ان کا وزیر مقرر کردیا جائے۔
درخواست منظور ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون کو ساتھ لیکر فرعون کے پاس گئے اور اسے دین حق کی دعوت
دی اور بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا، نمرود کی طرح فرعون نے بھی اہل مصر کو اپنی خدائی کی بھول بھلیوں میں مبتلا کر رکھا تھا
اپنی حقیقت سے ناواقف نہ تھا لیکن حکومت اور اقتدار میں ایسی طاقت ہے کہ وہ جسے بھی حاصل ہو بندگان خدا
اپنی خدائی منوا سکتا ہے، فرعون کا زمانہ تو جہل وتاریکی کا زمانہ تھا، موجودہ علم و روشنی کے دور میں بھی منکرین خدا
اور قوموں پر خدائی کر رہے ہیں اور کروڑوں انسان خدا ہی کی طرح ان کی اطاعت و بندگی کر رہے ہیں

فرعون نے درباریوں پر اپنی دھاک قائم رکھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑی بحث کی کہ میرے سوا وہ کون خدا ہے جس نے تم کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے؟ جب حضرت موسیٰ سے بحث و گفتگو میں ہارا تو کہا۔ اگر تم خدا کے رسول ہو تو اپنی رسالت کی کوئی سند پیش کرو۔ حضرت موسیٰ نے اپنی لاٹھی اس کے سامنے ڈال دی اور وہ سانپ کی طرح دوڑنے لگی۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالا اور باہر نکال کر دکھایا۔ مگر فرعون پھر بھی قائل نہ ہوا۔ درباریوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ یہ دونوں بہت بڑے جادوگر ہیں اور چاہتے ہیں کہ جادو کے زور سے ہم سے ہماری سلطنت چھین لیں۔ اب تم ہمیں مشورہ دو کہ ہم کیا کریں؟ درباریوں نے کہا۔ ہمارے ملک میں ایک سے ایک ماہر فن جادوگر ہیں ان کو بلا کر مقابلہ کرا دیا جائے۔ چنانچہ ملک بھر کے جادوگر بلائے گئے۔ ایک روز شہر کے باہر فرعون، اہل دربار اور شہریوں کے سامنے مقابلہ ہوا۔ پہلے مصری جادوگروں نے اپنی رسیاں زمین پر ڈالیں اور وہ سانپ بنکر دوڑنے لگیں، تمام مجمع پر ایک ہیبت چھا گئی، جادوگر اپنے کمال فن پر پھولے نہ سماتے تھے۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ میدان مقابلہ جادوگروں کے ہاتھ رہا۔ اتنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم سے اپنی لاٹھی زمین پر ڈالی وہ اژدہا بنکر جادو کے سانپوں کو نگلنے لگی، یہاں تک کہ تمام سانپوں کو نگل گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی اٹھالی اور وہ پھر لاٹھی کی لاٹھی تھی۔

جادوگر فن سحر کے ماہر تھے، ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ موسیٰ جادوگر نہیں اور نہ یہ کرشمہ جادو ہے، یہ اعجاز ہے، ان کے دلوں میں یکایک ایمان کا نور چمک اٹھا وہ اپنے ایمان کا اعلان کرتے ہوئے خدا کے حضور سجدے میں گر پڑے۔

والقی السحرۃ سجدین قالوا امنّا	جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ کہا ہم تمام
برب العٰلمین رب موسیٰ وھٰرون	جہان کے رب، رب موسیٰ اور ہارون پر ایمان لائے

فرعون کی اس سے بڑی ذلت و ناکامی اور اسکی خدائی کی اس سے بڑی ہتک و توہین اور کیا ہو سکتی تھی کہ جن جادوگروں پر اسے کامل اعتماد تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کو شکست دیدیں گے انھوں نے نہ صرف اپنی شکست قبول کرلی بلکہ فرعون کے علی الرغم تمام اہل شہر کے مجمع میں اپنے ایمان و اسلام کا بھی اعلان کر دیا۔ فرعون غصے سے بیتاب ہو کر غضب آلود لہجے میں تڑپا۔

اٰمَنْتُمْ لَہٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ	میرے حکم دینے سے پہلے ہی تم نے موسیٰ پر
الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ	ایمان لانے کا اعلان کر دیا۔ بلاشبہ یہ شخص تمہارا

وارجلکم من خلاف و لاصلبنکم فی جذوع النخل۔

بزرگ ہے اور اسی نے تمہیں جادو کی تعلیم دی ہے۔ میں تمہارے دائیں اور بائیں پاؤں کٹوا دوں گا، اور تمہیں کھجوروں کے تنوں پر سولی چڑھوا دوں گا

جن جادوگروں نے پورے جذبہ حق کے ساتھ فرعون کے سامنے اعلان ایمان کردیا تھا وہ اس کے رعب و جلال اور اس کی عقوبت وسزا سے مرعوب ہونے والے کب تھے؟ انھوں نے بھی اسی شانِ مومنانہ کے ساتھ جواب دیا۔

قالوا انا الی ربنا منقلبون وما تنقم منا الا ان امنا بایت ربنا لما جاءتنا ربنا افرغ علینا صبرا و توفنا مسلمین ۝

(پ ۹، سورہ الاعراف)

انھوں نے کہا۔ ہم تو (بہرحال) اپنے رب کی طرف لوٹ جانے والے ہیں (پھر ہم کو موت کی کیا پروا) ہم سے تیرے انتقام کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ جب ہم پر ہمارے رب کی نشانی نمودار ہوگئی تو ہم نے اسے مان لیا (اب ہم اپنے رب ہی سے طالب امداد ہیں) اے ہمارے رب ہم پر صبر انڈیل دے اور مسلمان کی موت عطا فرما۔

حکومت واقتدار اور خود پرستی کا نشہ ایسا ہے کہ وہ جب چڑھ جاتا ہے تو ہلاکت وبربادی کرکے اترتا ہے۔ اس شکست وناکامی کے بعد فرعون کی شقاوت وسنگدلی میں اور اضافہ ہوگیا اور وہ بنی اسرائیل پر مزید ظلم وستم ڈھانے لگا۔ بچوں کے قتل کا سلسلہ بند ہوگیا تھا، وہ دوبارہ جاری ہوگیا۔

اسی حالت میں کئی سال گذر گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا حکم ہوا کہ وہ شب میں بنی اسرائیل کو لے کر مصر کوچ کردیں۔ فرعون کو خبر ہوگی تو وہ پیچھا کرے گا مگر گھبرانے کی ضرورت نہیں وہ کچھ کر نہیں سکتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک شب بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے نکلے۔ فرعون کو خبر ہوئی تو اس نے ایک زبردست فوج کے ساتھ ان کا تعاقب کیا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بڑا سخت مرحلہ تھا، لیکن وہ مطمئن تھے کہ خدا ان کا محافظ ہے اپنی قوم کو لیے ہوئے بحر قلزم کے ساحل پر پہنچے اور فرعون لشکر لیے ہوئے ان کے سر پر پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل گھبرا اٹھے۔ انھوں نے کہا "اب ہم پکڑ لیے گئے" حضرت موسیٰ نے ان کو اطمینان دلایا۔ میرا رب میرے ساتھ ہے اور مجھے ضرور راستہ دے گا" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ کو خدا کا حکم ہوا "موسیٰ اپنی لاٹھی سمندر پر مارو" حضرت موسیٰ نے لاٹھی سمندر پر ماری، لاٹھی کی ضرب پڑتے ہی سمندر کا پانی پھٹ گیا اور سمندر میں اس طرح راستے بن گئے کہ راستے کے دونوں طرف

پانی پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں پر مشتمل تھے، سمندر میں بارہ راستے بن گئے اور ہر قبیلہ ایک راستے سے بافیت سمندر پار ہو گیا۔ فرعون نے سمندر میں راستے بنے دیکھے تو وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ سمندر میں داخل ہو گیا ایک مقام پر قرآن نے دونوں گروہوں کے انجام کو اس طرح بیان کیا ہے۔

وَانجینا موسیٰ ومن معه	ہم نے موسیٰ کو اور جو ان کے ساتھ تھے سب کو
اجمعین ثم اغرقنا الآخرین ان	بچا دیا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ بلاشبہ اس واقعہ
فی ذالک لآیة وما کان اکثرهم	میں (حق کی فتحمندی کی) ایک نشانی ہے لیکن منکرین
مومنین (پ ۱۹ س شعراء)	میں سے اکثر اس پر ایمان لانے والے نہ تھے۔

یہ پورا بیان قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ شری رامچندر کے واقعہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا مقابلہ کیجیے، دھرم جزیرۂ لنکا میں بھی مظلوم تھا اور سرزمین مصر میں بھی۔ وہاں کا راجہ راون ظالم تھا تو یہاں کا فرعون بھی ظلم وستم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ راون اپنی طاقت کے غرور میں خدا کو بھول گیا تھا تو فرعون بھی خدا کے قہر و غضب سے بے خوف ہو گیا تھا۔ وہ اگر رشیوں منیوں کو ستا رہا تھا تو فرعون بھی خدا کے قہر و غضب سے بے خوف پہاڑ توڑ رہا تھا۔ وہاں ایک سیتاجی راون کی قید میں تھیں تو یہاں ایک پوری قوم فرعون کے آہنی شکنجے میں کسی ہوئی تھی۔ وہاں ایک سیتاجی کی رہائی کا مسئلہ درپیش تھا تو یہاں ایک پوری قوم کی آزادی کا مرحلہ سامنے تھا۔ وہاں سیتاجی کی رہائی کے لیے سمندر پار کرنا تھا تو یہاں ایک پوری قوم کو مصر سے نکال لے جانے کے لیے سمندر سے گزرنا تھا۔ وہاں رام جی کے پرتاپ سے بندروں ریچھوں نے سمندر پر پل باندھ دیا تو یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجازی عصا نے سمندر میں بارہ راستے بنا دیے۔ وہاں سمندر سے پل کے ذریعہ رام چندر کی فوج سمندر سے پار اتری تو یہاں پل کے بغیر بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے جو کئی لاکھ مردوں عورتوں بوڑھوں اور بچوں پر مشتمل تھے سمندر سے پار ہو گئے۔ رام چندر کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ایشور کے اوتار تھے۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ خدا کے اوتار نہ تھے انسان تھے خدا کے بندے اور رسول تھے، عقیدے اور عقیدت کی بات نہیں، وہ تو ہمارے زیر غور ہے۔ واقعہ کو دیکھیے، واقعے دونوں ملتے جلتے ہیں جس طرح کے واقعہ کو شری رامچندر کے اوتار ہونے کا ثبوت قرار دیا جاتا ہے اس سے عجیب تر واقعہ یہاں موجود ہے۔ فیصلہ واقعہ اور اصول کی روشنی میں ہونا چاہیے اور واقعہ اور اصول کا فیصلہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ جس دلیل سے شری رامچندر کو اوتار قرار دیا جاتا ہے ویسی ہی دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی موجود ہے لیکن حضرت موسیٰ کو نہ آپ اوتار ماننے کو تیار ہو سکتے ہیں اور نہ ہم۔ اور یہ بات درست نہیں

ہو سکتی کہ حضرت موسیٰ کو کچھ بھی نہ مانا جائے، یا ان کے واقعہ سے انکار کر دیا جائے کیونکہ از روئے تاریخ حضرت موسیٰ کی شخصیت اور ان کا واقعہ شری رام چندر کی شخصیت اور ان کے واقعہ سے کم تاریخی نہیں بلکہ بہت زیادہ تاریخی ہے اس لیے شری رام چندر جی تاریخ اور واقعہ کی روشنی میں اوتار نہیں، زیادہ سے زیادہ رسول ہی قرار پاسکتے ہیں یہ ہم عقیدے کی بات نہیں کہتے نتیجہ بحث کا اظہار کر رہے ہیں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے

دوسرے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حالات زندگی محفوظ نہیں ہیں اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے ذریعہ کتنے معجزات کا ظہور ہوا۔ قرینہ یہی ہے کہ جتنے معجزات کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے ان سے کہیں زیادہ معجزے ظاہر ہوتے ہوں گے۔ میں نے بھی بہت سے معلوم و مشہور معجزات کا تذکرہ چھوڑ دیا ہے، چونکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مفصل سوانح مبارک موجود ہیں اس لیے حضورؐ کے بیشتر معجزات کا تذکرہ احادیث کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ حضورؐ کی سیرت پاک کا تو ایک پورا باب ہی معجزات کے تذکروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان معجزات میں سب سے اہم اور عظیم الشان معجزہ شق القمر کا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہجرت کے قریب کا واقعہ ہے حضورؐ کی رسالت کا شہرہ مدینہ تک پہنچ چکا تھا جہاں یہودیوں کی بہت بڑی آبادی تھی۔ مدینہ میں اسلام کی اشاعت بھی شروع ہو چکی تھی، علم و فضل اور دولت و جائداد کی وجہ سے یہودیوں کو مدینہ کے قبیلوں میں بڑا رسوخ حاصل تھا ان کو اندیشہ تھا کہ مدینہ میں اسلام پھیل گیا تو ان کے رسوخ و اثر کا خاتمہ ہو جائے گا اس لیے انھوں نے اسلام کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوششیں شروع کر دیں چنانچہ انھوں نے قریش مکہ سے کہا کہ اپنی قوم کے مدعی رسالت سے کہو کہ اگر وہ خدا کے سچے رسول ہیں تو اپنی صداقت کی نشانی کے طور پر چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھائیں یہودیوں کے اس مشورے کے مطابق سرداران قریش نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معجزہ طلب کیا۔ اس وقت آپ مکہ کے باہر مقام منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ حضور کے مشہور صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا چشم دید واقعہ بخاری و مسلم وغیرہ میں موجود ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقام منیٰ میں بیٹھے تھے کہ چاند پھٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کی طرف چلا گیا۔ آں حضرت نے فرمایا۔ "گواہ رہنا"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو بخاری و مسلم دونوں میں ہے اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے:۔

"اہل مکہ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کو کوئی بڑا معجزہ دکھایا جائے

حضور نے انھیں چاند کا شق ہوجانا دکھایا، چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے، ایک ٹکڑا کوہ حرا کے اس طرف تھا اور دوسرا اس طرف۔"

اس واقعہ کے راویوں میں حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم بھی ہیں، حضرت انس بن مالک مدینہ کے رہنے والے تھے ان سے اس واقعہ کی روایت کے معنی یہ ہوئے کہ یہ واقعہ صحابہ کے درمیان عام اور مسلّم تھا۔ حضرت جبیر بن مطعم کا بیان ہے کہ اس معجزے کو دیکھ کر قریش نے کہا کہ محمد نے ہم پر جادو کردیا ہے اس پر کچھ لوگوں نے کہا کہ اگر محمد نے ہم پر جادو کردیا ہے تو وہ تمام لوگوں پر تو جادو نہیں کرسکتے اور مقامات سے مسافر آئیں تو ان سے دریافت کیا جائے، دیکھا جائے وہ کیا کہتے ہیں چنانچہ مختلف مقامات سے مسافر آئے اور انھوں نے اپنا یہی مشاہدہ بیان کیا۔

چونکہ چاند کا شق ہوجانا ایک انتہائی اور غیر معمولی عجیب و غریب واقعہ ہے اس لیے معترضین علماء نے اس کی صحت کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات کیے ہیں مثلاً کہا گیا ہے کہ اگر چاند واقعی پھٹ گیا تھا تو اس کا یہ پھٹنا ساری دنیا میں کیوں نہیں دیکھا گیا؟ اس کے جواب میں "رحمۃ للعالمین" کے مصنف قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے ایک نقشۂ اوقات مرتب کرکے دکھایا ہے کہ اگر عرب میں رات کے ۹ بجے ہوں تو ہندستان، برما، ملایا، ترکی، یونان، انگلستان، جرمن، فرانس، اسپین، پرتگال، امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ میں بارہ بجے سے لیکر سہ پہر تک کے وقت ہوں گے۔ ان ملکوں کے باشندوں کا تو یہ سونے کا وقت تھا ہی۔ جہاں طلوع ماہتاب سے لیکر نصف شب تک کا وقت تھا وہاں کے اکثر لوگ بھی سوتے ہی رہے ہوں گے، یا اپنے مکانوں کے اندر رہے ہوں گے۔ ان حالات میں اگر بعض لوگوں نے شق قمر کا واقعہ دیکھا بھی ہو تو کیا ضرور ہے کہ سب اسے قلمبند کرنے کے لائق بھی رہے ہوں، یا یہ کہ جن لوگوں نے اسے قلمبند کیا ہو ان کا نوشتہ عام ہی ہوجائے اور وہ ہم تک پہنچ جائے، جب کہ دنیا کی بڑی بڑی تصانیف ناپید ہوگئیں تو چھوٹی سی یادداشت کا ضائع ہوجانا کیا بعید ہے؟ دوسرے مقامات میں عام طور پر یہ واقعہ اس لیے بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا کہ یہ واقعہ آنی طور پر ہوا تھا اور صرف انھیں لوگوں کے لیے تھا جنھوں نے اس کا مطالبہ کیا تھا، ان کے لیے ایک منٹ کا وقت بھی بہت تھا۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت النبی جلد سوئم میں اس واقعہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نشانی محض اہل مکہ کے لیے ظاہر کی تھی اس لیے تمام دنیا میں اس کے ظہور کی حاجت نہ تھی اس بنا پر اگر بالفرض دنیا کے دوسرے حصوں میں چاند کو شق ہوتے ہوئے نہ دیکھا گیا ہو تو یہ کوئی تعجب کی

بات نہ تھی، بلکہ مکہ کے علاوہ دوسرے ملکوں اور شہروں میں اس کا نظر نہ آنا ہی مصلحت الٰہی تھی۔ کیونکہ اگر یہ دنیا بھر کے لوگوں کو عام طور سے نظر آتا تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ بھی آسمان کے طبعی انقلابات سے ایک انقلاب تھا اور عام فلکی تغیرات سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا، مگر جب اہل مکہ کے علاوہ جو اور لوگ شہر مکہ میں تھے یا باہر سفر میں تھے صرف انھیں کو نظر آیا تو یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ صرف آں حضرت صلعم کے ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا تھا۔"

اس واقعہ پر علمی اور عقلی اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ چونکہ اجرام فلکی میں شکست و ریخت ناممکن ہے اس لیے چاند کا شق ہونا بھی محال ہے مگر یہ اعتراض پرانے زمانہ کی بات ہے جب علماء فلکیات کا علم محدود تھا اب ان کا یہ دعویٰ ہی غلط ثابت ہو چکا ہے کہ اجرام فلکی میں شکست و ریخت ناممکن اور محال ہے۔ امانول ولیکا فکی نے اپنی کتاب " ورلڈز ان کولائزن" میں تاریخی حوالوں کے ساتھ بڑے بڑے اجرام فلکی کے شکست و ریخت اور تصادم کے متعدد حادثوں کا ذکر کیا ہے حتی کہ سورج کے رخ بدلنے کے کم از کم ایک واقعہ کو بھی عین ممکن بتایا ہے[1]

شق القمر کے معجزہ کے وقوع سے متعلق ہندو بھائیوں کے لیے اس علمی اور عقلی بحث کی ضرورت نہ تھی، انھوں نے اوتاروں کے متعلق جو واقعاتی شواہد پیش کیے ہیں خود ان کی حیثیت روایاتی اور منقولی سے زیادہ نہیں ہے۔ ان شواہد کے علاوہ ان کے پران ایسے ہی عجیب و غریب واقعات سے بھرے ہوئے ہیں پھر وہ شق القمر پر سائنسی تجربی اور عقلی حیثیت سے کوئی اعتراض کر سکتے ہیں؟ میں نے یہ بحث آج کل کے عقل پرستوں کے پیش نظر لکھ دی ہے۔

تکمیل موضوع کے لیے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایک معجزہ کافی ہے۔ مزید معجزات کا پیش کرنا اس وقت مناسب ہوگا جب یہ مقالہ ہندی میں کتابی صورت میں شائع ہو سکے گا۔ آں حضرت صلعم کا یہی ایک معجزہ ان تمام واقعات پر بھاری ہے جو اوتار کے شواہد میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اب ہندو علماء غور فرمائیں کہ وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا قرار دیں گے؟ اوتار یا رسول؟ ہم بہرحال حضور کو رسول ہی مانیں گے۔ دشواری جو کچھ ہے ہندو علماء کے لیے ہے، ان کے لیے بھی صحیح صورت یہی ہے کہ وہ عقیدۂ اوتار کو عقیدۂ رسالت ہی کی بدلی ہوئی صورت مانیں اور ہمارے نزدیک اصل و حقیقت یہی ہے جو اب تک کی بحث کے نتیجے میں بے نقاب ہو کر

[1] یہ حصۂ مضمون ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم اے پی ایچ ڈی کی "کتاب مقالات سیرت" کے مقالہ معجزے سے ماخوذ ہے۔ موصوف نے معجزات کے وقوع پر سائنس، فلسفہ، تاریخ اور مذہب ہر پہلو سے عالمانہ بحث کی ہے۔

سامنے آگئی ہے۔

آخر میں اس سلسلے کی ایک اور حقیقت کا واضح کر دینا ضروری ہے۔ ہندو دھرم میں رسالت کا عقیدہ مشتبہ کیوں ہوگیا؟ اس کی نسبت ہم تحقیق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کا ایک سبب تو زمانے کا امتداد معلوم ہوتا ہے اور دوسرا سبب عقیدت میں غلو۔ امتداد زمانہ کے باعث حقیقتیں مشتبہ مسخ اور گم ہوجایا کرتی ہیں۔ خوش عقیدگی میں غلو بھی حقیقت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے جناب بدھ کے پیروؤں کی خوش عقیدگی کے غلو ہی کا نتیجہ ہے جو بدھ جی الشہد کا مظہر اور اوتار مان لیے گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا گیا۔ لیکن مسلمانوں میں رسالت کا عقیدہ اصل صورت میں کیسے محفوظ ہے؟ یہاں آتی روشنی کیوں ہے کہ اس میں کوئی چیز مشتبہ اور گم نہیں ہونے پاتی؟ بلکہ مشتبہ اور گم چیزیں بھی یہاں اصلی اور واضح صورت میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی وجہ ہے قرآن مجید کی روشنی اور بے لوث تعلیم۔ قرآن مجید نے رسولوں کی نسبت صاف صاف کہدیا کہ ان میں نہ خدا کا کوئی جز تھا اور نہ وہ غیر انسانی مخلوق تھے۔ وہ انسان تھے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:-

قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ	کہدو میں بھی تمہی جیسا انسان ہوں۔ ہاں
الیٰ انما الٰھکم الٰہ واحد فاستقیموا	مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود خدائے واحد ہے
الیہ واستغفروہ وویل	پس اسی کی جانب متوجہ رہو اور اسی سے مغفرت مانگو
للمشرکین۔ (حم سجدہ آیت ۶)	اور (سمجھ لوکہ) مشرکوں کے لیے خرابی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے۔

ان مثل عیسیٰ عند اللہ	عیسیٰؑ کا حال خدا کے نزدیک آدم کے حال
کمثل آدم خلقہ من تراب ثم	کا سا ہے۔ (پہلے) مٹی سے ان کا قالب بنایا پھر
قال لہ کن فیکون ۞	فرمایا کہ (انسان) ہو جا اور وہ ہو گئے۔

ایک اور مقام پر ان کے متعلق ہے۔

ما کان للہ ان یتخذ من ولد	خدا کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا
سبحٰنہ (مریم آیت ۳۵)	بنائے۔ اس کی ذات ایسی باتوں سے پاک ہے

معجزات کے بارے میں قرآن نے یہ بات صاف کردی ہے کہ کسی پیغمبر نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ معجزات کا ظہور کرنا

ان کی قدرت اور ان کے اختیار کی بات ہے، یا ان سے جس معجزے کا وقوع ہوا وہ ان کے ذاتی کمال کا نتیجہ ہے ۔ قرآن کا ہر مطالعہ کرنے والا کھلے لفظوں میں دیکھ سکتا ہے کہ جس رسول سے بھی جو معجزہ صادر ہوا جس میں بھی جو کمال موجود تھا اس نے یہی کہا کہ اس کا ظہور خدا کی قدرت سے ہوا یا اس کا عطیہ ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا گیا اور وہ ان کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن گئی تو قرآن اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمال کا نتیجہ قرار نہیں دیتا ۔ قرآن میں خدا کا ارشاد منقول ہے ۔

قلنا یا نار کونی بردا و سلاما علی ابراہیم — ہم نے حکم دیا کہ اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے اژدہا بنکر ساحران مصر کے سانپوں کو نگل لیا تو قرآن یہ نہیں کہتا کہ وہ موسیٰ کا کمال تھا ۔ کہتا ہے خدا نے فرمایا

وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِکَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا (طٰہٰ، آیت ۶۹) — تمہارے دائیں ہاتھ میں جو عصا ہے اسے پھینک دو ۔ ساحروں نے جو کرشمہ سازی کی ہے وہ اس کو نگل جائے گا ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہ میں سمندر حائل ہوا اور حضرت موسیٰ کے عصا کی ضرب سے سمندر میں راستہ بن گیا تو خدا نے اس واقعہ کا انتساب بھی اپنی ہی جانب فرمایا ہے ۔

فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاکَ الْبَحْرَ (سورۂ شعرا) — ہم نے کہا موسیٰ اپنے عصا کو سمندر پر مارو ۔

جب بنی اسرائیل صحرائے سینا میں پہنچے جہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ضرب سے پتھر کی چٹان سے بارہ چشمے جاری ہوگئے تو اس کے متعلق بھی خدا فرماتا ہے

فقلنا اضرب بعصاک الحجر (بقرہ) — ہم نے کہا اپنے عصا کو پتھر پر مارو

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی کے پرند بناتے اور اس میں پھونک مارتے، وہ سچ مچ کا پرند بن جاتا، وہ اندھوں اور کوڑھیوں کو تندرست کر دیتے ۔ مُردوں کو زندہ کر دیتے لیکن قرآن میں خود ان کا قول منقول ہے ۔

انی قد جئتکم بآیۃ من ربکم (آل عمران) — میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لیکر آیا ہوں

یعنی ان کے تمام اعجازات خدا کا عطیہ ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے کہتے ہیں:۔

واحی الموتیٰ باذن اللہ — میں خدا کے حکم سے مُردے کو جلاتا ہوں۔

شق القمر کے واقعہ کا قرآن مجید میں اس طرح ذکر آیا ہے:۔

اقتربت الساعۃ وانشق القمر	قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا
وان یروا ایۃ یعرضوا ویقولوا	اور کفار اگر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس سے
سحر مستمر وکذبوا	اعراض ہی کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو ہمیشہ سے
واتبعوا اھواءھم وکل امر	چلا آتا ہوا سحر ہے اور انھوں نے (یہی کیا کہ) جھٹلایا
مستقر	اور اپنی خواہشوں کے پیچھے چلے اور (ان کے سامنے
القمر	نتیجہ آکر رہے گا) ہر کا وقت مقرر ہے۔

ویسے تو قرآن مجید عقیدۂ رسالت کے تاریخی اور عقلی دلائل و شواہد سے بھرا ہوا ہے ہی۔ صرف معجزات سے متعلق قرآن مجید کے بیانات اور ان کے اسلوب پر غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ عقیدۂ رسالت ہی حق اور مذہب و عقل کے مطابق ہے اور قرآن مجید میں جتنے رسولوں کا ذکر ہے وہ خدا کے سچے رسول تھے، خدا خود نہیں آیا، اس نے اپنے رسول ہی بھیجے۔ اگر خدا خود آتا ہوتا تو جس طرح اس کے رسول ہر ملک اور ہر قوم میں آئے وہ بھی ہر ملک اور ہر قوم میں آتا، لیکن وہ کبھی کسی ملک و قوم میں نہیں آیا، نہ کہیں اور خدا کے خود آنے کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ جہاں بھی آئے اس کے رسول ہی آئے اور اوتار کے جو مقاصد بتائے جاتے ہیں یعنی دھرم کے زوال کے بعد اس کا ازسرنو احیاء اور دھرمیوں اور ظالموں کا استیصال وہ خدا کے رسولوں کے ذریعہ پورا ہوا۔ تمام دنیا کی انسانی اور سچے مذاہب کی تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ ہندوستان میں بھی خود خدا نہیں آیا۔ اس کے رسول ہی آئے ہوں گے اور ناممکن نہیں کہ شری رام چندر اور شری کرشن جی اپنے اپنے زمانے کے رسول رہے ہوں یا سچے دین کے مجدد۔

اگرچہ ابھی ہندو علماء نے عقیدۂ رسالت اور اوتار پر پوری طرح غور نہیں کیا ہے ورنہ وہ بھی مجھ سے متفق ہوتے۔ پھر بھی بعض علماء کے قلم سے از خود ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں کہ عقیدۂ اوتار عقیدۂ رسالت کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ہندی ماہنامہ "گورکھپور" رام نگر بنارس ایک خالص مذہبی رسالہ ہے اس کے لکھنے والے بھی سناتن دھرمی علماء ہیں جو اوتار کے عقیدے کے قائل ہیں۔ اس کے مضمون نگاروں میں شری پنڈت سیتا رام جی دیویدی سمن ونی ویدا اور سنسکرت کے اچھے عالم ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

"اس سمے سنسار میں دھرم نام پر انیک سمپردائے ہیں۔ اور ہر ایک سامپردائک دھرم کے سنستھاپک اوتارک پرش، سنت، اتھوا پیغمبر آدمی ہیں۔ یہ ناموں کا بھید ہے۔ یہ لوگ دیش، کال، ایوم پرستھتی آدمی کے انوکول منشوں کو سدھارنے کے ابھپرائے سے آئے تھے اور یتھوچت کاریہ کرکے چلے بھی گئے۔ سنسار میں مسلمانوں کا ایک برہد سموداے ہے اور اس سموداے کے سنستھاپکوں کو پیغمبر کی سنگیا پراپت ہے۔ بدپی پوتر قرآن کا اودیہ پیغمبر محمدؐ پر ہوا۔ پھر بھی مسلمانوں نے ان کے پوروکامی پیغمبروں جیسے موسیٰ اور عیسیٰ کو اسیویکار نہیں کیا۔

(گورکھپور جون ۱۹۶۱ء)

چونکہ یہ اقتباس بطور سند پیش کیا گیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اصل الفاظ دے دیے جائیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

اس وقت دنیا میں مذہب کے نام سے بہت سی ملتیں ہیں اور ہر ملی مذہب کے قائم کرنے والے اوتاری بزرگ سنت یا پیغمبر ہیں۔ یہ ناموں کا اختلاف ہے (یعنی ان کی حقیقت ایک ہے) یہ حضرات ملک، زمانہ اور ماحول وغیرہ کے مطابق انسانوں کی اصلاح کے مقصد سے آئے تھے اور حسب ضرورت اپنا فرض انجام دے کر چلے بھی گئے۔ دنیا میں مسلمانوں کی ایک وسیع ملت ہے اور اس ملت کے بانیوں کو پیغمبر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک کا نزول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا۔ پھر بھی مسلمانوں نے آپ سے پہلے گذرے ہوئے پیغمبروں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا انکار نہیں کیا۔"

اوتار اور رسالت کے ایک ہونے کی اس سے زیادہ صراحت و وضاحت اور کیا چاہیے۔ اوتاروں سے متعلق شری کرشن جی کے مشہور قول میں اوتاروں کا جو مقصد ظہور بتایا گیا ہے شری سمپورنانند جی نے وہی مقصد پیغمبروں کی رسالت کا بھی بتایا ہے اس سے بات بالکل صاف ہوگئی۔

تمام شد

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی۔

۲۔ رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ غیر فروخت شدہ رسائل واپس نہیں لیے جائیں گے۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا البتہ ۵۰ یا زائد رسائل کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی دیا جائے گا۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا

۵۔ رقم پیشگی آنی چاہیے یا رسائل بذریعہ وی پی روانہ کرنے کی اجازت دی جائے۔

منیجر ماہنامہ "زندگی" رامپور یوپی

انسانی جبلتوں کی تہذیب و تحسین

(جناب محمد فاروق صاحب اعظمی)

انسان دنیا میں قدم رکھتا ہے تو وہ ایک غیر تربیت یافتہ شکل (Un - Developed form) میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ضرور تمند وجود لیکر دنیا میں آتا ہے۔ اس کی کامیابی کا سارا راز اس بات میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ وہ کہاں تک اپنے فطری مطالبات کو دنیا کی زندگی میں پورا کرسکا۔ انسانی تقاضے اور مطالبے انسانی فطرت کا خاصہ ہیں۔ زندگی کی قدر و قیمت کا صحیح احساس آدمی کو اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہو اور زندگی کے فطری مطالبات کو سمجھتا ہو اس کے بغیر نہ وہ زندگی کی قدر و قیمت کو پہچان سکتا ہے نہ اس کے اعمال و کردار میں کبھی پختگی اور یک رنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جب تک آدمی کے یہاں فکر و نظر کی وسعت نہ پائی جائے زندگی کی پہچان ممکن نہیں۔ تہذیب انسانی کے بنیادی مسائل میں انسانی جبلتوں کا مطالعہ اور ان کی تہذیب و تزکیہ کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انسانی معاشرے کا ارتقاء اور تہذیب و تمدن کی ترقی انسانی جبلت کے ترفع و تربیت ہی سے وابستہ ہے۔

اخلاقی و روحانی قدروں کو حاصل کیے بغیر انسانی جبلت کی تہذیب و تحسین ممکن نہیں۔ جبلتوں کی تربیت، ارتفاع اور تہذیب ہی سے انسان کے اخلاقی وجود کا ظہور ہوتا ہے۔ وحشی کو وحشی اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے یہاں محرکات حیات (Motives) یا جبلتیں (Instincts) غیر تربیت یافتہ شکل میں اپنا کام کرتی ہیں۔

بربریت اور تہذیب میں مشرقین کا فرق ہے۔ وحشی اپنے جذبات کی ماہیت اور ان کے اسباب سے قطعاً ناواقف ہوتا ہے ان کی غرض و غایت سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اسے تو صرف جوش کی شدت اور جذبات کے ہیجان سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ حسیات و اعمال کو غور و فکر پر ترجیح دیتا ہے۔ جو چیزیں رفعتوں کی حامل ہیں اس کی زندگی ان سے ناآشنا ہوتی ہے۔ وہ صرف قریبی مفاد کو پہچانتا ہے۔ ماضی و استقبال اس کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ جوش و جذبات کے وجود اور ان کی فراوانی کو وہ کافی جانتا ہے۔ وہ صرف اپنی فطری

خواہشات اور وقتی جذبات کی فوری تسکین و تکمیل کے درپے ہوتا ہے۔ اپنی فطری خواہشات کی قدر و قیمت کا اسے احساس نہیں ہوتا۔ اسے کبھی کوئی دماغی اور روحانی ضرورت نہیں ستاتی نہ اسے اپنی انفرادی زندگی اور حیات انسانی کی غرض و غایت کے سمجھنے کی کوئی فکر ہوتی ہے انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی دونوں کے تصور میں اس کی نگاہ صرف جزئیات کے حسن کو دیکھتی ہے۔ کل کے حسن و تکمیل کا اسے ادراک نہیں ہوتا۔

اس کے برخلاف ایک تہذیب یافتہ انسان کی نظر ان چیزوں کی جویا ہوتی ہے جو رفعتوں کی حامل ہیں۔ جو اپنے اندر ہمارے ذہن و دماغ کی تسکین کا سامان لیے ہوتی ہیں۔ وہ ان کا قدر دان ہوتا ہے اور انھیں پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے اندر جذبات و احساسات کے وجود کو کافی نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے فطری داعیات اور جذبات کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کی یہ پہلی ذمہ داری ہے جسے وہ اچھی طرح محسوس کرتا ہے۔ اپنے جذبات و خیالات کے تزکیہ کی اسے فکر ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تہذیب و تزکیہ کے بغیر اس کے احساسات کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مقصد اور حیات انسانی کی غرض و غایت سے واقف ہوتا ہے۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی دونوں کے تصور میں جزئیات کے بجائے اس کی نظر کل پر ہوتی ہے۔ اس لیے اسے سکون و طمانیت زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ حسن یا حقیقت جمیل اس کے لیے صرف کسی جذباتی کیفیت کا نام نہیں ہوتا بلکہ یہ حقیقت اس کی روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ حسن اس کے لیے زندگی کی عام حقیقتوں میں شامل ہوتا ہے۔

اوپر جو اصولی اور بنیادی بات آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اسے اپنے پیش نظر رکھ کر اگر آپ آج کی نام نہاد مہذب دنیا پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اس "مہذب دنیا" میں بربریت اور وحشت کی کارفرمائی پورے شباب پر ہے۔ جب تک کہ انسان کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مقصد تک رسائی حاصل نہ ہو جب تک اسے اپنے جذبات و احساسات کی ماہیت اور ان کی غرض و غایت کا علم نہ ہو، وحشت اور بربریت سے وہ کبھی نجات نہیں پا سکتا۔ غور و فکر سے کام لینے اور اپنے فطری مطالبات و خواہشات کا تزکیہ کرنے کے بجائے انسان اگر فوری اور وقتی جذبات کی پرستش میں لگ جاتا ہے تو اس سے کسی پائدار اور مستحکم تہذیب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جس تہذیب کی بنیاد حیوانی اور مادی عناصر پر قائم ہو اس کی کچھ بھی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔ کسی مستحکم اور اعلا تہذیب کا وجود اس وقت ممکن ہے جب کہ ہمیں زندگی کی حقیقی قدروں کا علم حاصل ہو۔ ہم زندگی کے اصل مقصد سے نہ صرف یہ کہ واقف ہوں بلکہ اس کے حصول کے لیے سرگرم کار بھی ہوں۔

George post moore نے لکھا ہے :-

تہذیب کی نشو ونما صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کسی مقصد کے حصول کے لیے سعی وجہد کرے۔ اس قسم کا اتحاد محض وحدت تصورات (Unity of bare ideas) کی بنا پر قائم نہیں ہوتا یہ اتحاد وحدت جذبات واحساسات سے ممکن ہے۔ جن سے تصورات کو جذباتی تحریک ملتی ہے اور وہ تصورات تصورات نہیں رہتے بلکہ معتقدات اور مقاصد بن جاتے ہیں[1]

معتقدات اور مقاصد یقین سے حاصل ہوتے ہیں اور یقین کی بنا زندگی کی مستقل قدروں ہی پر قائم ہوتی ہے۔ میکانی نظریۂ حیات کو مستقل قدروں کے وجود ہی سے انکار ہے اس لیے اس کی دنیا میں یقین کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ مادیت کا لازمی نتیجہ بے یقینی اور تشکیک ہے ظاہر ہے ریب وتشکیک پر کسی تہذیب کی عمارت نہیں کھڑی کی جاسکتی۔ مادہ پرستوں نے انسان کو اس کے اصل مرتبہ سے صد درجہ نیچے گرا دیا ہے۔ انسان کی حیثیت گوشت پوست کے ایک ڈھانچے سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے حالانکہ انسان محض خاک کا کوئی ڈھیر نہ تھا اس کی فطرت میں ایک ایسی چیز بھی سموئی گئی تھی جو اسے پستی سے اٹھا کر بلندی پر لے جاسکتی تھی۔ آج انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک مہذب انسان کس طرح بن سکے۔ اپنی تہذیبی اور تمدنی زندگی کے لیے حقیقی بنیادیں فراہم کرنے وہ کہاں جائے۔

جب ہم سچی طلب کے ساتھ قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر زندگی کی راہیں کھلتی ہیں۔ ہماری فطرت کو اپنے مطالبات کا جواب ملتا ہے ہمیں انسانی زندگی کی غرض وغایت کا علم حاصل ہوتا ہے اور ہمارے لیے اپنی جبلتوں کی تہذیب وتکمیل کا سامان فراہم ہوجاتا ہے

قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے :-

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًاۙ	بلاشبہ انسان بے صبر واقع ہوا ہے جب اسے
اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًاۙ وَّاِذَا	تکلیف پہنچتی ہے تو بے صبری اختیار کرتا ہے اور جب
مَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعًاۙ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَۙ	اسے فارغ البالی یا اطمینان حاصل ہوتا ہے تو اگر ص
الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآىٕمُوْنَۙ	اور تنگ نظری کی وجہ سے بخل اختیار کرنے لگتا
وَالَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌۙ ص	ہو۔ مگر وہ نماز پڑھنے والے (ایسا نہیں کرتے) جو اپنی

---

[1] دیکھئے J. H. Denison کی کتاب Emotion as the basis of civilization کا مقدمہ

لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ وَالَّذِينَ
يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ وَالَّذِينَ
هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ۝
إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝
إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝
فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْعَادُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ
لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝
أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُكْرَمُونَ ۝ (۷۰، ۲۳-۳۴)

نماز پر برابر توجہ رکھتے ہیں۔ جن کے مالوں میں
سوالی اور بے سوالی سب کا حق ہے۔ جو یوم جزا
کی تصدیق کرتے ہیں، جو اپنے رب کے عذاب سے
ڈرتے ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب بے خوف
ہونے کی چیز نہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت
کرتے ہیں۔ علاوہ اپنی بیویوں یا لونڈیوں کے۔
کیونکہ اس میں وہ ملامت کے مستحق نہیں قرار پاتے
البتہ جو اس کے علاوہ کا طالب ہوا ایسے لوگ حدود
سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ جو اپنی (اسپردگی میں
لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھتے ہیں
جو اپنی شہادتوں کو ٹھیک ادا کرتے ہیں اور جو
اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ایسے لوگ بہشتوں
میں عزت سے داخل ہوں گے۔

قرآن کے اس ٹکڑے میں انسان کی اصل کمزوری کا اظہار کیا گیا ہے جو تمام بگاڑ کی جڑ اور بنیاد ہے پھر اس بات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ انسان کی وہ کمزوری کس طرح دور ہو سکتی ہے

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝　　انسان بے صبرا واقع ہوا ہے۔

بے صبری کسی تہذیب کی علامت نہیں ہوتی اس کا رشتہ وحشت اور بربریت سے جا کر ملتا ہے۔ ان آیتوں میں انسان کی بے صبری کی ایک واضح مثال یہ پیش کی گئی ہے کہ جب اسے کوئی تکلیف یا مصیبت پہنچتی ہے تو بے اختیار ہو کر اس طرح چلانے لگتا ہے گویا وہ ایک ایسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے جس سے نجات کی کوئی سبیل نہیں۔ لیکن جب اسے فارغ البالی اور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے تو اپنی مصیبتوں کو وہ بالکل بھول جاتا ہے پھر تو دادِ عیش دینا ہی دنیا میں اس کے لیے ایک کام رہ جاتا ہے[1]۔ زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنے کی فکر ہوتی ہے۔ اسے سماج اور سماجی

---

[1] اسی حقیقت کا اظہار ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

فلاح و بہبود کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے آرام و راحت کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے آرام و اطمینان میں اس کے لیے کوئی راحت کا سامان نہیں ہوتا۔ یہ بربریت کی بدترین مثال ہے۔ اس وحشت اور بربریت کے عناصر سے صرف ان لوگوں کی زندگیاں پاک ہوتی ہیں جو بربریت کے قلمرو سے نکل کر تہذیب کی دنیا میں آبستے ہیں وہ اپنی مہذب زندگی کی نئی ضرورتوں کے لیے نئے ساز و سامان فراہم کیے ہوتے ہیں۔ وہ غور و فکر سے کام لینے والے ہوتے ہیں۔ ان کے جو اوصاف مذکورہ بالا آیات میں بیان ہوئے ہیں وہ اعلیٰ تہذیب کی علامت ہیں۔ ان سے اس کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ تہذیب کی مستحکم بنیادوں پر ان کی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔

انھیں اپنی زندگی کی غرض و غایت کا علم ہوتا ہے وہ توحید و آخرت پر جو کائنات زندگی کی عظیم حقیقتیں ہیں ایمان رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے رب کے پاس حاضر ہونے کا پورا احساس ہوتا ہے۔ اپنے رب کی مرضیات سے ان کی زندگی پوری طرح ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اپنے رب کی پکڑ کا خیال انھیں بے چین رکھتا ہے۔ وہ اپنی فطری خواہشوں کو ضابطہ اور حدود کے اندر رہ کر پورا کرتے ہیں تاکہ دوسروں کے حقوق پامال نہ ہوسکیں۔ انھیں دوسرے انسانوں سے پوری طرح ہمدردی ہوتی ہے اپنے مال میں وہ دوسروں کا حق جانتے ہیں۔ جزو سے زیادہ ان کی نظر 'محاسن کل' پر ہوتی ہے۔ انھیں اپنے مستقبل کی فکر ہوتی ہے۔ وہ حیات انسانی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ آگاہ راز ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی زندگی کی امتیازی شان ان کی نمازوں سے عیاں ہوتی ہے۔ نماز ہی ان کی زندگی کا اوّل بھی ہے اور آخر بھی۔ یہی نماز ان کی زندگی میں جذباتی و دماغی توازن کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس پر مداومت اختیار کرنے اور اس کے آداب کے پاس و لحاظ میں ان کی زندگی کے حسن و جمال کا سارا راز مضمر ہوتا ہے اور انھیں اس کا پورا احساس ہوتا ہے۔

(پچھلے صفحہ کے حاشیہ کا بقیہ) وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي ۚ إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ۝ (ہود: ۱۰)

جب ہم انسان کو تکلیف کے بعد آرام و راحت عطا کرتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوتا ہے اور فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اب مصیبت کے دن مجھ سے ٹل گئے۔ وہ عیش و آرام کے وقت اپنے مصیبت کے دنوں کو بھلا دیتا ہے۔ اس کی زندگی بے فکری اور بے اعتنائی کی زندگی ہوجاتی ہے۔

اس مختصر سے اشارے سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قرآن اپنے اندر ہمارے مسائل کا فطری اور صحیح ترین حل رکھتا ہے۔ اس کے اندر ہمارے دل و دماغ کی تشفی کا پورا سامان موجود ہے۔ ہماری علمی سطح کتنی ہی بلند ہو جائے ہمارے مسائل کتنے ہی پیچیدہ ہو جائیں۔ قرآن ہماری رہنمائی کے لیے کافی ثابت ہوتا رہے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم قرآن پر صحیح معنوں میں ایمان لائیں اور اس کے پیش کردہ حلوں کو اپنی زندگی میں برتیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی زندگی کو اخلاقی اور روحانی قدریں صرف مذہب سے مل سکتی ہیں۔ ہماری زندگی میں معنویت پیدا ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ مذہب محدود معنی میں مذہب نہ ہو بلکہ صحیح معنوں میں انسانی زندگی کا ترجمان ہو۔ سچا مذہب وہی ہو سکتا ہے جو صرف عقیدہ ہی کو سعادت کا ذریعہ قرار نہ دیتا ہو بلکہ عمل کے ذریعہ زندگی کی تشکیل بھی کرتا ہو۔ مذہب ہمیں تنگ نظری کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ ہمیں زندگی کے تنگ دائرے سے نکال کر فکر و نظر کی ایک وسیع دنیا میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں انسان کو زندگی کے لامحدود امکانات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جہاں ذہن و فکر کی تنگ دامانی دور ہو چکی ہوتی ہے۔ جہاں زندگی کے ایسے راز اس پر کھلتے ہیں جن کی رفعتوں اور وسعتوں کا اندازہ کسی ایسے شخص کے لیے ممکن ہی نہیں جو زندگی کے محض ظاہر کا پرستار ہو۔

روحانی اور اخلاقی نظریات کے بغیر انسان صحیح معنوں میں کبھی تہذیب آشنا نہیں ہوتا۔ پروفیسر وہائٹ ہیڈ (Pr. Whitehead.) کو شدید احساس ہے کہ ان روحانی اور اخلاقی حقیقتوں کے حصول کے بغیر جن کا تعلق مابعد الطبعیات سے ہے کسی تہذیب کا وجود ممکن نہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

> "مابعد الطبعیات کے بارے میں ہمارا علم بہت تھوڑا سطحی اور نامکمل ہے۔ تمام خرابیوں کی اصل وجہ یہی ہے۔ مابعد الطبعیات کے متعلق صحیح علم و فہم ہی سے انسانی عقل کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اور مقصد حیات کا تعین ہوتا ہے۔ مابعد الطبعیاتی معتقدات کے بغیر کوئی تہذیب باقی نہیں رہ سکتی"
>
> Adventure of Ideas. P. 164)

پرنسپل کیرڈ نے لکھا ہے :۔

> "ایک شخص ایثار سے کام لیکر خود کو خاندان، مملکت یا تمام نوع انسانی کی طبعی زندگی میں ضم کر سکتا ہے (تاکہ خاندان، مملکت اور انسانی سوسائٹی کی تکمیل ممکن ہو سکے۔ لیکن یہ زندگی خود غیر مکمل ہوتی ہے۔ (اس کی ذات خود تکمیل کی محتاج ہوتی ہے[1]) اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس حقیقت پر

---

[1] اس سے کسی خاندان یا سوسائٹی کی تکمیل کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

ایمان رکھے کہ اس طبعی زندگی سے ماوراء ایک اور زندگی ہے۔ نیچر، تاریخ سب اسی زندگی کے مظاہر ہیں وہی زندگی اصل مقصود ہے۔"

(Introduction To the Philosophy of Religion)

انسانی جبلت کی تہذیب و تزکیے کے بغیر نہ زندگی میں وسعت، بلندی اور گہرائی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ کسی مستحکم اور پائدار تہذیب و تمدن کا وجود ممکن ہے۔ اور ہم انسانی جبلتوں کی تہذیب و تزکیہ کا تصور نہیں کر سکتے جب تک کہ انسان کی زندگی کو ان قدروں سے وابستہ نہ کیا جائے جو روحانی اور اخلاقی قدریں ہیں۔

اقامتِ دین کا محرّک

یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ اقامت دین کی جو جد و جہد ہو رہی ہے اس کا محرک اور اصل مقصود کیا ہے؟ یہ بات صراط مستقیم پر زندگی کے آخری لمحے تک قائم رہنے کے لیے اشد ضروری ہے اگر کچھ لوگ تحریک اسلامی کی طرف اس لیے لپکتے ہیں کہ اسلامی نظام دوسرے نظاموں کے مقابلے میں بہتر طور پر دنیا کے مسائل حل کرتا ہے لہٰذا اسی کو دنیا میں نافذ ہونا چاہیے۔ یہی داعیہ انہیں متحرک کرتا ہے اور وہ اس جد و جہد میں شریک ہو جاتے ہیں ـــــ اسلام بے شک ایسا نظام ہے جس سے بہتر کوئی نظام نہیں ہو سکتا لیکن جد و جہد کا یہ محرک غلط ہے۔ اس بات کا بہت اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ حالات کی ناسازگاری اور ماحول کی سختی کی وجہ سے گھبرا کر مایوس ہو جائیں۔ ان کی سرگرمیاں سرد پڑ جائیں اور وہ راستے ہی سے پلٹ جائیں

یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے وہ ایسے ذرائع اور ایسی تدابیر اختیار کر لیں جن کی اجازت دین میں نہ ہو اور وہ اپنی تدابیر کو تاویل کی خراد پر چڑھا کر بالکل درست ثابت کرنے لگیں اس طرح وہ تحریک کو غلط راستے کی طرف موڑ دیں۔ اس لیے اقامت دین کی جد و جہد کا محرک دراصل ہدف مقصود آخرت کی کامیابی اور رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے۔ یہ ایسا محرک ہے جو انسان کو مایوسی، کج روی اور حصول دنیا کے لیے مسابقت سے بچاتا اور زندگی کے آخری لمحے تک اسے سرگرم عمل رکھتا ہے۔ دنیا اور آخرت کی فلاح ایسے ہی لوگوں کے لیے مقدر ہے۔

جذباتی یک جہتی

(جناب اکرام الدین احمد صاحب الہ آباد)

جذباتی یک جہتی کمیٹی نے ڈاکٹر سمپورنانند جی کی صدارت میں ایک سوالیہ جاری کیا ہے تاکہ اس سلسلے میں عوام کی رائے حاصل کی جائے۔ ذیل کا مضمون اس سوالیہ کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

ہے کے اجزاء یہ ہیں:-

(۱) ہماری قومی زندگی کے اندر علیحدگی پسندی کے وہ کون سے رجحانات ہیں جو ہمارے ملک کے اتحاد کو برہم نے ہیں؟ ان کے کیا اسباب ہیں؟

(۲) جذباتی یکجہتی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ملک کے مختلف تہذیبی ورثہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ الاختلاف تہذیب میں کیا بنیادی اتحاد پاتے ہیں جس کی بنا پر ہم کو خالص ہندستانی سمجھا جائے۔ ان ت کو تقویت پہنچانے کے لیے آپ کیا تجویز پیش کرتے ہیں۔

(۳) آپ کی رائے میں ملک کی جذباتی یکجہتی کو مضبوط بنانے کے لیے تعلیم کیا کردار پیش کر سکتی ہے

قومی انتشار کے اسباب

سوالیہ کے پہلے جزو سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جبکہ یہاں کے وں میں جذباتی یکجہتی تھی اور ان میں ایک قوم ہونے کا احساس تھا لیکن بعد میں ان کے اندر کچھ ایسے رجحانات گئے کہ قوم کی جذباتی یکجہتی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ یہ بات ہمیں تاریخ سے نہیں معلوم ہوتی۔ تاریخ ، یہ بتاتی ہے کہ بھارت میں کبھی کوئی ایسا زمانہ آیا ہی نہیں جبکہ یہاں کے باشندوں میں دلی یک جہتی اور ی پائی گئی ہو۔ اس تاریخی حقیقت کے پیش نظر سوال یہ ہونا چاہیے کہ وہ کون سے رجحانات ہیں جو متحدہ قومیت یل میں سد راہ ہیں۔ بہر حال سوال کے الفاظ جیسے بھی ہوں ہمیں ان رجحانات کا پتہ لگانا ہے جو بھارت کے

شہریوں میں دلی یکجہتی پیدا نہیں ہونے دیتے ۔

علیحدگی پسندی کے رجحانات اور ان کے اسباب

بھارت کی قومی زندگی میں انتشار پیدا کرنے والے رجحانات کی تلاش میں جب ہم یہاں کی ابتدائی تاریخ سے لیکر آج تک کے قومی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے تمدن میں جیسے جیسے ترقی ہوتی گئی علیحدگی پسندی کے نئے نئے رجحانات پیدا ہوتے گئے ۔

نسلی رجحان

یہاں کی قدیم آبادی میں ہوسکتا ہے کہ جذباتی یکجہتی رہی ہو لیکن جب آرین نسل کے لوگ یہاں آئے تو انھوں نے ان قدیم باشندوں کو شمالی ہندوستان سے بے دخل کر کے دکن کی طرف نکال دیا جس سے ان قدیم باشندوں اور آرین نسل میں نفرت و بے زاری کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ حکومت کی طاقت نے اس جذبے کو صدیوں دبائے رکھا لیکن آزاد ہونے کے بعد جمہوریت کے قیام سے جب انھیں آزادی رائے اور خود اختیاری کا احساس ہوا تو وہی پرانی نفرت ابھر آئی ۔ دراوڑ کازگام کی تحریک اسی کا نتیجہ ہے ۔ آریوں کا اپنی پرانی تہذیب کے احیا کے لیے ملک کی سیاسی اور معاشی طاقت کو استعمال کرنا اس جذبۂ نفرت میں اشتعال پیدا کرتا ہے ۔ دراوڑ نسل کے لوگ آرین نسل کا سیاسی غلبہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے ۔ یہ نسلی علیحدگی کا رجحان ہے جو دراوڑوں اور آریوں کے درمیان منافرت قائم رکھنے کا بہت بڑا سبب ہے ۔

مذہبی و معاشرتی رجحان

آریوں نے چار فرقوں برہمن، چھتری، ویش اور شودروں میں تقسیم ہو کر چار مختلف النوع کام اپنے لیے مخصوص کر کے جو تمدنی زندگی شروع کی اس سے ان کے درمیان برتری اور کمتری کے اسباب پیدا ہو کر شدت اختیار کر گئے ۔ ان فرقوں کے درمیان نہ صرف یہ کہ تمدنی و معاشرتی علیحدگی پیدا ہو گئی بلکہ انھوں نے آپس میں ملنا جلنا مذہباً گناہ سمجھا اور یہ علیحدگی مذہب کا ایک اہم شعار سمجھی جانے لگی ۔ برہمنوں، چھتریوں اور ویشیوں نے شودروں کے ساتھ جو سلوک صدیوں روا رکھا اس سے ان کے اندر ان تینوں فرقوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا چلا گیا ۔ شودروں کے دل سے احساس کمتری اور برہمنوں، چھتریوں اور ویشیوں کے خلاف جذبۂ نفرت کو نکالنے کے لیے گاندھی جی آنجہانی نے اپنی زندگی وقف کر دی اور کس کس طریقے سے شودروں کو ملانے کی کوشش کی وہ اظہر من الشمس ہے لیکن یہ جذبۂ نفرت آج تک ختم نہیں ہوا ۔ ان فرقوں کے درمیان علیحدگی کا یہ جذباتی رجحان خالص مذہبی رجحان ہے ۔

مذہبی و سیاسی رجحان

خود برہمنوں، چھتریوں اور ویشیوں میں بھی کچھ ایسے امتیازی عوامل کام کر رہے ہیں

جو اگرچہ ان کے درمیان نفرت تو نہیں پیدا کرتے لیکن دلی یک جہتی بھی نہیں پیدا ہونے دیتے۔ چھتریوں کا یہ احساس ہے کہ برہمنوں اور ویشوں نے کبھی حکومت نہیں کی اور نہ ان لوگوں کا کام حکومت کرنا ہے اس لیے اس وقت ان کا سیاسی غلبہ ان کے لیے قابل برداشت نہیں ہے۔ آج کا زمانہ معاشی اور علمی زمانہ ہے۔ معاش کے میدان میں جو فرقہ پہلے ترقی پر تھا اس وقت لامحالہ انہیں کو سیاست میں غلبہ حاصل ہوگا اور ملک کی سیاست ان کے اشاروں پر چلے گی۔ علمی دنیا برہمنوں کی تھی اس لیے اس علمی زمانے میں برہمنوں کو ملکی اور غیر ملکی سیاست میں آگے بڑھنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ ان حالات میں ان کے درمیان بھی کبھی جذباتی یک جہتی پیدا نہیں ہو سکتی الّا یہ کہ ان کے دلوں میں کسی ایسی طاقت کا احساس پیدا کر دیا جائے جو ان تینوں کے لیے ایک حریف مشترک ہو اور جس کے مقابلے کے لیے آپس میں دلی اتحاد پیدا کرنا ان کی بقا کے لیے ضروری ہو۔

لسانی و صوبائی رجحان

ان نسلی، مذہبی اور معاشی رجحانات کے علاوہ علیحدگی پسندی کا ایک چوتھا رجحان بھی کام کر رہا ہے۔ بھارت کے اندر مختلف صوبوں میں نہ صرف یہ کہ معاشرتی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی بلکہ لسانی اختلافات اتنے سخت ہیں کہ کوئی صوبہ اپنی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کو حکومت کی مرکزی زبان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یوپی بہار اور مدھیہ پردیش کے علاوہ کوئی دوسرا صوبہ ہندی کو قومی زبان ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بھارت کی صوبائی تقسیم میں حکومت کی آسانی اور انتظامی معاملات کا اتنا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے جتنا ان کی زبان اور معاشرت میں اختلاف کا۔ بلکہ ان صوبوں کی تقسیم ادر معاشرتی نقطۂ نظر سے گویا ایک قدرتی تقسیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الگ الگ صوبوں میں لسانی اور معاشرتی ہم آہنگی کی بنا پر جذباتی یک جہتی پائی جاتی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے جس صوبے میں جذباتی یکجہتی جتنی مضبوط ہے اسی قدر اس کے اندر صوبائی تعصب شدید ہے یہاں تک کہ اس صوبے کے رہنے والے بھارت کے وقار کے لیے اپنے صوبے کے مفاد کو قربان نہیں کر سکتے۔ ملک کے اندر لسانی تحریکوں کا زور پکڑنا اور زبان کی بنیاد پر صوبوں کی نئی تشکیل اور ان کی مکمل آزادی کے لیے جد و جہد کرنا صوبائی تعصب کو زیادہ سے زیادہ ہوا دیتا جا رہا ہے۔ صوبائی تعصب وطن پرستی کی حد تک بڑھا ہوا ہے اس زمانے میں جذباتی یکجہتی پیدا کرنے والی سب سے بڑی طاقت وطنیت و قومیت ہیں اور ہمارے ملک میں وطنیت و قومیت کا زور صوبوں کی حد تک محدود ہے۔ صوبوں کے باہر اس کا زور بہت کم ہے۔ ایک صوبے کے رہنے والے خود کو ایک قوم سمجھتے ہیں اور اپنے صوبے کو ہی اپنا اصلی وطن سمجھ کر صرف اسی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ صوبائی

قومیت ملکی قومیت پر غالب ہے۔ بنگال کا رہنے والا یوپی کے لیڈر کو اپنا قومی اور وطنی لیڈر دل سے نہیں تسلیم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ انھیں کوئی دلی لگاؤ نہیں ہوتا۔ اس قسم کے صوبائی تعصب کی موجودگی یا ملکی وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت پیدا نہیں کی جا سکتی اور وہ بھی ایسی کہ جذباتی یکجہتی کارفرما ہو۔

مذہبی و تہذیبی بھارت کی تاریخ میں ایک زمانہ ضرور آیا تھا جبکہ اولیائے کرام و صوفیائے عظام رحمہم اللہ اجمعین نے ان علیحدگی پسندی کے رجحانات کو دلوں سے نکال کر ایک ایسی آواز پر ہندستانیوں کو مجتمع کرنا شروع کیا جو دراصل تمام انسانوں کے دل کی آواز ہے۔ اس آواز پر مجتمع ہونے والے آپس کے ان تمام روایاتی و مذہبی اختلافات کو بھول گئے جو انھیں صدیوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھے ہوئے تھے۔ ان بزرگوں کا کہنا یہ تھا کہ ساری کائنات ایک خدا کی تخلیق ہے وہ نہ صرف خالق ہے بلکہ رازق بھی ہے اور رب بھی۔ مدبر بھی ہے اور حاکمِ اعلیٰ بھی۔ اس ذات کے ساتھ جس کو جس قدر محبت ہوگی اسی قدر اس کے دل کو اطمینان اور روح کو سکون حاصل ہوگا۔ دلوں میں جس قدر خدا کا خوف ہوگا اسی قدر لوگوں میں پرہیزگاری کا جذبہ پیدا ہوگا۔ وہی اس قابل ہے کہ اس کے آگے پرستش میں سر جھکایا جائے۔ اس کے حکم کی بے چون و چرا اطاعت کی جائے دل میں اس بات کا یقین پیدا کر لیا جائے کہ اس کا جو حکم ہوگا وہ انسان اور انسانیت کی بہبود و ترقی کے لیے ہی ہوگا۔ ان بزرگوں نے لوگوں کے دلوں میں اس حقیقت کو بھی جاگزیں کیا کہ سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور پیدائشی بھائی بھائی ہیں۔ ان کے دلوں کو پھاٹنے والے رجحانات باطل اور جوڑنے والے تصورات سراسر حق ہیں۔ یہ باتیں کچھ ایسی دل کو لگنے والی تھیں اور اس مشفقانہ اور ہمدردانہ انداز میں کہی گئی تھیں کہ دلوں میں گھر کرتی چلی گئیں اور ہر نسل و فرقہ اور مذہبی و معاشرتی گروہوں سے کٹ کٹ کر لوگ ایک مسلک پر منسلک ہوتے چلے گئے۔ ایک حقیقی قوم کا وجود ہوا۔ جو اس وقت تک وسعت اختیار کرتی گئی جب تک کہ اس قوم میں خود ان بنیادی تعلیمات کے خلاف کچھ دوسرے رجحانات پیدا نہ ہونے لگے۔

بدقسمتی سے یہ قوم جس سے امید پیدا ہو گئی تھی کہ بھارت کے سارے علیحدگی پسندی کے رجحانات مٹا کر بھارت باشیوں کو اپنے آغوش میں لے لیگی انحطاط کی ایسی شکار ہوئی کہ بجائے اس کے کہ تمام فرقوں کو جوڑ کر ایک قوم بنا ڈالے، خود ایک فرقے کی حیثیت اختیار کر گئی، اور علیحدگی پسندی کے رجحانات میں ایک اور رجحان کا اضافہ کر گئی۔ جو سب سے زیادہ قوی ثابت ہوا۔ اس رجحان کو ختم کرنے والی کوئی طاقت نہیں ہو سکتی تھی سوائے اس کے کہ وہی تعلیم جس کی بنیاد پر اس قوم کی تشکیل ہوئی تھی تمام آلودگیوں سے پاک کر کے دوبارہ

پیش کی جائے۔

بنیادی تعلیمات کے دلوں سے اوجھل ہو جانے اور ان کی حقیقی تبلیغ کی عدم موجودگی سے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعصب کی ایک خلیج پیدا ہوگئی جو غیر ملکی حکمرانوں کے لیے اتنے بڑے اور وسیع ملک پر جو حقیقتاً ایک برصغیر ہے اطمینان کے ساتھ مدتوں حکمرانی کی آسانیاں بہم پہنچاتی رہی۔ اس کی وسعت و شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ انگریزوں نے بھی اسے خوب خوب ہوا دی اور پھر یہی وہ خلیج تھی جس نے ملک کے دو ٹکڑے کر دیے تقسیم کے بعد بھی مسلم و غیر مسلم تعصب ختم نہیں ہوا اور علیحدگی پسندی کے رجحانات میں سے یہ رجحان بھی موجود ہے

اس مختصر تاریخی جائزے نے ہم پر واضح کر دیا کہ ہمارے ملک میں پانچ ایسے بڑے بڑے اور زوردار عوامل ہیں جو ہماری قومی زندگی میں انتشار کے باعث ہیں اور جن کی موجودگی میں یک جہتی کا امکان نہیں۔

(۱) نسلی	قدیم باشندوں اور آریوں کے درمیان
(۲) مذہبی و معاشرتی	اونچی ذاتوں اور شودروں کے درمیان
(۳) مذہبی و سیاسی	برہمنوں، چھتریوں اور ویشوں کے درمیان
(۴) لسانی و صوبائی	مختلف صوبوں کے درمیان
(۵) مذہبی و تہذیبی	مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان

ان رجحانات کو ابھارنے والے عناصر

ان رجحانات کو ہوا دینے والے عناصر یوں تو کئی ایک ہیں جو اپنی جگہ پر برسرِ کار ہیں لیکن ایک عنصر سب پر غالب ہے جس ملک میں فرقہ بندی کے اتنے رجحانات کام کر رہے ہوں اور جذباتی حد تک شدید ہوں اس ملک میں کسی ایک یا دو فرقوں کا صاحب اختیار و اقتدار ہو جانا دوسروں کے لیے قابل برداشت کبھی نہیں ہو سکتا۔ جبکہ صاحب اقتدار گروہ سیاسی طاقت کے بل پر اپنے نظریات و خیالات دوسروں پر زبردستی ٹھونسنا چاہتا ہو۔ اگر صاحب اقتدار حضرات غیر معمولی ایثار و قربانی سے کام لیں اور ہر فرقے کے جذبات کا احترام ملحوظ خاطر رکھیں تو کم از کم اتنا ضرور ہو سکتا ہے کہ ان رجحانات کو متحرک غذا ملنا بند ہو جائیگی اور انتشار پیدا کرنے والی طاقتیں کمزور ہوتی جائیں گی۔

ملک کی ایک قومی زبان

ہمارے ملک میں جمہوری نظام قائم ہے تمام فرقوں میں اس نظام کی تبلیغ زور و شور سے کی گئی اور لوگوں کو سمجھایا گیا اور ان کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کی گئی کہ اب ملک کی حکومت میں ہر کس و ناکس کا اختیار ہے۔ تمام باشندگانِ ملک کو مکمل آزادی

ہے کہ وہ اپنے اعتقادات کے مطابق زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ان کی تہذیب ان کی زبان سب کچھ محفوظ ہے۔ اس تبلیغ کا مقصد تو یہ تھا کہ صدیوں تک غیر ملکی غلامی میں رہتے ہوئے جو پست ذہنیت اور غلامانہ مزاج پیدا ہو گیا تھا وہ دور ہو اور خود اعتمادی پیدا ہو تاکہ ملک کو دنیا کی نظروں میں اونچا مقام دینے کی سب مل کر جد و جہد کر سکیں۔ تبلیغ تو کی گئی جمہوریت کی اور سبق پڑھایا گیا خود اختیاری کا۔ ہر قسم کے تحفظات کے وعدے کیے گئے لیکن ایوان حکومت سے جو فیصلے کیے گئے وہ ان سب کے خلاف تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ پورے ملک کی سرکاری زبان ہندی ہوگی۔ جمہوریت کی کس دفعہ نے اس فیصلے کی اجازت دی؟ علمائے جمہوریت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہندی کو سرکاری حیثیت مل جانے کے بعد دوسری زبانوں کو پنپنے کا موقع نہیں مل سکتا اور ان زبانوں کے بولنے والے اپنی زبان کے لیے اگر خطرہ محسوس کریں تو حق بجانب ہوں گے۔ کسی قوم کی زبان اس کی تہذیب کا نشان ہوتی ہے۔ اس نشان کو مٹانے کی سعی دراصل اس تہذیب کو محو کرنے کی کوشش ہے اگر کوئی گروہ یا حکومت کسی قوم کی زبان کو اس کا واجبی حق دینے پر بھی تیار نہ ہو اور دوسری طرف اس سے جذباتی یک جہتی کا بھی مطالبہ کرے تو اس مطالبے کو زبردستی کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ کون ایسا ہے جسے اپنی زبان اور اپنی تہذیب پیاری نہیں ہے اور وہ ان سے جذباتی لگاؤ نہیں رکھتا؟ ایک زبان اور ایک تہذیب کو حکومتی اثر سے قائم کرنے کی کوشش کرنا یقیناً ان تمام رجحانات کو ختم کرنے کے ہم معنی ہے جن سے قومی و وطنی اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ غیر تہذیبی زبان والے اگر یہ خطرہ محسوس کریں کہ اب انھیں اپنے دوسرے ہم وطنوں کا سیاسی غلبہ برداشت کرنا پڑے گا اور اس جمہوری نظام میں بھی وہ کبھی اس قابل نہیں ہو سکتے کہ ملک کے انتظام میں حصہ لے سکیں تاوقتیکہ وہ ہندی زبان اور ہندی تہذیب نہ اپنا لیں اور اپنی تہذیب سے دست بردار نہ ہو جائیں تو بالکل قرین قیاس بات ہوگی اور انھیں کبھی اس پر مطمئن نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا خطرہ بے بنیاد ہے۔ کیا ایسی حالت میں جذباتی یک جہتی پیدا کرنے کی کوئی کوشش بار آور ہو سکتی ہے؟

تبدیلیٔ نظام

ایوان حکومت سے دوسرا فیصلہ یہ کیا گیا کہ بھارت کا نظام حیات اشتراکی ہوگا۔ پہلے اس بات پر بہت زور دیا گیا کہ اشتراکی نظام کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اشتراکی ملکوں روس اور چین وغیرہ نے اپنی اقتصادیات کو جس طریقے کو اپنا کر ترقی دی ہے وہی طریقہ بھارت میں بھی اپنایا جائے گا۔ اشتراکی فلسفے سے کوئی سروکار نہ ہوگا لیکن تدریجاً Socialistic Pattern کی گفتگو Socialistic state میں بدل گئی اور اب ملک کو پورا اشتراکی ملک بنانے کی ٹھان لی گئی۔ یہاں تک کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے یہ

تجویز منظور کرلی ہے کہ الکشن میں کانگریس کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے "سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی" بالفاظ دیگر اشتراکیت پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اس تجویز کی منظوری کے بعد سے اب کمیونسٹ حضرات روپ بدل بدل کر کانگریس میں داخل ہوتے چلے جارہے ہیں اور ہندوستان کے کمیونسٹ ہوجانے کا خطرہ بڑھتا چلا جارہا ہے۔ چونکہ اشتراکیت کا مزاج مذہبی اقدار سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے اشتراکیت اور ہندی تہذیب میں تصادم لازمی ہے۔ یہ دونوں متضاد فیصلے ہیں جو کانگریسی حکومت کی طرف سے کیے گئے ہیں جو صاف بتاتے ہیں کہ کانگریس کے اندر متضاد نظریات وخیالات رکھنے والوں میں نظریاتی کش مکش جاری ہے جو پوری قوم پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اور مذہبی اور غیر مذہبی تعصبات کے پیدا کرنے میں مدد کر رہی ہے۔ مذہبی اقدار کی حفاظت میں سرودیہ اور سوتنتر وغیرہ پارٹیاں وجود میں آگئیں ہیں۔ کانگریس جو ملک میں اتحاد کی ضامن تھی اپنے غیر حکیمانہ فیصلوں کی بنا پر انتشار کی باعث ہوگئی۔ یہ تو حکومت کے اپنے پیدا کردہ عناصر ہیں جو علیحدگی پسندی کے رجحانات پیدا کرنے اور انھیں ہوا دینے کا کام کر رہے ہیں۔

مسئلہ کشمیر

مسلم وغیر مسلم کے درمیان منافرت ابھارنے والا ایک عنصر مسئلہ کشمیر ہے۔ کشمیر کی وجہ سے ہندوستان وپاکستان میں اتحاد پیدا ہونے نہیں پاتا۔ جب کبھی پاکستان ہندوستان کے خلاف کوئی حرکت کرتا ہے یہاں کی غیر مسلم اکثریت بجائے اس کے کہ پاکستان کے خلاف اپنی طاقت مضبوط بنانے کے لیے اندرونی انتشار کو دور کرکے یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کرے اپنے مسلم بھائیوں ہی کے خلاف کارروائی کرنے کو پاکستان کے خلاف نفرت کے اظہار کا ذریعہ سمجھتی ہے۔

غیر مسلم اکثریت کی کچھ جماعتوں کے وجود کو تقویت اسی کارروائی سے پہنچتی رہتی ہے۔ اگر مسلمانوں کے خلاف ان کارروائیوں کا موقع فراہم نہ ہو تو یہ بات ایک حد تک یقینی ہے کہ یہ جماعتیں اپنا وجود ہی ختم کر بیٹھیں۔ کیونکہ ان جماعتوں کا نصب العین چاہے جو کچھ بھی ہو لیکن اس کے حصول کا شاید ذریعہ یہی مواقع ہیں

اقتدار پرستی اور الکشن

ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ رہبران قوم اقتدار پرستی کے شکار ہوچکے ہیں وہ اقتدار جو حکومت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اقتدار پسندی تو انسان کی فطرت میں داخل ہے جو انسان کی ترقی کی راہ میں زحمت نہیں بلکہ رحمت ہی ثابت ہوتی ہے لیکن یہی اقتدار پسندی جب اقتدار پرستی میں بدل جائے تو پھر صاحب اقتدار سے ملک اور قوم کی فلاح کی توقع نہیں کی جاسکتی بلکہ ہمیشہ ملک کی تباہی کا خطرہ لاحق رہے گا۔

ہم ان رہبران قوم کو اقتدار پرست کہتے ہیں جو اصولوں کو اقتدار پر قربان کر دیا کرتے ہیں جمہوری نظام کے اندر حکومتی قوت ان ہی کو حاصل ہوتی ہے جو الکشن میں زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کر لیتے ہیں اقتدار پرست لیڈروں کے اقوال و افعال اور کردار الکشن کی مصلحتوں کے زیر اثر ہوتے ہیں وہ اپنی ہر بات اور ہر فعل پر الکشن کی کامیابی کا لحاظ کرتے رہتے ہیں اور کبھی ایسی باتیں نہیں کرتے جو ان کے حلقۂ انتخاب کی اکثریت کی مرضی کے خلاف ہو چاہے ایسا کرنے سے ان کے وہ اصول مجروح ہو رہے ہوں جن کی علمبرداری کا وہ زندگی بھر دعویٰ کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ جب الکشن کا زمانہ آتا ہے تو علیحدگی پسندی کے رجحانات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور وہ رجحانات جو تین چار سال سے رو بہ زوال ہوتے رہتے ہیں ایک بار پھر جذباتی غذا پاکر ابھر آتے ہیں۔ اس طرح ہر چار پانچ سال کے بعد ان رجحانات کو وہ غذا ملتی رہتی ہے جسے آج کے جمہوری نظام میں ایک جائز غذا تسلیم کر لیا گیا ہے۔

مشرقی و مغربی قدروں کا تصادم

مغربی افکار و اعتقادات جو انگریزی حکومت کا ورثہ ہیں ہمارے بیشتر رہنماؤں کے دلوں میں رچ بس چکے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ پورا ملک انھیں قبول کر لے وہ پورے ملک کا نظام زندگی بدل دینا چاہتے ہیں، وہ اخلاق کے منکر تو نہیں ہیں لیکن مذہب کی مقرر کردہ اخلاقی قدریں ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان کے نزدیک اخلاقی قدریں وہ ہیں جو قوم کی مادی ترقی میں مددگار ہوں۔ اگر شرم و حیا عصمت و پاکدامنی، پاس عہد وغیرہ اخلاقی قدریں اس ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوں تو صدید ضابطہ زندگی میں ممنوع ہیں۔ ہمارا ملک مذہبی ملک ہے۔ یہاں کا سواد اعظم کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ مغربی افکار کے اثرات پھیلیں اور پروان چڑھیں اور مذہبی قدریں جو اس قوم کا طرۂ امتیاز ہیں ختم ہو جائیں۔

یہ ہیں وہ عناصر جن سے ملک کے علیحدگی پسندی کے رجحانات غذا حاصل کرتے رہتے ہیں، تا وقتیکہ انھیں روکا نہ جائے جذباتی یکجہتی کے امکانات پیدا نہیں ہو سکتے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ جذباتی یک جہتی کیا ہے اور اس کا حصول کن ذرائع سے ممکن ہے۔

جذباتی یک جہتی

انسانی نفسیات میں غم و غصہ، خوف و بیزاری، فخر و خوشی، امید و مایوسی وغیرہ جو فطری محرکات

ہیں اور جن کے مانند ہیجان پیدا ہو جانے سے ہی انسان حرکت میں آتا ہے وہ سب ایک جذبے کے زیر اثر ہوتے ہیں جو محبت کا جذبہ ہے۔ انسان کے دل میں جس شے کی محبت ہوتی ہے جس کا شعور اسے ہو یا نہ ہو جب اسے بگڑتے اور تباہ ہوتے ہوئے دیکھتا اور سنتا ہے تو اس کے غم و غصہ میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اس شے کے لیے جب کسی خطرے کا احساس کرتا ہے تو اس پر خوف طاری ہوتا ہے اور جس چیز یا ذات سے اسے خطرہ لاحق ہوا ہے سے بیزاری و نفرت پیدا ہوتی ہے اور جب اس شے کو پنپتے اور پھولتے پھلتے دیکھتا ہے تو خوشی ہوتی ہے گویا کہ تمام فطری محرکات اس شے کی محبت کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے تجربات انسان کو روزانہ پیش آتے رہتے ہیں۔ انسان کو عموماً سب سے زیادہ محبت اپنے نفس اور اپنی خودی سے ہوتی ہے اور اسی طرح والدین، خاندان، وطن، اصول زندگی، انسانیت، خدا وغیرہ کی محبت اس کے دل میں فطری طور پر موجود ہے لیکن ہر انسان کے اندر ان تمام اشیاء سے محبت یکساں نہیں ہوتی کسی کو سب سے زیادہ محبت اپنے والدین سے ہوتی ہے اور اگر والدین کو کسی شے سے کچھ نقصان پہنچ رہا ہو تو اسے اس شے سے نفرت و بیزاری ہوگی چاہے وہ اس شے سے محبت کرتا رہا ہو گویا والدین کی محبت پر ہر شے کی محبت قربان کر دی جاتی ہے کسی کو سب سے زیادہ محبت اپنی خودی سے ہوتی ہے۔ اپنے والدین کے ذریعہ بھی اگر اس کی خودی مجروح ہوتی ہو تو اس شخص کو اپنے والدین سے بھی نفرت و بیزاری پیدا ہو گی حالانکہ والدین کی محبت اس کے دل میں فطری طور پر موجود ہے۔ گویا اپنی خودی کی محبت پر ہر دوسری محبت قربان ہے۔ اس طرح مختلف انسانوں کے مراکز محبت مختلف ہوتے ہیں جن پر اور دوسری محبتیں قربان کر دی جاتی ہیں لیکن کوئی ضروری نہیں کہ محبت کے مراکز ہمیشہ ایک ہی رہیں اور تبدیلی نہ ہو بلکہ جیسے جیسے شعور و عقل میں ارتقاء ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے ایک انسان کے مراکز محبت بدلتے جاتے ہیں۔ غیر شعوری اور لاعلمی کی حالت میں اس کا اپنا نفس ہی اس کا مرکز محبت ہوتا ہے۔ اپنی جان بچانے، اپنے ہی لیے سب کچھ کرنے کی طرف اس کی توجہ مرکوز رہتی ہے اور وہ والدین، خاندان، وطن وغیرہ کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ جب شعور میں کچھ ترقی ہوتی ہے تو پھر اس کا مرکز محبت والدین ہو جاتے ہیں اس طرح اس کا مرکز محبت اپنے نفس سے والدین، والدین سے خاندان، خاندان سے وطن، وطن سے اصول، اصول سے انسانیت اور انسانیت سے خدا تک منتقل ہوتا چلا جاتا ہے اور شعور و عقل کے ارتقائی مدارج کے اعلیٰ ترین درجے پر پہنچنے پر اس کا مرکز محبت خدا کی ذات ہو جاتی ہے بقیہ تمام محبتیں اس کے تحت آجاتی ہیں۔ ایک معاشرے کے افراد کا مرکز محبت اگر ذات باری تعالیٰ نہ ہو تو پھر اسی معاشرے میں مختلف لوگوں کا مرکز محبت مختلف ہوگا یعنی مختلف باتوں پر لوگوں کے فطری محرکات میں ہیجان پیدا ہوتا رہے گا اور معاشرے میں انتشار رہے گا۔ وقتی طور پر ان سب کا مرکز محبت ایک

کیا جاسکتا ہے مثلاً وطن سب کا مرکز محبت قرار پائے اور جب ایسا ہوتا ہے تو معاشرے میں جذباتی یکجہتی پیدا ہو جاتی ہے اور جہاں مرکز محبت بدلا معاشرے میں انتشار پیدا ہوا۔

اس طرح انسانی نفسیات کا تجزیہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ جذباتی یک جہتی مرکز محبت پر منحصر ہے معاشرہ چھوٹا ہو یا بڑا یعنی ایک خاندان ہو یا ایک گاؤں یا محلہ ہو یا ایک شہر ہو یا ایک ملک ہو جو بھی ہو تمام افراد معاشرہ کا مرکز محبت اگر ایک ہے تو پھر پورے معاشرے میں جذباتی یک جہتی موجود ہے۔ ورنہ معاشرے کے جتنے افراد کا مرکز محبت ایک ہوگا اتنے میں جذباتی یکجہتی ہوگی اور باقی میں نہیں ہوگی اس طرح پورا معاشرہ مختلف مراکز محبت کی وجہ سے مختلف گروہوں اور اکائیوں میں تقسیم ہو جائے گا اور ان گروہوں میں یکجہتی نہیں بلکہ اختلافات ہوں گے۔ اگر ایک ملک کے رہنے والے جو مختلف صوبوں میں رہ رہے ہوں اپنا مرکز محبت اپنے اپنے صوبوں کو قرار دیں تو پھر ہر صوبے کا مرکز محبت الگ الگ ہوگا اور ملک میں جذباتی یک جہتی پیدا نہیں ہو سکے گی۔

حب الوطنی

ہندستان کے اندر مختلف العناصر معاشرے بستے ہیں جن کے مراکز محبت مختلف ہیں اس لیے ان میں جذباتی یک جہتی پیدا کرنے کے لیے ایک مرکز محبت کی تلاش کرنا پڑے گی۔

فی زمانہ کسی ملک کے معاشروں کے لیے مرکز محبت اس ملک کی محبت ہی کو سمجھا جاتا ہے جسے حب الوطنی کہتے ہیں اور اس سے بلند کوئی ایسی چیز یا ذات نہیں سمجھی جاتی جو پورے ملک کے لیے مرکز محبت قرار دی جائے۔ لیکن ہندستان کے لیے ہمیں حب الوطنی سے بلند تر شے کی تلاش کرنی ہے کیونکہ اسکی حیثیت ایک ایسے ملک کی نہیں ہے جہاں کی زبان ایک ہو، تہذیب ایک ہو، تاریخ ایک ہو، محبوب شخصیتیں ایک ہوں، حکومت ایک ہو بلکہ اس کی حیثیت اگر براعظم کی نہیں تو برصغیر کی ضرور ہے جس میں مختلف مزاج، مختلف تہذیب، مختلف کلچر، مختلف زبان اور مختلف عقیدوں کی حامل سوسائٹیاں بستی ہیں۔ ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے ان سب کو ملاکر ایک قوم کہا جاسکے الا یہ کہ وہ سب ایک مرکزی حکومت کے تحت رہ رہی ہیں۔ اس لیے وطن کی محبت کے ساتھ قوم کی محبت ملکر جو ایک زبردست طاقت بنتی ہے وہ ہندستان میں مفقود ہے۔ یہ طاقت تو یہاں کے مختلف صوبوں کو حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ صوبائی محبت ملکی محبت پر غالب ہے۔

علیحدگی پسندی کے رجحانات کا جائزہ بتاتا ہے کہ حب الوطنی کی بنا پر صوبائی اکائیوں کے درمیان دیرپا اتحاد ممکن نہیں۔ اسی طرح تہذیبی اکائیاں بھی ایک قومیت میں منسلک نہیں کی جاسکتیں۔ حب الوطنی کے

مقابلے میں صوبائی اور تہذیبی تعصب زیادہ طاقتور ہے۔ جیساکہ جائزہ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندستان کی صوبائی تقسیم کوئی سیاسی اور انتظامی تقسیم نہیں ہے بلکہ زبان اور کلچر کی بنیادوں پر ایک قدرتی تقسیم ہے اس لیے اپنی زبان اور کلچر کے ساتھ جو لگاؤ ہوتا ہے اسے کوئی شخص محض اس بنا پر ختم نہیں کرسکتا اور نہ ختم کرنے والے کسی سوال کو گوارا کرسکتا ہے کہ پورے ہندوستان میں ایک زبان اور ایک کلچر قائم کرنا ہے تاکہ ملک میں یک جہتی پیدا ہو۔ ملک میں مصنوعی یک جہتی پیدا کرنے کے لیے فطری لگاؤ کے بندھن توڑے نہیں جاسکتے

اس موقع پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ صوبائی اور تہذیبی اکائیوں کو جوڑنے والی ایک کشش تو کام کر ہی رہی ہے۔ یعنی سیاسی و معاشی مصلحتیں تو ان سب کو ایک مرکز پر مرکوز کیے ہوئے ہیں اور یہ ایک ایسا بندھن ہے کہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس لیے اسی کو زیادہ مضبوط بنانے کی ترکیبیں کرنی چاہیے۔ لیکن سیاسی و معاشی مصلحتوں کا تعلق دل سے نہیں ہوتا ان کا تعلق صرف فکر سے ہوتا ہے۔ فکری اور جذباتی تعلق کی طاقتوں میں بہت فرق ہے۔ جذباتی تعلق بمقابلہ فکری تعلق کے زیادہ گہرا اور دیرپا بلکہ دائمی ہوتا ہے اور فکری تعلق پر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔

دوسری چیز جو حب الوطنی کو کمزور کرتی ہے وہ خود سیاسی و معاشی مصلحتوں کا ایک حالت میں برقرار نہ رہنا ہے۔ آج کے انقلابی زمانے میں سیاسی و معاشی حالتوں کو استقلال نصیب نہیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے پاکستانی صوبوں اور ہندوستانی صوبوں میں جو وطنی تعلق محض سیاسی و معاشی مصلحتوں کی بنا پر تھا وہ اب باقی نہیں رہ گیا اس لیے دونوں کے درمیان بجائے محبت کے جذباتی مخالفت پیدا ہوگئی۔

کثیر الاختلاف تہذیب میں بنیادی اتحاد

ان وجوہ کی بنا پر ہندستان کے مختلف المزاج گروہوں میں صرف ہندوستانی وطنیت اور حب الوطنی کا واسطہ دیکر جذباتی یک جہتی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اس سے نہ تو مطلوبہ اتحاد کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے اور نہ اس پر کوئی نقشہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ہمیں ایک ایسی قدر مشترک کی تلاش کرنی چاہیے جو کسی حد تک سبھی اکائیوں — صوبائی، تہذیبی، مذہبی اور نسلی میں جھلک رہی ہو تاکہ اسی قدر مشترک کا سہارا لیکر ان اکائیوں کو جوڑنے کی فکر کی جائے۔

روحانیت

ہندوستان ہزاروں سال سے روحانیت کا علمبردار چلا آرہا ہے۔ اور باوجود آج کے مادی پر آشوب حالات

کے جو دنیا کے دوسرے تمام ملکوں پر طاری ہیں۔ ہندوستان نے اپنی روحانی خصوصیات پر آنچ نہیں آنے دی ہے۔ رہبرانِ قوم کی عظیم اکثریت روحانیت سے ایک جذباتی تعلق رکھتی ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں ہندوستان روحانیت کی بدولت ایک انفرادیت کا مالک ہے اور دنیا کے ملکوں میں یہی اس کی انفرادی شان ہے۔ خوش قسمتی سے تقریباً سبھی صوبائی تہذیبی نسلی اور لسانی اور مذہبی اکائیوں میں روحانیت ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس لیے پورے ملک کے لیے اسے ایک معیار مشترک بنایا جاسکتا ہے اور معیار مشترک کے حصول کے لیے سبھی اکائیوں میں جذباتی ہم آہنگی اور ایک جہتی پیدا کی جاسکتی ہے۔

ہندوستان کی امتیازی شان

اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کی نظروں میں ہماری امتیازی شان برقرار رہے اور ہماری تمام مختلف العقیدہ ومختلف المزاج اکائیاں ایک سلک میں اس طرح منسلک ہو جائیں کہ کوئی خارجی طاقت انھیں الگ نہ کرسکے تو ہماری تمام جد وجہد انفرادی، اجتماعی، معاشی اور سیاسی وغیرہ اسی نہج پر لگ جانی چاہیے جس سے روحانیت کو فروغ حاصل ہو اور دنیا کو ایک بار پھر نظارہ کرایا جاسکے کہ انسانیت کی ہمہ جہتی ترقی اگر ممکن ہے تو روحانیت کے برقرار رکھنے میں ہی ممکن ہے اسے چھوڑ کر مادی ترقی جتنی بھی کرلی جائے انسانیت کی ترقی نہیں بلکہ تباہی کا باعث ہوگی جیسا کہ دنیا مشاہدہ کررہی ہے۔ جو ممالک جس قدر مادی ترقی میں آگے ہیں اسی قدر ان سے انسانیت کو خطرہ لاحق ہے ہمیں اس وقت تباہی کی طرف جانے والی انسانیت کو روکنا ہے۔ اگر ہم نے اپنا مقصد وجود فروغ روحانیت قرار نہیں دیا اور صرف انسانیت انسانیت کی دہائی دیتے رہے اپنا سارا زور سرمایہ صرف مادی ترقیوں ہی کی طرف لگائے رکھا تو ہم بھی دوسرے ملکوں کی طرح معاشی بھیڑوں اور بھیڑیوں سے زیادہ کی حیثیت کے مالک نہیں بن سکتے۔

ہماری حیثیت آج سے ۵۰ سال پہلے معاشی بھیڑوں کی تھی اور اب خدا کا فضل ہو کہ ہم اس سے نکل آئے تو کیا اس لیے نکل آئے ہیں کہ بھیڑیوں کی حیثیت حاصل کرنے کی جد وجہد کرسکیں یا اس لیے نکل آئے ہیں کہ دنیا سے اس تصور حیات کو مٹا ڈالیں جس نے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت پر کاری ضرب لگائی ہے اور دنیا کے سامنے وہ نظام زندگی پیش کریں جو سراسر روحانیت پر قائم ہے اور جسے اپنانے سے ہی فلاح انسانیت کی امید کی جاسکتی ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ کم از کم کوئی ایک خصوصیت تو ایسی ہو جس کی بنا پر ہندوستان کا ہر فرد ہندوستانی

کہلانے میں فخر محسوس کرے اور دنیا میں اپنی امتیازی شان سمجھے تو ہمیں روحانیت کا علمبردار بن کر کھڑا ہونا پڑے گا اور اس راہ کے جتنے کانٹے اعتقادی، نظریاتی، فکری اور مادّی ہیں انھیں ایک ایک کرکے صاف کرنا پڑے گا۔

اگر ہندوستان نے اپنی دستوری زبان سے اپنے مقصدِ وجود اور معیارِ زندگی کا اعلان کردیا اور پھر اس کے لیے جدوجہد شروع کردی تو اگر پورے طور پر نہ سہی کم از کم ایک عظیم اکثریت کے درمیان جذباتی یک جہتی پیدا کرنے کے لیے راہیں خود بخود نکلتی چلی جائیں گی۔ اب تک چونکہ ہم نے اپنا کوئی بلند اور حقیقی نصب العین مقرر نہیں کیا ہے اس لیے مختلف جماعتوں اور گروہوں نے اپنے الگ الگ مقاصد قرار دیے ہیں اور انھیں کے حصول کی کوشش بھی ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے اور سب کا آخری گول ایک نہیں ہے تو ان میں تصادم ہوتا رہے گا اور تعصب و منافرت کے جذبات ابھرتے رہیں گے۔ اس لیے جذباتی یک جہتی کے لیے ضروری ہے کہ پورے ملک کا نصب العین ایک ہو اور وہ ہو روحانی ترقی۔

جذباتی یک جہتی کے لیے طریقۂ کار

روحانیت کیا ہے اور کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ اس کی فلسفیانہ تشریح کے لیے تو یہ صفحات گنجائش نہیں رکھتے صرف اتنا اشارہ کفایت کرسکتا ہے کہ روحانیت ایک ایسی طاقت ہے جو بلا کسی مادی لگاؤ کے انسان کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ اس کی انسانی صفات ابھر کر حیوانی جبلتوں پر غالب آجائیں۔ ہزاروں سال کا بلکہ یوں کہیے کہ جب سے انسان کا وجود اس کرۂ ارضی پر ہوا ہے دنیا کی تمام قوموں کا متفقہ تجربہ ہے کہ خالق کائنات سے محبت اور اس کی ناراضی کے خوف نے ہی حیوانی جبلتوں کے دبانے اور انسانی صفات کے ترقی دینے کا کام کیا ہے انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کے دل میں خوفِ خدا جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر اس کا اخلاق بلند ہوتا جائے گا یعنی اس کی انسانی صفات ابھرتی جائیں گی۔ اس کے خلاف کوئی عقلی یا نقلی دلیل تاریخ سے پیش نہیں کی جاسکتی۔

فروغِ روحانیت بالفاظ دیگر لوازمات روحانیت کی ترقی جن میں صداقت، شجاعت، عدالت، سخاوت، رحم و کرم، شرم و حیا، عصمت، خودداری وغیرہ انسانی صفات خاص اہمیت رکھتی ہیں ہمارے ملک کا نصب العین ہونا چاہیے۔ اربابِ حکومت اور رہبرانِ قوم کی پہلی توجہ اسی طرف ہونی چاہیے۔ کوئی وجہ نہیں

کہ ملک کی اکائیاں اس نقطہ پر متحد نہ ہوں نصب العین متعین کرنے اور اس کا اعلان کرنے کے بعد ہمیں یکے بعد دیگرے حسب ذیل قدم اٹھانے ہوں گے۔

۱۔ آنے والے الکشن میں امیدواروں کو ترجیح دینے کے لیے جو شرطیں رکھی جائیں انمیں پہلی شرط روحانیت ہو اور دوسری شرطیں مثلاً سیاسی تدبر اور علم وغیرہ اس کے تحت ہوں۔ الکشن کے زمانے میں اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ اشتراکی ذہنیت رکھنے والے افراد کامیاب نہ ہونے پائیں۔ ان کی کامیابی روحانیت کی شکست کے مترادف ہے۔ سوشلزم چاہے کسی بھی شکل میں ہو روحانیت کی ہمنوا نہیں ہوسکتی اور سوشلسٹک اسٹیٹ میں جمہوریت اپنی اصلی شکل میں برقرار نہیں رہ سکتی۔ جناب جے پرکاش نرائن قوم کی مشہور شخصیت جو مدتوں سوشلزم کی تبلیغ میں سرگرم کار رہے ہیں اور ہندوستان کی سوشلسٹ پارٹی کی اعلیٰ سطح سے رہنمائی فرماتی رہے۔ سوشلزم کے مزاج کا جو تجربہ رکھتے ہیں اس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۱ء کے ہندوستان ٹائمس میں مسائل جمہوریت کے عنوان کے تحت وہ فرماتے ہیں: "سوشلزم جمہوریت کے سیاسی اداروں کو تو محفوظ رکھتی ہے لیکن ملک کی معاشی قوت مرکزی ریاست میں مرکوز ہو کر جمہوریت کو برقرار رکھ سکتی ہے ناقابل اعتنا ہے۔ قرین قیاس بات تو ہے کہ ایسی حالت میں جمہوری سیاسی ادارے بھی قائم نہ رہ سکیں گے ایسی حالت پیدا کرنے میں خود سوشلزم کا اتنا ہاتھ نہیں ہوتا جتنا کہ اس اسٹیٹ کا ہوتا ہے جس کے ہاتھوں میں ملک کے تمام معاشی وسائل و ذرائع سمٹ کر آجاتے ہیں اور بڑے بڑے صنعتی اداروں میں منقسم ہوجاتے ہیں۔ سارے ملک کی ایک مرکزی حکومت جو ملک کے سارے وسائل و ذرائع پر قابض ہو کر اختیار کلی کی مالک ہوجاتی ہے۔ عوام کو بالکل موقع نہیں دیتی کہ وہ کچھ بھی ملکی انتظام میں حصہ لے سکیں گو کہ وہ اس حکومت کے منتخب کرنے اور توڑنے کا حق رکھتے ہیں۔ اسی مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اس بات پر مفکرین کی اکثریت متفق ہے کہ ملک کو بڑے پیمانے پر صنعتی بنا دینے سے جمہوریت محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔"

(۲) اسمبلیوں میں پہنچنے والے حضرات اور زمام کار سنبھالنے والے ارباب حکومت کو چاہیے کہ اسمبلیوں میں روحانی ماحول پیدا کریں۔ خود اپنے اندر وہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کریں جن کے بغیر وہ ملک اور قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے بلکہ قوم پر بار اور باعث زحمت بنے رہیں گے۔ ملکی و غیر ملکی معاملات میں ارباب حکومت اقتدار کا رویہ جیسا کچھ بھی ہوتا ہے اس کا پرتو پوری قوم پر پڑتا ہے اور افراد قوم بھی وہی رویہ اختیار کرلیتے ہیں

اگر ان کا رویہ ہر حالت میں غیر جانبدارانہ و غیر متعصبانہ ہوگا اور حق و انصاف و صداقت پر مبنی ہوگا تو عاملین حکومت اور دیگر ملازمین جو اپنے اپنے دائرۂ اختیارات میں من مانی کیا کرتے ہیں اور انسانی قدروں کی بے دریغ بے حرمتی کیا کرتے ہیں نہیں کر سکیں گے اور اوپر سے نیچے تک حق و انصاف کی ایک فضا پیدا ہو جائے گی جس کا اثر عوام پر یقیناً پڑے گا۔ وہی کردار عوام کا بھی رفتہ رفتہ بنتا چلا جائے گا جو ارباب حکومت کا ہوگا اس طرح نمائندگانِ قوم اور اربابِ حکومت بلا واسطہ یا بالواسطہ پوری قوم کے مزاج و کردار کے بنانے اور بگاڑنے والے ہوتے ہیں۔ جتنے بلند کردار ہونے کا ان کی طرف سے مظاہرہ ہوگا کم و بیش اسی بلند کرداری کا نمونہ پوری قوم بنتی چلی جائے گی

اگر قوم کا اجتماعی ضمیر برے کو برا اور اچھے کو اچھا نہ سمجھے اور ہر جبر و اختیار میں برے بھلے کی تمیز نہ کرے تو تنہا قانون قوم کو راہِ راست پر نہیں لگا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کا ضمیر اپنے امراء و علماء کے ضمیر کا عکس پذیر ہوتا ہے اس لیے قوم کے بناؤ بگاڑ کی ساری ذمہ داری رہبران قوم اور اربابِ حکومت کے عملی کردار پر آکر پڑتی ہے۔ قوم کے اندر جذباتی یکجہتی پیدا کرنے کی کوئی اسکیم کامیاب نہیں ہوسکتی اگر حکومت کی سطح پر مختلف گروہوں اور جماعتوں کے ساتھ غیر جانبدارانہ اور غیر متعصبانہ رویہ اختیار نہ کیا گیا۔

۳- قوم کا جمہوری مزاج اور ملک میں جمہوری فضا ہر حال میں اپنی پوری قوت و روح کے ساتھ برقرار رہے۔ رہبران قوم و امرائے حکومت اور علمائے سیاست کے نظریات و خیالات اور افعال و کردار پر روحانی و جمہوری نقطۂ نظر سے تنقید کا دروازہ ہر شخص کے لیے اور ہمیشہ کھلا رہے۔ تنقید کا نقطۂ نظر معاشی و سیاسی بھی ہو لیکن روحانی و جمہوری نقطۂ نظر سے متصادم نہ ہو۔

ہر اس گروہ اور جماعت کو مکمل آزادی ہو جو کسی خاص نظریۂ زندگی اور نظام زندگی کی مبلغ ہو اور اپنے خیالات کی پرامن طریقے سے اشاعت کر رہی ہو۔

ہندوستان کی تمام جماعتیں سیاسی، مذہبی، اصلاحی جو بھی ہوں سب پوری آزادی کے ساتھ اور بلا کسی سیاسی و معاشی خوف کے اپنے نظریات و نظام فکر کی اشاعت و تبلیغ کریں لیکن کوئی جماعت سیاسی و معاشی طاقت کے بل پر اپنا نظر غالب کرنے کی مجاز نہ ہو۔

سیاسی دنیا میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن جماعتوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آجاتی ہے وہ اپنے نظریات

کی اشاعت و تبلیغ میں حکومت کی طاقت کا استعمال کرنے لگتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ جن نظریات پر ان کا ایمان ہے انھیں سارے ملک میں پھیلانے کے لیے حکومت کی طاقت کا استعمال اس لیے جائز ہے کہ اسی میں ملک کی فلاح و بہبود مضمر ہے گو کہ یہ بات وہ خلوص اور نیک نیتی سے سمجھتی ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتیں کہ جو نظریات اور نظام زندگی عقل اور علم کی کسوٹی پر کھرے نہیں ثابت ہو سکتے انھیں حکومت کی طاقت اور سازشی طریقوں سے قوم پر ٹھونسنے سے قوم کے اندر اس نظام زندگی کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں جذباتی یکجہتی کا کیا سوال اٹھ سکتا ہے۔

۴۔ نظام عدالت پر حکومت کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ عدالت کا خوف حکومت کے اعلیٰ ترین سربراہ کے دل میں بھی ویسا ہی ہو جیسا کہ ایک عام شخص کے دل میں ہوتا ہے ارباب حکومت کے لیے کہیں سے گنجائش نہ رہے کہ وہ سمجھیں کہ کسی مخصوص معاملے میں فیصلہ وہ اپنے حق میں کرا سکیں گے۔ عدالتوں کو بھی اپنی شان و عظمت برقرار رکھنے کی بدرجۂ اتم فکر کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کا یہ تاثر ہو جائے کہ عدالتوں سے انصاف اپنے حق میں کرایا جا سکتا ہے اور خریدا جا سکتا ہے۔

(۵) ذرائع اطلاعات بالکلیہ آزاد ہوں۔ مجرم اخباروں یا رسالوں کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلانا چاہیے اور یہ کام عدالت کے دیکھنے کا ہے کہ اگر کوئی جھگڑا یا فساد پیدا ہوا ہے تو اس میں اس اخبار کا کتنا ہاتھ ہے۔

(۶) مخرب اخلاق مناظر اور ان کے پیدا کرنے والوں پر پابندی عائد ہونی چاہیے۔ جو قوم کا اور خصوصیت کے ساتھ قوم کی نئی نسل کا اخلاق تباہ کرنے میں سب سے بڑا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ ایسی فلمیں جو فحش مناظر اور فحش گانوں پر مشتمل ہوں بند کر دینی چاہییں۔ ان کی جگہ تعمیری فلمیں آنی چاہییں جس طرح حکومت کا فرض قوم کی تعلیم کا انتظام کرنا ہے اسی طرح قومی کردار اور اخلاق کو بگڑنے سے روکنے کا انتظام بھی حکومت ہی کا فرض ہے۔

نظامِ تعلیم

جذباتی یکجہتی کمیٹی کے سوالیے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ممبران کمیٹی کے خیال میں قومی یکجہتی بچوں کی تعلیم سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کچھ اس ڈھنگ کا ہو کہ بچہ اس نصاب تعلیم سے گزرتے ہوئے ملکی اتحاد کے خیالات اپنے دل و دماغ میں جذب کرتا چلے اور جب ابتدائی مدارج سے اعلیٰ مدارج تک پہنچے اور فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو اس کا اعتقاد، فکر، عمل و کردار سب کچھ متحدہ قومیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو اور اس طرح تعلیم یافتہ نوخیز نسل ہندوستانی قومیت کا نمونہ بن سکے۔ ان حضرات نے غالباً اس بات پر غور نہیں

کیا ہے کہ جمہوری نظام میں نوخیز نسل سیاسی جماعتوں، برسراقتدار طبقوں اور ملکی و غیر ملکی سیاستوں کا جو اثر قبول کرتی ہے وہ کچھ اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ خاندان کا ماحول، اساتذہ کی تعلیم اور کتابوں کی باتیں کچھ بھی اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

جذباتی یکجہتی پیدا کرنے میں تعلیم یقیناً اپنا ایک مقام رکھتی ہے اور اسی بنا پر اساتذہ معمار قوم کہے جاتے ہیں لیکن نظریاتی تعلیم جو صرف کتابوں اور اساتذہ کی تشریحات سے حاصل ہوتی ہے وہ معلومات میں اضافہ تو کرتی ہے رجحانات اور کردار کی تعمیر کا کام نہیں کرتی۔ رجحانات و کردار کی تعمیر کا کام تو خاندان کا ماحول اور والدین و اساتذہ کی شخصیتیں کرتی ہیں۔

بچوں میں مطلوبہ صفات تب ہی پیدا کی جا سکتی ہیں جب کہ خاندان، پڑوس اور والدین و اساتذہ کی شخصیتوں کے جو خارجی اثرات ان کے ذہن کی تعمیر میں ایک اہم اور ناگزیر پارٹ ادا کرتے ہیں مدرسوں کی تعلیم سے ہم آہنگ ہو جائیں جب تک ایسا نہ ہوگا مدرسوں کی تعلیم تعمیر سیرت کا کام نہیں کر سکے گی۔

ملک کے اندر مذکرہ بالا حالات پیدا کرنے کے بعد ہی کسی مؤثر اور تعمیری نظام تعلیم کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ بالفرض بھارت میں ان حالات کے پیدا کرنے کی داغ بیل ڈالدی گئی تو اب ہمیں نصاب تعلیم پر غور کرنا ہے کہ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے نوخیز نسل میں جذباتی یکجہتی کس طرح پیدا کی جائے۔

جہاں تک کہ نصاب اور مضامین نصاب کا تعلق ہے ان کے مقرر کرنے اور ترتیب دینے میں ہمیں سب سے زیادہ اہمیت جس بات کو دینا ہے وہ یہ کہ ایسے مضامین منتخب کیے جائیں جن کے ذریعہ بچوں کے ابھرتے ہوئے ذہن پر دھائی و جمہوری اقدار کا عکس جمتا چلا جائے۔ مذہبی عقیدوں کی تعلیم میں اس بات کا خیال کرنا ضروری ہے کہ ایسے عقیدے ان کے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش نہ کی جائے جنھیں آگے چل کر ان کی عقل قبول کرنے سے انکار کر دے اور بچپن کے بنے ہوئے عقیدوں اور عقل میں مطابقت نہ پیدا ہو سکے۔ بچے کا عقیدہ جیسا کچھ بھی بن جائے اس کے ساتھ ایک جذباتی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور جب اس کے جذبات اور اس کی عقل میں مطابقت نہیں پیدا ہوتی تو اس کے ارادے میں تذبذب اور کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ جس قوم کے افراد کمزور ارادے کے ہوتے ہیں وہ قوم ہمیشہ پیچھے چلنے والی ہوتی ہے۔ اس بنیادی اور اہم بات کا لحاظ رکھتے ہوئے نظام تعلیم کا خاکہ حسب ذیل ہونا چاہیے۔

(۱) ہر مذہبی اور تہذیبی گروہ اپنے مذہب کی تعلیم اپنے بچوں کو دینے کے لیے جو نصاب چاہے مرتب کرے اور جس زبان میں دینا چاہے دے۔ بنیادی مذہبی تعلیم ابتدائی مدارج ہی میں ختم ہو جانی چاہیے۔

(۲) ثانوی درجوں میں قومی زبان یعنی ہندی شروع کی جائے اور ہندی کا نصاب دو قسم کا ہو ایک آسان ہندی جو تمام بچوں کے لیے ضروری ہو اور ایک ہندی لٹریچر جو اختیاری ہو۔

(۳) دوسرے مضامین بچوں کی مادری زبان میں پڑھائے جائیں۔

(۴) روحانی اور اخلاقی مضامین کے ان پہلوؤں پر زور دیا جائے جن کے ذریعہ طلبا کی عقل کو اپیل کی جا سکے

(۵) ایک عالمگیر زبان یعنی انگریزی کی تعلیم بھی ثانوی درجوں سے ہی شروع کی جائے۔

(۶) سائنس اور دیگر علمی مضامین کی اصطلاحیں وہی اختیار کی جائیں جو دوسرے ملکوں میں بھی رائج ہیں تاکہ ہمارے طلبا نئے نئے انکشافات و ایجادات کے سمجھنے میں دقت محسوس نہ کریں۔

(۷) اعلیٰ تعلیم کے مرحلے میں گریجویٹ کے نصاب میں ایک مضمون اخلاقیات و مذہبیات کا بھی ہو اور ہر مذہب کے ماننے والوں کے لیے الگ الگ ہو اور ضروری ہو جو طالب علم جس مذہب کے بارے میں جاننا چاہے وہ اس مضمون کو اپنے گریجویٹ کے نصاب میں لے سکتا ہے۔ ہر مذہب کے ماننے والوں کی الگ الگ کمیٹیاں ہوں جو اس نصاب کے لیے کتابیں لکھیں اور وہی کتابیں نصاب میں داخل ہوں۔

اس طرح کا یا اس سے ملتا جلتا نصاب تعلیم اگر ملک میں جاری کر دیا جائے تو امید ہے کہ ہماری نئی نسل میں جذباتی یکجہتی پیدا ہو سکے گی۔

نوٹ:۔ جذباتی یکجہتی کمیٹی کے سوال نامہ کے اس جواب میں فاضل مقالہ نگار نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی حیثیت ذاتی ہے، جماعتی نہیں ہے ــــــ بھارت کی ترقی، قومی اتحاد اور جذباتی یکجہتی جیسے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ خیالات چونکہ قابل غور ہیں اس لیے ان صفحات میں انہیں شائع کیا گیا ہے:۔ (ادارہ)

سائنس کا فریب

(جناب وحید الدین خاں صاحب)

نظریہ ارتقاء کے سلسلے میں جو بے شمار سوالات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک اہم سوال یہ ہے کہ اگر انسان دوسرے حیوانات ہی کی ترقی یافتہ نسل ہے تو بیچ کی وہ مخلوقات کہاں ہیں جو ابھی موجودہ انسان کے مقام تک نہیں پہنچی تھیں اور حیوان اور انسان کے درمیان ارتقائی مراحل طے کر رہی تھیں۔ اس نظریہ کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ یقیناً ایسا ہوا ہے اگرچہ ابھی ہمیں اس کے تمام نمونے حاصل نہیں ہو سکے ہیں۔ اس یقین کی بنیاد پر ایک پورا شجرۂ نسب تیار کیا گیا ہے جو انسان کی نسل کو بندر تک جا ملاتا ہے۔ بندر اور موجودہ انسان کے درمیان کی یہ مفروضہ کڑیاں جن کو بالکل غلط طور پر گم شدہ کڑیاں (Missing Links) کہا جاتا ہے، ان کے بعض شواہد بھی زبردست تلاش و جستجو کے بعد فراہم کیے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک کا نام پلٹ ڈاؤن انسان (Piltdown Man) ہے جو پانچ سال پہلے تک ماقبل تاریخ کا سب سے قدیم انسان سمجھا جاتا تھا[1]۔ مگر جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ مکمل طور پر ایک فریب تھا جس میں تقریباً آدھی صدی تک سائنس مبتلا رہی۔ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے یہ پوری داستان ایک کتاب کی شکل میں شائع کر دی ہے جس کا نام ہے "Piltdown Forgery" یعنی پلٹ ڈاؤن کی جعل سازی۔

---

[1] لل (R. S. Lull) کی مشہور کتاب عضویاتی ارتقاء (Organic Evolution) جو سات سو صفحات پر مشتمل ہے اور ٹکسٹ بک کی حیثیت سے رائج ہے۔ اس میں انسان اور حیوان کے درمیان چار معلوم کڑیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

1. Ape-man of Jawa
2. Piltdown man
3. Neanderthal man
4. Cro-magnon man

چارلس ڈاسن (Charles Dawson) نامی ایک انگریز متحجر ہڈیوں (Fossil Bones) کے جمع کرنے کا بہت شائق تھا۔ ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے کہ وہ کچھ ہڈیوں کو لیکر برٹش میوزیم پہنچا اور یہ خبر دی کہ یہ ٹکڑے اسے جنوبی انگلینڈ کے ایک مقام پلٹ ڈاؤن (Piltdown) میں ایک کھوہ کے اندر کنکریوں کے درمیان پڑے ہوئے ملے ہیں۔ برٹش میوزیم کے ایک نامور عالم ڈاکٹر آرتھر اسمتھ وڈورڈ (A. S. Woodward) نے اس میں خصوصی دلچسپی لی اور بتائے ہوئے مقام پر پہنچ کر کھدائی کے ذریعہ مزید ٹکڑے حاصل کئے۔ اس طرح بہت کچھ زیادہ ہڈیوں اور دانت کے ٹکڑے جمع کرکے ان کا مطالعہ شروع کیا گیا۔

ان حاصل شدہ ٹکڑوں میں سب سے زیادہ نمایاں ایک جبڑے کا ٹوٹا ہوا حصہ تھا جو واضح طور پر ایک بندر کا جبڑا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس میں ایک خاص چیز بندر سے مختلف تھی۔ یہ اس میں لگے ہوئے داڑھ کے دو دانت تھے جن کی اوپری سطح ہموار (Flat) تھی۔ جو کہ صرف کسی انسانی دانت ہی میں ہوسکتی ہے۔ چنانچہ یہ قیاس کرلیا گیا کہ یہ جبڑا کسی انسان کا ہے اور اس کے بعد نہایت آسانی سے اس کو ارتقار کی ایک گم شدہ کڑی قرار دیا گیا۔ تلاش کرنے والوں نے جلد ہی پلٹ ڈاؤن کے آس پاس وہ کھوپڑی بھی حاصل کرلی جو دور سابق کے اس انسان کے سر پر قدرت نے پیدا کی تھی!

مذکورہ بالا کھوہ میں ماقبل تاریخ کے زمانے کے کچھ جانوروں کے آثار ملے جن سے یہ متعین ہوگیا کہ پلٹ ڈاؤن مین "قدیم برفانی دور کا انسان ہے جو پانچ لاکھ سال پہلے زمین کے اوپر گزر چکا ہے۔ اس تحقیق نے دوسری معلوم کی ہوئی گم شدہ کڑیوں —— جاوا مین اور پیکنگ مین وغیرہ کے مقابلے میں اس کو قدیم ترین معلوم انسان کی حیثیت دے دی۔ چارلس ڈاسن عظیم اعزازات کا مستحق قرار دیا گیا کیونکہ اس نے سائنس کی ایک پیچیدہ گتھی کو حل کرنے میں مدد دی تھی۔

پتھر میں تبدیل شدہ یہ انسانی ہڈیاں جو حاصل ہوئی تھیں وہ پورے انسانی ڈھانچے کے صرف بعض اجزا تھے مگر ماہرین نے اس کی روشنی میں قوتِ تخیل سے کام لیکر پانچ لاکھ سال پہلے کے انسان کا ایک پورا ڈھانچہ تیار کرلیا

جو اپنی بے ڈھنگی پیشانی اور بندر نما جبڑوں کے ساتھ سالہاسال تک سائنس دانوں کا مرکز توجہ بنا رہا۔ مگر ۱۹۵۰ء میں یکایک پلٹ ڈاون مین کی حیثیت کو سخت دھکا لگا۔ جب طبقات الارض کے ایک عالم ڈاکٹر کنیتھ آکلے (Kenneth Oakley) نے ایک کیمیاوی طریقے کو آزما کر اس کی تاریخ معلوم کی۔ یہ ایک اصول ہے کہ کوئی ہڈی جتنے دنوں تک زمین میں دفن پڑی رہے گی وہ اسی کے بقدر زیادہ مقدار میں ایک مخصوص عنصر کو جذب کرتی ہے جس کا نام فلورین (Fluorine) ہے۔ ڈاکٹر آکلے کی آزمائش سے معلوم ہوا کہ حاصل شدہ ہڈیوں میں جتنی فلورین پائی جاتی ہے اس کے لحاظ سے اس کی عمر صرف پچاس ہزار سال ہونی چاہیے نہ کہ پانچ لاکھ سال[1]۔

آکلے کی اس دریافت نے پلٹ ڈاون کو دوبارہ ایک معمہ بنا دیا۔ کیونکہ پانچ لاکھ سال پہلے کے ایک ڈھانچے کو تو گم شدہ کڑی فرض کیا جا سکتا تھا مگر ایک ایسا جاندار جو صرف پچاس ہزار سال پہلے موجود رہا ہو اس کا گم شدہ کڑی ہونا بالکل ناقابل قیاس تھا۔

اس کے بعد ۱۹۵۳ء کی ایک شام کو لندن کی ایک دعوت میں آکلے کی ملاقات آکسفرڈ یونیورسٹی میں انسانیات کے ایک پروفیسر ڈاکٹر وینر (J. S. Weiner) سے ہوئی۔ ڈاکٹر وینر آکلے کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے بعد گھر آکر اس نے سوچنا شروع کیا کہ آخر اس کی حقیقت کیا ہے۔ سب سے زیادہ حیرانی اس کو پلٹ ڈاون مین کے دانت کے بارے میں تھی — "ایک بندر نما جبڑے میں انسانی دانت جو اس طرح ہموار ہیں جیسے کسی نے ریتی سے ...." یہ سوچتے ہوئے اچانک ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ "ایسا تو نہیں ہے کہ کسی نے ریتی سے گھس کر دانتوں کو چکنا کر دیا ہو۔" اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ حقیقت کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اب وہ اپنے سامنے تحقیق کا ایک نیا میدان پا رہا تھا۔

وینر نے اپنے ایک ساتھی سر ولفرڈ لی گروز کلارک (Sir Wilfred Le Gros Clark) کی معیت میں چمپینزی (بندر کی ایک قسم) کا ایک داڑھ کا دانت لیا، اس کو ریت کر ہموار کیا اور اس کے بعد اسے رنگ کر دیکھا تو وہ پلٹ ڈاون کے دانت کے بالکل مشابہ تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں برٹش میوزیم گئے تا کہ

---

[1] بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ پلٹ ڈاؤن مین کی کھوپڑی کے متعلق آکلے کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی کے جبڑے کی عمر بھی جو اسی کے بقدر فرض کر لی تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ جبڑا درحقیقت موجودہ زمانے کے ایک بندر کا تھا جو فرضی طور پر مذکورہ کھوپڑی کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔

پلٹ ڈاون مین کے جبڑے حاصل کرکے اس کے متعلق اپنے قیاس کی تحقیق کریں۔ لوہے کا ایک مقفل بکس جو خاص طور پر فائر پروف بنایا گیا تھا، اس کے دروازے کھلے اور اس کے اندر سے پلٹ ڈاون کے ڈھانچے کے مقدس ٹکڑے نکالے گئے تاکہ سائنسی طریقوں کے مطابق ان کا گہرا تجزیہ کیا جائے۔ ایکسرے مشین اور دوسرے جدید قسم کے آلات حرکت میں آگئے۔ ایک مخصوص شکل کیمیاوی طریقہ بھی استعمال کیا گیا جو نائٹروجن کی کمی کو معلوم کرکے یہ بتاتا ہے کہ ہڈی پر کتنا وقت گزر چکا ہے۔

وینر کا قیاس صحیح تھا۔ ان مشاہدات سے معلوم ہوا کہ پلٹ ڈاون مین کے جبڑے کی ہڈی کوئی پرانی ہڈی نہیں تھی بلکہ معمولی قسم کے ایک بندر سے حاصل کی گئی تھی۔ ہڈی کا قدرتی رنگ چونکہ متحجر ہونے کے بعد بدل جاتا ہے، اس لیے فریب دہندہ نے نہایت ہوشیاری سے اس کو مہوگنی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ رنگ کو عین مطابق بنانے کے لیے چند مخصوص اجزا استعمال کیے گئے تھے۔ گہرے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ دانت کی سطح پر ایسے خراش موجود ہیں جو بلا اشتباہ اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ دانت مصنوعی طور پر رگڑا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے کناروں میں غیر فطری قسم کی تیزی بھی تھی جو کہ صرف ریتی سے رگڑنے ہی کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۳ء میں مندرجہ بالا تینوں محققین — آکلے، وینر، کلارک — نے اعلان کیا کہ جبڑا اور دانت بالکل فرضی ہیں — اس کے بعد وینر نے یہ معلوم کرنے کی کوشش شروع کی کہ اتنا بڑا فریب جو گھڑا گیا اس کا مصنف کون تھا۔ انہوں نے تمام ممکن تفصیلات جمع کرنا شروع کیں، ملک بھر کے سفر کیے تاکہ پلٹ ڈاون کے واقعہ سے متعلق جو افراد ہیں ان سے گفتگو کریں، جو لوگ مر چکے تھے وہ ان کے عزیزوں اور دوستوں سے ملا۔ اخبار کے قدیم فائلوں سے اس سلسلے کی تمام رپورٹیں پڑھ ڈالیں۔

اس گہرے مطالعہ کے بعد پلٹ ڈاون کے واقعہ سے تمام افراد بالکل بری نظر آئے۔ مگر ایک شخص — چارلس ڈاسن — اس سے مستثنیٰ تھا۔ جو اس واقعہ کا ہیرو تھا۔ تمام معلومات اشارہ کر رہی تھیں کہ اس بے بنیاد بات کا اصل مصنف ڈاسن ہی ہے۔

چارلس ڈاسن ایک کامیاب قانون داں تھا۔ وہ انگلینڈ کے اس مخصوص خطے کا باشندہ تھا جہاں متحجرات (Fossils) کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ڈاسن کو متحجرات سے بہت دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس کا یہی مشغلہ بن گیا کہ وہ متحجر ہڈیاں جمع کیا کرتا تھا۔ پلٹ ڈاون مین کے واقعہ سے پہلے وہ زمانۂ قدیم کے متعدد جانوروں کے ڈھانچے حاصل کرکے لندن کے عجائب خانے میں بھیج چکا تھا۔

بعد کو ڈاسن کو وہ مذاق سوجھا جس نے ۴۰ سال سے زیادہ مدت تک اہلِ علم کو فریب میں مبتلا رکھا۔ ڈاسن کے ایک ملاقاتی نے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ آواز دیے بغیر ڈاسن کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ ڈاسن کچھ تجربات میں مشغول ہے۔ وہ مختلف برتنوں میں کھاری اجزا اور رنگین عرق ڈال کر ہڈیوں کو اس میں ڈبوئے ہوئے تھا۔ ڈاسن نے اس کو دیکھ کر گھبرائے ہوئے انداز میں وضاحت کی کہ وہ متحجر ہڈیوں کو رنگ رہا تھا تاکہ یہ معلوم کرے کہ قدرتی طور پر ان کا جو رنگ ہے وہ کیسے بنتا ہے۔ اس قسم کے اور واقعات معلوم ہوئے جنھوں نے اس خیال کی تصدیق کر دی کہ اس گھڑے ہوئے فریب کا مصنف ڈاسن ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس وقت ہوا جبکہ اس سے بہت پہلے ڈاسن ۱۹۱۶ء میں ۵۲ برس کی عمر میں عین اپنی شہرت کے وقت مر چکا تھا۔

ڈاسن نے اپنے جھوٹ کو مکمل کرنے کے لیے ایک اور تدبیر کی۔ اس نے پتھر کے کچھ اوزار پیش کیے اور بتایا کہ یہ اسے پلٹ ڈاون کے مقام پر ملے ہیں۔ چنانچہ یہ تسلیم کر لیا گیا کہ یہ پتھر کے وہ اوزار ہیں جن سے پانچ لاکھ سال پہلے کا قدیم انسان کام لیا کرتا تھا۔ مگر بعد کی تحقیق نے اس کو بھی بالکل جعلی ثابت کر دیا۔ ڈاسن نے اسی قسم کا ایک پتھر کا اوزار ہیری موریز (Harry Moris) کو دیا تھا۔ موریز ایک بنک کا کلرک تھا اور پتھر کے پرانے نمونے جمع کرنے کا شائق تھا۔ بعد کو موریز اپنی تحقیق سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ پتھر کا اوزار بالکل جعلی ہے۔ موریز نے اس پتھر کو اپنی مخصوص الماری میں دوسرے نمونوں کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا۔ جب وینر کو اس کی اطلاع ملی تو اس کا شوق بڑھا مگر اس سے بہت پہلے موریز کا انتقال ہو چکا تھا۔

وہ پتھر کہاں ہے؟ وینر کو یہ سوال پریشان کرنے لگا۔ موریز کے مرنے کے بعد اس کی الماری دو ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی تاہم وینر نے اس کو ڈھونڈھ نکالا۔ الماری کھولنے پر معلوم ہوا کہ اس کے اندر بارہ خانے ہیں جن میں بہت سے نمونے لیبل لگے ہوئے رکھے ہیں۔ آخری خانے میں پلٹ ڈاون کا پتھر کا اوزار تھا۔ اس پر موریز کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ الفاظ درج تھے:۔

"Stained by C. Dawson with intent to defraud"

یعنی اس کو ڈاسن نے بالکل جعلی طور پر خود اپنے ہاتھ سے رنگا تھا تاکہ دنیا کو دھوکا دے کہ یہ بہت پرانے زمانے کا اوزار ہے۔ ایک نوٹ میں موریز نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہائیڈروکلورک ایسڈ پتھر کے بھورے رنگ کو ختم کر کے اس کو معمولی سفید رنگ کے پتھر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ دور قدیم کی ہڈیوں کے ٹکڑے جمع کر کے ان کی بنیاد پر جو فیاسی ڈھانچے کھڑے کیے گئے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ بے شک دور قدیم میں کوئی ڈاسن موجود نہیں تھا جو ہم کو دھوکا دینے کے لیے ان ہڈیوں کا حلیہ بگاڑ دیتا۔ مگر لاکھوں اور کروروں برس تک آندھی طوفان اور زلزلے زمین کے اوپر جو الٹ پلٹ کر رہے تھے ان کی وجہ سے ہڈیوں کے مقام اور ان کی ہئیت میں وہ ساری تبدیلیاں ہونا ممکن ہیں جن کا آج ہم نے "ڈاسن مین" کی صورت میں تجربہ کیا ہے۔ پھر ارتقاء کے حامیوں کے پاس وہ کون سا علم یقین ہے جس کی بنیاد پر وہ نامعلوم ماضی کے بارے میں اتنی قطعیت کے ساتھ اپنا دعوی پیش کر رہے ہیں۔

مضمون کو ختم کرتے ہوئے ماہنامہ پاپولر سائنس (Popular Science) کا مضمون نگار آخر میں لکھتا ہے:۔

"پلٹ ڈاؤن کی خیالی داستان اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔ مگر ایک معمّا ابھی تک حل نہ ہو سکا۔ وہ کیا مقصد تھا جس کے لیے ڈاسن نے اتنا بڑا جھوٹ تیار کیا؟ اس کو اس کام سے کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا برٹش میوزیم کو اس نے جو ہڈیاں فراہم کی تھیں وہ اس نے محض تحفہ کے طور پر پیش کی تھیں۔ اس نے ان کی کوئی قیمت وصول نہیں کی۔ پھر کیا شہرت اس کا مقصد تھا۔ کیا اس زبردست فریب کے ذریعہ وہ محض ایک مذاق کرنا چاہتا تھا۔ اس انگریز جعل ساز کو آخر کس چیز نے اس کام پر آمادہ کیا۔ اس کا معلوم کرنا کیمیاوی اور طبیعی تجربوں کی دسترس سے باہر ہے۔ اور شاید وہ ہمیشہ ایک راز ہی رہے گا۔"

یہ فقرہ درحقیقت اس بات کا اعتراف ہے کہ نام نہاد تجربی علم (Tested Knowledge) کائنات کی توجیہ نہیں کر سکتا۔ وہ ہماری دنیا کے صرف بعض واقعات کا تجزیہ کر سکتا ہے، جب کہ ہمیں ایک ایسے علم کی ضرورت ہے جو تمام واقعات کا تجزیہ کرے۔ جو تمام حقیقتوں کو ہم پر آشکارا کر سکے۔ یہ علم صرف وحی کا علم ہے، اس کے سوا کوئی اور علم اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا۔

(ریڈرز ڈائجسٹ، نومبر ۱۹۵۶)

حالات کا رُخ

(جناب کوثر یزدانی مدیر "کانتی" ہندی)

جن سنگھ آرگن "پانچجنیہ" کے ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے ترجمان کا ایک مضمون "سنگھ کی مخالفت کیوں؟" شائع ہوا ہے جس میں سنگھ کی اولین مخالف "مسلم سوسائٹی" گردانی گئی ہے۔ مسلم معاشرے کے بارے میں راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے خیالات کیا ہیں؟ ذیل کے اقتباسات اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

"سنگھ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اگر کسی کو بہت زیادہ پریشانی محسوس ہوتی ہے تو وہ ہے یہاں کا مسلم سماج۔ اس سماج کی پریشانی سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ یہ بدبختی ہی ہے کہ آج تک چند مستثنیات کے ساتھ یہ مکمل سماج بھارت ہی کا دانہ پانی حاصل کرنے کے بعد بھی اس ملک کے لیے "وفادار" نہ بن سکا۔ اگر اس کے دل میں ذرا بھی ملک کی وفاداری ہوتی تو اس ملک میں کسی نئے پاکستان کے بنانے کا خیال بھی نہ ہوتا۔ وفادار بننے کی صورت میں ہندو دل کی طرح ہی یہاں کا ذرہ ذرہ اس کے لیے "پاک" ہوتا۔ یہاں کے دریا، پہاڑ، جنگل غرض تمام چیزوں کے بارے میں اس کے اندر اپنے پن کا سوتا پھوٹتا رہتا اور مادر وطن کو تقسیم کرنے کا خواب دیکھنے والوں کی مخالفت میں وہ پیش پیش ہوتا۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ کچھ انگلیوں پر شمار کیے جانے والوں کو چھوڑ کر مجموعی حیثیت سے پورا مسلم معاشرہ یہاں کے قومی سماج کا جزو نہ بن سکا۔ وہ اپنے کو اس دھرتی کا پتر نہیں بلکہ اس سرزمین کا فاتح مانتا رہا۔ مغل سامراج کے خاتمے کے بعد بھی یہاں حکومت کرنے اور ہندو سماج کو منتشر کر کے اسلام کا علم لہرانے کی اس کی آرزوئیں ختم نہیں ہوئیں۔ انگریزوں نے اپنی غرض کے لیے ان آرزوؤں اور خواہشوں کو اور بھی شہ دی۔ پاکستان کا تصور اور اس کا وجود اسی رجحان کا پتہ دیتا ہے۔"

"یہاں ہم مسلم سماج پر عمومی حیثیت ہی سے غور کر رہے ہیں کچھ مستثنیات پر نہیں۔ استثنائی صورتوں میں ملک کے متعدد مخلص و فرمانبردار مسلمان بھی ہوئے ہیں لیکن ایک رحیم یار حسن خان یا عثمان یا اشفاق پر پورے سماج کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی جو چار کروڑ مسلمان یہاں بچ گئے خواہ انھوں نے راتوں رات کھدر پہن کر قوم پرستی کا جامہ ہی کیوں نہ پہن لیا ہو لیکن ان کے طبعی رجحانات و خیالات میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس کو ابن الوقت و خودغرض سیاستداں تسلیم کرنے سے گھبراتے ہیں۔ گزشتہ

۱۴ سالوں میں کوئی سال ایسا نہیں گزرا جبکہ یہاں پاکستان زندہ باد کے نعرے نہ لگائے گئے ہوں، پاکستانی جھنڈا
لہرانے کے واقعات نہ رونما ہوئے ہوں، یا کھلے عام پاکستان کی حمایت میں کلمات خیر نہ کہے گئے ہوں۔ اب تو
حالات سازگار پاکر پاکستان کو وجود بخشنے والی لیگ بھی دوبارہ سر اٹھانے لگی ہے یا بالفاظ دیگر بھارت دشمن
کٹر اسلام ازم نے دوبارہ کھلے عام اپنا مظاہرہ شروع کر دیا ہے۔"

یہ ہیں بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کے بارے میں ایک بڑے طبقے کے افکار و تصورات۔ یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ یہ
صرف راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے خیالات کی ترجمانی ہے جو بہرحال سنجیدہ اور پڑھے لکھے طبقے میں مطعون ہے۔
ڈاکٹر سمپورنانند جو ایک طرف تو اپنی مذہبیت کے باعث یہاں کی اکثریت کے لیے قابل تقلید ہیں تو دوسری طرف
حکومتی سطح پر وہ اترپردیش کے وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں اور اب قومی یکجہتی کمیٹی کے چیرمین بھی ہیں۔ ذرا سابق وزیر اعلیٰ
اترپردیش کے خیالات بھی ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ مسلمان ان کی نظر میں کیا ہیں۔

"مسلمانوں میں کچھ ایسی جماعتیں ہیں جو دن رات زہر افشانی کرتی رہتی ہیں۔ جماعت اسلامی ہی کو لے لیا
اس کو بھارت کا دستور تسلیم نہیں ہے۔ حکومت سے اس کا مستقل عدم تعاون (Non Co-operation)
ہے۔ یہ عدم تعاون اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ ملک کا دستور اسلامی شرع کے اصولوں کے مطابق
نہ ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں جب تک ملک میں پھر سے مسلم حکومت قائم نہ ہو جائے گی۔"

"تکلف تو ہوتا ہے لیکن ایک اور جماعت جمعیۃ العلماء کا نام بھی لینا پڑتا ہے۔ جمعیۃ کی شہرت مکمل
طریقہ سے قومی جماعت کی حیثیت سے ہے۔ اس کے متعدد معروف رہنما جنگ آزادی میں شامل رہے
ہیں۔ اب بھی اس کا کانگریس کا ساتھ ہے۔ جمعیۃ کے کئی ممبر کانگریس کے بھی ممبر ہیں۔ ہم ان کی اور ان کی قربانیوں
کی عزت کرتے ہیں لیکن ایک بات تو ظاہر ہی ہے۔ اگر جمعیۃ کا مقصد خالص سیاسی ہوتا تو اس کی ضرورت
ہی نہ ہوتی۔ کانگریس کافی تھی لیکن اس نے اپنے اوپر مسلمانوں کی محافظت کی ذمہ داری اوڑھ لی ہے اور
اس کے لیے اس کے ممبر اس مقام و مرتبہ کو استعمال بھی کرتے ہیں جو ان کو کانگریس میں حاصل ہے۔ یہ اس جماعت
کی تاریخ کے مطابق ہے۔"

"اپنے فرقہ کی مدافعت کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ سب کو اس کا حق ہے لیکن جمعیۃ نے کشمیر کے سوال پر جو
رخ لیا تھا، اردو کو اسلام اور مسلم تہذیب کے ساتھ جس طرح باندھا جاتا ہے، معمولی سے معمولی ہندو مسلم جھگڑوں کو
جو شکل دے دی جاتی ہے، کانگریس تنظیم کے داخلی انتخابات وغیرہ میں جمعیۃ کے ممبران جس طرح اپنے حق رائے دہندگی
کو استعمال کرتے ہیں اس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جمعیۃ کے طریقہ کار اور فرقہ پرستی کے درمیان اگر کوئی دیوار ہے
تو کہیں کہیں وہ بہت ہی پتلی ہے اتنا تو ہے ہی کہ بسا اوقات جمعیۃ کے کاموں سے دوسرے لوگوں میں اشتعال پیدا

ہوتا ہے اور فرقہ پرستی کو ہوا ملتی ہے ۔"

(کیا فرقہ پرستی ابھی زندہ ہے ؟) ——— دھرم یگ ۱۳ اگست ۱۹۶۱ء

پھر ڈاکٹر سمپورنانند ہی کی حد تک کیوں ؟ حکمراں پارٹی کے وہ لوگ جو وسیع النظر و وسیع القلب تسلیم کیے جاتے ہیں ان کے خیالات بھارت کے مسلمانوں کے بارے میں کیا ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اتر پردیش کے موجودہ وزیر داخلہ شری چرن سنگھ نے یوپی کے حالیہ فسادات سے متعلق ایک بیان میں فسادات کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دو وجوہ سے فسادات کے لیے پس منظر تیار ہوتا رہا۔ ایک وجہ تھی ہے اکثریتی فرقہ میں موجود ذات پات کی تقسیم اور دوسری ہے مسلمانوں میں نصف درجن جماعتوں کے ذریعہ پھیلائے گئے علیحدگی پسندی کے رجحانات۔ جب وزیر موصوف سے ان جماعتوں کے نام پوچھے گئے تو انھوں نے جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی، مسلم لیگ، مسلم مجلس، جماعت اور دینی تعلیمی کونسل کے نام گنا دیے گویا کہ موصوف نے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والی تمام ہی جماعتوں اور اداروں پر رائے زنی کی اور ان کے توسط سے پوری امت مسلمہ پر یہ الزام رکھ دیا کہ اس میں علیحدگی پسندی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت جمعیۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جب وزیر موصوف کے اس بیان پر چیلنج کیا تو اس کا جواب دیتے ہوئے وزیر داخلہ اتر پردیش کا ایک واضح بیان اور آگیا:۔

"جمعیۃ العلماء ہند ایک ایسی تنظیم ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ سیاست اور نظم و نسق مذہب کے دائرے میں داخل ہے .... مسٹر حفظ الرحمٰن اور دوسرے خواہ کچھ بھی کہیں جب ایک تنظیم صرف ایک فرقے کے مفادات کی حفاظت کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے تو اس کے کارکنوں کے لیے نفسیاتی طور پر قومی یکجہتی کے لیے کام کرنا ممکن نہیں ہے جمعیۃ برابر ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے تناسب کے لحاظ سے نمائندگی کا مطالبہ کرتی چلی آ رہی ہے۔ مختلف تقریبات پر جمعیۃ کے کارکنوں اور لیڈروں کی تقریروں سے یہ ظاہر ہے کہ وہ اقلیتی فرقے کو ہندوستانی قوم سے الگ سمجھتے ہیں جب بھی فرقہ وارانہ گڑبڑ ہوتی ہے جمعیۃ مسلمانوں کی کمک کے لیے دوڑتی ہے اور ایسا ماحول پیدا کرتی ہے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو اقلیت کے لوگوں کی شکایات کا مداوا نہ ہوتا .... کبھی کبھی اقلیتی فرقے کے لوگ غلطی کرتے ہیں اس کو بہت ہی نرم انداز میں پیش کر نا فرقہ وارانہ صورت حال کو خراب کر دینا ہے لیکن جب غلطیاں ہوتی ہیں تو جمعیۃ اس کی شاذ و نادر ہی مذمت کرتی ہے ۔"

"جمعیۃ کا اپنا ایک ترجمان "الجمعیۃ" ہے جو دہلی سے شائع ہوتا ہے اس کے اڈیٹوریل اور اس میں شائع شدہ خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ مسلمانوں کو علیحدہ رہنے کے لیے آمادہ کرتے رہنے میں کسی کٹر فرقہ پرست اخبار سے

دیکھے نہیں ہے"

پھر صرف شری چرن سنگھ ہی کی ذاتی رائے ہی کی حد تک نہیں بلکہ ان کے اس خیال کے مشیر بلکہ کل کے کل افراد ہیں جس کا اظہار انھوں نے خود اپنے بیان میں کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"ہو سکتا ہے کہ میں جمعیۃ کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں لیکن میں مولانا اور ان کے ساتھی کارکنوں سے کہوں گا کہ وہ ان کانگریسی کارکنوں کی رائے حاصل کریں جو کہ ملکی ترقی کے لیے ان کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے تقریباً سبھی جمعیۃ کے بارے میں بری طرح غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ وہ صرف مولانا کے احساسات کا خیال کر کے خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں"

یہ ہے وہ صورت حال جس سے ہم دوچار ہیں۔ اکثریت کی سیاسی و مذہبی جماعتیں مسلمانوں سے اب بالاعلان مطالبہ کر رہی ہیں کہ تم اپنی انفرادیت ختم کر دو، تمہارے ساتھ جو یہ اسلام اور مسلم کا دُم چھلا لگا ہوا ہے اس سے تو فرقہ پرستی کی بو آتی ہے۔ تم جو یہ امت مسلمہ اور انسانی برادری کا راگ الاپتے ہو اس سے ملک سے عدم وفاداری کا ثبوت آتا ہے، تمہاری زبان پر جو یہ محمدؐ، صحابہؓ اور دیگر غیر ہندوستانی شخصیتوں کے نام چڑھے ہوئے ہیں اس سے تمہاری قومیت مجروح ہوتی ہے۔ اگر تم کو بھارت کی سرزمین سے محبت ہے، اگر تمہیں اپنے ملک سے وفاداری کا ثبوت دینا ہے تو تم یہاں کی محترم شخصیتوں رام و کرشن کو نذرانۂ عقیدت پیش کرو۔ وغیرہ۔

حالات اتنے سنگین ہو گئے ہیں کہ بھارت کے وزیر داخلہ جناب لال بہادر شاستری اکثریت سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہوئے کہ "فیصلہ کرو کہ یہاں اقلیت کو رہنے دیا جائے یا نہیں"

افسوس یہاں کی اکثریت، فرقہ پرست جماعتیں نیز حکومتی افراد جس طرح زیر اقلیتوں کے بارے میں سوچتے ہیں یہ نہ تو اکثریت کے لیے مفید ہے اور نہ حکومت کے لیے۔ ایک فرقہ کی دوسرے فرقہ سے اس حد تک بڑھی ہوئی بدگمانی ملک کے لیے انتہائی مضر و مہلک ہے اس لیے یہ انداز فکر ہر صورت سے ختم ہونا چاہیے۔

اسی طرح اتحاد و یگانگت کی اسپرٹ نہ ادغام سے پیدا ہو سکتی ہے نہ انضمام سے بلکہ اس کی صحیح شکل یہ ہے کہ اکثریت اور حکومت انتہائی فراخ دلی سے تمام اقلیتوں کی انفرادی حیثیتوں کو تسلیم کرے اور پھر ان سے خیر سگالی اور دوستانہ ماحول میں دوش بدوش تعاون و معاونت چاہے۔ جارحیت و فرقہ پرستی کو کسی صورت بھی پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔

رہیں ہماری ذمہ داریاں تو مختصراً ان کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

(۱) ان بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں ہم نے اپنے آپ کو ایک نظریۂ حیات کے علمبردا
کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک قوم کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ہم نے اپنے معاملات میں، اپنے حقوق کے مطالبات میں،
اپنی انفرادیت میں اپنا رول کچھ اس طرح ادا کیا ہے کہ اس سے قوم پرستی کی بو آنے لگی۔ یہ انداز مختلف حیثیتوں سے غلط فہمیوں
بدگمانیوں کا موجب ہوا تلافی کی صحیح شکل یہ ہے کہ مسلمان اپنے کو ایک نظام حیات کے علمبردار گروہ ایک داعیِ حق اور
ایک اصولی جماعت کی حیثیت سے پیش کریں کسی قوم کے حریف یا معاند کی حیثیت سے نہیں۔
یہ واقعہ ہے کہ اسلام کسی قوم کی میراث نہیں، یہ اس شخص کی آبائی ملکیت نہیں ہے جس کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن ہے
اسلام تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے جو اسے اپنا لے یہ اسی کا ہے اور جو اسے ٹھکرا دے اس سے اس کا ادنیٰ سا بھی
تعلق نہیں لہذا ضرورت ہے کہ ہم اسلام کو دنیوی و اخروی فلاح و کامرانی کے واحد سبب کی حیثیت سے پیش کریں، ایک
قومی مذہب کی حیثیت سے نہیں۔
(۲) پھر اس دعوت و تبلیغ کا انداز کچھ ایسا ہو کہ اس میں جارحیت، قومیت اور کسی قسم کی محدودیت کی بو نہ آتی ہو
رب اللہ واحد کے مطیع فرمان کی حیثیت سے اللہ کے بندوں تک اس کا پیغام پوری وسیع القلبی کے ساتھ پہنچائیں۔
(۳) صرف اتنا ہی نہیں کہ ہم قولی اعتبار سے اسلامی دعوت کے علمبردار بن کر رہ جائیں بلکہ اپنے اخلاق و کردار میں
اپنے طرز معاشرت میں، کسب معاش اور معاملات میں اسلام کی پوری پوری شہادت دیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم مسجد میں تو
اللہ اللہ کریں اور بازاروں میں ہر وہ طریقہ اپنائیں جو کسی عامی کو زیب دیتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم گھر میں تو اللہ اور اس کے
رسول کی اطاعت پر پورا زور صرف کر دیں اور باہر معاشرہ میں ان تمام اطاعتوں کے پابند ہیں جو بہر صورت "اطیعوا اللہ
واطیعوا الرسول" کے حکم سے روگردانی کا مصداق بنتی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تو نجی محفلوں میں اسلام اور اسلامی احکام کا
چرچا کریں لیکن جب سوسائٹی کی بات آئے تو ہمارا کردار اس کا مخالف بن جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے ہم مسلک ساتھیوں
سے اپنے انتہائی خلوص کا اظہار کرتے پھریں لیکن جب غیروں سے سابقہ پڑے تو اپنے مسلمان ہونے پر بھی شرم محسوس
کرنے لگیں۔ اس نفاق اور منافقانہ روش کی اسلام نے سخت مخالفت کی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی مزاج
اسے کبھی برداشت کر ہی نہیں سکتا۔

(۴) آخری بات یہ ہے کہ اگر خدا نخواستہ دعوت و تبلیغ کے راستے میں شدید سے شدید تر آزمائشوں
سے دوچار ہونا پڑے تو صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اسی طرح ہم اللہ کی مدد کے مستحق ہو سکتے
ہیں۔

'ZINDGI' Monthly Rampur, Dec. 1961 Regd. No. A-688

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur